خواجہ غلام السیدین

(مع مقدمہ از ڈاکٹر سرسید راس مسعود ، ایل-ایل - ڈی - ڈی لٹ

ترقی اردو بیورو ، نئی دہلی

USOOL-E TAALEEM by K.G. SAYYEDAIN

پہلا ایڈیشن ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد ۱۹۳۵

دوسرا ایڈیشن ترقی اردو بیورو ، نئی دہلی

سنہ اشاعت 1981 1903 شک

تعداد 1000

قیمت 22-00

سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 229

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومت ے رعایتی
قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ڈائریکٹر ، بیورو فار پروموشن آف اردو ، (ویسٹ بلاک 8
آر - کے -پورم، نئی دہلی 110022) نے ترقی اردو بورڈ
وزارت تعلیم و ثقافت حکومت ہند ، نئی دہلی کے لیئے
گلڈیپ آرٹ پریس مایا پوری نئی دہلی سے چھپواکر شائع کیا۔

پیش لفظ

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت ہند کی وزارت تعلیم و ثقافت کے تحت ترقی اردو بیورو کے ذریعے جن لائحوں اور منصوبوں کو عملی شکل دی جا رہی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف جدید علوم پر کتابیں ماہرین سے لکھوائی جائیں اور ان علوم سے متعلق اہم مغربی و مشرقی کتابوں کے تراجم شائع کیے جائیں جو نہ صرف زبان بلکہ قوم کی ترقی میں بھی مفید و معاون ثابت ہوں۔

اس منصوبے کے تحت ترقی اردو بیورو اب تک خاصی تعداد میں کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ان میں شعر و ادب، تنقید، لسانیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، تجارت، زراعت، امور حکومت، معاشیات، عمرانیات، قانون، طب، فلسفہ اور نفسیات پر اعلیٰ کتابوں کے علاوہ تعلیم بالغان، بچوں کے ادب، سائنس اور تکنیکی علوم سے متعلق ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو اردو کی نصابی ضرورتوں کو بھی کسی حد تک پورا کر رہی ہیں۔ ان موضوعات پر اچھی آسان اور معیاری کتابوں کی جو کمی اردو حلقوں میں شدت سے محسوس کی جا رہی تھی وہ بیورو کے ذریعہ آہستہ آہستہ پوری ہو رہی ہے۔ ترقی اردو بیورو کی شائع کردہ کتابیں حسنِ طباعت کا ایک معیار قائم کرتی ہیں اور ان کی قیمت بھی نسبتاً کم رکھی جاتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کتابوں کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بیورو کے جامع منصوبوں کے تحت اردو انسائیکلو پیڈیا، اردو لغت (کلاں) اردو لغت (برائے طلبہ) انگریزی اردو لغت، اردو انگریزی لغت، بنیادی متون کی اشاعت، اردو کتابیات کی تیاری اور مختلف علوم کی اصطلاح سازی کے کام بھی جاری ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے ہمیں ملک بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب ترقی اردو بیورو کے اشاعتی پروگرام کا ایک جز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو داں حلقوں میں اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈائریکٹر، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

انتساب

میں اپنی اس تصنیف کو اپنے والد ماجد

آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم

کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں جنھوں نے اپنی تمام عمر

ان صحیح خیالات اور قدروں کی اشاعت میں صرف

کی جن پر قومی زندگی کی صحت اور بقا کا انحصار ہے

اور جن کی موثر تبلیغ تعلیم کا مقدس فرض ہے -

نہاں در سینۂ ما عالمے ہست

بخاک ما دلے، در دل غمے ہست

ازاں صہبا کہ جان ما بر افروخت

ہنوز اندر سبوئے ما نمے ہست

غلام السیدین

فہرست مضامین

مقدمہ

(از جناب نواب مسعود جنگ بہادر ڈاکٹر سر راس مسعود صاحب
ایل - ایل - ڈی ' ڈی لٹ ' بیرسٹرایٹ لا - سابق وائس چانسلر
علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

اس کتاب کے فاضل مصنف کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ھے جس نے ھمیشہ ادب کی اور بالخصوص اردو ادب کی صحیح خدمت کی ھے - خواجہ غلام السیدین صاحب کی رگوں میں الطاف حسین حالی مرحوم کا خون ھے اور یہ اسی کا فیض ھے کہ ان کی تحریر میں وھی سادگی اور صداقت پائی جاتی ھے جس نے حالی کی بیش بہا تصانیف کو اردو کے آئندہ ادیبوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بنا دیا ھے -

یہ ایک نہایت دل خوش کن شگون ھے کہ ھمارے ملک میں ایسے ھونہار نوجوانوں کی ایک جماعت پیدا ھوگئی ھے جنھوں نے مغرب میں تعلیم پانے کے بعد اردو زبان کی کم مائگی کو دور کرنے کا تہیہ کرلیا ھے اور جن کی کوششوں کا یہ نتیجہ ھے کہ اب اردو میں بھی اس قسم کی کتابیں تصنیف ھو رھی ھیں جن پر ھر ملک فخر کرسکتا ھے - میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ھوں کہ تعلیم اور اصول تعلیم پر خواجہ غلام السیدین صاحب کی اس کتاب سے بہتر آج تک کوئی کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی - یہ ایک ایسی کتاب ھے جس کو ھم فخریہ ان مستند کتابوں کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ھیں جو دوسرے ممالک کی زبانوں میں اس مضمون پر لکھی جا رھی ھیں - جہاں تک تعلیم کے اصولی مباحث کا تعلق ھے مصنف نے ھر پیچیدہ مسئلہ کو نہایت

قابلیت کے ساتھہ سلیس زبان میں عام فہم بنا کر ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ھے - اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ اس زمانے میں جب کہ ھماری قومی زندگی کے ھر شعبہ کا شیرازہ بکھرا ھوا ھے تعلیم و تربیت اور تعلیم و تمدن کا گہرا باھمی تعلق از سر نو سمجھایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ تعلیم بغیر تربیت کے ملک کے لئے مفید نہیں ھوسکتی - مجھے لایق مصنف کی اس رائے سے بھی پورا اتفاق ھے کہ کوئی نظام تعلیم صحیح معنوں میں کامیاب نہیں ھوسکتا جس نے اپنے تمدنی ماحول اور تاریخی روایات کو نظر انداز کردیا ھو -

میں ان لوگوں میں سے ھوں جن کا عقیدہ ھے کہ ھمارے ملک میں صحیح تعلیم اُس وقت تک نہیں پھیل سکتی جب تک کہ ھم اپنی مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم نہ بنائیں - موجودہ نقّالی سے جو نقصان ھو رھا ھے وہ اظہرمن‌الشمس ھے اور اسی کا ایک بڑی حد تک یہ نتیجہ ھے کہ ھمارے مدرسوں کے پڑھے لکھوں میں غور و فکر کا مادّہ کم ھوتا جاتا ھے - ان کی زیادہ تر قوت نقّال بننے میں صرف ھوتی ھے اور بجائے اس کے کہ ھماری قومی زندگی کی جڑیں زیادہ مضبوط ھوں اور سچی خود داری میں اضافہ ھو ' دونوں میں کمزوری بڑھتی جاتی ھے - موجودہ غلط طرز تعلیم نے ایک ایسا فرقہ ھمارے ملک میں پیدا کرنا شروع کردیا تھا جس کو نہ اپنی قومی روایات سے کوئی دلچسپی تھی ' نہ ملک کے عام باشندوں کے ساتھ ھمدردی اور تعلق - مجھے وہ زمانہ یاد ھے جب تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد اپنی مادری زبان کو بگاڑ کر بولنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھی - شکر ھے خدا کا کہ وہ زمانہ اب ختم ھوتا جارھا ھے اور لوگ یہ سمجھنے لگے ھیں کہ جو خود اپنی تہذیب اور روایات کی عزت نہیں کرتے ' ان کی عزت غیر قومیں بھی نہیں کرتیں -

اس کتاب کا وہ حصہ جس کا تعلیم فن معلمی سے ہے ہمارے ملک کے اساتذہ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا - اس کے پڑھنے سے اُن کو واضح طور پر معلوم ہوجائیگا کہ آج کل دنیا میں مختلف ممالک کس قسم کی تعلیمی جد و جہد میں مشغول ہیں اور مختلف قوموں نے اپنا تعلیمی نصب‌العین کیا قرار دیا ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جارہی ہیں - یہ کتاب ایک ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے جب ہمارے ملک کے سیاسی ماحول کے بدلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں - مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے ہر شخص کی معلومات میں اضافہ ہو گا چاہے اس کا تعلق تعلیم سے ہو یا سیاست سے - اگر ان اصولوں پر عمل کیا گیا جن کو اس کتاب میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے تو یہ ہمارے ملک کے لئے ایک نیک فال ہوگی اور وہ زمانہ جلد آجائے گا جب ہم یہ کہ سکیں گے کہ تعلیمی دنیا میں ہمارا ملک بھی کوئی وقعت رکھتا ہے -

بھوپال   سید راس مسعود

جنوری سنہ ۱۹۳۵ ع

اصول تعلیم

دیباچہ

اردو زبان میں فن تعلیم پر کتاب لکھنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں - یہ ان علوم میں سے ہے جن پر ہماری زبان میں بہت ہی کم کتابیں لکھی گئی ہیں حالانکہ نظری اور عملی اہمیت کے اعتبار سے اس کو انسانی علوم کی صف اول میں جگہ دینی چاہیے - شاید فی الحال ہمارے پاس چند ترجموں، چند مختصر تالیفوں اور نارمل اسکولوں کی درسی کتابوں کے سوا تعلیمی لٹریچر میں کچھ بھی نہیں - ترجموں میں سب سے متعدد اور مستند کتاب ہربرٹ **سپنسر** کی "فلسفہ تعلیم" ہے- کچھ رسالے اخلاقی تعلیم اور تعلیم کے بعض اور خاص مباحث پر لکھے گئے ہیں - کچھ مفید اور قابل قدر مواد اخباروں اور رسالوں وغیرہ کے متفرق مضامین میں ملتا ہے مثلاً سرسید احمد خاں کے مضامین تہذیب الاخلاق کی جلدوں میں یا ان خطبوں میں جو وقتاً فوقتاً ملک کی تعلیمی انجمنوں کے اجلاسوں میں دیے گئے ہیں - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے گذشتہ چالیس سالانہ جلسوں کے خطبات صدارت کو "خطبات عالیہ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کردیا ہے جن سے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور اہم تعلیمی مسائل پر روشنی پڑتی ہے - نارمل اسکولوں کی درسی کتب علمی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں - بس یہ ہے ہمارا کل تعلیمی سرمایہ ! لہذا جہاں اس کتاب کی تصنیف کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی نے مجھے اس کو لکھنے

کی دعوت دی وہاں دوسری وجہ یہ احساس ہے کہ موجودہ زمانے میں ہر تعلیمی تصنیف ایک نہایت شدید ضرورت کو پورا کرتی ہے اور شعبۂ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان میں تعلیمی تصانیف کا اضافہ کر کے اس کی موجودہ کم مائگی کو دور کریں -

اس کتاب کا مقصد اور نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مضامین کی تقسیم کا اصول بیان کردیا جائے - کتاب کے پہلے حصے میں میں نے تعلیم اور تمدن کے باہمی تعلق سے بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ تعلیم کا رشتہ تمدن کے مختلف شعبوں سے کیا ہے اور وہ کس طرح اس پر اثر انداز ہوتے ہیں - فن تعلیم کے بہترین ارباب فکر کا نظریہ یہی ہے اور یہی رہا ہے کہ ہم تعلیم کے کسی مسئلہ کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک اس کا مطالعہ اس کے تمدنی ماحول میں نہ کیا جائے - لہذا اس حصے میں ' میں نے ان تعلیمی مسائل سے بحث کی ہے جو موجودہ تمدنی اداروں کے مطالبات اور خصوصیات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ خانگی زندگی اور درسی زندگی کا کیا تعلق ہے - افراد کی سیرت اور شخصیت پر اجماعتی زندگی کیا اثر ڈالتی ہے - ہمارے نظام معاشی نے ماہرین تعلیم اور تعلیم گاہوں کے لئے کیا جدید اور اہم مسائل پیدا کردیے ہیں - حکومت کا تعلق تعلیم کی نوعیت اور اس کے نظم و نسق سے کیا ہے اور ملک کی موجودہ سیاسی حالت میں کس قسم کی تعلیم درکار ہے ؟ - مختصر یہ کہ اس حصے میں تعلیم کے وسیع تر علائق اور نتائج سے بحث کی گئی ہے تاکہ بالخصوص معلموں کو یہ محسوس ہوجائے کہ ان کے کام کی اہمیت اور حیثیت محض ایک اصطلاحی فن کی نہیں بلکہ اس کے اثرات بہت دور رس ہیں اور اس پر تمدنی زندگی کے تمام شعبوں کا رد عمل ہوتا رہتا ہے -

دوسرے حصے میں "درسی تعلیم" کے عنوان کے ماتحت ان مباحث کو پیش کیا گیا ھے جو بالعموم رسمی طور پر عقلی اور دماغی تربیت کے سلسلے میں اٹھائے جاتے ھیں مثلاً ذھنی تربیت، تدوین نصاب، جسمانی تربیت وغیرہ - لیکن ان ابواب کے ذیل میں "درسی تعلیم" کا جو نظریہ پیش کیا گیا ھے وہ استادوں کے عام نقطہ نظر سے بہت مختلف ھے کیونکہ برخلاف اس مفہوم کے جو مدرسے کے متعلق ان کے ذھن میں ھے اس میں "مدرسۂ عمل" کے اصولوں کی تشریح کی گئی ھے اور علم اور زندگی، علم اور عمل، رسمی مضامین اور عملی مشاغل اور دستکاریوں اور ذھنی اور جسمانی تربیت کے تعلق اور وحدت کو ظاھر کیا گیا ھے اور تعلیم کے مختلف شعبوں کے درمیان جو فصل اور تناقض قائم ھوگیا ھے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ھے - یعنی جام کہن میں مئے نو پیش کی گئی ھے کہ وہ مئے کہن سے بہتر ھے -

تیسرے حصے کا تعلق اخلاقی اور معاشری تربیت کے اصولوں سے ھے لیکن ابتدا ھی میں یہ بات ظاھر کردی گئی ھے کہ عقلی اور اخلاقی تربیت کے اصولوں میں کوئی نقیض یا مستقل فصل نہیں ھے بلکہ یہ تقسیم محض اظہار خیال کی سہولت کی خاطر کی گئی ھے - کیونکہ دراصل تعلیم کا موضوع، خواہ تعلیم دماغی ھو یا جسمانی ھو، اخلاقی ھو یا معاشرتی، بچے کی ذات ھے جو ایک سالم اور واحد ھستی ھے اور تمام اثرات جو اس پر ڈالے جاتے ھیں اس کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ لیتے ھیں - اس لئے اس حصے میں پہلے اخلاق کا حقیقی مفہوم واضح کیا گیا ھے تاکہ اس کی پوری وسعت اور ھمہ گیری کا اندازہ ھوجائے اور اس کا کوئی تنگ اور یک طرفہ مفہوم نہ لیا جائے - اس کے بعد یہ بحث اٹھائی گئی ھے کہ اخلاق کا تعلق عمل سے اور عقلی تربیت سے کیا ھے اور

مدرسے کے مجموعی نظام کا ہر جز و کس طرح اخلاقی تربیت میں معین یا حارج ہوتا ہے - اس سلسلہ میں نصاب، طریقۂ تعلیم، نظام ضبط و تادیب، انعام اور سزا اور معلم کی شخصیت کے اثرات کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جس وقت تک ان تمام عناصر کی تنظیم بعض خاص اصولوں کے تحت میں نہ کی جائے تاکہ ان کا مجموعی اثر طلبہ پر ہم آہنگ ہوکر پڑے مدرسہ موثر طریقہ پر اخلاقی اور معاشرتی تربیت کا مرکز نہیں بن سکتا - آخری باب میں اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ طلبہ کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کس طرح کرنی چاہئے تاکہ ہمارے مدرسوں سے جو نوجوان تعلیم پاکر نکلیں وہ اپنی ذات میں اہم ترین اور مفید ترین اخلاقی صفات اور اقدار کے حامل ہوں -

میں نے اس کتاب میں بالعموم تمام تعلیمی بحثوں کو مدرسے کی تعلیم تک محدود رکھا ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی مسائل کو اس میں شامل نہیں کیا کیونکہ اول تو اس ایک کتاب میں وہ تمام مسائل سما نہیں سکتے - دوسرے تعلیمی اصولوں کے تعین اور توضیح کے لئے سب سے زیادہ موزوں میدان مدرسے کی تعلیم کا ہے جہاں طلبہ کی جبلتوں اور نشو و نما کا مطالعہ زیادہ مکمل اور واضح طریقے پر کیا جاسکتا ہے اور ان کی تربیت پر فیصلہ کن اثر ڈالا جاسکتا ہے - کالج اور یونیورسٹی میں پہنچ کر مرکز ثقل تبدیل ہو جاتا ہے - تربیت کی ذمہ داری بہت زیادہ حد تک خود طالب علم کے اوپر عائد ہوجاتی ہے اور تعلیم اور تعلیم گاہ کی زیادہ توجہ عقلی اور ذہنی تربیت پر صرف ہوتی ہے - لیکن وہاں بھی ہم کوئی دیرپا کامیابی حاصل نہیں کرسکتے جب تک مدرسے کی تعلیم کو صحیح اصولوں پر قائم نہ کریں - اس کتاب کا مقصد انہیں صحیح اصولوں کی تشریح اور توضیح ہے -

میں نے اس کتاب کی تصنیف میں مغرب کے بہترین ماہرین تعلیم کے خیالات اور تجربی تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے - ان کے ناموں کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ ان کے حوالے جابجا کتاب میں موجود ہیں البتہ میں خاص طور پر امریکہ کے جدید فلسفی اور تعلیم جدید کے سر گروہ پروفیسر جان ڈیوئی کا مرہون منت ہوں جن کے تعلیمی خیالات نے مجھ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور جن کے تعلیمی نقطہ نظر سے بڑی حد تک مجھے اتفاق ہے - لیکن میں نے اس کتاب میں خود کو کسی خاص مصنف یا ماہر تعلیم کے خیالات کا پابند نہیں بنایا بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ جدید تعلیمی خیالات پر ہندوستان کی مخصوص ضروریات اور حالات کے نقطہ نظر سے تنقید کروں اور انہیں پیش نظر رکھ کر ان سے استفادہ کروں - کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی مخصوص روایات ، اپنی تہذیب و تمدن کے مطالبات ، اپنی نفسی زندگی اور اپنے فلسفہ کو پس پشت ڈالکر اندھادھند کسی دوسرے ملک کی تقلید کرینگے تو ہرگز منزل مقصود کو نہیں پہونچ سکتے - تعلیم کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائیوں میں پنہاں ہیں اور قومی زندگی عبارت ہے ان تمام اثرات اور عناصر سے جن کا تدریجی ارتقا ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے - اس لئے ہم کسی نظام تعلیم کو نہ پرانے لباس کی طرح بے پروائی سے اتار کر پھینک سکتے ہیں نہ نئے لباس کی طرح بے تکلفی سے پہن سکتے ہیں - وہ ایک نفسی اور روحانی نظام ہے جو ایک پودے کی طرح آہستہ آہستہ قومی زندگی کی سر زمین سے اُگتا ہے اور اس کی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے -

آخر میں مجھے اپنے فاضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (ناظم اردو اکیڈمی. جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کا شکریہ ادا کرنا ہے

جنھوں نے اس کتاب کے مسودے کو تمام و کمال پڑھا اور اُس کی زبان میں جابجا اصلاح اور ترمیم کی - اگر وہ اس ذمہ داری کو اپنے سر نہ لیتے تو مجھے کتاب کی اشاعت میں بہت تامل ہوتا - علاوہ انکے مجھے کتاب کی ترتیب اور مسودے کی صفائی میں اپنی بیوی اور اپنی بہن (بیگم عابد حسین) سے بھی بہت مدد ملی جن کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ھے - اگر وہ اس کام میں میرا ھاتھ نہ بٹاتیں تو نہ معلوم اس میں کتنی تاخیر اور ہوتی -

خواجہ غلام السیدین -

عزیز جہاں منزل

علی گڑھ

حصہ اول

تعلیم و تمدن

باب اول—تعلیم ، تمدن اور مدرسہ ۔

باب دوم—تعلیم اور تمدنی ادارے ۔

باب سوم—خانگی اور معاشری زندگی کے اثرات ۔

باب چہارم—تعلیم اور مسئلہ معاش ۔

باب پنجم—حکومت اور تعلیم ۔

باب اول

تعلیم تمدن اور مدرسہ

موضوع کا تعین

ہمارا مقصد اس کتاب میں یہ ہے کہ تعلیم کے بنیادی اصولوں اور نظریوں پر بحث کریں اور اس بحث کے ضمن میں اپنے ملک کے موجودہ نظام تعلیم کے نقائص کو ظاہر کرکے اس کی اصلاح کی تجاویز پیش کریں - یہ کام بہت مشکل اور بہت وسیع ہے اور ہم اس کے تمام پہلوؤں پر اس کتاب کے محدود دائرے میں نظر نہیں ڈال سکتے - موجودہ نظام تعلیم کی تنقید بجائے خود ایک مستقل بحث ہے جس کے لئے کئی جلدیں درکار ہیں کیوں کہ اس فرض کو انجام دینے کے لئے ہمیں اس نظام کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ کرنا ہوگا تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ اس کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور کس طرح اس میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں ہوتی رہیں جن کے مجموعی اثر سے اس نے موجودہ شکل اختیار کی - اس کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو پرکھنے کے لئے ہمیں اپنے ملکی تمدن کا مطالعہ کرکے ایک معیار قائم کرنا پڑیگا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہماری تعلیم کس حد تک ہماری قومی ضرورتوں اور آرزوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور کہاں تک ان کے لئے نا مناسب ہے - اسی طرح تعلیمی اصلاح کا مسئلہ بھی اتنا سہل اور سادہ نہیں کہ اس کا حل کوئی شخص وثوق کے ساتھ پیش کرسکے - اگر خرابیوں کو سمجھنے کے لئے دقت نظری، وسعت خیال، تاریخی واقفیت اور تمدن کا مطالعہ درکار ہے تو اصلاحی تجاویز پیش کرنے کے لئے

علاوہ ان تمام چیزوں کے ایک ایسے تخیل کی ضرورت ہے جو ایک آنکھ سے ماضی اور حال کے گونا گوں مناظر کا جائزہ لے سکے اور دوسری سے مستقبل کے دھندلکے کی سیر کرسکے - یعنی دوش و امروز کے آئینے میں فردا کو دیکھ سکے - اس کتاب کے محدود دائرے میں ہمارا مقصد نہ تو موجودہ نظام تعلیم کا مفصل تنقیدی تجزیہ ہے نہ کوئی مکمل اصلاحی پروگرام پیش کرنا جس پر فوراً عمل کیا جا سکے - ہم زیادہ تر ان مستقل اور ہمہ گیر اصولوں سے بحث کریں گے جن کے مطابق ہر نظام تعلیم کی تشکیل ہونی چاہئے اور یہ دکھائیں گے کہ اس عمل تشکیل میں ہرہر قدم پر تعلیم کو تمدن اور انسانی زندگی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور تعلیم کا نصاب، اس کے طریقے اور عام نظم و نسق یہ سب چیزیں اسی حالت میں درست ہوسکتی ہیں جب وہ تمدن و معاشرت کی کسوتی پر کسی جائیں - جہاں تعلیم و تمدن کا یہ رشتہ توتا تعلیم کا اثر بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے اور تمدنی ترقی کے راستہ میں بے شمار رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں - ان امور پر غور کرنے کے دوران میں توضیح اور مثال کے طور پر ہم اپنے موجودہ نظام کا ذکر کریں گے اور ضمناً یہ بھی بتائیں گے کہ وہ کس لحاظ سے ناقص ہے اور کس طرح اس کے نقائص دور کئے جاسکتے ہیں - لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحثوں میں جو زیادہ ترنظری اور اصولی ہیں ہمیں مخصوص اور معین تعلیمی طریقوں سے سروکار نہیں ہوتا بے شک جو طریقے دوسرے ملکوں میں یا کہیں کہیں ہمارے ملک میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں ان کا ہم ذکر کریں گے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تعلیم میں جو ایک زندہ فن ہے اور جس کا موضوع ذی روح اور نمو پذیر افراد ہیں، کوئی خاص طریقہ ایسا نہیں جو ہر حالت میں کام آسکے اس میدان میں کامیاب ہونے کے لئے عام اصول تعلیم سے واقفیت اور سمجھ

بوجھ کی ضرورت ھے تا کہ معلم اپنے گرد و پیش کے خاص حالات کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں تعلیم اور نظم تعلیم کے مناسب طریقے اختیار کرسکے -

فرد اور معاشرے کا تعلق

چونکہ تعلیم کا موضوع انسان کی سیرت اور اس کی زندگی کی تشکیل ھے اس لئے اس کے مطالعے کے لئے وسعت نظر کی خاص طور پر ضرورت ھے - انسان کی زندگی کی مثال سمندر کی سی ھے جس کو لکیریں کھینچکر یا لکڑی کے تختے لگا کر مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم نہیں کیا جاسکتا کہ ایک حصہ کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ھو - جس طرح سمندر کی ہر موج اٹھتی ھے اور روانی کے ساتھ پانی کی سطح پر کھیلتی ھوئی کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ھے، کہیں دوسری موجوں کے ساتھ مل کر طوفان بپا کردیتی ھے اور کہیں ھلکے سے تھپیڑے سے کشتی کو آگے بڑھا دیتی ھے، اسی طرح جو اثر انسان کی شخصیت یا سیرت پر ڈالا جاتا ھے اس کے حدود متعین نہیں کئے جاسکتے - اول تو خود انسان کی شخصیت میں جسم اور دماغ، عقل و روح اور حیوانی جبلتیں وغیرہ سب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ھیں اور گرد و پیش کے حالات سے ایک ساتھ متاثر ھوتی ھیں - دوسرے انسان تنہا بطور ایک فرد واحد کے زندگی بسر نہیں کرسکتا بلکہ اور افراد کے ساتھ مل جل کر رھتا ھے اور معاشری کاروبار اور مشاغل میں حصہ لیتا ھے - معاشرت کا تعلق ھماری زندگی سے اس قدر گہرا اور لازمی ھے کہ انسانوں کی وہ حالت جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ معاشرے کی شکل میں وابستہ نہ ھوں ھمارے تصور سے باھر ھے - سچ پوچھئے تو معاشرے کا رکن ھونا ھی انسان کو انسان بناتا ھے - اس کے بغیر اس کی

ذہنی اور روحانی قوتوں کی پوری نشو و نما ہو ہی نہیں سکتی - اگر ہم اپنے مشاغل کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کا مقصد اور معنی سمجھنے کے لئے ہمیں ہر قدم پر معاشرے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے - ہماری تجارت، ہماری صنعت و حرفت، ہمارا نقل و حمل غرض وہ تمام کام جنکے ذریعے ہم اپنی زندگی کی ضروریات بہم پہونچاتے ہیں افراد کے اشتراک عمل پر منحصر ہیں - اگر لوگ مل جل کر ان کاموں کو انجام نہ دیں تو ایک دن میں معاشرے کا بنا بنایا نظام درہم برہم ہو جائے - کارخانے کے مزدوروں کی ایک معمولی سی ہڑتال اس حقیقت کو نہایت موثر انداز میں ہم پر واضح کر دیتی ہے - لیکن فرد اور جماعت کا تعلق اس سے بھی زیادہ گہرا ہے - انسان کی ذہنی اور روحانی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کے لحاظ سے بہ ظاہر وہ بالکل تنہا ہوتا ہے اور صرف اپنے ذاتی خیالات، جذبات اور عقائد کی دنیا میں رہتا ہے جہاں کسی دوسرے شخص کا گذر نہیں - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو "روح کی اس خوفناک تنہائی" میں بھی ہم حقیقت میں تنہا نہیں ہوتے - ہماری اندرونی زندگی بھی اپنی تشکیل کے لئے دوسرے لوگوں کے خیالات جذبات اور معاشری تعلقات کی محتاج ہے اور ہمارے دل کے پوشیدہ ترین خیالات کا نظام بھی محسوس یا غیر محسوس طریقہ پر ان تجربات اور احساسات سے وابستہ ہے جن کو ہم بغیر دوسرے لوگوں کی مدد کے حاصل نہیں کر سکتے - اسی وجہ سے شاعر نے کہا ہے کہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھہ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دنیا کچھہ نہیں !

معاشرتی زندگی کا مفہوم

ہم نے مندرجہ بالا عبارت میں ''افراد کی زندگی اور معاشرے کی زندگی'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں یہ الفاظ کسی قدر تشریح طلب ہیں - زندگی سے یہاں ہماری مراد صرف وہ جسمانی زندگی نہیں جس کا مدار سانس کی آمد و رفت پر ہے جو ہم میں اور تمام حیوانوں میں مشترک ہے - یہاں ان الفاظ کے مفہوم میں افراد اور جماعتوں کے وہ تمام تجربات' کارنامے' ذہنی اور علمی کمالات اور سیرت کی خصوصیات شامل ہیں جو ہر فرد اور ہر جماعت کو باقی تمام افراد اور جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں - اس لئے جب ہم کسی خاص معاشرے یا کسی جماعت کی زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو اُس سے ہماری مراد ہوتی ہے اس کا رسم و رواج' مذہب' علوم و فنون' اقتصادی اور سیاسی مشاغل' خانگی زندگی کے اصول اور قاعدے جن پر نہ صرف اس کی حیات محض کا دار و مدار ہے بلکہ وسیع تر معنی میں اس کی زندگی کی تکمیل اور ترقی کا بھی انحصار ہے - ہر جماعت باوجود افراد کے فنا ہو جانے کے اس طرح قائم رہتی ہے کہ معینہ تدبیروں کے ذریعے سے اپنے سارے ذہنی اور تمدنی سرمائے کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی رہے - اس کی روز افزوں ترقی کا راز یہی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے تمام علمی اور عملی مشاغل میں پوری جد و جہد سے کام لے اور دوسری طرف ایسے ادارے ترتیب دے جن کے ذریعے سے ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسلوں کے خزانوں پر قابض ہو کر ان کی مدد سے ترقی کے میدان میں اور آگے قدم بڑھا سکے -

غرض معاشرے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے قیام اور اپنی بقا کے لئے ایسی تدابیر عمل میں لائے جن سے افراد سہولت اور کامیابی کے ساتھ اتفاق

و اتحاد کی زندگی بسر کرسکیں - چنانچہ هم دیکھتے هیں که همارے چاروں طرف ایسے نظام اور ادارے قائم هیں جن میں شریک هوکر هم اپنی قوتوں کو مناسب اور موثر طریقے پر استعمال کرتے هیں اور اپنی محنت اور جد و جهد کے نتائج کو مستقل شکلوں میں محفوظ رکھتے هیں - یه ادارے کسی عارضی مقصد یا مصلحت کي خاطر قائم نہیں هوئے بلکه انسان کي فطری ضرورتوں پر مبني هیں - اس میں شک نہیں که بہت سي مصلحتیں ایسی پیدا هو جاتي هیں جو ان کی اهمیت کو اور نمایاں کر دیتی هیں - لیکن بغیر فطرت انسانی کے تقاضے کے یه انتظامات ' اگر کئے بھی جاتے ' تو قائم نه رهتے - مثال کے طور پر خاندان کو لیجئے جو تمام عمراني جماعتوں میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ پائدار جماعت هے ' اس کي ابتدا یوں نہیں هوئي که افراد نے تجربے سے معلوم کیا هو که خاندان کي زندگی بسر کرنے میں خاص فوائد اور آسائشیں هیں جو تنہائي کی زندگی میں ممکن نہیں اور اس تجربے کی بنا پر انہوں نے اپنی تنظیم ' خاندانوں کي شکل میں کر لي هو - بلکه واقعه یه هے که خاندان کي بنیاد اس فطري محبت پر قائم هے جو قدرتاً والدین کو اپني اولاد سے هوتي هے اور جس کا اظہار حیوانوں کي زندگي مین بھي هوتا هے - هر بچه جب پیدا هوتا هے تو بالکل بے کس اور بے بس هوتا هے - اس کي زندگي هر قدم پر والدین کي خبرگیری اور نگهداشت کي محتاج هے - اس خبرگیري کا مستقل انتظام کرنے کے لئے قدرت نے والدین میں محبت کا جذبه ودیعت کیا هے - جو ان کو اس بات پر مجبور کرتا هے که وہ بچے کو هر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں اور خود تکلیفیں جھیل کر اُسکو آرام پہونچائیں بنی نوع انسان کي زندگی کو قائم رکھنے کے لئے قدرت کا یه انتظام لازم تھا - اُس کے بغیر انساني زندگي اور تمدن کي موجودہ تشکیل ممکن هي نہیں

تھي - لیکن خانداني زندگي کا محض یہي فائدہ نہیں کہ بچوں کي پرورش کي جائے اور ایک نسل دوسری نسل کو زندہ رکھنے کا انتظام کرے - عمراني زندگي کا ایک عام قاعدہ یہ ھے کہ جب کوئی ادارہ کسي خاص مقصد کے لئے قائم ھوتا ھے تو اس کي جد و جہد کے دوران میں بہت سے نئے اور ضمنی لیکن نہایت اہم نتائج پیدا ھو جاتے ھیں - یہی خاندان جو ابتدا میں محض بچوں کی جسمانی خبر گیری کا کام کرتا تھا رفتہ رفتہ ان کی تمدنی ' اخلاقی اور اقتصادی تربیت کا گہوارہ بن جاتا ھے - اس کے مقاصد زیادہ وسیع ' اس کے باھمی روابط زیادہ مستحکم اور اس کے فرائض زیادہ متنوع ھوجاتے ھیں - اس کا کام محض یہی نہیں رھتا کہ حیات موجودہ کو قائم رکھا جائے بلکہ اسے یہ آرزو پیدا ھوتی ھے کہ حیات برتر کي بنیاد ڈالی جائے - خاندان کے افراد آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرتے ھیں اور کاموں کو تقسیم کرکے اپنی کار کردگي کو بڑھاتے ھیں - وہ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لیتے ھیں اور ان کو نہ صرف وہ کام اور وہ عادتیں سکھاتے ھیں جن کی مدد سے انہیں آئندہ چل کر اپنی روزي کمانی ھوگی - بلکہ عمل مثال اور زبانی تعلیم کے ذریعہ ان اصول اور اخلاق سے بھی آگاہ کرتے ھیں جو اس خاندان میں چلے آتے ھیں اور کوشش کرتے ھیں کہ ان کی عمدہ رسوم و روایات اور پسندیدہ اصول زندگی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ھوکر مستقل صورت اختیار کرلیں - اسي وجہ سے خاندان تعلیم و تربیت کا سب سے قدیم اور غالباً سب سے زیادہ اثر آفریں مرکز ھے اور تعلیمی مسائل کو سمجھنے کے لئے اس کی اھمیت کو اچھی طرح ذھن نشیں کرنا ضروري ھے - ھم اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ ایک آئندہ باب میں بحث کرینگے - یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ھے کہ کس طرح ایک

معاشری ادارے کا ' جو کسی محدود اور مخصوص مقصد کے لئے قائم ہوتا ہے ' حلقہ عمل وسیع ہو جاتا ہے - بعض لوگوں نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ انسان بالطبع معاشرت پسند ہے اور دوسرے افراد کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنا اس کی فطرت کا اٹل قانون ہے - ان کا خیال ہے کہ ابتدا میں انسان بھی بعض جانوروں کی طرح تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے - لیکن رفتہ رفتہ ان کو عقل اور تجربے کی مدد سے معاشری زندگی کے فوائد کا احساس ہوا اور انہوں نے مختلف معاشرتی ادارے قائم کیے - اس نقطہ نظر کو امریکہ کے دو مفکرین ڈیلے (Dealey) اور وارڈ (Word) نے اپنی کتاب " درس عمرانیات " (Text Book of Sociology) میں پیش کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" انسان بالطبع معاشرت پسند نہیں ہے- معاشرہ اُس کی عقل کی جد و جہد کا نتیجہ ہے اور رفتہ رفتہ اس کے دماغی ارتقا کے ساتھ صورت پذیر ہوا ہے - بہ الفاظ دیگر ' معاشرے کی بنیاد اس طرح پڑی کہ انسان نے اس کے فوائد کو محسوس کیا اور جوں جوں یہ فوائد عقل پر ظاہر ہوتے گئے (عقل ہی ایک ایسی قوت ہے جو ان کو سمجھ سکتی ہے) معاشرے کا نظام ظہور میں آتا گیا "

اگر ہم اس خیال کو صحیح مانیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرہ ایک عارضی گروہ بندی کا نام ہے جو چند مخصوص فوائد کے حصول کے لئے قائم ہے اگر ان فوائد کا حاصل کرنا انسانوں کے لئے ضروری نہ رہے تو اس کا شیرازہ بکھر جائیگا اور انسان پھر اسی اِنفرادی زندگی کی طرف رجوع کرینگے جو اس خیال کے مطابق شروع میں تھی - اس نقطہ نظر

میں بڑی غلطی یہ ھے کہ اس میں عمرانی زندگی کے اصل اصول اور اُس کی تشکیل کے مختلف طریقوں میں تمیز نہیں کی گئی - ان دونوں مصلحوں نے یہ نہیں سمجھا کہ عمرانی زندگی کی بنیاد انسانی فطرت کے اس جذبے پر قائم ھے جس کے اظہار کی سب سے زیادہ پائدار اور سادہ شکل ماں اور بچے کی محبت ھے اور جو وسیع ہوکر تمام عالم کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیتی ھے - البتہ یہ ضرور ھے کہ وہ مخصوص طرز جو عمرانی زندگی اختیار کرتی ھے مختلف حالات کا نتیجہ اور مختلف فوائد کے حصول کا ذریعہ ھیں -

معاشری ماحول میں تربیت نفس

بہر حال خواہ سوسائٹی کی ابتدا کسی طرح بھی ہوئی ہو اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی بنیاد نہایت مضبوطی کے ساتھ عمرانی زندگی پر قائم ھے - اور انسان بچپن ھی سے مختلف تمدنی اداروں اور نظاموں کا رکن بن جاتا ھے - کامیاب زندگی کا بڑا معیار یہی ھے کہ انسان پر ان تمام اداروں کی رکنیت کی وجہ سے جو فرائض عائد ہوتے ھیں ان کو عمدگی کے ساتھ ادا کرے اور جو حقوق حاصل ہوتے ھیں ان سے پورا فائدہ اُٹھائے - ان اداروں میں شرکت کر کے اسے اپنی قوتوں کے اظہار اور نشو و نما کا موقع ملتا ھے اور وہ حقیقی معنی میں انسان بن جاتا ھے - پیدائش کے وقت آدمی محض جسمانی شکل و صورت اور جبلتوں کے اعتبار سے انسان ہوتا ھے - عمرانی اور اخلاقی اعتبار سے انسانیت کے مرتبے تک پہنچنے کے لئے ضروری ھے کہ ہر شخص ایک مسلسل اور منظم جد و جہد کے ذریعے اپنی شخصیت کی تشکیل و تربیت کرے - اس جد و جہد کی نگرانی بچپن اور نوجوانی میں والدین

اور استاد اور معاشرے کے مختلف ادارے کرتے ھیں اور بلوغ کے بعد خود انسان اپنا رھنما اور محتسب بن جاتا ھے - انسانی شخصیت کوئی بنی بنائی چیز نہیں جو قدرت کی طرف سے ہر شخص کو ملتی ھو بلکہ وہ ایک اعلی درجہ کا تخلیقی کارنامہ ھے جس کو انجام دینے کے لیے فرد اور جماعت کی قوتوں میں اشتراک عمل کی ضرورت ھے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) جو امریکہ کے سب سے بڑے تعلیمی مفکر ھیں ' اپنی کتاب '' فلسفہ کی تعمیر نو'' (Reconstruction in Philosophy) میں لکھتے ھیں کہ :

> '' انفرادی سیرت سے مراد ھے جدت ' ایجاد ' تدبیر کا مادہ اور اعمال و عقائد کے معاملے میں ذاتی انتخاب کی ذمہ داری اور یہ سب چیزیں فطرت کا عطیہ نہیں ھیں - انہیں حاصل کرنا پڑتا ھے '' [1]

اس کا آخری جملہ قابل غور ھے - شخصیت کے حصول کے لئے پیہم اور مستقل کوشش کی ضرورت ھے اور یہ اسی حد تک حاصل ھوتی جاتی ھے جس حد تک انسان کوشش کرکے اپنی جبلتوں اور صلاحیتوں کو تربیت دیتا ھے اور ان کو ھم آھنگ کر کے اپنی ذات میں قوت اور سکون اور توازن پیدا کرتا ھے - لیکن ظاھر ھے کہ انسان یہ کوشش تنہائی میں رہ کر نہیں کر سکتا - اس کی کوششوں کی جولاں گاہ بننے اور ان میں معنی اور مقصد پیدا کرنے کے لئے عمرانی زندگی کی ضرورت ھے کیونکہ اسی میں وہ مختلف قسم کے مواقع پیدا ھو سکتے ھیں جو افراد کی قوتوں کو ابھارتے ھیں اور ان کو دعوت عمل دیتے ھیں - بچہ کی جبلتوں کی ابتدائی شکل بالکل غیر معین ھوتی ھے - ان کو اظھار کی خواھش

[1] صفحہ 9 -

ہوتی ہے لیکن فطرت کی طرف سے ان کے لیے کوئی خاص طریقے اظہار کے معین نہیں ہوتے - یہ بچہ کے ماحول اور مشاغل پر منحصر ہے کہ وہ اپنی کسی خاص جبلت ، مثلاً تجسس یا ملکیت کو کسی طریقے پر ظاہر کرتا ہے - ممکن ہے کہ وہ بڑا ہوکر تجسس کا اظہار اس طرح کرے کہ دوسرے لوگوں کے بھید معلوم کرنے کی فکر میں رہے اور غیر متعلق اور فضول افواہوں سے دلچسپی لے - یا عمدہ نگرانی اور ہدایت کے ذریعہ اس قوت کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ بڑا ہوکر علمی تحقیق و تفتیش اور مظاہر فطرت کے مشاہدے سے اپنی اس جبلت کو تسکین دے - اس کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہے کہ گھر اور مدرسے میں بچے کو ایسے مشاغل میسر آتے ہیں یا نہیں جن کے ذریعے وہ ان جبلتوں سے عمدہ اور معاشرتی نقطہ نظر سے مفید طریقے پر کام لے سکے - برٹرنڈرسل (Bertrand Russel) اپنی کتاب " تعلیم " میں بچوں کی جبلت کی تربیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" غرض تعلیم کا گر جہاں تک اسکا تعلق سیرت کی تشکیل سے ہے یہی ہے کہ طلبہ کو ایسے کام اور ہنر سکھائے جائیں جن کے ذریعے سے وہ اپنی جبلتوں کو بطریق احسن استعمال کر سکیں - اظہار قوت کی جبلت جس کو بچہ نو عمری میں بھونڈے طریقے سے نیلی ریش [1] کی نقل اتار کر ظاہر کرتا ہے بڑی عمر میں زیادہ موزوں اور معقول صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے مثلاً سائنس کی تحقیقات میں ، آرٹ کی تخلیق میں یا بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت

[1] Bluebeard - ایک فرضی شخص جس کی کہانی مشہور ہے کہ وہ بہت سی عورتوں سے شادی کرتا تھا اور انہیں قتل کر دیتا تھا ۔

میں یا اسی قسم کے اور ہزاروں مشغلوں میں سے کسی ایک میں - اگر کسی شخص کو لڑنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں آتا تو اس کے عزم‌المقوۃ کی تسکین صرف جنگ و جدل ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے - برخلاف اس کے اگر اس کو اور بھی بہت سے کام آتے ہیں تو اسے ان میں اظہار خودی کر کے مسرت حاصل ہوگی......اگر موقع ملے تو میں مدرسے کے لڑکوں اور لڑکیوں کو طوفانی سمندروں میں جہاز چلانا ، بلندی سے پانی میں غوطہ لگانا ، موٹر اور ہوائی جہاز چلانا سکھاؤں میں - انہیں اونڈل کے پبلک اسکول کے ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کی طرح مشینیں بنانا اور سائنس کے تجربات کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالنا سکھاؤں اور جہاں تک ممکن ہو فطرت کی قوتوں کو ان کے سامنے حریف مقابل بناکر پیش کروں " [1]

اس مقولے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ افراد کی نشو و نما میں جماعت کا حصہ کس قدر زیادہ ہے اور وہ اپنی قوتوں کو مناسب شکل اسی وقت دے سکتے ہیں جب یہ قوتیں عمرانی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر استعمال کی جائیں - نظریہ تعلیم میں اس اصول کی بڑی اہمیت ہے اور ہم کسی آئندہ موقع پر اس کے نتائج سے بحث کرینگے اور بتائینگے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے مدرسے کی عملی تعلیم میں کیسی انقلاب انگیز تبدیلیاں لازم آتی ہیں اور نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم میں کن بنیادی تغیرات کی ضرورت پڑتی ہے - یہاں اتنا بتادینا کافی ہے کہ اگر

---

[1] صفحہ ۱۰۵

کسی جماعت کو مختلف قسم کے مشاغل کے مواقع حاصل نہ ہونگے تو اس کی عمرانی زندگی کا دائرہ بہت تنگ ہوگا اور اس کے افراد کی نشوونما بھی محدود رہے گی - انسانوں کا باہمی تعلق اور ان کی جماعت بندی خواہ کسی مقصد سے اور کسی شکل میں ہو ان کے ارتقاء پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی - جس حد تک ہم ان تعلقات کو جو کسی جماعت کی وکنیت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں منظم کرینگے یہ اثر زیادہ نتیجہ خیز اور بہتر ہوگا اور جس قدر ان کے افراد میں باہمی اشتراک عمل ہوگا اتنی ہی ان کی زندگی میں خیال اور عمل کی آزادی زیادہ ہوگی -

نتیجہ یہ نکلا کہ تمام عمرانی اداروں کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ افراد کو وسیع ترین معنوں میں تعلیم دیں اور ان کی شخصیت کی تشکیل کریں تاکہ وہ اپنی مختلف فطری قوتوں کو اس طرح استعمال کرسکیں کہ خود ان کو بھی فائدہ پہنچے اورمعاشرے کو بھی - لیکن یہ ان اداروں کا "مقصد اعلیٰ" ہے جس کا ہمیشہ ان کے اراکین کے پیش نظر رہنا ضروری نہیں - ان کے فوری مقاصد جو ان کے عمل پر زیادہ موثر ہوتے ہیں بالعموم دوسرے ہوا کرتے ہیں - مثلاً انسان جو پیشہ اختیار کرتا ہے اس سے اس کی طبیعت اور مزاج پر اثر پڑتا ہے اور اس کی شخصیت پر ایک خاص رنگ چڑھ جاتا ہے - یہ بھی وسیع معنوں میں تربیت کا ایک جزو ہے لیکن یہ اثر بالعموم ان مشاغل کا ایک ضمنی نتیجہ ہوتا ہے - ممکن ہے اس اثر کا عام رجحان یہ ہو کہ وہ شخصیت کو زیادہ مکمل اور موثر بنائے - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی امکان ہے کہ اس سے پیشہ‌ور کی دلچسپیاں زیادہ تنگ اور محدود ہو کر رہ جائیں - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اکثر صنعت و حرفت کے کاموں میں تقسیم عمل اتنی زیادہ ہوگئی ہے اور

مشینوں کو اس قدر غلبہ حاصل ہو گیا ہے کہ کارخانوں کے مزدوروں میں تنگ نظری ، اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہو جاتی ہے - پیشے کی طرح مذہب بھی وسیع معنی میں تربیت انسانی کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس کا اصلی مقصد اس تعلق کو جو خدا کے اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے واضح اور مستحکم کرتا ہے - غرض ان تمام اداروں میں تعلیم کا نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جو بلاواسطہ اور بالقصد اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی نشوونما اور ان کی اخلاقی اور معاشرتی رجحانات کی تشکیل کا انتظام کرے - اور اس کی صورت یہ قرار دی گئی ہے کہ ان کو بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے ماحول میں رکھا جائے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو فعل میں لاکر دنیا کی زندگی میں کامیابی اور عمدگی کے ساتھ حصہ لے سکیں اور اسی نظام تعلیم کی مدد سے ہر نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو اپنے گوناگوں تجربات اور معلومات میں شریک کرتی رہے اور اسے آیندہ فرائض کی ادائگی کے قابل بنائے -

ماحول کی تخلیق میں انسان کا حصہ

ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کی زندگی کی طرح جماعتوں کی زندگی میں بھی ایک تسلسل قائم ہے - جس طرح حیات حیوانی کا سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعے سے جاری رہتا ہے اسی طرح معاشرے کی زندگی کا تسلسل اس پیچیدہ نظام کے ذریعہ قائم رہتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جس سے ایک نسل اپنے تمام علمی اور اخلاقی کمالات اور فنون لطیفہ کے خزانوں کو دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی ہے - ہم اپنے چاروں طرف جو ماحول دیکھتے ہیں وہ ہمارا عمرانی ورثہ ہے

اور ہمیں اپنی پیشرو نسلوں سے ملا ہے - اس ماحول کے بہت سے ادارے اور عناصر تو صریحاً ایسے ہیں جو انسانی صناعی اور خلاقی کا نتیجہ ہیں - مثلاً علم و ادب کے شاہکار ، فنون لطیفہ کے نمونے ، عمارتیں ، کارخانے اور اسی قسم کی تمام چیزیں جو انسان نے اپنی دماغی کاوش سے ترتیب دی ہیں یا ایجاد کی ہیں - لیکن وہ چیزیں بھی جو بظاہر فطرت کا عطیہ ہیں - ایک حد تک انہیں انسانی کوششوں کی مرہون منت ہیں اور ان کو بھی اسی عمرانی ورثے میں شمار کرنا چاہئے - ہم اپنے گرد و پیش جو دریا اور پہاڑ کھیت اور سڑکیں وغیرہ دیکھتے ہیں یہ سب بھی اپنی ابتدائی فطری حالت میں نہیں ہیں بلکہ انسان کی قوت تخلیق و تسخیر کے کارنامے ہیں جس نے زمین کی شکل و صورت تک کو بدل دیا ہے اور اس کی تمام پوشیدہ اور زبردست قوتوں کو ، جو ایک زمانے میں ضعیف انسان سے نبرد آزما رہتی تھیں ، قابو میں لاکر انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے -

اقبال نے انسان اور خدا کے درمیان مکالمے کی شکل میں انسانی کوششوں کے اس اعجاز کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے - انسان خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے -

تو شب آفریدی ، چراغ آفریدم
سفال آفریدی ، ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم * من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

غرض اس ماحول سے جو ہمیں گویا ورثہ میں ملا ہے ، ہماری مراد ایک طرف تو مظاہر فطرت کی وہ جامد دنیا ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف علوم و فنون ، اخلاق و سیاست کی نمو پذیر دنیا جو گذشتہ نسلوں کی دماغی جد و جہد اور تخلیقی کوششوں کا نتیجہ ہے اور جس کی ترقی ہماری اپنی مسلسل کاوشوں پر منحصر ہے - ہماری موجودہ زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ عملی ہو یا نظری تمام تر اسی معاشرتی ورثے کا مرہون منت ہے جو ہم نے اپنے پیش رووں سے پایا ہے - ہمارے علوم اور ادب ہماری موسیقی اور مصوری ، ہمارا قانون اور سیاست ، ہمارے مدرسے ، ہماری صنعت و حرفت ، غرض ہر چیز اس منتظم اور تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے جس میں بے شمار افراد اور جماعتیں گذشتہ زمانوں میں حصہ لے چکی ہیں ، جن میں سے بعض کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اور اکثر کی کوششیں گمنامی کے پردے میں پوشیدہ ہیں - اس لحاظ سے یقیناً ہماری موجودہ نسل ان تمام نسلوں کے ترکے کی حامل ہے جو ہم سے پہلے گذر چکی ہیں اور ہم تہذیب و تمدن کے ارتقائے پیہم میں اپنی کوششیں اس منزل سے شروع کرتے ہیں جہاں سے گذشتہ نسل نے اس کو چھوڑا ہے - اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ ہر بچہ تمام گذشتہ زمانوں کا وارث ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کبھی معدوم نہیں ہوتا بلکہ حال کا ایک جز و لازم بن کر مستقبل کی تعمیر میں نہایت اہم حصہ لیتا ہے - ہم ماضی کے بوجھ کو اپنے شانوں سے اتھا کر اس طرح نہیں پھینک سکتے جس طرح ایک مزدور اپنے بوجھ کو پھینک دیتا ہے کیوں کہ اس کا اثر ہمارے رگ و ریشے میں ، ہمارے قلب و دماغ میں خون کی طرح سرایت کرچکا ہے - یہ اور بات ہے کہ ہم گذشتہ زمانے کے خیالات یا رسم و رواج کی مخالفت کریں ، اس کی برائیوں کے خلاف جنگ کریں اور

اپنے لئے نئے شاہراہ عمل کی بنیاد ڈالنا چاہیں - لیکن اس جنگ میں ہم جس قدر ذہنی اور مادی آلات اور وسائل کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی تمام تر اسی زمانہ ماضی کا عطیہ ہوتے ہیں ! قدامت پسندی اور جدت پسندی میں یہ فرق نہیں کہ قدامت پسند ماضی کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور جدت پسند اس سے آزاد - وابستہ دونوں ہوتے ہیں اور اس سے مدد لئے اور فائدہ اٹھائے بغیر دونوں کو چارہ نہیں - فرق صرف نقطہ نظر کا ہوتا ہے کہ اس معاشرتی ورثے کو جو انہیں ملا ہے کس طرح استعمال کریں - آیا اپنی علمی اور عملی قوتوں کو محض اپنے بزرگوں کے کارناموں کی تشریح اور تفسیر اور حفاظت میں صرف کریں - یا ان کارناموں پر خود اپنے ارتقاء پذیر تجربے کی بنیاد رکھیں اور ان میں اپنی عقل سے اپنے زمانے کی روز افزوں ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی عمل میں لائیں - بڑے سے بڑا سائنس داں اور فلسفی اور موجد بھی اس سے زیادہ نہیں کرسکتا کہ دنیا کی پچھلی معلومات اور واقفیت سے فائدہ اٹھاکر مادی یا ذہنی مظاہر میں سے بعض کو لے کر انہیں ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کردے یا ان کے مشاہدے سے ایسے قانون دریافت کرے جن کے سمجھنے سے اس سے پہلے کے صاحبان فکر قاصر رہے ہوں - اس لئے گو اس کی ایجاد یا دریافت کی قدر کتنی ہی زیادہ ہو لیکن وہ اپنی کامیابی کے لئے سراسر متقدمین کا محتاج ہوتا ہے - ایک انگریز مصنف اپنی کتاب [۱] میں لکھتا ہے کہ

" اگر ہم کسی قابل ترین شخص کے کارناموں کا مقابلہ اس علمی دولت سے کریں جو اس کو ماضی سے وراثتاً ملی ہے اور جس کی وجہ سے وہ اپنا کام کر پایا تو اس کے کارنامے مقابلتاً بالکل ہیچ معلوم ہوتے ہیں -

---

[۱] Brown : Underlying Principles of Modern legislation صفحہ ۱۱۲

تعلیم و تہذیب کے نقطہ نظر سے یہ تمدنی ورثہ بھی ہمارے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا وہ جسمانی اور نفسی ورثہ جو ہم اپنے آبا و اجداد سے براہ راست حاصل کرتے ہیں ہماری دماغی نشو و نما کے لئے یہ **ماضی کا عطیہ** اسی قدر ضروری ہے جس قدر جسمانی صحت کے لئے تازہ ہوا اور صاف پانی - بالڈون (Baldwin) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :—

" بچہ بالکل اسی طرح معاشرتی تعلقات کے نظام کے اندر پیدا ہوتا ہے جس طرح وہ کرہ ہوا کے اندر پیدا ہوتا ہے - جس طرح ہوا میں سانس لے کر اس کا جسم بڑھتا ہے اسی طرح اس عمرانی ورثے کو جذب کرنے سے اس کی دماغی نشو و نما ہوتی ہے [1] "

معاشرتی ورثے سے مستفید ہونے کے لئے تعلیم کی ضرورت

لیکن انفرادی جسمانی اور اجتماعی تمدنی ورثے میں ایک نہایت اہم فرق ہے جن کو ذہن نشین کرنا فلسفہ تعلیم کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے - جسمانی ورثہ بھی تمدنی ورثہ کی طرح ہر انسان کو ملتا ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے یا اس پر قابو پانے کے لیے کسی خاص جد و جہد کی ضرورت نہیں - وہ خصوصیتیں اور جبلتیں جو بچے کو اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے وراثتاً ملتی ہیں رفتہ رفتہ طبعی حالات میں ، خود بخود ظاہر اور پختہ ہوتی جاتی ہیں - یہ سچ ہے کہ جبلت کے اظہار کے لئے کسی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس قسم کی مناسب تحریکیں ہر حیوان کے ماحول میں موجود ہوتی

---

[1] ملاحظہ ہو : Social and Ethical Interpretations

ہیں - بچے میں غذا حاصل کرنے کی جبلت ہوتی ہے چنانچہ وہ بغیر کسی وقت اور پس و پیش کے ماں کا دودھ پینے لگتا ہے - اس کو نقل و حرکت کرنے ، کھیلنے : چیزیں بنانے اور بگاڑنے ، انہیں اپنی ملک بنانے کی جبلی خواہش ہوتی ہے اور وہ اُن خواہشوں کو مناسب وقت پر اپنے ماحول کے اشیا کے ذریعے پورا کرتا ہے - لیکن تمدنی ورثے کا معاملہ زیادہ نازک ہے - یہاں محض قبضے کا نام ملکیت نہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتی ہے - کوئی کتاب اس وقت تک واقعی طور پر ہماری نہیں ہو سکتی جب تک ہم اپنی دماغی کاوش سے اس کا مطالعہ کرکے اس کے مضمون پر عبور حاصل نہ کر لیں - محض قیمت ادا کرنے سے وہ ہماری حقیقی ملک نہیں بن سکتی - وہ ایک خارجی چیز رہتی ہے اور صرف اسی معنی میں ہماری ملکیت ہے جس معنی میں مثلاً کوئی میز یا کرسي ہماری ملکیت ہوتی ہے - بلکہ میز کرسی پر بھی صحیح طور پر ملکیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُس کا مناسب استعمال جانتے ہوں اور کرتے ہوں - جب معمولی مادی اشیا پر تصرف کے لیئے خاص قسم کی اہلیت درکار ہے تو ظاہر ہے کہ وہ قیمتی اور گوناگوں ورثہ حاصل کرنے کے لیئے ، جس کا تعلق مادی اور ذہنی دنیا دونوں سے ہے ، ہم پر اور زیادہ سخت شرائط عائد ہوتے ہیں - ایک لحاظ سے یہ ورثہ ہر وقت ہمارے پاس ہے ، ہمارے چاروں طرف موجود ہے - ہم ہر قدم پر اُس کے اثرات دیکھتے ہیں - سائنس نے فطرت کي بیشتر قوتوں کو مسخر کر کے اُنہیں ہمارا غلام بنا دیا ہے ، ادب فلسفہ اور تاریخ نے ماضی ، حال اور مستقبل کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں ، فنون لطیفہ کے شاہکار ہر طرف نظر کو کھینچتے ہیں - معاشرتي زندگي کا وسیع اور پیچیدہ نظام ہمیں اس طرح گھیرے ہوئے ہے جیسے کرہ ہوا -

لیکن یہ تمام چیزیں ہمارے لیے ایک مضمون سربستہ کے مانند ہیں جب تک ہم اس کو پڑھنے اور سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا نہ کریں - دنیا میں بہت سے آدمی ایسے ہیں جن کی آنکھیں ہیں مگر اندھے ہیں - یعنی بہت سی چیزوں پر ان کی نظر پڑتی ہے - لیکن نہ وہ انہیں دیکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اُن سے کام لے سکتے ہیں - عالم رنگ اُن کے لیے کوئی وجود نہیں رکھتا - اسی طرح بہت سے آدمی ہوتے ہیں جن کے کان موسیقی سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں - اُن کے لیے بہترین نغمہ بھی خواہ وہ عالم فطرت میں پایا جائے یا انسانی تخلیق کا نتیجہ ہو، بالکل بے معنی ہے - اسی طرح جس شخص کے ذوق حسن کی تربیت نہیں ہوئی وہ نہ مناظر فطرت کی خوبصورتی سے لطف اُٹھا سکتا ہے نہ مصوری اور فن تعمیر کے شاہکاروں سے محظوظ ہو سکتا ہے - یہی حال عمرانی زندگی کے نظام کا ہے جو صدیوں کی کوششوں اور تجربے سے وجود میں آیا ہے - اُس کے حقوق و فرائض سے آگاہی کے بغیر کوئی شخص اس سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا - مثلاً نظام بلدیہ کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے ہر شہری اپنی زندگی کو بہت آرام دہ اور مفید بنا سکتا ہے - لیکن ہندوستان میں کتنے فی صدی لوگ ایسے ہیں جو اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں یا اُٹھا سکتے ہیں ؟ ان کے لئے اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے - متمدن ممالک میں جا بجا کتب خانے، عجائب خانے، مختلف قسم کے علمی جلسے اور نمائشیں منعقد ہوتی ہیں لیکن بہت کم لوگ وہاں جاکر اپنے علم، ذوق اور تجربے میں اضافہ کرتے ہیں - لہذا اُن کے لیے یہ تمام چیزیں کوئی معنی نہیں رکھتیں - یہ سب اُسی بیش بہا تمدنی خزانے کے اجزا ہیں جو ماضی نے حال کو ورانتاً دیا ہے اور جس میں ہماری کوشش اور ذہنی اجتہاد سے

روز بروز اضافہ ہو رہا ہے - لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے یہ تمام ورثہ باوجود اس کے کہ ہر وقت ہمارے سامنے موجود ہے در اصل گویا ایک سنگین عمارت میں بند ہے جس کے دروازے اس وقت تک نہیں کہل سکتے جب تک افراد کی دماغی اور معاشرتی نشو و نما مناسب طریقہ پر نہ کی جائے اور اُن میں اُن چیزوں کی قدردانی کی صلاحیت اور اُن کے استعمال کی قابلیت پیدا نہ ہو -

بچپن کے زمانے کی تعلیمی اہمیت

اس تمام بحث سے تعلیم کے معنی اور اس کی عمرانی اغراض پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب تک افراد کی تعلیم اور اُن کے فطری قوتوں کی نشو و نما کے لیے کوئی مناسب انتظام نہ کیا جائیگا وہ اپنے ماحول کو سمجھنے اور اس سے کام لینے سے قاصر رہینگے اور زندگی کے کاروبار میں عمدگی کے ساتھ حصہ نہ لے سکینگے - اگر ہم اسی مسئلے کے دوسرے پہلو کو دیکھیں یعنی بچے کی نفسی زندگی کا مطالعہ کریں تب بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچینگے کیونکہ تعلیم کا عمل افراد اور جماعت کے باہمی ربط اور تعلق پر منحصر ہے اور اُس کا کوئی نظریہ اُس وقت تک صحیح نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ اُس ترازو کے دونوں پلوں پر برابر نہ اُترے - ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ تمام انسانی ادارں اور نظاموں کی بنیاد انسان کی فطرت اور جبلت پر ہے - یہی حال تعلیم کا ہے - اگر بچے میں شوق اور تجربہ حاصل کرنے اور اُسے برتنے کی قابلیت نہ ہوتی تو سرے سے تعلیم دینا ناممکن تھا - لیکن انسان کو تعلیم دینے کے لیے محض یہ جبلی قوتیں کافی نہیں - حیوانوں کے لیے اُن کی سہلت اور اُن کے گرد و پیش کی مفید اور مضر قوتیں معاون کا کام دیتی

ہیں اور اُنہیں کی مدد سے وہ اپنی مقابلتاً محدود اور سادہ زندگی کا کار و بار انجام دینے کے قابل ہو جاتے ہیں - وہ کھیل کود کے ذریعے ' زیادہ تجربہ کار حیوانوں کی تھوڑی سی ہدایت سے اور زیادہ تر اُن جبلتوں کی بدولت جو انسانوں اور حیوانوں دونوں کے لیے محرک عمل ہوتی ہیں ' ضرورت کے مطابق اپنے ماحول کو سمجھ لیتے ہیں ' خوراک تلاش کرنا ' رہنے کے لیے کسی قسم کا گھر بنانا یا ڈھونڈنا ' اپنے دشمنوں اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے بچنا - بقائے نسل کے فرائض ادا کرنا یہی چند چیزیں بالعموم اُن کا شغل زندگی ہوتی ہیں - اور اُن سب کو وہ آدمی کے بچے کی نسبت بہت جلد سیکھ جاتے ہیں اور بچپن کا زمانہ ختم کرکے اپنی نوعی زندگی میں شریک ہو جاتے ہیں - برخلاف اُس کے انسانوں کی تعلیم میں دو مشکلات ہیں - اول تو یہ کہ بچہ پیدائش کے وقت بالکل بے بس اور بے کس ہوتا ہے - وہ اپنی حفاظت اور پرورش کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور ہر بات میں ماں کا یا دوسرے لوگوں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کے بچپن کا زمانہ اور تمام حیوانات کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے - یہاں بچپن سے مراد وہ تمام زمانہ ہے جب تک فرد میں اس قدر جسمانی اور دماغی پختگی نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی زندگی کا رہنما بن سکے اور بحیثیت ایک آزاد شہری کے معاشرے کے مشاغل میں شریک ہو کر اپنے فرائض پورے کر سکے - انسانی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان کا بچپن اور تمام حیوانات کی نسبت کیوں زیادہ مدت تک رہتا ہے - بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے ' اور بعض لوگوں کا سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال ہے ' کہ بچپن کا یہ تمام زمانہ ایک طرح سے اکارت جاتا ہے کیونکہ اس سارے عرصے میں بچہ اپنا

وقت اُن اہم انسانی مشاغل میں صرف نہیں کر سکتا جو اُس کے شایان شان ہیں - جارج برنارڈ شا (G. B. Shaw) اپنے ڈراما " رجوع بہ میتھوسلا " (Back to Methuselah) میں ایک ایسے زمانے کی پیشین گوئی کرتا ہے جب پیدائش ہی کے وقت بچوں کی عمر سترہ سال کی ہوگی یعنی وہ اُس زمانے سے گذر چکے ہونگے جو اب نابالغی اور خام کاری کا سمجھا جاتا ہے اور وہ تمام باتیں سیکھے سکھائے پیدا ہونگے جو اب بہت مشکل اور محنت سے سیکھنا پڑتی ہیں - اِس تخیل کے لطیفہ سے قطع نظر کرکے ، جس کا اگر امکان بھی ہوتا تو ہرگز مفید نہ ہوتا ، غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے بچپن کا طویل ہونا عین مصلحت ہے - جانوروں کے لیے بہت مختصر سا بچپن کا زمانہ ان تمام مشاغل کو سیکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے جن سے اُن کو آئندہ سابقہ پڑنے والا ہے اور اس عرصہ میں وہ اپنے کم و بیش محدود اور معین ماحول کی ضروری چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں - انسان کی حالت اُس سے مختلف ہے اُس کا ماحول نہ معین ہے نہ محدود - جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ہے اُس نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی ہے ، علوم و فنون میں کمال حاصل کیا ہے ، مادی اور ذہنی نظام قائم کیے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اور تمام حیوانات کی نسبت یہ صلاحیت بہت زیادہ ہے کہ گذشتہ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر نئے کاموں اور نئے مواقع سے زیادہ عمدگی کے ساتھ عہدہ بر آ ہو سکے اپنی سیرت کو ضرورت کے مطابق ڈھالے اور اپنے طرز عمل اور طرز زندگی میں ترمیم اور اصلاح کرے - اس صلاحیت کی وجہ سے ابتدائے آفرینش سے اب تک انسان کی ترقی جاری رہی ہے اور اُس نے گذشتہ تجربات کے نتائج کو آئندہ کامیابی کے لیے استعمال کیا ہے اس طرح ہر نسل نے ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ، علوم و فنون

میں اضافہ کیا ہے اور تمدن کی مجسم یادگاریں چھوڑی ہیں - اس لیے
انسان کے بچوں کو اپنے غیر محدود ، تغیر پذیر ، نمو پذیر ماحول سے
مطابقت پیدا کرنے کے لئے گذشتہ نسلوں کے صدیوں کے تجربات کو سمجھنے
اور ان سے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے خاص اہتمام کی اور طویل
مدت کی ضرورت ہے - یہی خاص اہتمام تعلیم کہلاتا ہے اور اس کی تکمیل
کے لیے قدرت نے بچپن کا زمانہ جو تعلیم کا بہترین زمانہ ہے مقابلتاً
طویل رکھا ہے - تعلیم کا مسئلہ در اصل ایک نسل سے دوسری نسل کو
مفید تجربات منتقل کرنے کا مسئلہ ہے - معاشرے کی تمدنی اور اخلاقی
زندگی کے بقا کے لیے ضروری ہے کہ انسان جو کچھ تجربے سے سیکھتا ہے
اس کو آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرتا رہے - اگر یہ علمی خزانے اور
علمی وسائل مناسب طریقے پر ایک نسل سے دوسری نسل تک نہ پہنچائے
جائیں تو تھوڑے سے عرصہ میں نہایت متمدن اور تہذیب یافتہ جماعتیں
بھی وحشی اور جاہل افراد کا مجموعہ بن کر رہ جائیں - واقعہ یہ ہے
کہ عمرانی زندگی کا انحصار ہی ان چیزوں پر ہے جو اس کے تمام افراد
میں مشترک ہوتی ہیں اور جن کو وہ اسی طرح حاصل کرتے ہیں کہ
اُن میں مبادلۂ خیالات اور داد و ستد ہوتی رہتی ہے اور وہ ایک دوسرے
کے تجربات سے مستفید - ہوتے ہیں اگر اس تعامل اور داد وستد کا سلسلہ
بند ہو جائے تو جماعت کی یک جہتی کا فوراً خاتمہ ہو جائے کیونکہ
جماعت محض افراد کے ایک جگہ اکٹھا ہو جانے سے نہیں بنتی بلکہ اُن کے
اتحاد خیالات اور اتحاد اعراض و مقاصد سے وجود میں آتی ہے - یہ ممکن ہے
کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوں لیکن اُن میں باہمی مراسلت
وغیرہ کے ذریعے سے وہ تعلقات قائم ہوں جو افراد کو ایک دوسرے سے منسلک
کرتے ہیں اور اُنہیں صحیح معنوں میں ایک زندہ جماعت بناتے ہیں

'' ایک کتاب یا ایک خط کے ذریعے سے اُن لوگوں میں جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہیں ایسے قریبی مراسم اور تعلقات قائم ہو سکتے ہیں جو ممکن ہے ایک ہی گھر میں رہنے والوں کے درمیان نہ پائے جائیں......افراد کو ایک جماعت یا سوسائٹی کی شکل میں منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے مقاصد، اُن کے عقائد، اُن کی خواہشات، ان کا علم مشترک ہو، ان میں یک جہتی اور باہمی مفاہمت ہو - اس قسم کی چیزوں کو مادی حیثیت سے، اینٹ پتھروں کی طرح، ایک سے دوسرے کو منتقل نہیں کیا جا سکتا - اُن میں لوگ اس طرح شریک نہیں ہو سکتے جس طرح کسی کھانے کی چیز کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ سکتے ہیں - وہ باہمی داد و ستد جس سے یک‌جہتی پیدا ہوتی ہے - ایسی ہونی چاہیے جس سے ذہنی اور جذباتی میلانات میں یکسانیت پیدا ہو اور افراد توقعات اور ضروریات کو ایک ہی طرح پورا کریں '' [1] -

افراد کی باہمی اثر پذیری

ابھی ہم تعلیم کے محدود اور مسلمہ معنی سے بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ افراد کی عام تربیت اور تاثیر و تاثر کے اس وسیع تر نظام کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں جو معاشرے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے اور جس میں مدرسہ کی تعلیم کو ایک اہم لیکن جزوی حیثیت حاصل ہے - بیشک مدرسوں کا کام بھی یہی ہے، جیسا کہ ہم آئندہ چل کر زیادہ تفصیل کے ساتھ دکھائینگے کہ وہ گذشتہ اور موجودہ نسلوں کے تجربات کو منظم اور مرتب کر کے بچوں اور نوجوانوں کے سامنے پیش کریں اور اُن کے افکار اور اعمال پر معاشرتی مقاصد اور اغراض کے مطابق

[1] Dewey : Democracy and Education صفحہ ٥ -

اثر ڈالیں - لیکن اس کام کی پوری اہمیت اور اُس کی حدود کو ہم اُس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ وہ مستقل اور بنیادی طریقے کیا ہیں جن کے ذریعے معاشرہ خود بخود افراد کی تربیت کرتا ہے اور جس کی تکمیل اور تنظیم کے لئے مدرسے کا مخصوص ماحول ترتیب دیا گیا ہے - ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے افراد کو تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کے تجربات سے متاثر ہونے کا موقع ملتا ہے - یعنی اسکی وجہ سے ان کے خیالات میں وسعت اور کار کردگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے - جو تربیت کا مرادف ہے - اس داد و ستد میں صرف اسی شخص کو فائدہ نہیں پہنچتا جو شاگرد کی حیثیت سے اُستاد سے کچھ سیکھتا ہے بلکہ تجربے میں شرکت ایسی چیز ہے جو دونوں فریقین کے لئے مفید ہے - جب کوئی بچہ کسی کام میں شریک ہوکر اپنے والدین کے خیالات اور جذبات سے واقفیت حاصل کرتا ہے تو ایک حد تک اس کا طرز عمل اور نقطہ نظر تبدیل ہو جاتا ہے - اس کی طبیعت اور اُس کے علم میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ گویا ایک نئی ہستی بن جاتا ہے - اسی طرح جب وہ اپنے ہم عمروں میں کھیلتا ہے' ان کی نقل اتارتا ہے؛ ان کے ساتھ مقابلہ یا تعاون کرتا ہے تو اس کے تجربے میں وسعت اور وضاحت پیدا ہوتی ہے - اسے اپنے تخیل سے کام لینا پڑتا ہے - اپنے خیالات کو' اپنی گفتگو کو' اپنے سارے طرز عمل کو ذمہ داری کے ساتھ معین اور مرتب کرنا پڑتا ہے تا کہ وہ دوسروں کے دوش بدوش زندگی بسر کرسکے - عمرانی زندگی ہی کی بدولت وہ تمام مواقع حاصل ہوتے ہیں - جو انسان کو غور و فکر اور محاسبہ نفس کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اس کے تجربے کو منظم اور نمو پذیر بناتے ہیں - بالکل تنہائی کی زندگی میں تو انسان کو اس سے زیادہ غور و فکر

اور تگ دو کی ضرورت نہ پڑتی وہ کہ اپنی حیوانی ضروریات کو کس طرح پورا کرلے - اسی طرح اس اشتراک عمل سے وہ بالغ افراد بھی مستفید ہوتے ہیں جو نوعمر بچوں کو اپنے تجربات میں شریک کرکے ان کی تربیت کرنا چاہتے ہیں ان کے تجربات اکثر ان کے عمل کا جزو بن جاتے ہیں اور عادت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں - جب وہ کسی بات کو ایک دفعہ سیکھ لیتے ہیں تو انہیں یہ ضرورت نہیں رہتی کہ اس کی منطقی یا نفسیاتی تحلیل کریں - اور اپنی معلومات کو معین اور واضح شکل میں ترتیب دیں - لیکن جب انہیں نوعمر بچوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تجربے کو اس طرح مرتب کریں کہ بچے اس سے مستفید ہوسکیں یعنی ان کے پختہ اور مکمل تجربے اور بچوں کے نامکمل اور آزمائشی تجربات کے درمیان رابطہ قائم ہوجائے - اس مقصد کے لئے انہیں بہت کچھ دماغی کاوش کرنی پڑتی ہے جو خود ان کی ذات کے لئے مفید ہوتی ہے - غرض بالغوں کے نقطہ نظر سے فن تعلیم کے معنی یہی ہیں کہ معاشرے کے تجربات کو ایسی شکل میں منتقل کیا جائے کہ وہ بچوں کے خیالات جذبات اور دلچسپیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوجائیں - اور ان کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے نامکمل اور مبہم تجربات کی تکمیل اور تنظیم کرکے تہذیب و تمدن کے حامل بن جائیں- جو لوگ فن تعلیم سے پوری واقفیت رکھتے ہیں انہیں اندازہ ہے کہ یہ کام کس درجہ مشکل اور کتنی ذمہ داری کا ہے - اس کو انجام دینے کے لئے کسی قدر تعلیمی قابلیت اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے اور اگر یہ ایمان داری اور خلوص کے ساتھ کیا جائے تو اس سے خود معلموں کی قابلیت میں کتنا اضافہ ہوتا ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں -

" ذرا اس بات کی کوشش کیجئے کہ کسی تجربے کو وضاحت اور صحت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو سمجھایا جائے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ خود آپ کا نقطہ نظر اس کے متعلق بدل گیا ہے - بالخصوص اس صورت میں کہ وہ تجربہ ذرا پیچیدہ اور مشکل ہو.........کسی تجربے کو منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کو ایک مخصوص شکل میں مرتب کیا جائے - اور ترتیب دینے کے لیے لازم ہے کہ ہم بے تعلقی سے اس پر غور کریں ، اسے دوسرے شخص کے نقطہ نظر سے دیکھیں ، یہ سوچیں کہ اس تجربے میں اور دوسرے کی زندگی میں کسی طرح رابطہ قائم ہو سکتا ہے - اور یہ اُس کے سامنے کس شکل میں پیش کیا جائے کہ وہ اِسے آسانی سے سمجھ لے . سوائے اس صورت کے کہ ہم بالکل پیش پاافتادہ اور جانی بوجھی باتیں سکھانا چاہیں ہمیشہ اِس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے تجربے کو موثر طور پر کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہم ایک حد تک ، اپنی قوت تخیل سے اُس کے تجربات کو اپنے تجربات بنا لیں " [1] -

نظام تمدن کا ارتقا

انسان نے جوں جوں ترقی کی ہے ، انتقال تجربات کے وسائل بھی بڑھ گئے ہیں اور زیادہ مکمل ہو گئے ہیں - سب سے قدیم اور موثر ذریعہ تو یہی ہے کہ لوگوں کو ایسے مشاغل میں شریک کیا جائے کہ وہ براہ

[1] Dewey : Democracy and Education صفحہ ۷ -

واسطہ اُن تجربات کو حاصل کریں جن کو منتقل کرنا مقصود ھے - اور تعلیم کی ابتدا بھی اسی طرح ہوئی کہ بالغوں نے بچوں کو اپنی روز مرہ زندگی میں شریک ہونے کا موقع دیا اور اس طرح اُن کو وہ ضروری فنون اور رسوم و روایات سکھائیں جو معاشرے کے نزدیک قائم رکھنے کے قابل تھیں - لیکن اسکے ساتھہ ھی خود بالغ افراد کے روز افزوں تجربات کو محفوظ رکھنے کا مسئلہ بھی پیدا ہوگیا تھا - اول اول اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے محض حافظے سے کام لیا جاتا تھا - اور اُن کو منتقل کرنے کے لیے زبانی الفاظ سے - چنانچہ قدیم ترین ادب اور شاعری کے شاہکار ہم تک اِسی طرح سینہ بسینہ پہنچے ہیں - مگر انسان کا دماغ اِس ناقابل اعتبار اور محدود انتظام پر قناعت نہیں کر سکتا - اُس کی قوت اِختراع نے اپنے تجربات کی حفاظت کے لیے بہت سے نئے ذرائع اِیجاد کر لیے - فن تحریر نے انسانی خیالات کو حیات و دوام بخشدیا اور ہمیں حافظہ کے فریب سے آزاد کر دیا - آوازوں کو قائم رکھنے اور منتقل کرنے کے لیے بھی مختلف قسم کے آلات، گراموفون وغیرہ بنائے گئے - صورتیں مصوری اور عکسی کے ذریعہ فنا ہونے سے بچا لی گئیں - یہ تمام ذرایع انسانی تجربات کو منتقل کرنے کے کام میں آنے لگے ہیں اور اُن میں آئے دن نت نئی اِیجادیں اور اضافے ہوتے رہتے ہیں - چنانچہ آج ہر متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں خیالات کو منتقل کرنے کے ذرائع اِس کثرت سے موجود ہیں کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر علوم و فنون کے کسی شعبے میں کام کرتے ہیں ایک دوسرے کی کوششوں، کامیابیوں، اور ناکامیوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں - زمان و مکان کی قیود سے انسان بڑی حد تک آزاد ہو گیا ھے اور خیال کے گویا پر لگ گئے ہیں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں پہنچ سکتا ھے - اخباروں کے ذریعے تمام ملکوں

کی خبریں روز کے روز معلوم ہو جاتی ہیں - گراموفون کے ذریعے ہم حال اور ماضی کے بڑے بڑے موسیقی دانوں اور مقرروں کی آواز سن سکتے ہیں - ٹیلیفون ، سنیما ، لاسلکی ، وغیرہ خیالات کو سرعت کے ساتھ پھیلاتی ہیں اور اشتراک عمل کے امکانات کو زیادہ کرتی ہیں - اُن تمام چیزوں کی مدد سے تہذیب و تمدن کا نظام ، جس کی بنیاد وحشیوں اور نیم شائستہ جماعتوں نے ڈالی تھی ، نہایت تیزی کے ساتھ پھیلتا اور وسیع ہوتا چلا جاتا ہے -

اب تعلیم کا مسئلہ اِس صورت میں ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے کہ ایک طرف تو نو عمر بچہ ہے جو نہ جسمانی نقل و حرکت کے قابل ہے ، نہ اپنے ماحول سے واقف ہے ، نہ اپنے دماغ سے کام لے سکتا ہے اور دوسری طرف یہ عظیم‌الشان نظام تمدن اور علوم و فنون کی دنیا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے - کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی کا بچہ بھی بغیر کسی خارجی امداد کے ، محض اپنی جبلت اور ماحول کی قوتوں کی رہنمائی میں ، جانوروں کے بچوں کی طرح تھوڑے سے عرصہ میں اس نظام کے تمام عناصر پر حاوی ہوکر اپنے فرائض کو ادا کرنے کے قابل ہو جائے ؟ ظاہر ہے کہ یہ بات امکان سے خارج ہے -

تعلیم کے ذریعہ نظام تمدن کا قیام

انسانوں اور جانوروں کے ماحول میں اب تو زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن تمدن کے ابتدائی مدارج میں بھی یہ تفاوت نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا - ممکن ہے کہ بالکل ابتدائی مدارج میں انسانی تمدن اس درجہ سادہ اور واضح ہو کہ اُس وقت کے بچے بغیر کسی خاص بیرونی امداد کے چھوٹی سی عمر میں "بالغ" ہو جاتے ہوں یعنی بالغوں کی

زندگی میں شریک ہوکر تمدنی کاروبار میں حصہ لیتے ہیں - لیکن جوں جوں یہ نظام زیادہ متنوع اور پیچیدہ ہوتا گیا بچوں کو تمدنی زندگی کے لیے تیار کرنا بھی ایک مشکل اور اہم ذمہ داری ہو گئی - جس کے لیے زیادہ مدت درکار ہونے لگی - بچپن جس کو " تیاری کے زمانے " سے تعبیر کیا جا سکتا ہے - کوئی معین مدت نہیں بلکہ اُس کی میعاد ضرورت کے مطابق خود بخود بڑھتی جاتی ہے تاکہ بچے اس عرصہ میں کم از کم اُن وسائل پر قابو پا سکیں جن کی مدد سے وہ نظام تمدن کو سمجھ لیں اور اُن کی جسمانی اور دماغی نشو و نما صحیح راہ پر لگ جائے - تعلیم کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم کا زمانہ واقعی زیادہ طویل ہوتا گیا ہے - گذشتہ صدی کی تعلیمی جد و جہد کا ایک اہم باب وہ کوششیں ہیں جو بچوں کی لازمی تعلیم کی مدت کو بڑھانے کے لئے کی گئی ہیں - اکثر مغربی ممالک میں صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد سے برابر یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ نہ صرف بچپن کے زمانے میں بلکہ زمانہ بلوغ میں بھی طلبہ تعلیمی ماحول اور تعلیمی اثرات میں رہیں کیونکہ ماہرین تعلیم محسوس کرتے ہیں کہ دور حاضرہ کے تمدن کے بہت سے اصول اور فرائض ایسے ہیں جن کو طلبا بچپن کے زمانے میں نہیں سمجھ سکتے - اُن کو عمدگی کے ساتھ سمجھنے کے لیے زیادہ پختہ تجربے کی ضرورت ہے جو بلوغ کے زمانے میں حاصل ہوتا ہے جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں عمرانی زندگی کے حقوق اور فرائض کو خود اپنے عملی تجربے کی بدولت پہچانتی ہیں - اسی وجہ سے امریکہ میں ثانوی تعلیم کو بھی تمام طلبہ کے لئے مفت اور لازمی قرار دیا گیا ہے اور جرمنی میں ہر طالب علم کو ابتدائی تعلیم کے مدارج ختم کرنے کے

بعد اتھارہ سال کی عمر تک " تعلیم مزید " کے کسی شعبے میں داخل ہونا پڑتا ھے - انگلستان میں چند سال ہوئے ایک مشورتی کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس نے تعلیم بالغان کے مسئلہ پر غور کر کے ایک نہایت قابل قدر رپورٹ پیش کی ھے [1] اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ھے کہ عہد بلوغ کے شروع ہوتے ھی بچوں کو مدرسے سے نکال کر زندگی کی کشمکش اور آزمائشوں میں ڈال دینا اور ان کو تعلیمی ھدایت اور رھنمائی سے محروم رکھنا ؛ بہت خطرناک چیز ھے - شہری زندگی کے فرائض اور اصولوں کو سمجھنے کے لئے یہ نہایت ضروری ھے کہ عمر کی اس اھم اور نازک منزل میں ان کے لئے مناسب تعلیمی ماحول اور سہولتیں فراھم کی جائیں - اقتصادی اور تمدنی مشکلات اور ایک حد تک انفرادی اختلافات کا خیال کرتے ہوئے وہ اس بات کو مناسب نہیں سمجھتے کہ تمام نوجوان ثانوی تعلیم کے کل مدارج مدرسوں میں طے کریں - اس لئے انھوں نے یہ تجویز پیش کی ھے کہ تعلیم مزید کے موجودہ نظام کو مرتب اور مکمل کیا جائے اور وہ تمام طلبہ جو با قاعدہ ثانوی مدارس میں تعلیم نہیں پا سکتے اپنے وقت کا ایک حصہ ' جو ان کے اقتصادی مشاغل سے بچایا جائے ' ان مدرسوں میں صرف کریں اور وھاں ان کو تعلیم ایسی دیجائے کہ وہ نہ صرف اپنے مخصوص اقتصادی کاروبار میں زیادہ قابلیت کے ساتھ حصہ لے سکیں بلکہ اپنے عمرانی وظائف کو بھی اچھی طرح سمجھ کر ادا کریں -

اب یہ بات صاف ہو جاتی ھے کہ انسانی تمدن کے نظام میں تعلیم کی ابتدا کس طرح ہوئی - بچہ اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے

[1] Report of the Consultative Committee on the Education of the Adolescent.

اپنے گھر والوں کا ، خصوصاً اپنے والدین کا سہارا لیتا ھے - محض اسی بات سے کہ وہ پیدا ہوتے ھی اپنے سے زیادہ عمر اور تجربہ کے لوگوں کے ساتھ رھتا ھے - اور ان سے تعلقات پیدا کرتا ھے اس کی تعلیم کی ابتدا ہو جاتی ھے - شروع میں اس " تعلیم " کا مقصد علم سکھانا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا قائم رکھنا ہوتا ھے - والدین اس کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کرتے ھیں جن کا منشا اس کی جسمانی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کی نشو و نما کرنا ہوتا ھے - اگر اس کے لئے یہ انتظام نہ ہو تو زندگی محال ہو جائے - اب جوں جوں اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت اور دماغ میں آدمیوں اور چیزوں کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ھے وہ اپنے انسانی اور طبیعی ماحول سے تعلقات پیدا کرتا ھے - اپنے والدین ، عزیزوں اور دوستوں کی ہمت افزائی اور روک تھام ، اور ایک حد تک قدرتی تادیب کے ذریعے اس کی عمرانی اور اخلاقی تعلیم بھی شروع ہوجاتی ھے - خاندان کے افراد اور متعلقین جو تعلیمی اثر بچے پر ڈالتے ھیں اس کی تفصیل ہم ایک آئندہ باب میں کریں گے لیکن اس کی ابتدائی تربیت میں قدرتی تادیب کی اہمیت کا سمجھ لینا ضروری ھے - اکثر محبت اور احتیاط کرنے والے والدین اس بات کی کوشش کرتے ھیں کہ بچے اس تکلیف سے بالکل محفوظ رھیں جو غلط اور نا مناسب حرکات کی وجہ سے انہیں پہونچنی چاھئے - لیکن مشہور انگریزی مفکر ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) نے شد و مد اور قابلیت سے یہ ثابت کیا ھے کہ اخلاقی تعلیم کے لئے وہ تادیب بہت موثر ہوتی ھے جو بچے اپنے افعال کا قدرتی خمیازہ بھگتنے سے حاصل کرتے ھیں - وہ اپنی معرکۃالارا تصنیف " فلسفہ تعلیم " میں لکھتا ھے :-

"یہ قدرتی سزائیں جو بچے کے بے جا کاموں کا نتیجہ ہوں مستقل بلا واسطہ اور یقینی ہیں اور ان سے چھٹکارا نہیں ہوسکتا - یہاں زجر و توبیخ کا کچھہ کام نہیں - بلکہ چپ چاپ سختی سے کام لیا جاتا ہے - اگر بچہ اپنی انگلی میں سوئی چبھو لے تو نتیجہ یہ ہے کہ اس کو تکلیف ہوتی ہے - اگر دوبارہ ایسا کرتا ہے تو پھر یہی نتیجہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہتا ہے - بچہ موجودات غیر ذی روح کے ساتھہ اپنے تمام معاملات میں یہ بات معلوم کرتا ہے کہ وہ اپنی خاصیت سے منحرف نہیں ہوتے - کوئی عذر نہیں سنتے اور ان کی نہ داد ہے نہ فریاد - اس سخت مگر فیض پہنچانے والی تربیت کو پہچان کر بچہ نہایت ہی ہوشیار ہو جاتا ہے کہ آئندہ ان کی خلاف ورزی نہ کرے ....معاشرتی تربیت اور بچوں کی ابتدائی تربیت جو قدرت کرتی ہے ان دونوں تربیتوں کی باہمی مشابہت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے - اور کنایتاً اس بات کا بھی یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہی تربیت سب سے زیادہ موثر ہے" [۱]

اس تمام بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ تعلیم اور تمدن ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں - تعلیم کوئی ایسا نظام نہیں جس کو بعض ضروریات سے مجبور ہو کر انسان نے قائم کر لیا ہو اور نہ وہ ایسا شغل ہے جس کو انسانی زندگی کے لئے محض زینت کا باعث سمجھا جائے - وہ تو تمدنی زندگی کے رگ و ریشے میں پیوست ہے اور جسم

---

[۱] ہربرٹ سپنسر : فلسفہ تعلیم (مترجمہ خواجہ غلام الحسنین)

اجتماعی میں جان بن کر سمائی ہوئی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر دکھایا ہے اس کا مقصد اب محض اتنا نہیں کہ وہ تسلسل حیات کو قائم رکھے بلکہ وہ "حیات برتر" کا ایک وسیلہ بن گئی ہے جس کے ذریعہ ہم نا واقف اور نا تجربہ کار بچے کو بہترین اخلاقی اور معاشرتی اقدار [1] اور اصولوں سے روشناس کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے ورثے کے ان عناصر کو جو بہترین تعلیمی قدر رکھتے ہیں بچے کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں خود بخود ایک بہتر معاشرے کی بنیاد ڈالنے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ اس طرح تعلیم ایک طرف بچے کی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف اسے تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے - بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ شخصیت کی نشو و نما ہی ان مشاغل کے ذریعہ کرتی ہے جو تمدنی زندگی کا اہم جزو ہیں اور جن کے ذریعے سے بچہ رفتہ رفتہ اسے سمجھنے اور اس میں شرکت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے - لیکن یہ نظریہ تعلیم کا صرف ایک رخ ہے - یعنی اگر ہم عمل تعلیم کو معاشرے یا بالغ افراد کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے بچوں کو تمدنی زندگی کے لیے تیار کر رہے ہیں -

تعلیم کا ایک غلط تصور

لیکن اس نظریہ کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ہم مسئلہ تعلیم پر اس کے موضوع یعنی بچوں کے نقطہ نظر سے بھی غور کریں اور دیکھیں کہ ان کے نزدیک اس تمام سلسلہ مشاغل کے کیا معنی ہیں جو تعلیم گاہوں وغیرہ میں رائج ہے - ان کو ان تمام سبقوں اور کھیلوں کے سیکھنے سے کیا حاصل ہوتا ہے جن میں وہ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف

Values [1]

کرتے ہیں؟ تعلیم پر یک طرفہ غور کرنے سے اکثر معلموں نے اور تعلیمی نظریے قائم کرنے والوں نے بہت بڑی غلطیاں کی ہیں جن کا خمیازہ بے چارے بچوں نے صدیوں بھگتا ہے - انہیں غلطیوں میں سے ایک یہ خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف اتنا ہے کہ بچوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کرے - بظاہر یہ خیال نہ صرف بالکل بے ضرر بلکہ بہت صحیح اور مفید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُس میں تعلیم اور تمدنی زندگی کا باہمی تعلق مد نظر رکھا گیا ہے - لیکن ہر خیال جو بجائے خود مفید ہوتا ہے اگر ہم اس میں اس قدر محو ہو جائیں کہ ہمیں دائیں بائیں آگے پیچھے کچھ نہ دکھائی دے تو وہ بہت سی غلطیوں کا سبب بن جاتا ہے - تعلیم کا کام یقیناً یہ ہے کہ طلبہ کو اُن فرائض اور ذمہ داریوں کے لئے تیار کرے جن سے اُن کو سابقہ پڑیگا لیکن اِس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے جو عملی نتائج نکلے وہ سراسر نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں - اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ معلم نے بجائے اُس کے کہ بچوں کی موجودہ ضرورتوں ، قوتوں اور دلچسپیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا مستقبل کی توقعات اور ضروریات کو اپنا نصب العین ٹھہرایا اور تعلیم کے مرکز ثقل کو بالکل بدل دیا - اس میں شک نہیں کہ منزل مقصود تو بلوغ کی زندگی ہے - لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے جس قدر درمیانی منزلیں راستے میں پڑتی ہیں وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اتنی ہی اہم اور قابل توجہ ہیں جتنی وہ آخری منزل - اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر یعنی اُس کی نشو و نما کے ہر ہر قدم کو اُس کے لئے معنی خیز اور دلچسپ نہ بنائیں ہم اُس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے ، اُس کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکتے - معلم کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر نو عمر بچہ ایک

مخصوص شخصیت کا مالک ہے اور مخصوص شوق اور رجحانات رکھتا ہے - جن کا دریافت کرنا اُس کا فرض ہے اور جن کی تربیت کے لئے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اُس کا خاص فن ہے - لیکن استادوں اور والدین نے عام طور پر اس نفسیاتی نکتے کو بھلا دیا اور مستقبل کی تیاری کی دھن میں بچوں کی موجودہ قوتوں اور ضرورتوں کو نظر انداز کر کے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ بچہ جلد سے جلد اس '' بے کار '' زمانے سے گذر کر سن شعور کو پہنچ جائے - گویا سن شعور کوئی طلسمات کا دروازہ ہے جس کے اندر قدم رکھتے ہی ناتجربہ کار یا خام کار افراد پر زندگی کے تمام حقائق منکشف ہو جاتے ہیں ! یورپ میں یہ خیال صدیوں کار فرما رہا - روسو (Rousseau) کے زمانے میں فرانسیسی سوسائٹی میں اس نظریہ تعلیم کا دور دورہ تھا - بچپن کی اہمیت کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا - گھر پر والدین اور مدرسے میں استادوں کی یہی کوشش رہتی تھی کہ جلد سے جلد نو عمر بچوں کو '' سوسائٹی '' میں شریک ہونے کے قابل بنا دیا جائے - اُن کی دماغی نشو و نما سے قطع نظر کر کے اُنہیں گفت و شنید ، نشست و برخواست کے وہ آداب سکھا دئے جائیں جن سے یہ دیکھنے میں قبل از وقت بالغ معلوم ہوں - اس حماقت اور کوتہ اندیشی سے نہ معلوم بچوں کی کتنی نسلوں کو نہایت سخت جسمانی اور دماغی نقصان پہنچا - روسو (Rousseau) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف '' امیل (Emile) میں اس خیال کے خلاف بہت قابلیت اور زور کے ساتھ جہاد کیا اور اس خلاف فطرت تعلیم کی بنیادیں ہلا دیں - یہی وجہ ہے کہ یہ باتفاق رائے تعلیم جدید کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا پیغمبر مانا جاتا ہے ، حالانکہ اُس کے پیش کردہ نظام تعلیم میں جزئیات اور تفصیلات کے اعتبار سے بے شمار غلطیاں بھری پڑی ہیں - اُس کی حقیقی عظمت کا

راز یہی ھے کہ اُس نے تعلیم کے بنیادی اصول کو سمجھہ لیا کہ خواہ تعلیم کا منتہا کچھہ ھو اُس کا نقطہ آغاز بچے کی ذات ھے جس کی جبلتوں اور کمزوریوں اور مخصوص رحجانات کا احترام اور اُن کی ھدایت معلم کا اولین فرض ھے - ھمارے ملک میں اب بھی یہ خیال عام طور پر رائج ھے اور استاد اور والدین سب کی یہی خواھش ھے کہ کسی طرح بچہ بہت جلد ''پڑھہ جائے'' یعنی تعلیم کے مرئی اثرات جلد از جلد ظاھر ھونے لگیں - اس کے دماغ میں ھر قسم کی خشک غیر ضروری اور دوراز کار معلومات بھر دی جائے ' اور وہ کسی دفتر میں یا کسی اور ملازمت میں کام کرنے لگے - اس سے بحث نہیں کہ اس کی دماغی ارتقا کس حد تک ھوئی ھے اور اُس کا کیا تقاضا ھے - اُنھیں تو یہ آرزو ھے کہ اپنے محبوب مقاصد کی تکمیل اور اپنے عزیز خوابوں کی تعبیر دیکھیں - بچے کی نشو و نما اور اُس کی نفسی زندگی سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں - کوئی چاھتا ھے کہ بچہ جلد سے جلد ایک خاص پیشہ سیکھہ لے ' خواہ طبیعت اور میلان فطری کے لحاظ سے وہ اُس کے لئے موزوں ھو یا نہ ھو - کسی کو خواھش ھے کہ اُس کی اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرے خواہ فطرت نے اُسے اُن تمام دماغی اوصاف سے محروم رکھا ھو جن کے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا محض تضیع اوقات ھے - بعض کی نیت یہ ھوتی ھے کہ کسی طرح بچے کو چھوٹی سی عمر میں علوم دین کا عالم بنا دیں چنانچہ (اگر اُن میں سوچنے اور اظہار رائے کرنے کا مادہ ھے) تو وہ اپنے اپنے خیال کے مطابق مدرسے کے نصاب میں ترمیم اور تبدیلی چاھتے ھیں - بعض علوم و ادب کو غیر ضروری سمجھتے ھیں کہ وہ براہ راست پیشہ کی تعلیم میں کام نہیں آتے - بعض عملی تعلیم کی تمام تحریکوں پر ناک بھوں چڑھاتے ھیں کیونکہ وہ ان کی رائے عالی میں اعلیٰ تعلیم کے منافی ھیں -

بعض اس بات پر مصر ہیں کہ بچوں کو ابتدا سے مذہبی مسائل اور علوم اور مذہبی زبانوں یعني عربی اور سنسکرت وغیرہ کی تعلیم دی جائے خواہ بچہ اپنی مادری زبان سے بھی اچھی طرح واقف نہ ہو اور ان علوم کی اہمیت اور مفہوم سمجھنے سے بالکل قاصر ہو - اُس تمام خلط مبحث کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفسیات اطفال اور فن تعلیم کے صریحی قوانین کے برخلاف ' طلبہ کو کسي خاص مقصد بعید کے لیے تیار کرنے کے خبط میں لوگوں نے نصاب کو بجائے تعلیمي ضروریات کے مطابق مرتب کرنے کے مختلف لوگوں کے درمیان ایک گیند بنا دیا ہے جو کبھي ایک طرف اُچھالا جاتا ہے کبھی دوسری طرف - کوئی مضمون دماغ کی تربیت اور " اس میں تیزي " پیدا کرنے کے خیال سے شامل کیا جاتا ہے - کوئی برکت کی خاطر ' کوئی مفید ہونے کی بنا پر - نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں کا نصاب ایک معجون مرکب بن کر رہ گیا ہے جس سے کوئی ایک مقصد بھی کامیابی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا - وہ نہ افادی ہے ' نہ تہذیبی ' نہ مذہبی !

ڈیوئي کا نظریہ تعلیم

بہر حال یہاں ہماری غرض نصاب کی بحث میں پڑنا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اگر ہم تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے میں بچے کی اپني ذات اور اس کی فطرت کے مقتضا کو نظر انداز کریں تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں جا بجا اس خیال پر زور دیا ہے کہ تعلیم کو در اصل نشو و نما کے مرادف سمجھنا چاهئے - اس کو کسی دوسرے بیروني مقصد کے تابع کر دینے سے اس کا حقیقی مقصد فوت ہو جاتا ہے - وہ نہ کسی مستقبل بعید کے لئے تیاري کا نام ہے ؛ نہ دماغ کی چند مخصوص قوتوں کو تیز

اور مرتب کرنے کا - ڈیوئی (Dewey) کے نزدیک تعلیم کا کوئی خارجی مقصد یا کوئی علحدہ منزل مقصود نہیں - وہ خود ہی راہ ہے اور خود ہی منزل ، آپ ہی مقصد اور آپ ہی مقصود - بالفاظ دیگر اس کا مقصد یہی ہونا چاہئیے کہ اس کے ذریعے سے انسان میں علمی ، اخلاقی ، معاشرتی نشو و نما کی قوت زیادہ ہوتی جائے اور اس کی مجموعی شخصیت کی ارتقا برابر جاری رہے - ایک واقعی تعلیم یافتہ اور جاہل آدمی میں اصلی فرق یہ نہیں کہ ان میں سے ایک کو بہت سی باتیں معلوم ہیں اور دوسرے کو نہیں معلوم - ایک کو بہت سے کام آتے ہیں دوسرے کو نہیں آتے - بلکہ اصلی فرق یہ ہے کہ پہلے میں سیکھتے رہنے کی غیر محدود صلاحیت ہے اور دوسرے میں یہ صلاحیت نہیں - پہلے کی تعلیم ہمیشہ جاری رہتی ہے کبھی ختم نہیں ہوتی ، دوسرے کی اگر کبھی شروع بھی ہوئی تھی تو اب بند ہے - اسی بنا پر اسلام کے معلم اعظم نے فرمایا ہے کہ گہوارہ سے لے کر قبر کی منزل تک تمام عمر تحصیل علم کرتے رہو - حیات بخش صرف وہی علم ہو سکتا ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے ، ہمیشہ متحرک رہے - جب علم میں یا تعلیم میں جمود پیدا ہو جائے تو اصل میں انسان کی زندگی کی مدت ختم ہو جاتی ہے اگر ہم تعلیم کے اس حرکی [۱] نظریہ کو قبول کریں تو اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ شیر خوارگی کے زمانے سے لے کر سن شعور تک زندگی کی ہر منزل کے لئے اس کی ضروریات کے مطابق تعلیم کا نظام مرتب کریں اور ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھیں کہ عمر کے قدرتی رحجانات کیا ہیں جن سے کام لے کر ہم طلبہ کی فطری قوتوں کو اپنا معین و مددگار بنا سکتے ہیں اور ان کو تعلیم کا وسیلہ قرار دے سکتے ہیں - تعلیم کو محض تیاری کا ذریعہ

Dynamic [۱]

سمجھنے کا سب سے بڑا نقصان یہی ھے کہ ہم ان فطری قوتوں کی طرف سے بےپروائی برتنے لگتے ھیں جو بچوں کے لئے محرک عمل ھوتی ھیں اور جن کی بنا پر وہ ھر کام کو استقلال اور جوش کے ساتھ انجام دیتے ھیں - بچوں کی نفسی زندگی کی ایک خصوصیت یہ ھے کہ حال کا زمانہ ان کی تمام دلچسپیوں کا مرکز ھوتا ھے - وہ اپنے ذھن میں مستقبل کی تصویر صاف طور پر نہیں کھینچ سکتے - ان کے نزدیک مستقبل کا زمانہ ایک مبہم اور غیر یقینی چیز ھے جس میں اتنی کشش اور زور نہیں کہ وہ ان کی موجودہ دلچسپیوں پر غالب آسکے - اس لئے بچوں کی فوری ضروریات اور ان کی موجودہ نشو و نما کے اقتضا سے قطع نظر کر کے ھر قدم پر مستقبل کی امیدوں اور فرائض کا واسطہ دینے سے تعلیم میں جان باقی نہیں رھتی - وہ محض رسمی مشقوں اور سبقوں کے پڑھنے پڑھانے تک محدود ھو کر رہ جاتی ھے - بچوں کی سمجھ میں کوئی معقول وجہ نہیں آتی کہ وہ کیوں اپنے گرد و پیش کی ھنگامہ آفریں زندگی کو چھوڑ کر اپنی تمام توجہ کو مدرسے کے کاموں پر مبذول کریں - ان کی توجہ میں انتشار پیدا ھو جاتا ھے - وہ اپنی تمام دماغی قوتوں کو درسی مشاغل پر مجتمع نہیں کر سکتے جو ان کی ذھنی اور اخلاقی تربیت دونوں کے لئے مضر ھے - یہی وجہ ھے کہ جو تعلیم طلبہ تمدنی زندگی میں براہ راست شریک ھو کر حاصل کرتے ھیں اس کا اثر ان پر زیادہ دیرپا ھوتا ھے خواہ اس میں بالقصد تعلیم مد نظر نہ ھو - مثلاً جب گاؤں میں کوئی بچہ اپنے باپ کے کھیت پر کام کرتا ھے اور کام ھوتے دیکھتا ھے ، آدمیوں ، جانوروں ، زمین ، پانی ، بارش ، کا تجربہ حاصل کرتا ھے تو اس تمام واقفیت کا نقش اس کے دل و دماغ پر بہت گہرا ھوتا ھے بمقابلہ اس اثر کے جو مدرسہ کی تعلیم کا پڑتا ھے - وجہ یہ ھے کہ وہ کام اس کی بعض بنیادی جبلتوں

مثلاً جسمانی نقل حرکت یا دستکاری ، یا تعمیر کو ابھارتا ھے - اور اُس کی محرک اُس کی موجودہ قوتیں اور ہیجانات ہوتے ھیں - بر خلاف اس کے مدرسہ کا کام سطحی اور مصنوعی معلوم ہوتا ھے جو اس کے زیادہ دلچسپ مشاغل کے راستے میں حائل ہوتا ھے - اس مشاہدہ سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ھیں کہ انسانی زندگی بجائے خود بہترین اور موثر ترین معلم ھے اور تعلیم اپنے مقاصد میں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ھے جب وہ بھی انہیں محرکات عمل کو کام میں لائے جو تمدنی زندگی میں کار فرما ھیں -

اس کے علاوہ پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اس نظریہ تعلیم کی ایک اور خرابی بتائی ھے اور وہ یہ ھے کہ جب طلبہ کی موجودہ دلچسپیوں کے لئے مدرسے کے مشاغل میں کوئی سامان نہیں ہوتا تو ان کی توجہ کو جذب کرنے کے لئے ہمیں خارجی ذرائع سے امداد لینی پڑتی ھے - کبھی انہیں سزا کا خوف دلایا جاتا ھے کبھی انعام کا لالچ دیا جاتا ھے - اگر ہم کسی کام میں بالکل محو اور مشغول ہو جاتے ھیں تو اس کام کی فطری کشش ہمیں تمام مشکلات اور ترغیبات سے نکال لے جاتی ھے - بالغ افراد کے لئے بھی اکثر یہ خیال کافی نہیں ہوتا کہ فلاں کام کو استقلال کے ساتھ کرنے سے کبھی آگے چل کر ہمیں بڑا فائدہ ہوگا - ان میں بھی جوش و انہماک پیدا کرنے کے لئے ضروری ھے کہ وہ محسوس کریں کہ ان کا کام ان کی موجودہ ضروریات کے لئے بھی مفید ھے اور ان کی فطری قوتوں کے اظہار کا ذریعہ ھے - بچوں کے لئے تو اس بات کا احساس اور بھی زیادہ لازم ھے کہ جو کام وہ کر رہے ھیں وہ ان کے لئے با معنی اور اہم ھے یعنی ان کے مشاغل کی نوعیت خود ان کے عمل کی محرک ہونی چاہئے - اور جیسا کہ ہم اوپر بتا

چکے ہیں- یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ مدرسے کے مشاغل بچوں کے تمام فطری جذبات اور دلچسپیوں کو ابھاریں اور ان کی تنظیم کریں- گو ان کا آخری مقصد یہی ہو کہ انہیں مفید اور ضروری علوم و فنون کی تعلیم دی جائے؛ لیکن ان کی فوری غرض یہ ہونی چاہئے کہ بچوں کی روز مرہ کی زندگی اُن کے لئے زیادہ سے زیادہ خوشگوار' نتیجہ خیز اور بامعنی تجربے سے مالا مال ہو جائے - ورنہ یہی ہوگا کہ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق بعض استاد سزا کے خوف اور آئندہ کی بہتری کے کمزور حربوں کو اِستعمال کرینگے اور بعض یہ کوشش کرینگے کہ غیر دلچسپ مضامین اور سبقوں کو عارضی اور مصنوعی طور پر دلچسپ بنانے کے لئے ایسی تدبیریں اختیار کریں جن کی تعلیمی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں - اُن تدبیروں سے کام لینا گویا کونین کی تلخ گولی شکر میں لپیٹ کر کھلانا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اس قسم کی دوا کو جو فی‌نفسہ ناگوار ہو' زبردستی یا بہ‌لطائف‌الحیل کھلا دینے سے جسمانی امراض کا علاج ممکن ہے لیکن دماغی اور اخلاقی نشو و نما ایسی چیز ہے کہ جب تک اس میں خود متعلم اپنے ارادے اور خواہش سے شریک نہ ہو خاطر خواہ نتائج بر آمد نہیں ہو سکتے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) فرماتے ہیں کہ :—

> "سوال یہ نہیں ہے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کیا جائے یا نہیں - اگر تعلیم کے معنی نشو و نما کے ہیں تو لازم ہے کہ وہ موجودہ امکانات کو بتدریج قوت سے فعل میں لائے اور اِس طرح افراد میں آئندہ کے فرائض پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرے - نشو و نما کوئی ایسی چیز نہیں جو یونہیں کبھی کبھی واقع ہو جایا کرے - وہ تو برابر رفتہ رفتہ موجودہ کیفیت سے مستقبل کی طرف

بڑھنے کا نام ھے - اگر مدرسہ کا ماحول اور خارجی حالات ایسے ھیں جن میں بچوں کی موجودہ صلاحیتوں کو مناسب طریقہ پر کام میں لایا جا سکتا ھے تو مستقبل جو حال ھي میں سے پیدا ھوتا ھے خود بخود بہتر اور خاطر خواہ صورت اختیار کر لے گا - غلطی یہ نہیں کہ بچوں کو مستقبل کے لیے تیار کرنے پر زور دیا جائے بلکہ یہ ھے کہ اس مقصد کو موجودہ کوشش اور جد و جہد کا مرکز اور مدار قرار دیا جائے - چونکہ واقعتاً یہ بات بہت اھم ھے کہ نو عمر طلبہ کو اس زمانے کی زندگی کے لئے جو دم بدم ترقی کرتی رھتی ھے تیار کیا جائے اس لئے لازم ھے کہ اُن کے موجودہ تجربات کو معنی خیز اور گوناگوں بنانے کے لئے ھر ممکن کوشش کی جائے - جب غیر محسوس طریقہ پر حال مستقبل میں تبدیل ھو جائے گا تو ھم دیکھینگے کہ حال کی فکر کرنے میں مستقبل کی فکر خود بخود ھو گئی ھے " [1] -

اگر تعلیم کا مقصد محض یہی نہیں کہ بچوں کو کسی آنے والی زندگی کے لئے تیار کرے بلکہ اُن کی موجودہ زندگی کو تجربات سے مالا مال کرنا اور خوشگوار بنانا ھے توسوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ مدرسہ کی تنظیم کس طرح کی جائے ؟ ظاھر ھے کہ ھمارے مروجہ مدارس تو یہ مقصد پورا نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کی توجہ تمام تر چند مقررہ مضامین کے پڑھانے میں صرف ھوتی ھے جو نصاب کا جزو ھیں - یہ مدرسے مناسب حالات میں زندگی کی تفسیر کرنے میں مدد ضرور دیتے ھیں لیکن زندگی کے قائم مقام نہیں بن سکتے -

---

[1] Democracy and Education صفحہ ٦٥ -

اوپر کی تمام بحث سے جو تعلیم اور تمدن کے تعلق کو واضح کرتی ہے صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنے تعلیمی ماحول کی تنظیم اِس طرح کرنی چاہیے کہ اِس میں معاشرے کی زندگی کا ایک نمونہ پایا جائے - مدرسہ کو بقول پروفیسر ہاورتھ (Howerth) کے بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہونا چاہیے جس میں وہ تمام عمدہ اثرات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جو تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں - یہی بات در اصل مدرسہ کی دنیا اور بیرونی دنیا میں مابہ‌الامتیاز ہونی چاہیے - اُن دونوں کا اصل فرق یہ نہیں کہ دنیا میں اِنسان زندگی بسر کرتے ہیں ' کام کرتے ہیں ' تعاون اور تعامل برتتے ہیں ' عمرانی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں اور مدرسے میں بچے پڑھتے ہیں ' سبق یاد کرتے ہیں ' کتابوں کے ساتھ مغز مارتے ہیں گویا یہ کہنا چاہیے کہ زندگی کو ایک دھندلے سے آئینہ میں دیکھتے ہیں - زندگی کی روح تو دونوں میں یکساں ہونی چاہیے لیکن مدرسہ میں یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انتخاب و تنظیم کا زیادہ عمدہ موقع حاصل ہے - بیرونی دنیا میں ہم آسانی کے ساتھ مختلف قسم کے اثرات میں تمیز اور انتخاب نہیں کر سکتے - اس میں بری ' بھلی نیک اور بد ' نشو و نما میں مدد دینے والی اور رکاوٹ پیدا کرنے والی ' غرض سب طرح کی قوتیں اور اثرات موجود ہوتے ہیں - نو عمر اور ناتجربہ کار بچوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ بغیر بیرونی امداد اور رہنمائی کے اُس کے عمدہ اثرات سے فائدہ اُٹھائیں اور برے اثرات سے محفوظ رہیں - علاوہ اُس کے دنیا میں اتنے مختلف قسم کے ادارے ہیں اور اُن میں باہمی کشمکش اور جد و جہد کی وجہ سے اس قدر پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں کہ نو عمر طلبہ بغیر رہنما کے اس بھول بھلیاں میں نہیں چھوڑے جا سکتے - اُن کو تنہا اس ہنگامے میں ڈھکیل دینا

ایسا ھے جیسا کسي شیر خوار بچے کو مثلاً کسي بہت بڑے مشینوں کے کارخانے میں چھوڑ دینا جس کا ایک کل یا پرزہ بھی اس کي سمجھہ میں نہیں آ سکتا - اس لئے سوسائٹي نے بچوں کي تعلیم کے لئے خاص قسم کے تعلیمي ادارے قائم کر دئے ھیں - تاکہ اُن کي اثر پذیر شخصیتیں ایسے ماحول میں نشو و نما پائیں جہاں وہ اثرات نہ ھوں جو انساني شخصیت کي نشو و نما میں حائل ھوتے ھیں - بلکہ وہ تمام محرکات اور اسباب مہیا کئے جائیں جو اُس کي تربیت میں مدد دیں -

اب ھم یہ دیکھنا چاھتے ھیں کہ اِس خاص طرز پر ڈھالے ھوئے ماحول کي کیا خصوصیتیں ھیں جو اُس کو اور ھر قسم کے عمراني ماحول سے ممتاز کرتی ھیں - ایک خصوصیت کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ھے اور وہ یہ ھے کہ اس ماحول کو بیرونی دنیا کي نسبت زیادہ سادہ اور واضح ھونا چاھیے تاکہ اُس کا نظم و نسق اور اصول عمل بچے کی سمجھہ میں آسانی سے آ جائے - موجودہ متمدن سوسائٹی کا نظام اس قدر وسیع اور پیچیدہ ھے کہ بچہ اُس کو بلا واسطہ تمام و کمال کیا جزوی طور پر بھی نہیں سمجھہ سکتا - اِس لئے مدرسہ اس نظام میں سے اُن اجزا اور عناصر کا انتخاب کرتا ھے جو تربیت کے لئے خاص طور پر اھمیت رکھتے ھیں اور بچوں کی زندگی کے ساتھہ ھم آھنگ ھو سکتے ھیں اور اُن کو ایسی ترتیب سے پیش کرتا ھے کہ جو چیزیں بچہ اپنے شوق سے سیکھتا اور کرتا ھے اُنھیں کے ذریعہ اُس پر علم اور واقفیت کے نئے دروازے کھل جاتے ھیں اور وہ رفتہ رفتہ اِنسانی مشاغل میں سمجھہ بوجھہ کر شرکت کرنے لگتا ھے - نصاب کی تدوین اور مدرسے کے تمام مشاغل کی تشکیل میں معلم کو ھمیشہ یہی خیال رکھنا چاھیے کہ وہ تمدنی زندگی کے اھم ترین عناصر کو سادہ اور دلچسپ شکل میں

مدرسے کی زندگی کا جزو بنا دے اور اُن کی ترتیب اس طرح کرے کہ جوں جوں بچوں کی عمر اور تجربے میں ترقی ہو وہ رفتہ رفتہ تمدنی زندگی کے زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل سے روشناس ہوتا جائے - جہاں تک خود بچوں کا تعلق ہے اُنہیں ہمیشہ یہی محسوس ہونا چاہیے کہ وہ ایسے مشاغل میں شریک ہیں جو اُن کے لئے دلچسپ ہیں ' جن میں اُن کی قوتوں کا اظہار ہوتا ہے ' جن سے اُنہیں مسرت حاصل ہوتی ہے - البتہ معلم اور والدین جو اُن مشاغل کے نتائج کو سمجھ سکتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آگے چل کر اُن کی تکمیل کس شکل میں ہوگی وہ بچوں کے طفلانہ کھیلوں اور اُن کے پڑھنے لکھنے میں ان مہتم بالشان مقاصد کی جھلک دیکھ سکتے ہیں جن کا حاصل کرنا مدرسے کا انتہائی فرض ہے-

مدرسے کے ماحول کی دوسری خصوصیت یہ ہےکہ اُسے اُن اثرات سے پاک ہونا چاہیے جو طلبہ کی دماغی نشو و نما اور اُن کی معاشرتی عادات پر برا اثر ڈالیں - معاشرے کے ارباب فکر اور ارباب عمل خصوصاً معلمین اور ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ عہد حاضرہ کے تمدنی ورثے میں سے ان چیزوں کا انتخاب کریں جو نئی نسل کی تربیت اور معاشرے کی آئندہ ترقی کے لئے مفید ہیں اور پھر ان چیزوں کو بہ اسلوب مناسب مدرسے کے نصاب میں داخل کریں - اس زمانے میں یہ انتخاب خاص طور پر ضروری ہوگیا ہے کیونکہ ہر شعبہ زندگی میں اس قدر تیزی کے ساتھ ترقی اور توسیع ہو رہی ہے اور علوم و فنون کی دنیا اس قدر پھیلتی چلی جاتی ہے کہ تمام چیزوں کا علم حاصل کرنا کسی شخص کے لئے ممکن نہیں - ایک زمانہ ایسا تھا جب لوگ یہ کوشش کرتے تھے کہ اعلی تعلیم پانے والے جملہ علوم دفنون پر عبور حاصل کریں - مشرق اور مغرب دونوں کی تعلیمی تاریخ میں ایسے دور گزرے ہیں کہ اعلی درسگاہوں میں

لوگ طب ، فلسفہ ادب ، منطق ، ریاضی وغیرہ جملہ علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور اب بھی ایک حدتک ہندؤں اور مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم کی بنیاد اسی خیال پر قائم ھے اگر چہ اب رفتار زمانہ نے اس کی ظاہری حیثیت میں تبدیلیاں کردی ھیں - یورپ میں بھي قرون وسطیٰ میں ، بالخصوص کومینیس (Comenius) کے زمانے تک اس قسم کي ھمہ دانی پر مبنی تعلیم مرتب کرنے کا شوق ماھرین تعلیم میں عام تھا - اس وقت اگر ایک حدتک یہ خیال قابل عمل تھا بھي ، تو ظاھر ھے کہ اس زمانے میں ھم اس کو قابل غور بھی نہیں سمجھ سکتے - کیونکہ یہ نہ صرف ناممکن ھے بلکہ ممکن بھي ھوتا تو مفید نہیں ھوسکتا تھا - اب تو ضرورت اس بات کی ھے کہ وقتاً فوقتاً بہت احتیاط اور وسعت نظر کے ساتھ مدرسے کے نصاب کي چھان بین اور پڑتال کی جائے - یعنی بالفاظ دیگر معاشرے کے مشاغل اور ضروریات کا جائزہ لیا جائے کیونکہ دراصل یہی نصاب کا ماخذ اور سرچشمہ ھیں - چونکہ یہ ضروریات اور مشاغل بدلتے رھتے ھیں اس لئے نصاب میں بھی ترمیم اور تبدیل کی ضرورت ھوتي رھتی ھے - اگر اس کی طرف سے غفلت برتی جائیگی تو مدرسے کے نصاب میں ھر قسم کي رطب و یابس چیزیں بھر جائینگی - بہت سی چیزیں جن کی اھمیت عارضی ھے یا کم ھے یا بالکل نہیں وہ نصاب کا جزوبن جائینگی اور بہت سی ضروري چیزیں نا واقفیت کی وجہ سے یا اس اندیشہ سے چھوٹ جائینگی کہ نصاب میں بہت زیادہ مضامین کا ھجوم نہ ھوجائے - اس میں بہت سے دورازکار مضامین جو ماضي کی یاد گار ھیں اور حال کی ضروریات سے ھم آھنگ نہیں محض قدامت پرستی کی وجہ سے باقي رہ جائینگے ، بعض مضامین انفرادی ذوق کی وجہ سے داخل ھوجائینگے اور نصاب کے مسئلے پر جو ایک طرف تمدنی

زندگي کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسری طرف بچوں کی نفسی زندگی سے ' کماحقہ غور نہ ہوسکے گا -

ہم آئندہ کسی باب میں نصاب کے مسئلے پر بحث کرینگے اور بتائینگے کہ ہمیں نہ صرف درسی نصاب کے مضامین میں ترمیم اور انتخاب کي ضرورت ہے بلکہ موجودہ اصول انتخاب کو صحیح راستہ پر لانا ہے ہمارا مقصد مدرسے کی تعلیم سے یہ بھی نہیں کہ مفید تریں علوم وفنون کي تمام ضروری ضروری ابتدائی باتیں بچہ کو سکھا دي جائیں کیونکہ ان کا دائرہ بھی بہت بڑا ہے اور ایک محدود مدت میں کسي اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے طالب علم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ادب ' سائنس ' علم معاشرت اور آرٹ کی مبادیات پر بھی عبور حاصل کرسکے - ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس میں اس امر کی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ مدرسے کي ذہنی تربیت کی مدد سے اپنی ضرورت اور مصلحت کے مطابق آئندہ چل کر جس علم یا ہنر کو ضروری سمجھے اسے حاصل کرسکے- یعني اسے علوم پر نہیں بلکہ تحصیل علم وفن کے ذرائع اور وسائل پر قابو حاصل ہوجائے - ہم یہ توقع نہیں کرسکتے کہ مدرسے کي مختصر زندگی کے دوران میں طالب علم اس ساری زمین کو کھود کر کاشت کرے جو اس کو زندگي بھر میں درکار ہوگي - لیکن ہم مدرسے کی تعلیم کی بدولت اتنا ضرور کرسکتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت ' اس کے دماغ میں بیداری ' حوصلہ اور جوش ' اس کے دل میں ولولہ عمل پیدا کردیں اور اس کے ہاتھ میں ایسے اوزار دیدیں کہ وہ آگے چل کر بغیر کسي بیروني جبر یا تحریصی یا نگرانی کے جس زمین کو چاہے کھود کر کاشت کرے اور اسے لہلہاتا ہوا کھیت یا ہرا بھرا چمن بنادے -

یہ ہے تعلیمی ماحول کی دوسري خصوصیت کہ وہ تمدن حاضرہ کے بے شمار

مظاہر میں سے بہترین اور مفید ترین کو چن کر انہیں نو عمر بچوں کے گرد اس طرح ترتیب دے کہ وہ ان میں منہمک ہوکر اپنے اندر اس تمدن کو سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت پیدا کریں -

تعلیمی ماحول کی تیسری خصوصیت پروفیسر ڈیوئی (Dewey) یہ بیان کرتے ہیں [1] کہ وہ تمدنی ماحول کے مختلف عناصر میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرتا ہے - اکثر بچوں کا گھر اور پڑوس کا ماحول بہت تنگ اور محدود ہوتا ہے اور اس میں اتنی گنجائش اور امکانات نہیں ہوتے کہ وہ ان کی مجموعی اور مکمل تربیت کرسکے - مثلاً ایک بچہ کسی صناع یا مزدور کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو اس کے گرد وپیش کے تمام حالات اس کو مزدوری یا صنعت، و حرفت کی طرف رغبت دلاتے ہیں - اسی قسم کے خیالات، جذبات اور دلچسپیاں اس میں پیدا کرتے ہیں - اس طرح اگر کوئی بچہ کسی دولت مند گھرانے میں پیدا ہوتا ہے جس کے افراد کوئی خاص کام نہیں کرتے تو وہ صنعت اور محنت کے سارے نظام سے ناواقف رہتا ہے اور اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ

زمزدبلدہ کر پاس پوش و محنت کش

نصیب خواجہ ناکردہ کار رخت حریر

اگر کوئی بچہ گاؤں میں کسی کاشتکار کے یہاں پیدا ہوتا ہے تو وہ اکثر صورتوں میں نہ صرف موجودہ صنعت و حرفت کے نظام اور شہری زندگی سے بے خبر ہوتا ہے بلکہ ان تمام تہذیبی مشاغل سے بھی نا بلد رہتا ہے جن میں فرصت کا وقت خوش دلی اور عمدگی سے بسر ہوسکتا ہے - غرض خواہ بچہ معاشرے کے کسی طبقہ میں پیدا ہو وہ اپنے محدود ماحول میں مقید ہوتا ہے اور آسانی

---

[1] Democracy and Education باب اول صفہ ۲۳ _ ۲۶

سے اس سے باہر نہیں نکل سکتا - صرف مدرسہ ھی ایک ایسا منظم
اور گوناگوں ماحول ھے جہاں خاص طور پر اس بات کا التزام ہوتا
ھے یا ہو سکتا ھے کہ بچے کی نشو و نما کے لئے ایک مناسب
فضا پیدا کی جائے جس میں وہ مختلف قسم کے دماغی اور جسمانی
مشاغل میں شریک ہو سکے اور مکمل اور ہم آہنگ تربیت پا سکے
اور ساتھ ھی وہ ان مشاغل کے دوران میں اپنی مخصوص صلاحیتوں
اور رجحانات کا پتہ چلا سکے - مدرسے کو اس کے لئے ایک آزاد ماحول
ہونا چاہیئے جہاں وہ اپنی تعلیم کے زمانے میں بغیر بے جا روک
توک کے مختلف قسم کے تجربے کر سکے اور زندگی کی مختلف راہوں
سے واقفیت حاصل کرے - مدرسے سے باہر دنیا میں مختلف قسم کے
ادارے ھیں جو نو عمر طلبہ کو اپنی طرف کھینچتے ھیں - ہر فرد
صرف ایک ھی جماعت کا رکن نہیں ہوتا بلکہ بہت سی جماعتوں
میں شریک ہوتا ھے اور ان میں سے ہر جماعت کی رکنیت سے اس
کی طبیعت اور مشاغل اور دلچسپیوں پر اثر پڑتا ھے جیسا کہ
ہم اس سے اگلے باب میں وضاحت کے ساتھ بتائیں گے - ہر معاشرتی
ادارہ خواہ اس کا تعلق اقتصادی مسائل سے ہو، یا سیاسی مسائل
سے، یا وہ خلاف قانون اور مخرب اخلاق اغراض کی تکمیل کے لئے
قائم کیا گیا ہو، اپنے اراکین کی تربیت میں دخیل ہوتا ھے اور
وہ افراد جو اس میں شریک ہوتے ھیں اس کے مطالبات کو پورا
کرنے میں نئے تجربات سے متاثر ہوتے ھیں - اس کشمکش کی زندگی
میں جہاں ہر فرد پر مختلف اور متضاد قوتوں کے اثرات کام
کرتے رہتے ھیں بچوں کے لئے مدرسہ نہ صرف ایک تربیت گاہ ھے
بلکہ جائے امن ھے - یہاں بغیر اس کی شعوری واقفیت کے اس کے

نفس میں ان اخلاقی قدروں اور معیاروں کا نظام مرتب ہوتا ہے جو تمام عمر اس کی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں - اگر معاشرہ اس قسم کا کوئی مرکزی ادارہ قائم نہ کرے تو نو عمر نسلوں کی تربیت بہت ناقص ، نا مکمل اور یک طرفہ ہو اور ان کی طبیعتوں میں بھی وہ توازن اور انصاف پسندي پیدا نہ ہو سکے جو حقیقی تہذیب کی بنیاد ہیں اور جن کی بدولت انسان نظري تحقیق اور عملي زندگی میں متانت اور سلامت روی سے کام لیتا ہے اور ہر بات کے کل پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کرتا ہے - اس زمانے میں جب ہمارے ملک میں باہمی اختلافات بے حد بڑھ چکے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں بلکہ اختلافات کی حد سے گذر کر مناقشات کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں اور معاشرہ بے شمار جماعتوں میں تقسیم ہوتا چلا جا رہا ہے جن میں اغراض و مقاصد ، رسوم و روایات کا فرق ہے ، ایک ایسے تعلیمی نظام کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے جو قوم کے تمام بچوں اور نوجوانوں کے لئے ایک سا ماحول مہیا کرے اور مناسب حد تک ان میں یکسانی پیدا کرے - جب کسي مدرسے میں بہت سے بچے جن کا تعلق مختلف معاشرتی طبقوں ، مذہبوں اور جماعتوں سے ہوتا ہے ساتھہ پڑھتے ہیں ، کھیلتے ہیں ، مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں تو ان کے لئے مدرسہ ان کے گھروں سے زیادہ وسیع اور موثر ماحول بن جاتا ہے جہاں ایک ہي قسم کے مشاغل میں مصروف رہ کر ان میں اتحاد خیال اور ہم رنگي پیدا ہو جاتی ہے جو ایک ملک کے باشندوں اور ایک قوم کے افراد کے لئے لازم ہے - "مدرسے کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ہر فرد کی طبیعت میں ان تمام اثرات کی ہم آہنگ تنظیم کرے

جو مختلف معاشرتی اداروں میں شرکت کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ گھر کی زندگی میں ایک ضابطہ اخلاق کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور گلی اور بازار میں دوسرے کی، دوکانوں کارخانوں میں تیسرے کی، مذہبی تعلقات میں چوتھے کی۔ جب ایک ہی آدمی ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جاتا ہے تو اس پر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی قوتیں عمل کرتی ہیں اور اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت پر ایسا اثر پڑے کہ وہ مختلف موقعوں پر عمل و جذبات کے مختلف مقتضا اور معیار کے مطابق کام کرے۔ اس وجہ سے مدرسے کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت میں استقلال اور وحدت کا رنگ پیدا کرے"۔ [1]

اگر مدرسے میں تربیت کا انتظام اچھا ہے تو بچے کی زندگی اور کردار کے لئے ایسے اٹل قانون قائم ہو جائیں گے جو اس کو آئندہ زندگی میں سیدھے راستے پر چلاتے ہیں اور ایسے وقت میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں جب مختلف قسم کی ترغیبیں اور ماحول کے اثرات ان کو مختلف سمتوں میں کھینچتے ہیں اور عقل جوانی کی اندھیری رات میں راستہ ٹٹولتی ہوئی بھٹکتی پھرتی ہے۔

[1] Democracy and Education صفحہ ۲۶

باب دوم

تعلیم اور تمدني ادارے

ہم نے گزشتہ باب میں ، مختصر اور عام الفاظ میں تعلیم اور تمدن کا تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ تمدنی زندگی کا سلسلہ نسلاً بعد نسل اس طرح قائم رہتا ہے کہ مختلف ذرائع اور وسائل سے ہر نسل اپنے تمدنی ورثے کو جس میں وہ خود اپني جد و جہد سے اضافہ کرتی ہے اپنے بعد آنے والی نسل کی طرف منتقل کردیتی ہے- جب یہ عمل انتقال دوفریقوں کے درمیان واقع ہو جن میں سے ایک پختہ کار اور سن رسیدہ ہے اور دوسرا ناتجربہ کار اور نو عمر تو ہم اسے اصطلاحاً تعلیم و تربیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں - یہ تعلیم و تربیت جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں معاشرہ براہ راست بھی کرتا رہتا ہے اور بہت سی مفید اور ضروری باتیں جو بچے سیکھتے ہیں وہ زیادہ تر معاشرے کے بلا واسطہ اثر سےسیکھتے ہیں یعنی بچے ان مشاغل میں جو ان کے گرد و پیش ہوتے رہتے ہیں شرکت کرتے ہیں اور عملی تجربے کی بدولت اپنی واقفیت اور کار کردگی میں اضافہ کرتے ہیں - لیکن معاشرے کی موجودہ حالت میں تمدنی ترقي کی وجہ سے ہم اس بلا واسطہ تعلیم پر اکتفا نہیں کرسکتے کیونکہ یہ تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہوتي - اور اس میں وہ نظم و تربیت نہیں پائی جاتی جو ایک مخصوص تعلیمی ماحول میں ہونا چاہیے جہاں ہر کام اس مقصد سے داخل کیا جائے کہ اس کے ذریعے بچوں کی مکمل تربیت اور نشو ونما ان کي نفسی زندگی کے قوانین کے مطابق ہوسکے - لہذا با قاعدہ مدرسوں کي ضرورت محسوس

ہوئی اور تعلیمی ادارے قائم کئے گئے جن کی بعض اہم خصوصیات کا ذکر ہم کر چکے ہیں -

اس تمام بحث میں ہم نے تعلیم کے لفظ کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے - ایک تو وہ خاص مفہوم ہے جس سے ہر شخص واقف ہے اور جو '' علم '' کے لفظ کے ساتھ وابستہ ہے - اس معنی میں مدرسوں میں '' تعلیم '' دی جاتی ہے یعنی طلبا کو بعض علم و فنون سکھائے جاتے ہیں جو بعد کی زندگی میں ان کے کام آتے ہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں - اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے اور اسے لفظ تعلیم کے دوسرے وسیع معنی سے ممیز کرنے کے لئے انگریزی میں (Instruction) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے لغوی معنی '' سکھانے '' کے ہیں - پروفیسر فنڈلے (Findlay) اپنی کتاب '' مدرسہ '' (The School) میں تعلیم کی یہ تعریف کی ہے :—

'' تعلیم ان تدابیر اور وسائل کے مجموعے کا نام ہے جو نو عمروں کو تمدنی زندگی کا اہل بنانے کے لئے بالارادہ کام میں لائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے ان کے دماغوں کو بعض خاص اثرات اور مقاصد سے متاثر کیا جاتا ہے ''

اس تعریف میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ معاشرے کے بالغ اور ذمہ دار افراد بالارادہ نو عمر بچوں اور نو جوانوں کی تشکیل صورت میں حصہ لیں اور ان کی نشو ونما پر اثر ڈالیں - اس محدود معنی میں تعلیم کا عمل دو فریقوں سے تعلق رکھتا ہے - ایک طرف والدین اور اساتذہ وغیرہ کی جماعت ہے اور دوسری طرف نو عمر بچے - ان کی باہمی اثر آفرینی اور اثر پذیری تعلیم کہلاتی ہے - تعلیم کا ایک

دوسرا مفہوم زیادہ عام اور وسیع ھے جس کے مطابق انسان کو زندگی اور اس کے تمام مظاہر اور ادراے تعلیم دیتے ھیں - اس کے لئے انگریزی میں (Education) کا لفظ استعمال ہوتا ھے - جس کا ترجمہ " تربیت " کیا جاسکتا ھے - بعض مصنفوں نے " تعلیم " اور " تربیت " کے الفاظ کو ان معنوں میں احتیاط کے ساتھ علیحدہ علیحدہ استعمال کیا ھے " تعلیم " کو مدرسے کے اندر علوم و فنون سکھانے کے محدود معنی میں اور " تربیت " کو عام ذھنی نشو ونما کے معنی میں - لیکن ہم ان الفاظ کو اس طرح استعمال نہیں کرتے - اول تو اردو میں یہ تفریق رائج نہیں - دوسرے معنوی اور نفسی اعتبار سے بھی یہ مناسب نہیں کہ ان میں ایک حد فاصل قائم کردی جائے کیونکہ در اصل تعلیم و تربیت کے حدود آپس میں ملتے ھیں اور ان میں آسانی سے تمیز نہیں کی جاسکتی - جب ہم کسی بچے کو کوئی نیا علم یافن سکھاتے ھیں مثلاً اس کو پڑھنے یا لکھنے کی تعلیم دیتے ھیں یا ڈرائنگ اور مصوری کا ہنر سکھاتے ھیں تو اس کا اثر محض دماغی تعلیم تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی شخصیت کی عام تربیت اور نشو ونما میں بھی معین ہوتا ھے - اسی طرح جو تربیت ہم عمرانی زندگی میں براہ راست شریک ہوکر حاصل کرتے ھیں وہ ہمارے علم میں بھی اضافہ کرتی ھے اور اس کا اثر مدرسہ کی تعلیم پر بھی پڑتا ھے - اس لئے ہم حسب ضرورت کہیں دونوں الفاظ کا استعمال کرینگے اور کہیں صرف ایک کا تاکہ معلوم ہوجائے کہ ہمیں اس عمل کے کسی پہلو پر زور دینا مقصود ھے -

ہماری شعوری کوششوں سے بہت پہلے فطرت نے وسیع معنی میں نسل انسانی کی تعلیم و تربیت کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا - اس

کے تمام مظاہر اور تمام قوتیں ابتدائی زمانے کی انسانی جماعتوں پر مختلف طریقوں سے اپنا اثر ڈالتی تھیں اور ان کے مفید اور مضر اثرات کا تجربہ حاصل کرکے انسان اپنے اعمال و افعال میں حسب ضرورت ترمیم اور تغیر کرتے تھے۔ اس اثر آفرینی کا ذریعہ قدرتی ضبط اور سزا کا وہی طریقہ تھا جس کا ذکر ہم گذشتہ باب میں کرچکے ہیں۔ لیکن جب معاشرتی اور تمدنی ادارے قائم ہوئے اور افراد ان میں شریک ہونے لگے تو تعلیم و تربیت کے نئے ذرائع اور وسائل پیدا ہوگئے۔ کیونکہ فطرت کی قوتوں کی طرح، نظام معاشرت کے اثرات نے بھی ان کی طبیعت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا شروع کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملہ جو دو انسانوں میں ہوتا ہے، ہر تجربہ جو ہم معاشرتی زندگی یا قدرتی مظاہر کے سابقے سے حاصل کرتے ہیں ہمارے خیالات، ہمارے چال چلن ہماری کار کردگی پر اثر ڈالتا ہے اور ہمارے عام رویہ میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یہ اثر سب لوگوں کے لئے عام ہے خواہ وہ نو عمر ہوں یا سن رسیدہ۔ اس معنی میں ہم ہر معاملے اور ہر تجربے کو اپنا معلم کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ ہماری طبیعت اور ہمارے اعمال میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ بہ قول غالب

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں!

غرض "تربیت" وہ عمل ہے جس کے ذریعے سے شعوری یا غیر شعوری طور پر، بلاواسطہ یا بالواسطہ، افراد (بالخصوص بچوں) کی حرکات اور اعمال کی نگہداشت اور اصلاح کی جاتی ہے۔ تاکہ ان میں بعض تبدیلیاں جو پسندیدہ سمجھی جاتی ہیں پیدا کی جائیں۔ ان تبدیلیوں کو پیدا کرنا اور نو عمروں کی طبیعت کو ان مقاصد اور

اصولوں کے مطابق ڈھالنا جو بحیثیت مجموعی اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے بہترین قرار پائیں معلموں اور تعلیم گاھوں کا فرض منصبی ھے - لیکن ظاھر ھے کہ یہ فرض محض تعلیم گاھوں تک محدود نہیں، نہ وہ اس کو بغیر بیرونی امداد کے پورا کرسکتی ھیں - بچے کی طبیعت کی ساخت اور تشکیل میں، اس کی ابتدائی تربیت میں، اس کے شوقوں اور رجحانوں کے ابھارنے اور سدھارنے میں مدرسہ کے علاوہ اور بھی بہت سے تمدنی اداروں کو دخل ھے - ان میں سے بعض کو تمام عمر اور بعض کو زندگی کی مخصوص منازل میں انسان کی ذھنی نشو و نما سے بہت قریبی اور گہرا تعلق ھوتا ھے - جو شخص مسئلہ تعلیم پر غائر اور وسیع نظر ڈالنا چاھتا ھے اس کے لئے لازم ھے کہ وہ ان تمام عناصر اور قوتوں کو خیال میں رکھے جو بچے کی شخصیت کو بناتی یا بگاڑتی ھیں اور مدرسے کے کام میں مدد دیتی ھیں یا اس میں رکاوٹیں پیدا کرتی ھیں - تعلیمی مباحث کے لئے یہ وسعت نظر نہایت اھم ھے - کیونکہ اس کے بغیر ھم مدرسہ کو ایک مفید اور موثر ماحول نہیں بنا سکتے - مدرسے کے بے شمار اور گوناگوں مسائل مدرسہ کی چاردیواری ھی میں پیدا نہیں ھوتے بلکہ تمدنی زندگی کے وسیع اور ھمہ گیر نظام کے مختلف شعبوں میں ان کی ابتدا ھوتی ھے اور وھاں سے ان کا اثر مدرسے کے اندر پہنچتا ھے - مدرسے کا خاص کام یہ ھے کہ وہ ان مسائل کے حل کرنے میں بچوں کی مخصوص ضرورتوں اور نفسی کیفیتوں کا لحاظ رکھے - مدرسے کے باھر معاشرے کے بالغ افراد بھی ان مسائل سے دو چار ھوتے ھیں - لیکن وہ ان کا حل دوسرے اثرات اور تجربات کی رھنمائی میں تلاش کرتے ھیں - مدرسہ ان سب چیزوں سے مسالے کا کام لیتا ھے اور ان

کی تشکیل ایک مخصوص طرز پر کرتا ھے - اس لئے تمام تمدنی اداروں سے ھر وقت اس کا رابطہ قائم رھتا ھے اور رھنا چاھئے - اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو اس بات کا اندیشہ ھے کہ مدرسہ محض ایک رسمی درس گاہ بن کر رہ جائے گا جہاں زندگی کے بہترین عناصر کا تجربہ حاصل ہونے کے بجائے محض کتابوں کے سبق پڑھائے جاتے ھیں اور تربیت قدرتی اصولوں کے مطابق نہیں مصنوعی اور دور ازکار طریقوں سے ہوتی ھے - جو استاد یا ماہرین تعلیم مدرسے اور نظام تمدن کا صحیح تعلق نہیں سمجھتے وہ ہمیشہ یہ غلطی کرتے ھیں کہ مدرسے کے سبقوں اور درسی مشقوں کو مقصود بالذات بنا لیتے ھیں اور اس اصول کو بھول جاتے ھیں کہ ہم بچے کو کوئی چیز کوئی بات، کوئی کام بلا واسطہ نہیں سکھا سکتے - طبیعت کی تشکیل ہمیشہ ان مشاغل میں شرکت کرنے سے ہوتی ھے جو معاشرے میں رائج ھیں یا مناسب ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ مدرسہ میں رائج کئے جاتے ھیں - مدرسے کو اپنے مخصوص کام میں حقیقی کامیابی صرف اس صورت میں حاصل ہوسکتی ھے جب اس کا طریقہ تعلیم انہیں اصولوں پر مبنی ہو جن پر عمل کرنے سے تمدنی زندگی کا نظم اور ربط قائم ھے - اور وہ انہیں متحرکات عمل سے کام لے جو بالغ افراد کی زندگی میں کارفرما ھیں - ورنہ محض کتابی اور لفظی تعلیم کا نتیجہ وھی ہوتا ھے جو طوطوں کو رٹانے کا - یعنی بچوں کی واقفیت سطحی اور اوپری ہوتی ھے اور ان کے اخلاق و عادات محض نقالی بن کر رہ جاتے ھیں - "بچوں کے نفس میں ان عادات اور رجحانات کی تربیت کے لئے جو عمرانی زندگی میں تسلسل اور ترقی کو قائم رکھتے ھیں یہ طریقہ کارگر نہیں

هو سکتا کہ براہ راست انھیں الفاظ کے ذریعے عقائد ، جذبات اور معلومات کا درس دیا جائے - طبیعت کی مستقل اور ہمہ گیر تشکیل دانشمندی کے ساتھہ اسی وقت ہو سکتی ھے جب نو عمر بچے رفتہ رفتہ ان مختلف عمرانی جماعتوں کے مشاغل میں حصہ لیں جن سے وہ تعلق رکھتے ھیں - [۱]

اس باب میں ہم انھیں عمرانی جماعتوں کے نظام اور تعلیمی اثرات سے بحث کرنا چاھتے ھیں جن سے بچے کو تعلق ھوتا ھے اور جو اس کی تربیت پر گہرا اور پائدار اثر ڈالتے ھیں - ہم دیکھہ چکے ھیں کہ دو اشخاص یا دو جماعتوں کے باہمی تعلق اور ربط سے ہمیشہ دونوں پر کچھہ نہ کچھہ ، برا یا بھلا ، اثر ضرور پڑتا ھے - یہ تعلقات عمرانی زندگی میں محض اتفاقی اور عارضی نہیں بلکہ اپنی اپنی نوعیت کے مطابق مستقل اداروں (institutions) کی شکل میں منظم ھیں - ان میں سے بعض ایسے ھیں جن میں افراد کا تعلق اور اشتراک عمل بہت گہرا اور قریب کا ھوتا ھے اور وہ براہ راست ایک دوسرے سے مل جل سکتے ھیں - مثلاً خاندان ، کھیل کی ٹیمیں ، محلے والوں کی جماعت - بعض اداروں میں باہمی تعلقات ایک حد تک بلا واسطہ ھوتے ھیں اور ایک حد تک بالواسطہ - مثلاً مدرسہ یا مذہبی جماعتیں ، یا امداد باہمی کی مختلف قسم کی انجمنیں - ان میں افراد ایک دوسرے سے براہ راست بھی ملتے جلتے ھیں اور متاثر ھوتے ھیں اور بعض اثرات بغیر ذاتی میل جول کے بھی اپنا کام کرتے ھیں - مثلاً مدرسہ ایک لحاظ سے ایک مقامی ادارہ ھے جس میں استاد طلبہ آپس میں ملتے جلتے ھیں اور ذاتی

---

(۱) Dewey : Democracy and Education صفحہ ۲۶

تعلقات سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک لحاظ سے اس کے اثرات غیر شخصی ہوتے ہیں - کتابیں، تعلیمی آلات اور وسائل: مدرسے کا عام نظم و نسق ایسی چیزیں ہیں جو تمام تعلیمی اداروں، معلموں اور متعلموں کو ایک سلسے میں منسلک کرتی ہیں - اسی طرح مذہبی اداروں میں جہاں لوگ ایک دوسرے سے یا مذہبی پیشواؤں کی زندگی سے براہ راست مستفید ہوتے ہیں وہاں ان کے خیالات اور عقائد پر رسوم و عبادات اور روایات کا بھی اثر پڑتا ہے - تیسری شکل ان تمدنی اداروں کی ایسی ہے جن میں افراد میں بلاواسطہ تعلق بہت ہی کم ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا بلکہ باوجود بعد مقام کے تمام اراکین ایک سلسلہ میں منسلک ہوتے ہیں - مثلاً ریاست کا نظام، صنعت و حرفت کے کارخانے، یا علمی تحقیق و تفتیش کرنے والوں کی جماعتیں جن کے ارکان کا ایک دوسرے سے ذاتی طور پر ملنا جلنا ضروری نہیں - وہ اپنے اپنے اداروں کے عام نظم و نسق سے متاثر ہوتے ہیں، کتابوں، کانفرنسوں، رسالوں کی مدد سے ایک دوسرے کے کام سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور گو باہم صورت آشنا تک نہ ہوں مگر حقیقت میں ایک ہی جماعت کے رکن ہوتے ہیں -

مندرجہ بالا تقسیم پروفیسر سمتھ (Smith) نے اپنی کتاب "معاشیات تعلیمی" (Educational Sociology) میں افراد کے باہمی تعلقات کی بنا پر کی ہے - اگر ان اداروں کی تقسیم ان کے مقاصد کے لحاظ سے کی جائے تو ہمیں میکنزی (Mackenzie) کے نقطہ نظر سے مدد ملے گی [۱] اس کے خیال کے مطابق بعض جماعتوں

---

[۱] دیکھو میکینزی: زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamental Problems of life) صفحہ ۱۵۹ -

اور اداروں کا مقصد مذہبي یا تہذیبی ہوتا ھے جن میں بنائی اشتراک یہ خیال ہوتا ھے کہ وہ اپنی تہذیب نفس یا تفریح کے لئے اجتماعی طور پر ہتمام کریں - اس ذیل میں ہم مذہبي نظاموں ، تعلیمی اداروں ، علمی انجمنوں اور فنون لطیفہ کے مرکزوں کو شمار کر سکتے ھیں - دوسری قسم ان جماعتوں کی ھے جن کی وجہ قیام اقتصادی ھے اور مادی کار و بار سے تعلق رکھتی ھے مثلاً مختلف پیشوں کی برادریاں ، صنعت و حرفت کے کارخانے ، وہ تمام ادارے جو پیدائش دولت اور تقسیم دولت کا کام انجام دیتے ھیں - اور بعض اوقات ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور دور رہنے والے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرتے ھیں - تیسری قسم ان جماعتوں کی ھے جن کی بنیاد قانونی ھے - ان کی سب سے اهم اور بڑی مثال ریاست ھے - ان تمام اداروں سے مل کر همارا تمدنی ماحول بنتا ھے - بقول پروفیسر ایڈمسن (Adamson) یہ هماری "دنیائے تمدن" ھے جو "طبیعی دنیا" اور "اخلاقی دنیا" کے ساتھہ ساتھہ هماری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ھے [۱] - اور هماری فطرت کے اظہار کے لئے مواقع اور وسائل بہم پہنچاتی ھے - بچے ، جوان ، بوڑھے سب اپنی اپنی قابلیت اور حالات کے مطابق ان کے مشاغل میں حصہ لیتے ھیں اور اپنی قوتوں اور جبلتوں کا اظہار کرتے ھیں اور اسی طرح ان کی علمي ، اخلاقي اور تمدنی نشو و نما ہوتي ھے جس کا تجزیہ آئندہ باب میں صراحت کے ساتھہ کیا جائیگا -

[۱] ایڈمسن (Adamson) نے اپنی معرکۃ الارا تصنیف "فرد اور ماحول" (Individual Environment) میں انسانی ماحول کي تقسیم اس عنوان سے کی ھے -

ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کے تعلیمی اثرات سے بحث کر سکیں جو بچے کی زندگی کا احاطہ کئے ہوتے ہیں کیوں کیونکہ ان کی تفصیل کے لئے معاشرے کے ہر شغل کا تجزیہ لازم آتا ہے - اس لئے ہم مختصراً صرف ان اداروں کا ذکر کریں گے جو بچے کی زندگی سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں اور مدرسے کے نصاب اور نظام عمل پر اثر ڈالتے ہیں -

پروفیسر فنڈلے (Findlay) نے اپنی تازہ تصنیف " تعلیم کی بنیادیں" (Foundations of Education) میں ان اداروں کو مندرجہ ذیل نقشے کے ذریعہ ظاہر کیا ہے -

تمدنی ادارے جن کا تعلیم سے تعلق ہے

گھریا خاندان | معاشرتی طبقے | نظام معاشی | ریاست (حکومت) | تہذیب | مذہب

تہذیب:
علم (علوم و فنون)
اشاعت علم (تعلیم)

کتاب کے اس حصے میں ہم ان مختلف اداروں کے تعلیمی اثرات اور مطالبات سے بحث کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ دور حاضرہ میں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں جنھوں نے ہمارے نظام تعلیم کو صریحاً متاثر کیا ہے - البتہ تہذیب اور مذہب کے اثرات کی بحث کو کتاب کے آخری حصے کے لئے ملتوی رکھیں گے جس کا تعلق طلبہ کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت کے مسائل سے ہے -

باب سوم

خانگی اور معاشري زندگی کے اثرات

بچے کی درسگاہ اولین گھر کی زندگی اور خاندان کے افراد کا جو اثر اوائل عمر میں بچے کی شخصیت پر پڑتا ہے اس کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات ہر شخص کے ذاتی مشاہدہ اور تجربہ میں آتی ہے - پہلے ماں کی گود میں اور اس کے بعد اور گھر والوں کی صحبت میں بچہ وہ ابتدائی حرکات اور مشاغل سیکھتا ہے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروري ہیں - اور یہی نہیں بلکہ اس کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت بھی زیادہ تر گھر ہی میں ہوتي ہے- یہاں وہ سب سے پہلے یہ محسوس کرتا ہے کہ کس طرح متعدد افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر مشترک مقاصد کے لئے کوشاں ہیں اور جب تک ان میں سے ہر ایک اپنا اپنا کام نہ کرے گھر کا کارخانہ نہیں چل سکتا - باہمی احتیاج اور امداد کا یہ احساس ساری اخلاقي اور تمدنی تربیت کی بنیاد ہے - اس میں شک نہیں کہ جیسا ارسطو نے کہا ہے اور سب تمدنی اداروں کني طرح خاندان کي ابتدائی غرض بھی محض زندگی کو قائم رکھنا ہے - لیکن رفتہ رفتہ اس کے مقاصد میں اچھي طرح زندگي بسر کرنا بھی شامل ہوجاتا ہے - لیکن یہ امر کہ خاندان کا اثر بچے کی طبیعت اور خیالات پر خوشگوار ہوگا یا نہیں خاندان کي پراني روایات اور اصول اور بزرگوں کے طرز عمل اور مثال پر منحصر ہے - اگر اس کے محدود ماحول میں ایسے مواقع موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھاکر بچے اپنی شخصیت کی تشکیل اور

اپنی جبلتوں کا اظہار کرسکتے ہیں تو اس کا اثر ان کي زندگی پر اچھا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر خاندانی روایات تنگ نظري پیدا کرکے بچوں کے مشاغل اور دلچسپیوں کا میدان بہت محدود کردیتی ہیں اور رسم ورواج اور بزرگوں کي سخت گیر طبیعت کے دباؤ سے ان کی شخصیت ابھرنے نہیں پاتی تو اسي کا مجموعی اثر جیسا کہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں بہت خراب ہوتا ہے۔ کیونکہ جب بچوں کي تربیت کی بنیاد ہی کمزور ہوگئی تو اس پر جو عمارت بنائی جائے وہ کسی طرح مستحکم نہیں ہوسکتی

خشت اول چوں نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج !

بچے کی سیرت کي تشکیل میں گھر کی زندگي کے دواثرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک طرف تو وہ بچے کو تمدنی زندگی کے سب سے پہلے اور سادہ ترین نظام سے آشنا کرتی ہے اور اس کے دل میں محبت ہمدردي اور تعاون کا بیج بوتي ہے اور دوسري طرف بچہ کی شخصیت اور انفرادیت کی حفاظت کرتی ہے۔ ہر ماں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا بچہ دنیا سے نرالا اور سب بچوں سے بڑھکر ہے۔ وہ اس کی نظر میں غیر معمولی طور پر ذہین اور محبت کرنے والا اور عجیب و غریب صفات کا مالک ہوتا ہے یعنی ماں جو گھر کی سردار اور اس کي روح کا بہترین مظہر ہوتي ہے ہر بچہ کی غیر محدود انفرادی قدر کو تسلیم کرتي ہے۔ اس کا یہ نقطہ نظر، خواہ وہ محبت کي وجہ سے کتناهی مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو، معلم کے رسمی نقطہ نظر کی نسبت حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ معلم بالعموم یہ سمجھتا ہے کہ سب بچے ایک لاٹھی سے ھانکے جاسکتے ہیں اور ان سے ایک ہی قسم کے

معیار عمل کی توقع کی جاسکتی ہے کیونکہ اسے یہ بات اچھی طرح محسوس نہیں ہوتی کہ ان میں سیرت اور قابلیت کے اعتبار سے کسی قدر بین فرق ہوتا ہے - زمانہ حال کی نفسیاتی تحقیقات نے پوری طرح ثابت کردیا ہے کہ ان بچوں میں بھی جو ایک ہی یا ایک سے ماحول میں رہتے ہیں اور ایک ہی تعلیمی منزل میں ہوتے ہیں بعض اوقات نہایت زبردست دماغی اور جذباتی اختلافات پائے جاتے ہیں جن کی طرف سے بے پروائی برتنے سے اکثر طلبہ کی زندگی برباد جاتی ہے یا کم سے کم ان کی ابتدائی تربیت ناقص رہ جاتی ہے اور ان کی صلاحیتوں کی ارتقا پوری طرح نہیں ہونے پاتی - مندرجہ بالا بحث میں بچوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بڑی حدتک ان نوجوانوں پر بھی عائد ہوتا ہے جو بچپن کی وادی عمیق سے نکل کر شباب کی پر آشوب منزل میں قدم رکھتے ہیں - بچپن میں، جب عادتیں مستحکم ہونی شروع ہوتی ہیں اور طلبہ کے جذباتی میلانات نشو ونما پاتے ہیں، گھر کا اثر مدرسے سے بہت زیادہ دیرپا اور وسیع ہوتا ہے - اس کے بعد نوجوانی کے دور میں جب بچپن کا توازن تہ و بالا ہوجاتا ہے نئی جبلتیں اور نئے جذبات رونما ہوتے ہیں. اور نوجوان طالب علم کو طرح طرح کی تحریصوں اور کششوں کے درمیان اپنے لئے راہ نکالنا پڑتی ہے - اس وقت بھی گھر کی فضا اور روایات اس کی رہنمائی کرتی ہیں - ممکن ہے کہ یہ فضا خراب اور یہ روایات ناقص اور گمراہ کن ہوں - ایسی حالت میں نوجوان کی بے مرکز زندگی کا خدا حافظ ہے - لیکن اگر اس وقت والدین اور بھائی بہن اور عزیز ترین دوستوں کی صحبت اور مثال خاموشی کے ساتھ اپنا عمدہ اثر ڈالتی ہے تو نوجوان کی زندگی ہمیشہ کے لئے سدھر

جاتی ھے - اسی جد و جہد اور کشمکش کے دور میں اگر نوجوان کو یہ احساس ہو کہ اس کا گھر اس کے لئے ایک امن و سکون کی منزل ھے جہاں ایسے اصولوں اور قدروں کی حکمرانی ھے جن کا وہ احترام کرتا ھے تو ممکن ھے بلکہ اغلب ھے کہ وہ اس تقویت اور اطمینان قلب کی بدولت تمام تحریصات پر غالب آئے - بقول ڈاکٹر وھیلر کے

"والدین اور بھائی بہنوں کی محبت، گھر کی مسرت بخش زندگی، عزیزوں کی باھمی مراعات، وہ بے تکلفی اور ارتباط جو ایک چھوٹی سی قدرتی جماعت ھی میں پیدا ہوسکتا ھے، حفظ حقوق ومراتب کی فضا میں زندگی بسر کرنا، حق، خیر اور حسن کا احترام، یہی چیزیں ھیں جو فرد کے جذبات کی تربیت کرتی ھیں" [۱]

ھمارے ھندوستانی گھروں میں بچوں اور نوجوانوں کو دو مختلف خطرے در پیش ھیں - ایک خطرہ تو یہ ھے کہ بعض اوقات ان کی اس قدر بے جا ناز برداری اور رعایت کی جاتی ھے کہ وہ بڑے ہوکر معاشرتی زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہتے یا بہت سے تلخ تجربے اٹھانے کے بعد دوسروں کے حقوق اور فرائض کا احترام کرنا سیکھتے ھیں - دوسرا خطرہ یہ ھے کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ اس قدر بے جا سختی کا برتاؤ کیا جاتا ھے کہ ان میں آزادی سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی ان کی اپچ دب جاتی ھے ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ھے یا ان کے دل میں والدین اور عزیزوں کی طرف سے نفرت اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ھیں جو انہیں اندر ھی اندر "باغی" اور

Wheeler, Youth [۱]

" سرکش " بنادیتے هیں - اور لطف یہ هے کہ اکثر ایک هی بچے کے
ساتھ دونوں قسم کا برتاؤ کیا جاتا هے - کبھی تو والدین ان کے ساتھ
حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتے هیں، ان کی هر بات اور هر ضد کو مان
لیتے هیں اور کبھی کم از کم بچوں اور نوجوانوں کے خیال میں، منطق
کے تمام کلئے توڑ کر خواہ مخواہ ان پر ناراض هوتے هیں اور ان کی قدرتی
خواهشوں کو روکنا چاهتے هیں - یا والدین میں سے ایک بے جا
نازبرداری اور دوسرا غیر ضروری سختی کرتا هے جس کا نتیجہ یہ هوتا هے
کہ بچہ اپنے بڑوں کے ساتھ صحیح اور مستحکم تعلقات قائم نہیں
کرسکتا - اور اس وجہ سے ان کی صحبت کے عمدہ اثرات سے بھی
مستفید نہیں هوسکتا - کچھ عرصے کے بعد جب بچہ بڑا هوکر نوجوانی
کی منزل میں قدم رکھتا هے تو یہ قباحت پیدا هوتی هے کہ والدین اور
گھر کے دوسرے لوگ ان تبدیلیوں اور انقلابات کی پوری اهمیت کو نہیں
سمجھتے جو اس زمانے میں هوتے هیں - اس وقت بھی وہ اپنے
لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ وهی سلوک کرنا چاهتے هیں جو بچوں
کے ساتھ کیا جاتا هے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اب ان کو زیادہ
آزادی رائے اور آزادی عمل حاصل هونا چاهیئے اور بجائے تحکمانہ
برتاؤ کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا زمانہ آگیا هے - اس ناواقفیت
یا تحکم پسندی کی بدولت والدین اور اولاد کے تعلقات خراب هو
جاتے هیں اور روز مرہ کے جھگڑوں کی وجہ سے ان کی نشو و نما
کے لئے سازگار ماحول پیدا نہیں هو سکتا - چنانچہ گھر جو در اصل
ایک تعلیمی ادارہ هے اپنے فرائض کی ادائگی سے قاصر رهتا هے - اسی
وجہ سے بچوں اور نوجوانوں کی نفسی زندگی کے صحیح اور واضح
علم کی اشاعت والدین کی آگاهی کے لئے ضروری هے - ورنہ یہ اندیشہ

کہ ہماری موجودہ غلط فہمی اور جہالت ہماری طبیعت میں راسخ ہو جائیگی اور نو عمروں کی صحیح تربیت نہ گھر کے بس کی بات رہے گی نہ مدرسے کے بس کی - بچوں کی نشو و نما سے گھر کا جو تعلق ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ کی تعلیم اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوسکتی جب تک مدرسہ اور گھر دونوں مل کر اس میں حصہ نہ لیں اور باہمی اتحاد عمل کے ساتھ ان کی زندگی کو سدھارنے اور مفید بنانے کی کوشش نہ کریں - آج کل تو یہ حالت ہے کہ مدرسے کے معلموں کو گویا طلبہ کی خانگی زندگی سے اور گھر والوں کو ان کی تعلیمی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں - یہ صورت حال بہت افسوسناک اور مضر ہے - کسی شخص کی زندگی بھی مختلف شعبوں میں اس طرح تقسیم نہیں کی جا سکتی کہ انہیں ایک دوسرے سے تعلق نہ ہو چہ جائیکہ بچوں کی زندگی جن کی ذات سراسر وحدت کا مظہر ہوتی ہے۔ بچے روزانہ چوبیس گھنٹوں میں سے تقریباً اٹھارہ گھنٹے مدرسے سے باہر گھر میں اور اس کے آس پاس بسر کرتے ہیں - ان کے ذہن اور سیرت کی تشکیل صرف مدرسے کے وقت تک محدود نہیں بلکہ بیداری کے ہر لمحہ میں ہوتی رہتی ہے اور کم سے کم بچپن میں تو گھر کا اثر مدرسے کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے - اگر گھر کا مجموعی اثر مفید ہے اور مدرسے کے کام میں اعانت کرتا ہے تو بچے کی نشو و نما مناسب طریقے پر ہوگی لیکن اگر ان دونوں کے اثرات ہم آہنگ نہیں اور مدرسے کی تربیت گھر میں آکر زائل ہو جاتی ہے یا گھر کی عمدہ روایات اور عادتیں مدرسے میں پختہ نہیں ہوتیں تو طالب علم کے نفس میں ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے - جس کا نتیجہ

اس کی زندگی کے لئے اچھا نہیں ہوتا - اس کی ایک معمولی سی مثال زبان اور گفتگو کا مسئلہ ہے - اکثر طلبہ کے گھروں پر جو زبان بولی جاتی ہے وہ غلط یا گنواروں کی زبان ہوتی ہے - مدرسے میں بحیثیت مجموعی اس سے بہتر اور زیادہ صحیح زبان رائج ہوتی ہے - جب طالب علم مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو استاد کوشش کرتے ہیں کہ وہ صحیح زبان بولے لیکن گھر کی پڑی ہوئی عادات آسانی سے نہیں چھوٹتی بلکہ روز مرہ کے اثر سے اور پختہ ہوتی جاتی ہے - بالعموم یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جو طلبہ ابتدائی یا ثانوی مدارس کی تعلیم حاصل کرکے چھوڑ دیتے ہیں وہ پہلے تو ایک عجیب مخلوط زبان بولتے ہیں جس میں کچھہ ان کی "تعلیمی" زبان کا جز و ہوتا ہے اور کچھہ ان کے گرد و پیش کی روز مرہ کا - کچھہ عرصہ کے بعد وہ مدرسے کی زبان رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں اور تقریباً وھی زبان بولنے لگتے ہیں جو ان کے گرد و پیش رائج ہوتی ہے - اس مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اکثر تعلیمی مقاصد اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک گھر اور مدرسہ یعنی والدین اور استاد مل جل کر' بچوں کی تربیت کا انتظام نہ کریں - یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں کہ ان دونوں اداروں میں اشتراک عمل کے لئے کیا عملی طریقے استعمال کئے جائیں لیکن اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس مقصد کے لئے محض دو تین سالانہ جلسے کافی نہیں - جن میں والدین تماشہ دکھلانے کے لئے بلا لئے جاتے ہیں - اس کے لئے وہ مخصوص ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن سے والدین اور سر پرست یہ محسوس کریں کہ ان کے شہر یا گاؤں کا مدرسہ کوئی اجنبی یا سرکاری ادارہ نہیں جو

ان کی زندگی اور مشاغل سے بے تعلق ہے ۔ بلکہ ان کی تمدنی زندگی کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے جس کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا - اس مقصد کے حصول کے لئے دو باتوں کی خاص ضرورت ہے - ایک تو یہ بدیہی امر ہے کہ والدین اور معلموں میں باہمی میل جول ہونا چاہئے تا کہ وہ ایک دوسرے کی ضروریات اور مقاصد سے واقف ہو جائیں اور اپنے بچوں کی تربیت کے لئے بہترین اور مناسب ترین ذرائع اختیار کریں - دوسری بات جو ایک لحاظ سے زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ مدرسے کو بحیثیت ایک تعلیمی ادارے کے ایسے مشاغل اختیار کرنے چاہئیں جو گرد و پیش کے بالغ لوگوں کو براہ راست فائدہ پہنچائیں - موجودہ نظریہ تعلیم کا یہ اصول کہ مدرسہ کو اپنے شہر یا گاؤں کی تمدنی زندگی کا مرکز ہونا چاہیے اور لوگوں کو بہتر طرز زندگی سے روشناس کرنا چاہئے اسی خیال کی تفسیر ہے - مغربی ممالک میں جا بجا اور ہندوستان میں کہیں کہیں اس قسم کے جو تجربے کئے گئے ہیں خصوصاً گاؤں کی زندگی کی اصلاح اور لوگوں کی طرز معاشرت اور حفظان صحت کے انتظام میں مدرسوں نے جو حصہ لیا ہے وہ غور اور مطالعہ کے قابل ہے اور اس قسم کے کام اس سے بڑے پیمانہ پر کرنے کی ضرورت ہے - اگر ہندوستانی مدارس کی تنظیم جدید میں اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا تو اس سے نہ صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جن کی مدرسے خدمت کریں گے بلکہ خود مدرسے کی تعلیم زیادہ مفید، زیادہ دلچسپ اور زیادہ علمی ہو جائے گی کیوں کہ طلبہ محسوس کرینگے کہ ان کے تعلیمی مشاغل بے کار اور بے مقصد نہیں ہیں بلکہ ان سے ایسے کاموں کو کرنے میں مدد ملتی ہے جو

صریحاً مفید ہیں اور ان کی تعمیری قوتوں کو اُبھرنے کا موقع دیتے ہیں -

معاشرتی زندگی کا تعلیمی اثر

گھر بچے کا سب سے پہلا اور قریبی ماحول ہوتا ہے - اس سے زیادہ وسیع ماحول جو اس کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے ان گروہوں اور جماعتوں پر مشتمل ہے جن سے بچے کا قریبی تعلق ہوتا ہے - انہیں ہم مجموعی طور پر معاشرتی طبقے کہتے ہیں - ان میں سے ایک تو وہ خاص جماعت ہے جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے اور جسکا رکن وہ تقریباً اسی حیثیت سے ہوتا ہے جس حیثیت سے اپنے خاندان کا فرد ہوتا ہے - کسی گروہ کو اس معنی میں ایک جماعت بننے کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے - اس کے افراد کی مالی حیثیت ' رسم و رواج ' طرز معاشرت ' تہذیب و تمدن کی روایات کم و بیش ایک سی ہوں اور ان میں خود بخود اتحاد اور میل جول ہو - مثال کے طور پر اس معنی میں کسی شہر کے جلاہے یا قصاب ایک " جماعت " ہوتے ہیں نہ اس وجہہ سے کہ وہ ایک ہی پیشہ اختیار کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں ہر طرح یک جہتی اور یکسانی پائی جاتی ہے - وہ لفظاً اور معناً ایک ہی برادری کے ہوتے ہیں - اسی طرح کسی شہر کے تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ لوگ جن کی اقتصادی اور معاشرتی حیثیت ایک سی ہوتی ہے اور آپس میں میل جول ہوتا ہے ایک جماعت کے افراد ہیں - یا انگلستان میں کچھہ عرصہ پیشتر تک جو طلبہ وہاں کے بڑے بڑے تاریخی پبلک اسکولوں مثلاً ایٹن (Eton) اور رگبی (Rugby) وغیرہ میں تعلیم پانے کے لئے داخل ہوتے تھے وہ خوش حال امرا کے

طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی خاص روایات اور خاص نقطہ نظر ہوتا تھا جو اپنی خوبیوں اور خرابیوں دونوں کے لحاظ سے اور تمام جماعتوں سے علحدہ اور ممتاز ہوتا تھا - یہاں ہم نے ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ گزشتہ چند سال میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہاں جمہوری تحریکوں کی بدولت ان مدرسوں میں بھی وہ امتیازی شان نہیں رہی جو پہلے تھی - اس معاشرتی ماحول میں ہم پڑوس کے اثرات اور بعض صورتوں میں شہری اور دیہاتی زندگی کے مجموعی تمدنی اثرات کو بھی شامل کرسکتے ہیں - کیونکہ ان سب چیزوں کو مجموعی طور پر نہ صرف افراد کی سیاسی اور اقتصادی نشو ونما میں دخل ہے بلکہ وہ ان کی معاشرتی تعلیمی اور مذہبی حالت کو بھی متاثر کرتی ہیں -

جب بچہ زندگی کا سفر شروع کرتا ہے تو وہ نہ صرف گھر کی فضا میں پرورش پاتا ہے بلکہ اس کے گرد ایک دائرہ عمرانی زندگی کا ہوتا ہے جو اکثر غیر محسوس لیکن نہایت موثر طریقہ سے اس کی عادات ، خیالات اور سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے - اس کی چال ڈھال ، اس کا طرز گفتگو اور ذخیرہ الفاظ ، اس کے اخلاقی اصول اور نصب العین اپنے ماحول کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں - اوپر کی مثالوں کو لے کر ان پر غور کیجیے - اگر بچے کی ابتدائی زندگی جلاہوں کی کسی منظم اور محنتی جماعت میں بسر ہوگی تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اس میں اپنے اس ماحول کی وجہ سے عمرانی احساس بہت مستحکم ہوگا محنت کرنے کی عادت ہوگی ، ہاتھ سے کام کرنے میں عار نہ ہوگا ، لیکن اگر اس کے خاندان میں تعلیم کا چرچا نہیں تو وہ ان خوبیوں کے باوجود تنگ خیال اور تنگ نظر ہوگا - اس کی ہمدردی

اور مشاغل کا دائرہ محدود ہوگا - اس کو چند انی گنی چیزوں کے علاوہ دنیا کي کسی اچھی چیز سے دلچسپی نہ ہوگي - اس کے مقابلے میں کسی ایسے بچے کو لیجیے جو ایک تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ شخص کے گھر میں پیدا ہوتا ھے اور جسے ہوش سنبھالتے ھي زیادہ تر اسی جماعت یا طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ھے - اس کی بول چال اس کے خیالات ' اس کی طرز زندگي سب پہلے بچے سے مختلف ہونگے - اغلب یہ ھے کہ اس کو ہاتھ کا کام کرنے کی نہ عادت ہوگی نہ شوق - بلکہ اگر اس کي تربیت '' شرافت '' کے غلط تصور کے زیر اثر ہوگی تو وہ محنت اور دستکاري کو ذلیل سمجھے گا اور تعلیم ھی کے زمانے میں '' نوکری '' کو اپنا مطمح نظر بنائے گا - اس کو شاید یہ احساس بھی نہ ہو کہ وہ زندگی کتنی محدود اور تنگ ہوتی ھے جس میں انسان کو ہمیشہ دفتر میں بیٹھ کر مشین کی طرح کام کرنا پڑتا ھے - فطرت کے مناظر اور مظاہر سے اسے نہ واقفیت ہوگی اور نہ دلچسپی - وہ اپنے خیال میں معاشرے کو دوطبقوں میں تقسیم کرے گا - ایک وہ لوگ جن کے رہنے سہنے کا طریقہ اس سے ملتا جلتا ھے ' جنھوں نے تھوڑي بہت تعلیم پائی ھے ' جدید تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے ہیں - دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہوگا جو اس کے نزدیک '' ذلیل '' اور کم درجہ کے کام کرتے ہیں' اس سے کم ترحیثیت رکھتے ہیں اور معاشرتی زندگی کے آداب و رسوم میں بھی اس سے مختلف ہیں - اس کے ساتھ یہ امکان بھی ھے کہ یہ لڑکا گفتگو ' آداب مجلس ' عام علمی اور کتابی واقفیت اور ذہنی بیداری میں اپنے ہم عمر جلاھے کے لڑکے سے بہتر ہو کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بچے بغیر کسی خاص تعلیمی اہتمام کے خود بخود اپنے ماحول سے سیکھہ لیتے ہیں - یہ دونوں مثالیں اس خاص مطلب کو واضح کرنے کے لئے دي

گئی ہیں کہ اگر تعلیم و تربیت کے اثرات اور طبعی اختلافات کا دخل نہ بھی ہو تو بھی قرین قیاس یہ ہے کہ محض عمرانی ماحول کے فرق کی وجہ سے دو اوسط درجے کے بچوں میں اس قسم کا فرق پایا جائیگا - یہ اور بات ہے کہ خاص اثرات کے ماتحت ان دونوں کی شخصی نشو ونما اس کے برعکس ہو - بہر حال اس امر سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ مقامی حالات اور روایات بڑی حد تک بچوں کے لباس ' گفتگو ' خیالات ' مذاق اور اخلاقی اصول کو بناتے یا بگاڑتے ہیں -

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرتا لیکن عملاً اس کی تعلیمی اہمیت اور نتائج کو لوگوں نے نہیں سمجھا - تعلیم کا کام بھی یہی ہے کہ وہ بعض معینہ اصولوں کے مطابق اور کسی اعلی نصب العین کے ماتحت بچوں اور نوجوانوں کی زندگی کی تشکیل کرے یعنی ان کے موجودہ عادات وخیالات اور ان کی طبیعت اور مذاق کی اصلاح کرکے ان کو بہتر اور شائستہ تر بنائے - اس لئے ایک لحاظ سے تعلیم اور عمرانی اثرات کا دائرہ بڑی حد تک ایک ہی ہے اور معلموں اور تعلیم گاہوں کو ہرگز ان اثرات کی طرف سے بے پروائی نہیں برتنا چاہئے جو طلبا کے گرد وپیش کی جماعتی زندگی سے پیدا ہو کر ان کی شخصیت میں جذب ہوتے رہتے ہیں -

ہمارے ملک میں بعض خاص معاشرتی اسباب سے یہ اثر دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ راسخ اور مستحکم ہے - یہاں ذات پات کی بندشیں اور قیود ایسی ہیں جو نہ صرف افراد کی معاشرتی حیثیت کو بلکہ ایک حد تک ان کے خیالات ؛ ان کے باہمی میل جول کی حدود ' ان کے پیشوں کو بھی پہلے سے متعین کردیتی ہیں اور لوگ خواہ وہ سن رسیدہ ہوں یا نو عمر ؛ آسانی سے ان بندشوں اور ضابطوں کو نہیں توڑ سکتے

جو "ذات" ایک مطلق العنان اور جابر حاکم کی طرح ان پر عائد کرتی ھے - اس میں شک نہیں کہ گزشتہ زمانے میں بہت سی اصلاحی اور سیاسی تحریکوں کی وجہ سے ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ہوگئی ھیں اور ایسے اثرات کام کر رھے ھیں جو غالباً کچھ مدت میں ان کو بالکل توڑ دینگے لیکن ابھی تک ان کا اثر اتنا وسیع اور راسخ ھے کہ نظریہ تعلیم اس کو نظر انداز نہیں کرسکتا -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ھے کہ تعلیم کا تعلق ان جماعتی اثرات سے کیا ھے - اس مسئلہ کے بعض پہلو تو بالکل صاف اور واضح ھیں - مدرسہ اکیلا بچے طلبہ کی تربیت کا فرض ادا نہیں کرسکتا اس کے ساتھ دوسرے تمدنی اداروں کی شرکت بھی ضروری ھے کیونکہ اس کا اثر ان کے روز مرہ کے اوقات کے ایک تھوڑے سے حصے تک محدود ہوتا ھے اور باقی اوقات میں ان کی تربیت وہ تمام عمرانی تعلقات اور روایات کرتی ھیں جن کا مرکز مدرسے سے باھر ھے لہذا کوئی تعلیمی اصلاح اس وقت تک پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ساتھ وسیع تر تمدنی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے تاکہ تمام تمدنی اداروں کا مجموعی اثر ہم آھنگ اور طلبہ کی تربیت کے لئے مفید ہو - ظاھر ھے کہ اگر عمرانی اثرات مدرسے کے کام میں معین ہوں تو تربیت کا فرض بہت سہل ہوجاتا ھے - اور یہ بات بھی غور کے قابل ھے کہ ان اثرات کی وجہ سے مدرسے کے طلبہ میں انفرادی اختلافات بہت نمایاں ہو جاتے ھیں - اول تو فطری اختلافات کا دائرہ بجائے خود بہت وسیع ہوتا ھے پھر جب اس کے ساتھ گھر اور عمرانی ماحول کا فرق بھی شامل ہو جائے تو افراد میں باھم اور زیادہ تفاوت ہو جاتا ھے - کیا بہ لحاظ جسمانی اور معاشرتی تربیت کے ، کیا بہ لحاظ اخلاقی اور دماغی

نشو و نما کے ہر طالب علم اور تمام طلبہ سے مختلف ہوتا ہے
یہاں تک کہ ان طلبا میں بھی جو کم سے کم ذہنی اعتبار سے
بظاہر ایک ہی معیار کے معلوم ہوتے ہیں پوری طرح غور اور امتحان
کرنے پر بہت بڑا فرق نکلتا ہے - ان سب کی تربیت کرنا مدرسے
کا فرض ہے - کسی قدر پیچیدہ اور دشوار ہے یہ فرض اگر اس کو
پوری طرح سمجھا جائے! ہم دیکھ چکے ہیں کہ مدرسہ ایک تمدنی
ادارہ ہے جسے معاشرہ اپنے مشترک اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے
قائم کرتا ہے - برخلاف اس کے خاندان کا نقطہ نظر تمام تر انفرادی ہوتا ہے
یعنی جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے نزدیک ہر بچہ ایک
مخصوص سیرت کا مالک ہے جس کی نشو و نما گھر کی تربیت کا
سب سے زیادہ اہم فرض ہے - مطالبات کی اس کشمکش میں مدرسے کا
نازک فرض یہ ہے کہ نہ صرف طلبا کی انفرادی بہبود کا خیال
رکھے بلکہ ان کو اجتماعی ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری کے
لئے بھی تیار کرے - اس فرض کی دقت اور نزاکت کا پورا احساس
انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو یہ جانتے ہیں کہ اگرچہ حالت
کمال میں فرد اور جماعت کی اغراض بالکل متحد اور ہم آہنگ
ہونی چاہئیں لیکن عملاً ہماری اس ناقص دنیا میں ہر ہر قدم
پر انفرادی آزادی اور معاشرے کے اٹل مطالبات میں جنگ ہوتی
رہتی ہے - بہر حال اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ
بچوں اور نوجوانوں میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کی اہلیت
پیدا کی جائے اور ان تعصبات اور اختلافات کو دور کیا جائے جو
افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط و ضبط اور اشتراک عمل میں
سدراہ ہیں اور لوگوں کے دلوں میں قومی روح اور وحدت مقاصد

کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتے - یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے یوں نظری طور پر تو ہر شخص تسلیم کرلیتا ہے لیکن اگر لوگ خلوص اور ہمت کے ساتھ اس پر عمل کریں تو نہ صرف تعلیم بلکہ تمام نظام معاشرت میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جائے کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تعلیم کے اداروں اور انتظامات کا مجموعی اور متحدہ رجحان یہ ہو کہ ذات پات کی تمام بیجا بندشوں ' جماعتی خود غرضیوں ' اقتصادی مظالم اور نا انصافیوں کی بیخ کنی کی جائے - اگر تعلیم کے میدان میں یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو کسی ''اونچی'' ذات کا لڑکا کسی ''نیچی'' ذات کے لڑکے کے ساتھ تعلیم پانے سے کیوں کر انکار کر سکتا ہے ؟ مختلف طبقوں کے لئے مختلف قسم کے تعلیمی ادارے کب جائز رکھے جا سکتے ہیں ؟ محض دولت مند ہونا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی شرط کیسے قرار پا سکتا ہے ؟ ہر طبقے اور ہر گروہ میں اشتراک عمل کے بجائے مقابلہ اور رقابت کے جذبات پیدا کرنا کس طرح گوارا کیا جا سکتا ہے ؟ جمہوریت کا اصل مفہوم یہی ہے کہ ہر اس چیز کو جو معاشرے کے افراد کو اجتماعی بندشوں میں جکڑ کر ان کی آزادانہ نقل و حرکت اور میل جول کو روکتی ہے ' جو نام و نسب کی اضافی صفات کے مقابلے میں ذاتی صلاحیت کو خاطر میں نہیں لاتی ' جو بعض لوگوں کو صرف محنت کی کڑیاں سہنے کے لئے اور بعض کو محض فرصت کا لطف اٹھانے کے لئے مخصوص کرتی ہے ' مٹا دیا جائے ' تا کہ ہر فرد بغیر کسی روک ٹوک کے ایک آزاد اور سازگار ماحول میں اپنی قوتوں کو پوری طرح نشو و نما دے سکے اور ان کو اجتماعی اور قومی اور اس سے بڑھ کر نوعی خدمت کے لئے استعمال

کرنا سیکھے - لہذا جمہوری تعلیم کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو ان ناجائز سہولتوں اور غیر معمولی رعایتوں کو دور کیا جائے جو بعض افراد یا جماعتوں کو بغیر ذاتی استحقاق کے حاصل ہوگئی ہیں اور تمام افراد قوم کے لئے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کی معرکۃ الارا کتاب " تعلیم اور جمہوریت " (Democracy and Education) جو اس صدی کی بہترین تعلیمی تصنیف ہے اس مبحث پر ہر پہلو سے روشنی ڈالتی ہے اور اس کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعہ ان تمام اجتماعی بندشوں اور سختیوں کو دور کیا جائے جنھوں نے افراد کی قوتوں اور صلاحیتوں کو جکڑ رکھا ہے اور عام لوگوں کے اندر جو جوہر ہے اسے ابھرنے کا موقع نہیں دیتیں - اس طرح تعلیم تمدنی اصلاح کے لئے ایک زبردست آلۂ کار بن جاتی ہے جو نئی نسل کے افراد میں ایک نئی ذہنیت پیدا کرکے معاشرتی ناانصافیوں کو دور کرنے کی فکر کرتی ہے -

لیکن اسی کے ساتھ تعلیم کا یہ بھی کام ہے کہ وہ جماعتوں کی مختلف خصوصیت اور تمدنی روایات کا لحاظ رکھے اور افراد کی تربیت اسی طرح کیے کہ نہ صرف ان کی ذہنی قوتوں کی نشو و نما ہو بلکہ وہ ان کو اپنے عمرانی ماحول میں بغیر کشمکش اور تصادم کے خوبی اور عمدگی کے ساتھ استعمال کرسکیں - ہر شخص کی زندگی صرف مجموعی معاشرے کے زیر اثر نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کا ماحول زیادہ تر ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور گروہوں پر مشتمل ہے جو اس کی گھر کی زندگی کو کئی ہم مرکز دائروں کی طرح گھیرے ہوئے ہیں - ہم کیسے کسی شخص کو صحیح

طور پر تعلیم یافتہ کہہ سکتے ھیں جب تک اس یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اپنے گھر والوں ' اپنے ہمسایوں اور پڑوسیوں ' اپنی " برادری " کے اشخاص کے ساتھہ مناسب سلوک کرسکے ؟ مناسب سلوک سے ہماری مراد یہ ھے کہ وہ ان جماعتوں کے اصول معاشرت ' روایات ' اور مخصوص معاملات کو سمجھے اور ان سے ہمدردی کرے ' بالعموم اس کے افعال ان کے ساتھہ ہم آہنگ ہوں اور وہ ان فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھہ ادا کرے جو ان جماعتوں کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے ذمے عائد ہوتے ہیں - مثال کے طور پر ہندوستان کے کسی گاؤں کے باشندے کو لے لیجئے جس نے مقامی یا ضلع کے مدرسے میں تعلیم پائی ہے - اگر یہ تعلیم اس کو اپنے مخصوص دیہاتی ماحول میں زندگی گذارنے کے قابل نہ بنا سکے ' اگر اس کو مناظر فطرت سے دلچسپی باقی نہ رہے ' کام اور محنت کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے ' گاؤں کی زندگی کے بنیادی اصول یعنی باہمی امداد اور اشتراک عمل اس کے دل کو نہ لگیں تو وہ تعلیم اس کے لئے نہ صرف بے کار ہے بلکہ نہایت مضر ہے - اس کو اپنی زندگی اسی ماحول میں گذارنی ہے اور سوائے خاص صورتوں کے اسی ماحول میں میں گذارنی چاہئے - لہذا اگر وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود اپنے گاؤں میں اجنبی بن کر زندگی بسر کرے گا اور ان معاملات میں دلچسپی نہ لے گا تو ایک طرف وہ خود خوشی اور مسرت سے محروم رہیگا اور دوسری طرف اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی کوئی خدمت نہ کرسکے گا -

ہندوستان کے موجودہ تعلیمی حالات اور رجحانات کو دیکھہ کر اس بات پر زور دینے کی ضرورت خاص طور پر محسوس ہوتی

ھے - اس سے ھمارا مقصد تنگ نظری اور محدود مذاق کی حمایت کرنا نہیں اور نہ ھم یہ چاھتے ھیں کہ گاؤں کے رھنے والوں کو صرف گاؤں سے دلچسپی ھو اور شہروں کے رھنے والے اپنے سامنے کی چیزوں کے سوا کسی چیز کو نہ دیکھیں اور نہ اس پر غور کریں - موجودہ زمانے کی ایجادات اور سائنس کی ترقی نے دنیا کو اس طرح ملا دیا ھے اور تمام انسانوں کو تعلقات اور باھمی احتیاج کی زنجیروں میں اس شدت سے جکڑ دیا ھے کہ ھمارے لئے ھرگز مناسب نہیں کہ ھم اپنی فوری ضروریات کے علاوہ اور تمام مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں - لیکن ھمیں یاد رکھنا چاھئے کہ دنیا کا باشندہ بننے سے پہلے ھمارا یہ فرض ھے کہ ھم اپنے گاؤں کے دیہاتی یا اپنے شہر کے مفید اور ذمہ دار شہری بنیں - حقیقت میں کوئی شخص جس کو اپنی مقامی حالات سے واقفیت اور دل چسپی نہ ھو وسیع ترقومی اور بین الاقوامی معاملات میں معقول اور مفید طریقے پر شرکت نہیں کرسکتا - وہ " لیڈری " کرسکتا ھے مگر خدمت اس کے بس کی بات نہیں - اکثر لوگ جنھوں نے خاموشی اور استقلال کے ساتھ اپنے ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت انجام دی اور صفحہ تاریخ پر اپنا نقش ثبت کرگئے وھی تھے جنھوں نے ابتدا میں کسی محدود حلقہ عمل میں خلوص اور محنت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام کرکے بڑے کارناموں کے انجام دینے کی قابلیت بہم پہنچائی - اس کے علاوہ ھم میں سے زیادہ تر لوگوں کے لئے یہ امکان ھی نہیں کہ براہ راست قومی یا بین الاقوامی معاملات پر کوئی زبردست اثر ڈال سکیں - وہ حلقہ عمل ان لوگوں کے لئے ھے جنھوں نے اپنی قابلیت ، اپنی مسلسل محنت اور ایک حد تک اچھے موقعوں سے فائدہ اٹھا کر مسلمہ حیثیت پیدا کرلی ھے جس کی بدولت ، وہ ان معاملات میں حصہ لے سکتے ھیں -

اقی لوگوں کا فرض اور نہایت اہم فرض یہي ھے کہ وہ اپنے محدود حلقہ
ل میں اپنے متعلقین اور گرد و پیش کے لوگوں کی خدمت کریں - اس
خدمت کی انجام دھی کے لئے ضروری ھے کہ وہ اپنے مقامی ماحول کا مطالعہ
کریں اور اس کو سمجھیں ؛ عمرانی زندگی کے نظام پر غور کریں اور اپنی
پنی قابلیت کے مطابق جہاں تک موقع ملے ان میں اصلاح اور بہتری
ي کوشش کریں - معاشرے کے جمہوری نظام کی کامیابی کے لئے
یقیناً قابل لیڈروں کی ضرورت ھے لیکن اتنی ھی ضرورت تربیت یافتہ
اور فرض شناس پیرووں کی ھے جو ان لیڈروں کے ماتحت اپنا اپنا کام
ذمہ داری اور دانش مندی کے ساتھ انجام دیں - اول تو لیڈر بجائے خود
کچھہ نہیں کرسکتے جب تک ان کے ساتھ ایک جماعت نہ ہو جو اُن کے
بتائے ہوئے راستے پر چل سکے - دوسرے جمہوری نظام میں لیڈر بننے کے
لئے کسي خاص طبقے میں پیدا ہونا یا دولتمند ہونا شرط نہیں بلکہ
انہیں تمام لوگوں میں سے غیر معمولي قابلیت کے لوگ اپنی اپچ اور
کار کردگی کی بدولت آگے بڑھ کر قیادت کے فرائض انجام دیتے ھیں -
لہذا قومی اصلاح اور سیاسی اور معاشرتی تعمیر اسي وقت ممکن ھے جب
تمام افراد قوم کو ایسی تعلیم دي جائے کہ وہ چھوتے چھوتے مفید کاموں اور
فرائض میں انہماک اور دلچسپی کا اظہار کریں اور ان کو نیک نیتی
اور خلوص کے ساتھ انجام دیں کیونکہ یہی وہ قطرے ھیں جو مل کر
سمندر بن جاتے ھیں اور جن کے بغیر ساری کوششیں جو بڑی بڑی قومی
انجمنوں اور اداروں میں کی جاتی ھیں بیکار ثابت ہوتی ھیں -
ہندوستان میں جو مفید تحریکیں آئے دن ناکام ہوتی رہتی ھیں ان کی
اصل وجہ یہی ھے کہ لوگ بڑے بڑے منصوبوں اور دعووں کے ساتھ ان کو
شروع کرتے ھیں لیکن جب وقتی جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ھے تو کوئی ایسی

خاموش کارکن جماعتیں نہیں ملتیں جو باوجود مشکلات اور ہمت شکن حالات کے استقلال کے ساتھ انہیں اپنے اپنے حلقۂ عمل میں چلاتی رہیں - ہماری موجودہ تعلیم کا ایک اندیشہ ناک رجحان یہ ہے کہ وہ افراد کو ایک حد تک ان کے قریبی ماحول اور اس کے اہم اور غور طلب مسائل سے بیگانہ کردیتی ہے اور دور از کار باتوں میں الجھادیتی ہے یا محض ذاتی فوائد کے پھیر میں ڈال دیتی ہے - ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ نصاب، طریقۂ تعلیم اور تعلیم کی اندرونی روح کو اس طرح بدلیں کہ طلبہ میں مقامی '' حب وطن '' پیدا ہو اور وہ مقامی معاملات میں توجہہ اور ہمدردی کے ساتھ حصہ لے سکیں - اب اگے انہیں جہاں تک توفیق اور ان میں جتنی قابلیت ہو - انسان کا ذہن زنجیروں سے بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ آزادی سے نامحدود فضا میں اڑتا ہے - اگر اس میں مطالعے اور تخیل کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو انسان ادب اور فلسفہ اور سیاست کے بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے مسائل میں دلچسپی اور حصہ لے سکتا ہے -

هم چو پر کاریم در راہ شریعت مستقیم

پائے دیگر سیر هفتادو دو ملت می کنیم

اس میں '' راہ شریعت '' سے ہماری مراد سامنے کے فرائض اور معاملات ہیں اور ''هفتادو دوملت'' وہ بیشمار مسائل جن کی بدولت ہمارا تعلق بحیثیت انسان کے تمام دنیا کے انسانوں سے ہے - مستقبل کی تعلیم کے لئے یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے کہ مخصوص مقامی حب وطن اور تعلقات اور ہمارے وسیع تر مفاد اور دل چسپیوں میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے تاکہ تعلیم یافتہ لوگ ایک دو طرفہ خطرہ سے محفوظ رہیں - بعض تو ایسے ہیں جو بالکل اپنے سامنے کی چیزوں

کو نہیں دیکھتے بلکہ عام معاملات میں محض ایک سطحی اور نظری دلچسپی کا اظہار کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ نظام عالم میں ایک مفید خدمت انجام دے رہے ہیں - اور بعض ایسے ہیں جن کی توجہ ذاتی اور وقتی مسائل میں اس درجہ منہمک ہوتی ہے کہ ان کو دنیا کی وسعت اور گونا گوں دلچسپیوں اور مسائل کا علم ہی نہیں ہوتا - اس قسم کی تعلیم کا تشکیل دینا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں - انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں تعلیم، طلبہ میں مقامی حب وطن کا احساس پیدا کرتی ہے اور لوگ اپنے اپنے ضلعوں اور شہروں کے مخصوص ادارات اور روایات سے محبت رکھتے ہیں اور ان کے تحفظ اور استحکام کی کوشش کرتے ہیں - انگلستان کے ہر ضلعے کی کرکٹ ٹیم وہاں کے باشندوں کی مشترک چیز ہوتی ہے جس پر وہ ناز کرتے ہیں - اسی طرح ہر ضلع اپنے اپنے مدارس، اپنے حفظان صحت کے نظام وغیرہ میں دوسرے ضلعوں پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتا ہے - ہندوستان میں ابھی تک یہ احساس کسی مفید شکل میں پیدا نہیں ہوا - مختلف صوبوں کے باشندوں میں باہمی رقابت ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو حقیر سمجھنا اس جذبے کا بدل نہیں ہوسکتا - لیکن ہماری حالت کو دیکھتے ہوئے اس جذبے کی تربیت اور رہنمائی نہایت ہی ضروری ہے کیونکہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور جب اس میں عنقریب وفاقی نظام قائم ہوجائے گا تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہمیت حاصل کریگا کہ لوگوں میں کس طرح ملکی حب وطن کے ساتھ ساتھ مقامی حب وطن کا احساس گہرا اور مستحکم کیا جائے -

یہاں ہم ان تمام اصولوں کے عملی نتائج سے بحث نہیں کرسکتے - لیکن یہ ظاہر ہے کہ تعلیم اور معاشرتی جماعتوں کے باہمی تعلق کا صحیح

احساس تعلیم کے تمام پہلوؤں پر بہت نمایاں اثر ڈالے گا اور اس کی وجہ سے نہ صرف تعلیم کے عام مفہوم میں تبدیلی لازم آئیگی بلکہ مدرسوں کے نصاب اور تعلیمي طریقوں اور ضبط و تربیت کے نظام سب میں اس بات کا لحاظ رکھنا پڑیگا کہ یہ چیزیں طلبہ کو معاشرتی زندگی کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرتي ھیں یا نہیں - نصاب کی تدوین اور مدرسے کے تمام مشاغل کی تربیت اور انتخاب کرتے وقت ھمیں یہ سوچنا ہوگا کہ جس خاص ماحول میں مدرسہ واقع ھے جہاں اس کے طلبہ اپنی زندگی بسر کرتے ھیں وہاں معاشرے کي بہبود اور کامیابی کے لئے کن چیزوں پر زور دینے کی اور کیا کیا سکھانے کي ضرورت ھے - معاشرے کے مشاغل کیا ھیں ان کا تعلق صنعت و حرفت سے ھے یا تجارت سے یا زراعت سے - لوگوں کا طرز معاشرت کس قسم کا ھے - ان کے عام رجحانات ' کار و بار کے اصول ' تفریح اور فرصت کے مشغلے کیا ھیں - ان مشاغل اور معاشرت کے طریقوں کا پرتو مدرسے کے نصاب پر بھي پڑے گا - اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم براہ راست پیشوں کی تعلیم دینگے یا فرقہ‌دارانہ تعصبات اور تنگ نظري کو مستقل بنانے کي کوشش کرینگے اور تعلیم کے وسیع تر مقاصد یعنی دماغ اور روح کي بیداری اور انساني قوتوں کی ہم آہنگ تربیت کو نظر انداز کر دیں گے - لیکن یہ ضرور ھے کہ مدرسے کی اونچی جماعتوں کي تعلیم میں پیشوں کی مناسبت کا خیال رکھا جائے گا اور ان مضامین میں بھی جو تمام مدارس میں مشترک ہونگے ایسے حصوں پر زور دیا جائیگا جن کا تعلق بالخصوص ماحول کي زندگي سے ہو - مثلاً یہ ضروری نہیں کہ سائنس یا جغرافیہ یا حساب پڑھانے میں دیہات اور شہر کے مدارس

میں یا زراعتی اور صنعتی اضلاع میں ان مضامین کا بالکل ایک ہی نصاب مقرر کیا جائے - بلکہ یہ بہت بہتر ہوگا کہ عام اصولوں کی تشریح کے لئے عملی مثالیں ایسی منتخب کی جائیں جو مدرسے کے مخصوص ماحول سے لی گئی ہوں - اس طرح سائنس کی تعلیم میں ہم دیہاتی مدارس میں علم نباتات و حیوانات ' مطالعہ فطرت وغیرہ پر زیادہ زور دینگے اور صنعتی علاقوں کے مدارس کی توجہ ریاضی اور طبیعیات اور کیمیا کی طرف زیادہ ہوگی اگرچہ تعلیمی مصلحت سے ان میں سے کسی شاخ کو بھی بالکل نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا - ڈاکٹر وھیلر (Wheeler) نے اپنی کتاب Youth (" شباب ") میں نوجوانوں کے نصاب تعلیم سے بحث کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ثانوی منزل میں نصاب کے دو حصے ہوجانے چاہئیں - ایک وہ حصہ جو تمام طلبہ کے لئے مشترک اور ہر اسکول میں ایک سا ہو اور جس کا پورا کرنا ذہین اور کند ذہن ' سائنس پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے ' شہری اور دیہاتی غرض سب طلبہ کے لئے لازمی ہو - اس حصے میں وہ مندرجہ ذیل مضامین کو شامل کرتی ہیں :—

جسمانی تربیت -

کوئی صناعی یا دست کاری -

مطالعہ فطرت -

مادری زبان یا زبانیں -

ادب -

تاریخ وجغرافیہ -

معاشرتی اور مذہبی تربیت -

دوسرے حصے میں ان کے نزدیک ایسے مضامین ہونے چاہئیں

جن کو نوجوان طلبہ اپنی مخصوص قابلیت اور ضروریات کے مطابق منتخب کرسکیں - اس حصے میں باقی تمام مضامین جز بالعزم نصاب کا جزو ہوتے ہیں شامل ہیں وہ اس ضمن میں لکھتی ہیں :—

"زیادہ ذہین طلبہ کے لئے اس چھوٹے سے چھوٹے نصاب میں بعض ایسے مضامین اور مشاغل بھی شامل کرنے چاہئیں جن کی تعداد اور نوعیت کا انحصار افراد کی ذاتی صلاحیت اور شوق اور مختلف مدرسوں کے ماحول کی ضروریات پر ہو - گزشتہ باب میں جن نفسیاتی تعلقات سے بحث کی گئی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ذہانت رکھنے والے طلبہ دو قسم کے ہوسکتے ہیں ایک وہ جن کا رجحان علمی ہے یعنی ادب یا سائنس کی طرف ہے - دوسرے وہ جن کی دلچسپیاں زیادہ تر عملی ہیں - ان دونوں سے ہمیں یہ توقع رکھنی چاہئیے کہ وہ اوسط یا کم تر ذہانت کے طلبہ کی نسبت مندرجہ بالا نصاب سے زیادہ کام کرینگے - لیکن پہلی قسم میں جو طلبہ شامل ہیں اُن کے نصاب میں حساب، فرانسیسی، جرمن، لاطینی، طبیعیات کیمیا جیسے مضامین پڑھائے جائینگے - اور دوسری قسم کے طلبہ کے لئے عملی مضامین کا اضافہ کیا جائیگا مثلاً مختلف دستکاریاں اور صنعتیں اور عملی سائنس کی وہ شاخیں جن کا ان سے تعلق ہے" [1]

ظاہر ہے کہ مقامی حالات اور جماعتی ضروریات کا اثر نصاب کے دونوں حصوں پر پڑیگا لیکن پہلے حصے کی نسبت دوسرے حصے پر اس

---

[1] صفحہ ۹۷ -

کا اثر زیادہ نمایاں ہوگا - " اگر مدرسہ دیہاتی ماحول میں ھے تو ان علوم و فنون پر زور دیا جائے گا جن کا زراعت سے قریبی تعلق ھے - اگر مدرسہ کسی کان‌کنی کے مرکز میں واقع ھے تو علوم طبیعی پر زیادہ زور دیا جائیگا " - لیکن ہر صورت میں یہ احتیاط شرط ھے کہ نصاب اور مشاغل کی وہ ترتیب و تدوین خراب نہ ہونے پائے جو طلبہ کی عام ذہنی بیداری اور جذبات کی نشو و نما کے لئے قائم کی گئی ھے -

دوسرا اہم مسئلہ جو ہم کو اس ضمن میں پیش آئیگا وہ یہ ھے کہ مدرسے کو عمرانی زندگی کا مرکز کس طرح بنایا جائے - ہم نے گھر اور مدرسے، والدین اور معلموں کے باھمی تعلق کو واضح کرتے ہوئے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا ھے - ھمارے ملک میں بدقسمتی سے یہ خیال بہت عام ھے کہ مدرسہ بھی بہت سے سرکاری دفاتر اور اداروں کی طرح ایک سرکاری ادارہ ھے جس کا قومی زندگی اور قومی ضروریات سے کوئی قریبی تعلق نہیں ھے - اس کے بہت سی تاریخی وجوہ ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - ان وجوہ کی بنا پر اس خیال کا پیدا ہونا ایک حد تک قرین عقل ھے - مگر اس کا اثر تعلیم کی ترقی پر بہت برا پڑا ھے اور قومی زندگی، اور تعلیم گاھوں کا وہ تعلق جو تعلیم میں روح پھونکتا ھے اور اسے اثر آفرینی کی قوت بخشتا ھے مفقود ہوگیا ھے - اس لئے ہمیں ایک طرف تو تعلیم کو بحیثیت مجموعی قومی ضروریات کا کفیل اور قومی مقاصد اور معیاروں کا ضامن بنانا ھے اور دوسری طرف یہ کوشش کرنی ھے کہ ہر مدرسہ اپنے خاص ماحول اور اس کے باشندوں کی زندگی کے لئے تہذیب کا ایک مرکز ہو تاکہ معاشرہ یہ محسوس کرے کہ یہ درسگاہ نہ صرف بچوں کو بعض ضروری علوم و فنون کی تعلیم دیتی ھے بلکہ کل جماعت کے لئے براہ راست مفید ھے اور اس کو بہتر مقاصد اور

دل چسپیوں سے روشناس کرتی ہے - بعض ملکوں میں اکثر مدرسوں کی عمارت اور تمام تعلیمی وسائل اور آلات شام کے وقت گردو نواح کے لوگوں کے لئے بطور کلب اور تفریح گاہ بلکہ ایک حد تک بطور بالغوں کی تعلیم گاہ کے استعمال کئے جاتے ہیں اور اس طرح مدرسہ تبادل خیالات ' باہمی میل جول اور تفریحی مشاغل کا مرکز بن جاتا ہے - مدرسے اور ماحول کی زندگی میں یہ زندہ رابطہ پیدا کرنا تعلیم کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کو حقیقی معنوں میں '' قومی تعلیم '' بنانے کا جزو لازم ہے -

باب چہارم

تعلیم اور مسئلہ معاش

اب ہم تعلیم اور مسئلہ معاش کے تعلق کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس تعلق کی نوعیت اور نتائج سے کسی قدر تفصیل کے ساتھہ بحث کرینگے کیونکہ صنعت و حرفت کے موجودہ دور میں اقتصادی مسائل کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور برابر بڑھتی جاتی ہے اور پیشے کی اہمیت محض اقتصادی نہیں بلکہ تمدنی اور اخلاقی بھی ہے - اس لئے نظریہ تعلیم کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے - علاوہ بریں اس مسئلے کے متعلق عام طور پر لوگوں میں اس قدر غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور تعلیمی مسائل میں ان کی وجہہ سے ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں کہ یہ بحث خیالات کو سلجھانے کے لئے ضروری ہے - اس ضمن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے معاشی نظام کو ان تمدنی اداروں میں کیوں شامل کیا ہے جو بچوں اور نوجوانوں کی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کا اثر ان کی طبیعت اور سیرت پر کس طرح پڑتا ہے -

بالغوں کے پیشوں کا کوئی اثر بچوں کی زندگی پر گو براہ راست نہیں پڑتا اور ان کے تعلیمی نصاب میں پیشوں کی تربیت کو داخل کرنے کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے قابل تسلیم نہیں تاہم کسی خاص جماعت یا ملک کے پیشوں کے نظام کا جو اثر اس کے افراد پر پڑتا ہے وہ بالواسطہ بچوں کی طبیعت عادات اور مشاغل کو بھی متاثر کرتا ہے - بچہ اپنے تمدنی ماحول سے مختلف قسم کے اثرات قبول کرتا ہے - ان میں ایک بڑا اور

مستقل حصہ اس اثر کا ہوتا ہے جو کسی جماعت کے پیشوں اور وسائل معاش کی تنظیم کا لوگوں کی زندگی پر پڑتا ہے - لوگوں کی ذہنی اور عملی دلچسپیاں، ان کا نظریۂ حیات ، ان کی سیرت کا عام رنگ بہت کچھ اس کام کی بدولت معین ہوتا ہے جو وہ اپنی روزی کمانے کے لئے آٹھ دس گھنٹے روزانہ کرتے ہیں - ہر شخص کو جو کسی پیشے میں داخل ہوتا ہے ایسے شرکائے کار سے سابقہ پڑتا ہے جن کی گفتگو ، خیالات ، عادتیں اور تفریحی مشاغل ایک خاص قسم کے ہوتے ہیں - وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا خواہ ابتدا میں اس کی طبیعت بالکل ہی مختلف کیوں نہ ہو - رفتہ رفتہ ان مشاغل اور خیالات کا رد عمل اس کی خانگی زندگی اور فرصت کے مشاغل پر بھی ہوتا ہے جو براہ‌راست اس کی اولاد کی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں - اس مثال کو اگر زیادہ واضح کر دیا جائے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ پیشوں کی تنظیم کس طرح قومی سیرت اور ذہنیت کو بناتی اور بگاڑتی ہے اور "کاروباری اخلاق" اور "کاروباری ذہنیت" کس طرح رفتہ رفتہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھا جاتی ہے - انگریزوں کو بعض نقادوں نے "دوکانداروں کی قوم" کا خطاب دیا ہے - اس نام سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کا سب سے بڑا اور اہم وسیلۂ معاش تجارت اور اس کے متعلقہ کاروبار ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کی قومی سیرت اور سیاسی ارتقا کو سمجھنے کے لئے اس خصوصیت کو پیش نظر رکھنا لازم ہے - اسی طرح سوئستان "یورپ کا مہمان خانہ" کہا جاتا ہے - جو شخص سوئس لوگوں کی قومی خصوصیات سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ان کے اخلاقی اور ذہنی رجحانات پر مہمانداری کے پیشے کا کس قدر گہرا اثر پڑا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں دونوں کو سمجھنے

میں اس سے کس قدر مدد ملتی ہے - علی ہذالقیاس ہندوستان صدیوں سے زراعت کا گھر رہا ہے اس وجہ سے کوئی شخص ہماری قومی تاریخ اور قومی سیرت کی بھلائیوں اور برائیوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اس مسئلہ پر غور نہ کرے کہ اس ملک میں اسی فی صدی لوگ کاشتکاری کرتے ہیں یا اسی کے متعلق اور کام انجام دیتے ہیں اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ اسی قناعت آموز اور صبر طلب شغل میں بسر ہوتا ہے - پھر کیا تعجب ہے کہ بچے جو اپنے بڑوں کی سیرت اور ماحول کا اثر بڑی جلدی قبول کرتے ہیں ایک غیر محسوس طریقہ پر ان معیاروں کو تسلیم کر لیتے ہیں جو ان کے ماحول میں مانے جاتے ہیں اور اس پیشے کے گرویدہ ہو جاتے ہیں جو ان کے گرد و پیش رائج ہے - خواہ وہ زراعت ہو یا تجارت یا صنعت و حرفت - پروفیسر اسپرانگر (Spranger) اپنی قابل قدر تصنیف "نفسیات عنفوان شباب" [۱] میں لکھتے ہیں :—

> "ہر پیشہ انسان کے لئے نوشتہ تقدیر بنجاتا ہے - چند سال کے عرصہ میں وہ انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کی سیرت کی تشکیل کرتا ہے - کیونکہ یہی ذہن خارجی کا وہ پہلو ہے جس سے فرد کو بہت قریبی تعلق ہوتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اس کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے - صرف پیشہ ہی ہمارا نہیں ہوتا بلکہ ہم بھی پیشے کے ہو جاتے ہیں - پیشے کے اثر سے انسان کے تصور کائنات کے بیشتر حصے

[۱] یہ کتاب جرمن زبان میں (Psychologie des Jugendalters) کے نام سے شائع ہوئی ہے - اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا ہے جو اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے -

کی تشکیل ہوتی ہے - یہی وہ گوشہ ہے جہاں سے انسان دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے......جہاں نوجوان کی ذات پوری قوت سے مکمل خارجی تمدن سے ٹکراتی ہے" [۱] -

ایک دوسرا سبب جس سے پیشوں کی تعلیمی اہمیت اور بڑھ گئی ہے وہ ان کی جدید اندرونی تنظیم ہے - یورپ اور دوسرے مغربی ممالک میں گذشتہ دو سو برس میں جو صنعتی انقلاب ہوا ہے اِس نے لوگوں کے کاروبار اور مشاغل کی نوعیت کو بالکل تبدیل کردیا ہے - پہلے تقریباً ہر قسم کا کام ہاتھہ سے یا بہت سادہ آلات اور اوزاروں سے کیا جاتا تھا جو ہاتھہ ہی سے چلائے جاتے تھے - ماہرین فن اپنے اپنے شاگردوں کو مختلف کاموں کی تعلیم دیتے تھے - لیکن اب تقریباً ہر قسم کا کام مشینوں کے ذریعے ہونے لگا ہے - بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں جن میں سیلکڑوں مزدور مشین کے پرزوں کی طرح کوئی ایک مقررہ حرکت یا کام کرتے رہتے ہیں - ان ممالک کے علاوہ ہندوستان میں بھی دستکاروں اور صناعوں کی سرپرستی کم ہوتی جاتی ہے - کیونکہ جو کام وہ بہت وقت اور محنت صرف کر کے کرتے تھے وہ اب آسانی اور کفایت سے مشین کے ذریعے ہو سکتا ہے - لیکن اس تبدیلی سے جہاں ایک طرف وقت اور روپئے کی کفایت ہوئی وہاں دوسری طرف یہ نقصان ہوا کہ عام لوگوں کے مشاغل میں سے صناعی اور دستکاری کا وہ عنصر مفقود ہوگیا جو ان کی شخصیت اور سیرت کی تربیت میں مدد دیتا تھا - ایک صنّاع جو کوئی چیز مثلاً جوتیوں کا ایک جوڑا یا کپڑے کا ایک تھان محنت اور شوق سے بناتا ہے اس ذریعہ سے نہ صرف اپنی روزی پیدا کرتا ہے بلکہ اس میں اپنے ذوق طبع کا

---

[۱] صفحہ ۲۷۱ -

اظہار بھی کرتا ھے - ایک حدتک اس چیز میں جو وہ تیار کرتا ھے اپنی شخصیت کا رنگ بھرتا ھے اور اس طرح اسے اپنے کام میں اظہار خودی کی مسرت حاصل ہوتی ھے - برخلاف اس کے جو شخص تمام عمر کسی کارخانے میں محض مشین کے پرزے کی طرح کام کرتا ھے اور اس کا کام بھی محض چند مقررہ حرکات تک محدود ہوتا ھے اسے ہرگز اس میں لطف نہیں آسکتا نہ اس کے ذریعے اس کی قوتوں کی نشو و نما ہو سکتی ھے - اس کا دماغ اس تمام عرصہ میں معطل رہتا ھے وہ نہ اس کام کی ابتدا سے واقف ہوتا ھے نہ انتہا سے' نہ اس کی پوری تنظیم کو سمجھتا ھے نہ یہ جانتا ھے کہ اس کی تمدنی اھمیت کیا ھے - اس صورت حال نے تعلیم کو نئی مشکلات اور نئے مسائل سے دو چار کر دیا ھے - چونکہ صنعت و حرفت وغیرہ کے معمولی مشاغل میں شخصی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع تقریباً مفقود ہو گئے ھیں اس لئے اکثر عمدہ عادتیں اور صنعتیں جو مدرسے کی تعلیم کے ذریعے پیدا ہوتی ھیں بہت سے پیشوں کے ناساز گار ماحول میں ضائع ہو جاتی ھیں - تعلیم کا تقاضا یہ ھے کہ طلبہ میں جدت ، تجسس اور اپج کا مادہ ابھارے لیکن بچارے کارخانوں کے مزدوروں کو اپنے روز مرہ کے مشاغل میں ان چیزوں سے کیا مطلب ؟ ان کا وقت تو ایسے کاموں میں صرف ہوتا ھے جس سے نہ دماغ کی تربیت ہو سکتی ھے نہ روح کی - انسان کی نفسی ترکیب میں بے شمار عناصر شامل ھیں جن میں سے بعض جسمانی نشو و نما چاہتے ھیں ، بعض ذہنی جد و جہد کی طرف راغب ھیں ، بعض مشاہدہ حقیقت اور نظارہ جمال کے جویا ھیں- لیکن اس قسم کے مشین نما کام میں ان میں سے کسی خواہش کی تشفی بھی نہیں ہو سکتی اور انسان کی شخصیت پست اور محدود

ہوکر رہ جاتی ہے - اسپرانگر (Spranger) لکھتے ہیں :—

"اب اگر ہم موجودہ زمانے میں پیشے کی زندگی کی خارجی ترکیب پر غور کریں تو ہمیں یہ دیکھکر افسوس اور رنج ہوگا کہ ہر پیشے میں ، خصوصاً اقتصادی پیداوار کے کاموں میں اس عین پسندی (idealism) کی کس قدر کم گنجائش ہے - یہ شکایت کہ صنعتی کاروبار تخصیص پسندی اور مشین پرستی کے سبب سے روحانیت سے خالی ہوگئے ہیں ایک نغمہ دلدوز ہے جو ہمارے آہنگ تمدن میں نشیداجل کی طرح سنائی دیتا ہے .... مختصر یہ ہے کہ صنعتی پیداوار کے اکثر شعبوں میں انسان اور اس کے کام میں کوئی زندہ اور معنوی کلّی رابطہ باقی نہیں رہا ہے محض اس لئے کہ ایک انسان سے کوئی پورا کام نہیں لیا جاتا" [۱] -

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے اول تو صنعت و حرفت کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ جو کام بالکل میکانکی ہیں یعنی جن میں صرف ایک مقررہ حرکت درکار ہے ان کو مشینوں ہی کے ذریعہ انجام دیا جائے تاکہ لوگوں کی زندگی اور وقت ان کے لئے وقف نہ ہو جائے - یہ ایک وسیع تمدنی اور عملی مسئلہ ہے جس کا تعلیم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں - البتہ تعلیم کا یہ فرض ضرور ہے کہ طلبہ کی علمی اور دماغی تربیت اس طرح کرے کہ وہ آئندہ زندگی میں اپنے محدود کاموں کی غیر محدود اہمیت کو سمجھ سکیں - خواہ ان کے ذمہ محض اتنا ہی کام ہو

[۱] صفحہ ۲۲۸

کہ مشین کے ذریعہ سوئی کے ناکے میں سوراخ کریں پھر بھی ان کو کارخانے کے پورے نظام سے واقفیت اور تمدنی زندگی میں اس کی اہمیت کا علم ہونا چاہیے تاکہ وہ کولھو کے بیل کی طرح کام نہ کریں بلکہ یہ سمجھ سکیں کہ وہ اپنے محدود دائرۂ عمل میں ایک ضروری خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس قسم کی خدمتوں کی انجام دہی پر معاشرے کے پیچیدہ نظام معاش اور کاروبار کا دارومدار ہے - جو مزدور اور کاریگر اس حقیقت کو سمجھکر اپنا فرض انجام دیتا ہے ، جو خاکروب صفائی کے کام کی وقعت اور تمدنی اہمیت کا علم رکھتا ہے ، اس کے لئے اس کا کام اسی معنی میں متبرک ہو جاتا ہے جس معنی میں کارلائل (Carlyle) نے کہا تھا کہ "ہر قسم کا سچا کام متبرک ہے......جس شخص کو یہ برکت نصیب ہے اسے کوئی اور برکت طلب کرنے کی حاجت نہیں"- لہذا تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عام لوگوں کی کاروباری زندگی کے تنگ اور محدود کرنے والے اثرات کو دور کرنے کے لئے طلبہ کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کی وسیع تر اہمیت سے آگاہ کر کے انہیں ان کی نظر میں معنی خیز بنائے اور ان میں یہ بات پیدا کردے کہ پیشے کی زندگی میں بھی اعلیٰ مقاصد اور عین پسندی کو ہاتھ سے نہ دیں ، محض مشین بن کر نہ رہ جائیں بلکہ اپنی فطرت کی پوری بلندی اور وسعت کو حاصل کر سکیں - اس لحاظ سے ہماری موجودہ تعلیم ، جو محض رسمی علوم و فنون تک محدود ہے اور تمدن کے زندہ مسائل سے ان کا ربط ظاہر نہیں کرتی ، بالکل نا قابل اطمینان ہے - وہ نہ صرف طلبہ کو معاشی نظام سے نا واقف رکھتی ہے بلکہ ان میں عملی کاموں کی صلاحیت کو بھی مردہ کر دیتی

ھے - محنت اور ھاتھ کا کام کرنے کے خلاف ان میں ایک تعصب پیدا ھو جاتا ھے جو آگے چل کر ان کو بہت تکلیف پہنچاتا ھے اور معاش کی بہت سی راھیں ان پر بند کر دیتا ھے -

مندرجہ بالا بحث کا تعلق زیادہ تر نوجوانوں کی تعلیم سے ھے - جیسا ھم اوپر بتا چکے ھیں بچوں کی تعلیم کو اس مسئلہ سے براہ راست زیادہ تعلق نہیں - بچپن میں طلبہ کی دلچسپی اور شوق کو تتلی کی طرح ایک جگہ قرار نہیں ھوتا - ان کی توجہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ھوتی رھتی ھے - بچہ اپنی بڑھتی ھوئی شخصیت کے لئے نئے تجربے اس طرح حاصل کرتا ھے کہ کبھی وہ ایک شخص کا پارٹ کرتا ھے کبھی دوسرے کا - کبھی انجن ڈرائیور بنتا ھے تو کبھی ڈاکٹر' کبھی بچوں کو پڑھاتا ھے تو کبھی گھوڑا بن کر ایک خیالی گاڑی کھینچنے لگتا ھے گویا بقول ورڈزورتھ (Wordsworth) کے " اس کا کام یہی ھے کہ ھمیشہ نیا بھروپ بھرتا رھے" - اس کی کام کرنے کی خواھش جو آگے چل کر کوئی پیشہ اختیار کرنے کے ارادے میں تبدیل ھو جاتی ھے' مختلف کھیلوں اور نقلوں کی شکل میں ظاھر ھوتی ھے - بچوں کے کھیلوں اور ان کے پیشوں کے شوق میں جو تعلق ھے اس کے بارے میں پروفیسر اسپرانگر (Spranger) جن کی رائے ھم نے اوپر بیان کی ھے لکھتے ھیں :—

" بچے جو پیشے کے خواب دیکھتے ھیں ان پر کھیل کا اور نقل کا رنگ غالب ھوتا ھے لیکن ان کھیلوں میں نہ صرف گھرے معنی ھوتے ھیں بلکہ ایک مخفی قوت تشکیل بھی جو بڑی گھری اھمیت رکھتی

ہے - اس میں شک نہیں کہ پیشوں کے جو کھیل
بچے کھیلتے ھیں اُن میں سے بعض عہد طفلی سے
مخصوص ھیں اور ان سے آئندہ ارادے کا پتہ نہیں
چلتا - بعض پیشے ہر بچے کو متوجہ کرتے ھیں
کیونکہ وہ عہد طفلی کی جبلی زندگی سے مناسبت
رکھتے ھیں یا ان میں آئندہ زندگی کے اہم پہلو
نمایاں ھوتے ھیں - مثلاً سپاھی یا کوچبان یا
سوداگر بننا ' عمارت یا دوسری چیزیں بنانا ' شکار
یا صیادی ' گھوڑے کی سواری ' شمشیر زنی اور
نشانہ بازی آئندہ زندگی کی عام ضروریات میں سے
ھیں - اس لئے اگر بچے کو ان کا شوق ھو تو ھم یہ
نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ وہ آئندہ چل کر ان میں
سے کسی چیز کو اپنا پیشہ بنائے گا " [1]

لیکن بچہ منزل طفولیت اور شباب کی پہلی منزل سے گزر کر شباب کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ھے تو وہ ان نقلی مشاغل پر قانع نہیں رھتا - اب معاش کا مسئلہ درپیش ھوتا ھے یعنی اسے کوئی پیشہ اختیار کرنے کی خواھش اور ضرورت ھوتی ھے - اس کی بڑھتی ھوئی قوتیں عملی زندگی کے ساتھ نبردآزمائی کرنا چاھتی ھیں - وہ یہ جاننا چاھتا ھے کہ اس کے گردوپیش دنیا میں کیا کیا کام ھوتے ھیں اور وہ ان میں سے کس کام کے لئے زیادہ موزوں ھے - اس کے شوق جو چند سال پیشتر نچلے نہیں بیٹھتے تھے اب کسی ایک مرکز کے گرد جمع ھونے شروع ھوتے ھیں - وہ محسوس

[1] صفحہ ۲۵۲

کرنے لگتا ہے کہ اس کی طبیعت کو زیادہ لگاؤ ادبی مشاغل سے ہے، یا سائنس سے، یا عملی کاروبار سے۔ اس کا ذاتی مطالعہ، اس کی دلچسپیاں اس کے فرصت کے مشاغل یہ سب اسی چیز کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں جس کی طرف اسے خاص رجحان ہے۔ بالفاظ دیگر آئندہ پیشہ کی جھلک ابھی سے اس کی درسی زندگی پر اپنا اثر ڈالنا شروع کرتی ہے اور وہ بالعموم انہیں مضامین اور مشاغل کا انتخاب کرتا ہے اور انہیں پر زیادہ توجہ اور شوق صرف کرتا ہے جو اس کے نزدیک اس کی آئندہ زندگی میں مفید ثابت ہونگے اور اسے اس کی منزل مقصود کی طرف لے جاتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ واقعاً ہمارے ملک میں تمام نوجوانوں کی عملی اور ذہنی دلچسپیوں کا ارتقا اسی طریقہ پر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ان میں سے اکثر کو یہ موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنی مخصوص صلاحیتوں اور رجحانوں کے مطابق اپنے لئے کوئی شغل زندگی اختیار کریں۔ مدرسے سب کو ایک ہی قسم کی کتابی تعلیم دے کر ایک اندھیری گلی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اس میں جو راستہ بھی مل جائے وہ اسی کو اختیار کرلیتے ہیں خواہ وہ ان کے فطری میلانات کے لحاظ سے مناسب ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اگر بچوں کی ابتدائی تعلیم صحیح اصول پر ہو اور عہدشباب میں نوجوانوں کے شوقوں اور جبلتوں کی پرورش مناسب طریقہ پر کی جائے تو وہ ثانوی یا اعلیٰ مدارس میں پہنچ کر یقیناً بعض خاص مشاغل کی طرف زیادہ مائل ہونگے اور اپنی علمی اور عملی دلچسپیوں سے ظاہر کردینگے کہ ان کا فطری میلان کس طرف ہے۔ یہ تو مشکل ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں کہ

طالب علم صحیح اور قطعی طور پر بتا سکے کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرے گا - اس کے لئے تجربے کی پختگی اور خودشناسی درکار ہے جو ابھی اسے میسر نہیں آسکتی - واقعہ یہ ہے کہ مناسب پیشے کا انتخاب نہایت مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے جس کے لئے ماہرین علم النفس اور والدین دونوں کی مدد درکار ہے - اس غرض کے لئے بعض ترقی یافتہ ممالک میں جابجا ایسے ادارے قائم کئے گئے ہیں جو پیشوں کے انتخاب میں نوجوانوں کی رہنمائی کرتے ہیں؛ اور وہاں اس سلسلے میں بہت سے مفید مشاہدات اور تجربات ہوئے ہیں - اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوغ کے زمانے میں نوجوانوں کو اپنے مستقبل کے مشغلے اور پیشے کی بڑی فکر ہوتی ہے اور اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ نوجوان اپنی تمام دماغی جدوجہد اور توجہ تعلیم کی طرف مبذول کریں تو ان کی تعلیم میں پیشے کے رجحان کو زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے - محض نظری رسمی تعلیم جو ان کے نزدیک نہ ان کی موجودہ زندگی اور ضروریات کے لئے موزوں ہے نہ انہیں مستقبل کے لئے تیار کرتی ہے ہرگز یہ کشش نہیں رکھتی کہ وہ دل و جان سے اس میں محو ہو جائیں - اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ طلبہ کو قبل از وقت عام تعلیم سے ہٹا کر پیشوں کی تعلیم دلائی جائے کیونکہ یہ طریقۂ عمل نہ صرف ان کے شخصی ارتقا کے لئے مضر ہوگا بلکہ اُن کی اقتصادی کارکردگی کو بھی یقیناً کم کردے گا - جو شخص اپنے بچپن اور نوجوانی میں عمدہ ادبی اور علمی تعلیم سے محروم رہتا ہے اس کی دماغی قوتیں پوری طرح نشوونما نہیں پاتیں - خواہ وہ کوئی شغل اختیار کرے اُسے اس میں پوری کامیابی اور کمال حاصل نہیں ہو

سکتا - بعض لوگ ، خصوصاً وہ جن کا تعلق براہ‌راست کاروبار سے اور
اقتصادی پیداوار کے کاموں سے ہے ، عام ادبی تعلیم کو بچوں اور نوجوانوں
کے لئے غیر مفید سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وقت اور روپیہ
کی کفایت کر کے جلد سے جلد بچوں کو کوئی "کام کی چیز" سکھادی
جائے تا کہ وہ زیادہ وقت پیشے میں مہارت حاصل کرنے اور روزی کمانے
میں صرف کر سکیں - اس خیال کی محرک جس حد تک وہ بے
اطمینانی ہے جو سمجھدار لوگوں کو ہمارے ملک کی کتابی اور نظری
تعلیم سے ہے ہمیں اس سے ہمدردی ہے اور ہر شخص جو علمی
دل‌چسپیوں کے علاوہ دنیا کے حالات اور ضروریات سے بھی واقفیت رکھتا
ہے اس خیال کی تائید کرے گا کہ ہماری موجودہ تعلیم طلبہ کو
اس زندگی کے لئے بخوبی تیار نہیں کرتی جو ان کو پیش آنے والی
ہے - لیکن اس خیال کا وہ پہلو جو عام عقلی تعلیم و تربیت کو
مضر اور فضول سمجھتا ہے اور اس کو بند کر کے وقت اور روپئے میں
کفایت چاہتا ہے سراسر ناواقفیت اور تنگ نظری پر مبنی ہے - یہ
کفایت اگر کی جائے تو آگے چل کر قوم کو بہت گراں پڑجائے گی -
اس طرح یہ تو ممکن ہے کہ ہم ملک میں ایک بڑی تعداد معمولی
کاری‌گروں اور پیشہ‌وروں کی مہیا کرسکیں جو لکیر کے فقیر بن کر
ایک مقررہ راستے پر چلتے رہیں اور اپنے محدود دائرۂ عمل میں
کافی مہارت پیدا کرلیں - لیکن قوم میں موجد اور مخترع، محقق
اور نئے راستے نکالنے والے لوگ پیدا نہیں ہو سکتے جن کے بغیر کوئی
ملک صنعت و حرفت کے سرگرم مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا -
جب تک تمام لوگوں کو یہ موقع نہ ملے تا کہ وہ بہترین علوم و فنون
اور خیالات کے مطالعے سے اپنی ذہنی قوتوں کو بیدار کریں اس وقت

تک غیر معمولی قابلیت اور ذھانت کے لوگ بھی اپنے جوھر کا اظہار نہیں کر سکینگے - اس کے بغیر نہ تو معاشرتی زندگی کے رھبر پیدا ھو سکتے ھیں نہ صنعت و حرفت کے ھر اول - یہ ضروری نہیں کہ وہ سب لوگ جو عام تعلیم اور اعلیٰ تعلیم سے بہرہور ھوں قوت ایجاد کا اظہار کریں - لیکن کون کہ سکتا ھے کہ اگر ھم ایک ہزار طلبہ کو تعلیم دے کر نو سو ننانوے معمولی ذھانت کے محنتی اور ایمان‌دار کام کرنے والے اور ایک غیر معمولی ذھانت کا موجد پیدا کر سکیں تو یہ دراصل بہت بڑی کفایت نہ ھو گی ؟ کیونکہ ممکن ھے کہ وہ ایک ھی شخص اپنی خدا داد قابلیت کی بنا پر علم اور صنعت و حرفت میں ایسی کایاپلٹ کردے کہ باقی تمام کام کرنے والوں کی کارگزاری کئی گنی بڑہ جائے - جس شخص نے بھاپ کی قوت کو انسان کا مطیع بنایا اور اس کو مشینیں چلانے میں استعمال کیا اس نے نوع انسانی کی کارکردگی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ! لہذا عام تعلیم کا عمدہ انتظام کرنا نہ صرف ان اعلیٰ انسانی مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ھے جن کا ھم مختصراً گزشتہ باب میں ذکر کرچکے ھیں بلکہ کاروبار اور حصول معاش کے نقطہ نظر سے بھی مفید ھے - لیکن شرط یہی ھے کہ ''عام تعلیم'' اس قدر ''عام'' نہ ھو جائے کہ اس کو دابہ کی نفسی کیفیات اور دنیا کی عملی ضروریات سے کوئی تعلق ھی نہ رھے اور وہ محض نظری اور کتابی مطالعے میں محصور ھو کر رہ جائے - یہاں بھی صحیح راستہ اعتدال کا ' مختلف مطالبات کے درمیان توازن پیدا کرنے کا راستہ ھے - یعنی نہ تو ھمیں قبل ازوقت پیشے کی مخصوص تعلیم شروع کرنی چاھئے اور نہ عام تعلیم کے زمانے میں بچوں اور نوجوانوں کو دنیا کے عملی اور مادی مشاغل سے اس قدر

بے تعلق اور بے نیاز کردینا چاھئے کہ وہ ثانوی تعلیم ختم کرنے کے بعد کسی قسم کے کاروبار کے قابل ھی نہ رھیں اور اُنھیں محض یہ خواهش ھو کہ کسی دفتر میں محرری یا ملازمت اختیار کرلیں -

پیشے کی بحث میں ایک نہایت اهم سوال جس کی حیثیت ایک قدیم تاریخی مسئلہ کی ھو گئی ھے یہ ھے کہ عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا صحیح مفہوم کیا ھے اور آیا یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور مختلف ھیں یا ان میں ربط اور تعلق کا امکان ھے - قدیم نقطۂ نظر تو یہی ھے کہ ان دونوں کے مقاصد بالکل جداگانہ ھیں اور ھم دونوں کو کسی طرح جمع نہیں کرسکتے - لیکن ھمیں یہ یاد رکھنا چاھئے کہ بہر حال دونوں قسم کی تعلیم ایک ھی شخص کو دی جاتی ھے گو ان کا زمانہ مختلف ھو اور دونوں ایک ھی نظامِ تعلیم کے جزو ھیں - اس لئے ھم اپنے نقطۂ خیال کے بموجب کسی ایسے نظرئیے سے مطمئن نہیں ھو سکتے جو ھمارے نظام تعلیم کے مختلف عناصر کو ایک سلسلے میں منسلک نہ کرے اور ان سب کو ان کے مشترکہ موضوع یعنی انسان کی شخصیت کی نشو و نما کا ذریعہ نہ بنائے - لہذا ھم ان الفاظ پر غور کر کے پہلے ان کے صحیح مفہوم کا تعین کرینگے اور اس کے بعد بتائینگے کہ ان دونوں میں اتحاد مقاصد کس صورت میں ممکن ھے -

مدرسوں میں جو تعلیم بالعموم رائج ھے وہ عام تعلیم کہلاتی ھے - یہ طلبہ کو براہ راست کسی پیشے کے لئے تیار نہیں کرتی - اس لئے کہا جاتا ھے کہ اس کا مقصد ھے طلبہ کی سیرت کی تربیت ، اُن کی ذهنی قوتوں کو بیدار کرنا ، اُن میں تہذیب نفس پیدا کرنا - چونکہ یہ تعلیم روزی کمانے میں مدد نہیں دیتی اس لئے اس کو غیر افادی

تعلیم بھی کہا جاتا ہے لیکن آپ کے حامی اس اصطلاح کو کسی برے معنی میں استعمال نہیں کرتے بلکہ فخر اور تعریف کے طور پر کہتے ھیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان شرفا کے لئے ھے جنھیں بوجہ اپنی خوش حالی کے کسب معاش کی ضرورت نہیں ' محض ذھن کی تربیت اور اخلاق کی جلا درکار ھے -

بر خلاف اس کے صنعتی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ھے وہ براہ راست طلبہ کو کسی خاص شغل یا پیشے کے لئے تیار کرتی ھے - وہ محدود مادی معنوں میں " افادی " ھے اور عام طور پر ان لوگوں کے لئے ضروری سمجھی جاتی ھے جو اعلیٰ تعلیم پانے کی مقدرت نہیں رکھتے اور جن کے لئے ضروری ھے کہ وہ جلد سے جلد روزی کمانے لگیں - لوگ بالعموم " غیر افادی " تعلیم کو " افادی " تعلیم پر ترجیح دیتے ھیں اور " افادی " تعلیم کو مقابلتاً کم تر اور حقیر سمجھتے ھیں - لیکن واقعہ یہ ھے کہ یہ سب خیالات غلط فہمی پر مبنی ھیں جس کے بہت سے تاریخی اسباب ھیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - یہ اسباب ایک طرف اس دوئی سے تعلق رکھتے ھیں جو فلسفہ اور انسانی عقائد کی تاریخ میں مدت سے چلی آتی ھے جس کی وجہ سے ھم بالعموم دنیا کے تمام امور اور مسائل کو بجائے ایک کل کی صورت میں دیکھنے کے دو متضاد حصوں میں منقسم سمجھتے ھیں - چنانچہ لوگ ھمیشہ انسانی زندگی کے لازمی اجزا یعنی علم و عمل ' عالم معقول اور عالم محسوس ' فرصت کے مشاغل یعنی فنون لطیفہ اور کام کے مشاغل یعنی دستکاری میں ایک حد فاصل کھینچتے آئے ھیں - ان کا خیال یہ رھا ھے کہ وہ تعلیم جو لوگوں کو نظری علوم سکھائے ان کو غور و فکر کی زندگی کے لئے تیار کرے ' ان میں

فنون لطیفہ کا مذاق پیدا کرے بجائے خود مکمل ہے اور اس تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے جو عملی مشاغل اور مادی علوم سکھاتی ہے اور لوگوں کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کے لئے تیار کرتی ہے - وہ انسان کی زندگی اور ضروریات پر ایک مجموعی اور ہمہ گیر نظر نہیں ڈال سکتے بلکہ اس کو بالکل دو جدا گانہ شعبوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کی علیحدہ قدر و قیمت مقرر کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جب تک ان دونوں میں اشتراک عمل نہ ہو متمدن اور مہذب معاشروں کا قیام ہی ممکن نہیں - اس خیال کی دوسری وجہ جیسا کہ موجودہ زمانے کے بہت سے مفکرین اور تعلیم کے میدان میں بالخصوص پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی تصانیف میں ثابت کیا ہے بعض اقتصادی اور معاشرتی حالات ہیں جنہوں نے صدیوں سے انسانی سوسائٹی کو دو جماعتوں میں تقسیم کردیا ہے - وہ جماعت جس کو ہر قسم کی اقتصادی سہولتیں حاصل رہی ہیں اور معاش کی جد و جہد سے فرصت نصیب ہے اپنی فرصت کے اوقات میں کتابی اور نظری علوم کی تحصیل کرتی رہی - اس نے اپنی پسند کے علوم اور مشاغل کو ان تمام علوم پر فوقیت دی جو صنعت و حرفت کے کار و بار سے یا مادی اشیا کے بنانے اور فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں - چونکہ ان لوگوں کو خود ہاتھ سے کام نہیں کرنا پڑتا تھا اس لئے انہوں نے ان تمام مشاغل کو حقیر جانا جن میں ہاتھ کا کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں تک کہ فنون لطیفہ اور صنّاعیوں کو بھی نظری علوم مثلاً فلسفہ، منطق، اور ریاضی وغیرہ سے کم درجے کا قرار دیا - انہیں لوگوں نے اپنے محبوب خیالات اور تصورات کو مروجہ فلسفہ کا جزو بنا دیا اور اسی

کا نتیجہ ہے کہ آج تک تعلیم میں وہ فرق نمایاں ہے جو نظری علوم اور عملی مشاغل میں کیا گیا تھا -

جہاں تک ہمارے موجودہ نظام تعلیم کا تعلق ہے عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا - ہمارے یہاں کی " عام تعلیم " جس کو پیشے کی تعلیم سے علحدہ اور بر تر سمجھا جاتا ہے در اصل بہت تنگ اور محدود معنی میں پیشے کی تعلیم ہے - کیونکہ ہمارے مدارس طلبہ کو ایک خاص قسم کی کتابی تعلیم دیتے ہیں جو اُن کو سوائے چند مخصوص پیشوں مثلاً دفتروں کی نوکری یا قانون یا تعلیمی ملازمت کے اور کسی لائق نہیں بناتی - اس سے ذہنی قوتوں کی عام تربیت اور بیداری کا مقصد حاصل نہیں ہوتا گو اس کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ طلبہ کی سیرت کی تشکیل کرتی ہے - لیکن جن لوگوں کو اصول تعلیم اور طلبہ کی نفسی ارتقا کے اصولوں سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی طریقے اس درجہ ناقص اور امتحانوں کے تابع ہیں کہ طلبہ کے ذہنی رحجانات اور قوتوں کی نشو و نما کی طرف توجہ کرہی نہیں سکتے - واقعہ یہ ہے کہ پیشہ آموزی کے نقطۂ نظر سے اس تعلیم میں اور نجاری یا زراعت یا انجینئری کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں - دونوں کے مقاصد، خواہ ان کا دعویٰ کچھ بھی ہو ' تنگ اور محدود ہیں - فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ بعض نوکریوں کے لئے طلبہ کو تیار کرتی ہے اور یہ بعض دست کاریوں اور عملی فنون کے لئے - لہذا اس روایتی اختلاف کو نظر انداز کرکے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کے اپنی اپنی جگہ پر کیا فوائد ہیں اور دونوں کے ذریعہ ذہنی تربیت اور بیداری کے اسباب مہیا ہوسکتے ہیں یا نہیں - موجودہ تعلیمی نظرئے کا دعویٰ یہ ہے کہ پیشے کی تعلیم کو حقیر سمجھنا

غلطی ہے کیونکہ اس میں ایسے امکانات موجود ہیں کہ اگر ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کو دانشمندی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ ذہنی تربیت اور تہذیب نفس میں بھی معین ہوسکتے ہیں - نفسیاتی تحقیقات نے اس امر کو ثابت کردیا کہ ذہنی عمل اور دست کاری میں بذاتہ کوئی تضاد نہیں اور یہ خیال غلط ہے کہ اگر کسی فن یا ہنر کے سیکھنے میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے تو وہ ذہنی تربیت کا ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا - اس غلط خیال کا اثر نہ صرف فنی تعلیم کے مسائل میں نظر آتا ہے بلکہ ابتدائی ثانوی اور اعلی مدارس کے نصاب کی بحثوں میں بھی نمایاں ہے - اکثر ملکوں کے تعلیمی نظام پر صدیوں یہ غلط فہمی حاوی رہی ہے کہ لڑکوں کی تعلیم میں نجاری ' پارچہ بافی اور مختلف قسم کی دست کاریوں اور فنون کو داخل کرنے سے یا لڑکیوں کی تعلیم میں امور خانہ‌داری ' کھانا پکانا ' گھر کی درستی اور صفائی کپڑوں کی سلائی وغیرہ کو اہمیت دینے سے ہم اس کو ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے ناقص بنادینگے اور طلبہ کو ان چیزوں کا سکھانا معلم کے بلند اور اعلی فرائض سے فرو تر ہے - یہ قدیم تعصب آج تک پوری طرح دور نہیں ہوا اور ہندوستان میں خاص طور پر پھیلا ہوا ہے - اس بارے میں پروفیسر ڈیوئی کی رائے غور طلب ہے -

" اگر کسی نئے ہنر کے سیکھنے سے طالب علم بہت سے نئے خیالات سے روشناس اور متاثر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے خود انسانی زندگی کے مقصد اور منشا پر روشنی پڑتی ہے تو اس کو یقیناً علمی لحاظ سے بہت قابل وقعت سمجھنا چاہئے - حقیقت میں ہر فن اور ہنر کی علمی قدر کا معیار

یہی ہے کہ آیا وہ فن طالب علم کی دلچسپیوں کا
حلقہ وسیع کرتا ہے اور نئے حل طلب مسائل اور
بحث مباحثے کے مواقع پیدا کرتا ہے یا نہیں
" [1]

ممکن ہے کہ غلط اصولوں کو اختیار کرنے کی وجہ سے صنعت اور دستکاری کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ اس سے نہ طلبہ کی دلچسپیوں میں وسعت پیدا ہو ، نہ ان میں ذہنی کاوش اور جدوجہد کا ملکہ بیدار ہو ، نہ زندگی کے منشا پر کوئی روشنی پڑے بلکہ انسان محض نقل اور مشق کے ذریعے مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص کام کرنا سیکھ لے - لیکن یہ بات کچھ صنعتی تعلیم ہی پر موقوف نہیں - نظری اور کتابی تعلیم کی بھی یہ صورت ہو سکتی ہے - ممکن ہے (بلکہ بالعموم ہوتا یہی ہے) کہ استاد طلبہ کو مختلف علوم اس طرح پڑھائے کہ سوائے حافظے کے ان کی اور کوئی دماغی قوت کام میں نہ آئے اور وہ باوجود اعلیٰ امتحانات پاس کرلینے کے دماغی نشو و نما کے ابتدائی مدارج سے آگے نہ بڑھ سکیں - لہذا اصلی فرق طریقۂ تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے مضامین کی نوعیت کو اس میں زیادہ دخل نہیں - اگر مدرسوں میں عملی مضامین کی تعلیم یعنی ان مضامین کی جن کا رجحان پیشہ آموزی کی جانب ہے اس طرح دی جائے کہ اس کے دوران میں طلبہ نئے نئے مسائل سے دو چار ہوں جن کو حل کرنے کے لئے جسمانی اور دماغی کاوش کی ضرورت ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ تمدنی زندگی کے وسیع تر اغراض و مقاصد سے ان کا کیا تعلق ہے تو یہ مضامین بھی علمی اور معاشرتی اعتبار سے

[1] Dewey : Democracy and Education

ایسے ھی قابل قدر ثابت ھونگے جتنے خالص علمی مضامین - بلکہ ھمارے خیال میں مخصوص پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی ' جو پیشہ آموز تعلیم گاھوں میں دی جاتی ھے ' یہی اصول کارفرما ھے -

اس بحث سے عام تعلیم کے مسئلے پر کافی روشنی پڑتی ھے اور اس سے بعض مفید نتائج مترتب ھوتے ھیں جن کو ماھرین تعلیم نظر انداز نہیں کر سکتے - نوجوانوں کی نفسی ارتقاء کی ایک خصوصیت یہ ھے کہ مدرسوں کی نظری اور کتابی تعلیم ان کی مکمل تربیت اور ان کی شخصیت کی نشو و نما کی ضامن نہیں ھو سکتی - بہت سے نوجوانوں کی دلچسپیاں اور جبلی شوق زیادہ تر عملی ھوتے ھیں - ان کو یہ تعلیم بےکار اور مصنوعی معلوم ھوتی ھے کیونکہ وہ ان کے عملی شوقوں کو اظہار کا موقع نہیں دیتی - نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ وہ اپنی پوری توجہ کو اس پر صرف نہیں کرتے ' اس کے مقاصد کو اپنا نہیں بناسکتے ' اس کے مشاغل اور درس و تدریس میں اپنی شخصیت اور مخصوص ذاتی رحجانات کے اظہار کا موقع نہیں پاتے - ان نوجوانوں کے لئے تو خالص نظری تعلیم صریحاً بے سود ھوتی ھے - لیکن باقی طلبہ میں بھی اکثر ایسے ھوتے ھیں جن کی طبیعت پر گو عملی دلچسپیاں حاوی نہ ھوں پھر بھی ان کی زندگی کا ایک اھم جزو ضرور ھوتی ھیں - ان سب کے لئے اس نازک اور اھم دور میں پیشے کا تصور اور اس کی طرف رھنمائی کرنے والے مشاغل بہت کشش رکھتے ھیں اور مفید ثابت ھوتے ھیں کیونکہ وہ انھیں اپنے بہت سے نئے تجربات اور خیالات کا مرکز بنا سکتے ھیں - اگر معلم اس امر کی احتیاط رکھے کہ ان مشاغل کی وجہ سے نوجوانوں کی نظر اور ان کی ذھنی دلچسپیاں تنگ اور محدود نہ ھونے پائیں

تو ہم تعلیم میں اس عنصر کو شامل کر کے ان کی تخلیقی قوتوں کو دعوت عمل دے سکتے ہیں جو موجودہ حالات میں نامناسب ماحول کی وجہہ سے مرجھا کر رہ جاتی ہیں -

ہم نے جو مفہوم پیشے کی تعلیم کا پیش کیا ہے وہ اس مفہوم سے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے بہت زیادہ وسیع ہے - ہماری مراد اس سے محض یہی نہیں کہ ہر شخص کو ایک خاص کام یا صنعت سکھادی جائے مثلاً ایک آدمی کو درزی ' دوسرے کو جلاھا ' تیسرے کو انجینیر ' چوتھے کو معلم بنا دینے سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا - کسی شخص کو دنیا میں صرف وہی ایک کام کرنا نہیں ہوتا جس کی علت غائی حصول معاش ہو بلکہ اس کے اور بھی بہت سے کام اور فرائض ہوتے ہیں - اگر درزی کا پیشہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر اپنی روزی پیدا کرے تو اس کا دوسرا " پیشہ " یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان کی تعلیم و تربیت اور آسائش کا اہتمام کرے - اس کا تیسرا " پیشہ " یہ ہے کہ وہ اپنے گردو پیش کے لوگوں ' اپنے شہر یا گاؤں کے رہنے والوں کے حقوق ادا کرے اور اس پر جو تمدنی فرائض بحیثیت معاشرے کے ایک رکن کے عائد ہوتے ہیں ان کو پورا کرے یعنی لوگوں کے رنج و راحت میں شریک ہو ' اپنی بساط کے موافق ان کی امداد کرے ' ہر قسم کی اصلاحی تحریکوں کا ساتھہ دے اور خراب رسموں اور روایتوں کو دور کرنے کی کوشش کرے - لہذا ہر شخص صرف ایک ہی پیشہ نہیں رکھتا بلکہ بہت سے پیشے رکھتا ہے جن میں سے ہر ایک کے خاص فرائض اور ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنا اس پر فرض ہے - وہ یہ نہیں کرسکتا کہ صرف ایک پیشے کو جس کا تعلق حصول معاش سے ہے اپنی توجہہ اور جدوجہد کا مرکز بنالے اور باقی سب

کی طرف سے غافل رہے - اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی شخصیت اور اس کی ترقی کے امکانات بہت محدود ہو کر رہ جائیں گے اور وہ نہ خود کامیابی حاصل کر سکے گا نہ معاشرے کے لئے مفید ثابت ہو گا - اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کا معاشی پیشہ "وہ مخصوص گوشہ" ہوتا ہے جہاں سے وہ ' بہ قول اشپرانگر (Spranger) کے " دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے" اور ایک لحاظ سے وہی اس کی روز مرہ کی جدو جہد اور سوسائٹی کی خدمت کا مرکز بن جاتا ہے - لیکن وہ مرکز جس کے گرد کوئی دائرہ نہ ہو بالکل بے معنی اور مہمل ہوتا ہے - اور اس کی معاشی جدوجہد کا صحیح منشا اور مفہوم بھی اُس وقت واضح ہوتا ہے جب وہ اس کو معاشرتی زندگی کے وسیع تر مقاصد کے ساتھ ربط دیتا ہے - جس قدر کسی شخص کے معاشرتی تعلقات زیادہ ہوتے ہیں ۔ اس کی تعلیم اعلیٰ ہوتی ہے ' اس کے عمل کا دائرہ وسیع ہوتا ہے ' اسی نسبت سے اس کے فرائض اور "پیشے" بھی زیادہ ہوتے ہیں - اس کو مقامی ' ملکی اور بعض اوقات بین الاقوامی معاملات میں دلچسپی اور حصہ لینا پڑتا ہے ' اپنے حقوق سے مناسب طریقے پر فائدہ اٹھانا اور فرائض کو مناسب طریقے پر انجام دینا پڑتا ہے - وسیع انسانی نقطہ نظر سے پیشہ ورانہ تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ انسان کو ان تمام پیشوں اور فرائض کے لئے تیار کیا جائے تاکہ وہ محض اقتصادی پیداوار کا ایک آلہ نہ بن جائے بلکہ ایک مفید اور کارکن شہری اور ذمہ دار فرض شناس انسان ثابت ہو -

یہ ہے پیشے کی تعلیم کا وسیع مفہوم - لیکن اگر ہم اس کے محدود اور معروف معنی پر غور کریں تو اس کے لحاظ سے بھی اس کا مفہوم یہ نہیں کہ ہر شخص کو ایک خاص کام سکھا دیا جائے اور بس -

ضرورت اس بات کی ھے کہ تمام کام کرنے والوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ ذھنی تربیت اور بیداری کے ان مواقع اور امکانات سے فائدہ اٹھا سکیں جو زمانۂ حال کی صنعت و حرفت کے نظام میں موجود ھیں - ممکن ھے بعض سرے سے اس کے قائل نہ ھوں کہ اس مشین کے عہد میں صنعت و حرفت کے مشاغل میں اس قسم کے کوئی امکانات پائے جاتے ھیں - ھم نے خود بھی اوپر اس بات کو تسلیم کیا ھے کہ عام لوگوں کے موجودہ مشاغل سے وہ عنصر منقود ھوگیا ھے جو ان کی شخصیت کی تربیت میں مدد دیا کرتا تھا - لیکن اصل میں صورت حال یہ ھے - کہ اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد سے کام کی نوعیت بدل گئی ھے - یہ سچ ھے کہ موجودہ حالات میں اکثر لوگوں کو نہ اپنے کام میں کوئی دل چسپی ھے ' نہ اس کے نتائج اور عام اثرات سے واقفیت - لیکن اس کی وجہ یہ ھے کہ صنعتی انقلاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے تعلیم میں جو تبدیلیاں ھونی چاھئے تھیں وہ نہیں ھوئیں - زمانۂ حال کے صنعتی کاروبار میں سائنس کو بہت زیادہ دخل ھوگیا ھے بلکہ یوں کہنا چاھئے کہ اس کی بنیاد تمام تر سائنس ھی پر قائم ھے - اس وجہ سے پہلے کی نسبت اس میں علمی اور عقلی عنصر بہت بڑھ گیا ھے یعنی اسے سمجھداری اور قابلیت سے انجام دینے کے لئے بہتر اور وسیع تر تعلیم کی ضرورت ھے - موجودہ صنعتی نظام کا اثر تمدنی ترقی پر پڑا ھے اور اس کا جو تعلق انسان کی فلاح اور خوش حالی سے ھے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے ذھنی بیداری اور ھمہ گیر دل چسپی درکار ھے - یہ بات اسی وقت حاصل ھوسکتی ھے جب نظام تعلیم میں ایسی اصلاح کی جائے کہ وہ کاری گروں، مزدوروں اور مشین چلانے والوں کو ان نئے تعلقات اور حالات کے لئے تیار کرے - کوئی کاری گر جس کو ابتدائی

تعلیم اور ذاتی مطالعے نے یہ نہیں سکھایا کہ سائنس کی حیرت انگیز نشو و نما اور وسائل آمد و رفت کی ترقی نے جماعتوں اور قوموں اور ملکوں کو ایک نئے مضبوط اور قریبی رشتے میں منسلک کر دیا ہے اور لوگوں کے مفاد اور مقاصد میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کردی ہے' یا کم از کم اس کے پیدا ہونے کا امکان بڑھ گیا ہے؛ اور زندگی کو کامیابی اور خوش حالی سے بسر کرنے کے لئے افراد اور اقوام اور فطرت کی تمام قوتوں میں اشتراک عمل کی ضرورت ہے' وہ شخص نہ معاشرت اور معیشت کے جدید نظام میں مفید طریقے سے حصہ لے سکتا ہے نہ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے اس لئے بقول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے -

> " ایسی تعلیم کی شدید ضرورت اور تقاضا ہے جو کاریگروں کو ان مشاغل کے معاشرتی اور علمی نتائج اور اثرات سے آگاہ کرے کیونکہ جو لوگ اس تعلیم سے محروم رہینگے وہ محض ان مشینوں کے پرزے بن کر رہ جائینگے جن کو وہ چلاتے ہیں " [1] -

لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ کاریگروں کو مختلف پیشوں کا یا کارخانوں کا کام سکھا دیا جائے یا مدرسوں میں وہی اقتصادی اور صنعتی نظام رائج کر دیا جائے جو عام دنیا میں پایا جاتا ہے - ہمارے سامنے یہ سوال ہرگز درپیش نہیں کہ مدرسوں کو تجارت' کاروبار اور صنعت و حرفت کی ایک شاخ یا شعبہ بنا دیا جائے بلکہ تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ " صنعت و حرفت کے مشاغل کو کس طرح کام میں لایا جائے کہ مدرسوں کی زندگی زیادہ معنی خیز اور طلبہ کی موجودہ ضروریات اور مدرسے سے باہر کے تجربات کے ساتھ زیادہ

[1] صفحہ ۳۶۷ .Dewey : Democracy and Education

مربوط اور ہم آہنگ ہو جائے" لہذا ہمارے ماہرین تعلیم کو خاص طور سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ موجودہ نظری تعلیم میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو اس کو ملکی حالات کے لئے مناسب اور ملکی ضروریات کے لئے مفید بنا دیں - ہندوستان میں مفاسی اور بے روزگاری کا مسئلہ ایک نہایت اہم اور اندیشہ ناک مسئلہ ہے اور اس کی ذمہ داری ایک بڑی حد تک ہمارے نظام تعلیم پر عائد ہوتی ہے جو فارغ التحصیل طلبہ پر کسب معاش کی بہت سی راہیں بند کر دیتا ہے جن میں ترقی کرنے اور دولت پیدا کرنے کے مواقع ہیں - اور تعلیم یافتہ جماعت کے افراد کا ضرورت سے زیادہ ہجوم چند محدود اور مقابلتاً کم مفید پیشوں میں ہو جاتا ہے - ابتدائی مدارس میں دستکاری اور عملی مشاغل کو اس لئے شامل کرنا چاہیئے کہ وہ بچوں کی آرزوئے تخلیق و خواہش عمل کو پورا کرتے ہیں اور جسم و دماغ سے بیک وقت کام لیتے ہیں - اور ثانوی مدارس میں ایسے مضامین ' علوم اور مشاغل کو داخل کرنا چاہیے جن کا تعلق نوجوانوں کی آئندہ پیشے کی زندگی سے ہو تاکہ یہ تعلیم نہ صرف ان کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو بلکہ ان کے شوقوں اور دلچسپیوں کا مرکز بھی بن جائے - لیکن شرط یہی ہے کہ یہ پیشہ ورانہ رجحان عام ذہنی بیداری اور تہذیب نفس کے امکانات کو مسدود نہ کرے بلکہ ان کو رفتہ رفتہ زندگی کی عملی ضروریات کے ساتھ مربوط اور منسلک کرکے اور زیادہ مستحکم اور مستقل بنادے - اگر طلبہ میں علمی اور عملی مشاغل کے استمزاج سے اپنے مشاغل کی صحیح تمدنی اہمیت کا احساس پیدا ہو جائے گا تو وہ انسان نما مشینوں کے درجے سے گزر کر ذمہ دار اور آزاد انسانوں کے مرتبے پر پہنچ جائیں گے جن کو اپنے کام میں خوشی ' تہذیب نفس اور اظہار خودی کے موقعے

حاصل ھیں - ھم اس کتاب کے مختصر حدود میں پیشہ ورانہ تعلیم کا کوئی نظام نہیں پیش کرسکتے نہ یہ بحث چھیڑ سکتے ھیں کہ ھندوستان میں کس قسم کی صنعتی اور فنی تعلیم درکار ھے اور اس کے لئے بہترین انتظامات کیا ھوسکتے ھیں - لیکن مختصراً یہ واضح کردینا ضروری ھے کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد کن اصولوں پر رکھنی چاھئیے - ہمیں اندیشہ یہ ھے کہ کہیں رفتار زمانہ اور روزگار کے مسئلے سے پریشان اور ضرورت سے زیادہ متاثر ھو کر ھمارے مدارس اصلی تعلیمی مقاصد کو نظر انداز نہ کردیں اور محض مخصوص پیشہ ورانہ تعلیم میں منہمک ھوکر نہ رہ جائیں , کیونکہ بہ ظاھر اس میں فوری فائدہ اور مالي نفع زیادہ معلوم ھوتا ھے اور فطرت انساني کا تقاضا ھے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے قریب کی راہ ڈھونڈتی ھے خواہ آگے چل کر یہ جلد بازی نقصان کا باعث ھو - ایک حد تک یہ مطالبہ بعض جماعتوں اور ذمہ دار افراد کی طرف سے تحریر و تقریر کے ذریعہ کیا بھی جارھا ھے - اس لئے ماھرین تعلیم کا فرض ھے کہ وہ اس معاملے میں رائے عامہ کی صحیح رھنمائی کریں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھہ لیں اور لوگوں کو سمجھادیں کہ ابتدائی مدارج میں عام تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مقاصد میں حقیقی تناقض نہیں ھے - اس منزل میں تعلیم کے عام مقاصد کو جن میں دماغ اور مختلف انسانی قوتوں کی صحیح نشو و نما اور استعمال شامل ھیں ھر وقت پیش نظر رکھنا چاھئے لیکن اسی کے ساتھ ان عام مقاصد کے واسطے نصاب کی تدوین اور تعلیمی وسائل اور مدرسے کے مشاغل کی تنظیم اسی طرح کرنی چاھیئے کہ طلبہ میں عمل اور ذھنی اجتہاد کی قوتیں بیدار ھوں جو دنیا کے تمام کاروبار اور پیشوں میں مفید ھیں - پیشہ ورانہ تعلیم کے لحاظ سے بھی تاریخ ، جغرافیہ ، ادب ، سائنس ، زبانیں

اور دستکاریاں سکھانا فضول نہیں بلکہ مفید اور لازمی ہے کیونکہ ان سے جو عام ذہنی بیداری پیدا ہوتی ہے اور جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ہر قسم کے پیشے کے لئے مفید ہیں - مگر شرط یہی ہے کہ یہ تمام مضامین اس طرح نہ پڑھائے جائیں کہ بچوں کی عملی قوتیں اور جسم و دماغ بالکل معطل ہوجائیں اور وہ محض حافظے کی مدد سے واقعات اور غیر مفید معلومات کا ذخیرہ دماغ میں ٹھونس لیں جو بجائے محرک عمل ہونے کے ذہن پر بار ہوکر رہ جائے - طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہئے کہ طلبا کو اپنی جدت اور اپج کے اظہار کا موقع ملے ' ان میں اشتراک عمل کی صلاحیت اور کاموں کی تقسیم و ترتیب کا ملکہ پیدا ہو اور وہ عملی اور نظری مشکلات سے عہدہ برآ ہونا سیکھیں اور رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن جائیں -

ثانوی تعلیم میں پیشے کا رجحان مقابلتاً زیادہ نمایاں ہونا چاہئے اور اس کے نصاب اور مشاغل میں ایسے مضامین شامل کرنے چاہئیں جو آگے چل کر پیشوں میں براہ راست مفید ہوسکیں مثلاً عملی سائنس ' تجارتی جغرافیہ ' کارو باری واقفیت وغیرہ - لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ طلبہ کو انتخاب مضامین کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے اپنے مذاق اور طبیعت کے موافق بعض مضامین کو اختیار اور بعض کو ترک کرسکیں - ہمیں یہاں نصاب کی مفصل بحث منظور نہیں مگر جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ثانوی مدارس میں بعض مضامین تو لازمی ہونگے کیونکہ ان کے بغیر طلبہ کی تعلیم ادھوری اور نا مکمل رہ جائے گی - بعض مضامین ایسے ہیں جنہیں لازمی قرار دینا مذاق اور طبائع کے اختلاف کی وجہ سے قرین مصلحت نہیں - مثلاً اگر ایک طالب علم صریحاً ادبی ذوق رکھتا ہے اور اس کو زبانوں سے ' فنون لطیفہ سے ' تاریخ سے دل چسپی

ھے تو کیا ضرورت ھے کہ اس کو ھندسہ اور جبر و مقابلہ سیکھنے پر مجبور کیا جائے - یا اگر ایک طالب علم فطرتاً سائنس کے عملی پہلو کی طرف زیادہ متوجہہ ھے اور اس کی دماغی جدت اور جولانی کا اظہار اس کے ھاتھوں کے ذریعے ھوتا ھے تو کیا ضرور ھے کہ اس کا وقت اور محنت زبانوں کی تحصیل پر صرف کی جائے - ابتدائی مدارس میں وہ اپنی مادری زبان سیکھتا ھے اور کسی قدر انگریزی جو اس وقت ھمارے ملک میں ایک خاص حیثیت رکھتی ھے - ثانوی مدرسے میں وہ ان زبانوں کا مطالعہ جاری رکھتا ھے لیکن اونچی جماعتوں میں اس کی توجہ زیادہ تر ایسے مضامین کی جانب رھنی چاھئیے کہ بحیثیت مجموعی اسے سائنس سے زیادہ گھری دلچسپی اور واقفیت پیدا ھو- مثلاً ایک طالب علم حساب اور طبیعات کا مطالعہ کرتا ھے اور اس کو مشینوں اور آلات سے دلچسپی ھے - وہ اپنے آپ کو انجینیری کے کسی شعبے کے لئے تیار کرتا ھے - یا ایک دوسرا طالب علم کیمیا اور حیاتیات سے شوق رکھتا ھے اور اُن علوم کو حاصل کرتا ھے جن کا تعلق اجسام نامیہ سے ھے - اس کے لئے آئندہ چل کر متوقع ھے کہ وہ زراعت یا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے - کیا ان طلبا کے نصاب میں بہت سے غیر ضروری مضامین اس خیال سے داخل کرنا مناسب ھوگا کہ ان سے "دماغ کی تربیت" ھوتی ھے ؟ ایسا کرنے میں یہ اندیشہ ھے کہ ھم ان کے مخصوص اور نمایاں رجحان کو بھی کمزور یا معدوم کردینگے - ان طلبہ کو ایسے مضامین پسند کرنے کا موقع دینا چاھئے جن میں باھمی ربط ھو اور وہ سب ان کے خاص مقصد کی طرف رھنمائی کرتے ھوں اور ان کے لئے ایسا انتظام کرنا چاھئے کہ وہ ان چند مضامین کا مطالعہ وسیع اور گھری نظر سے کر سکیں - ھماری موجودہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی کمزوری اور پیشوں کی تعلیم کی

خرابی کا بڑا سبب یہی ہے کہ طلبہ تمام مضامین کا بالکل سرسری مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی واقفیت بہت سطحی ہوتی ہے وہ کسی مضمون پر بھی پورا عبور اور مہارت نہیں رکھتے - وہ مجبوراً محض امتحان کی ضرورت سے مر کھپ کر سب مضامین یاد کر لیتے ہیں - اس قسم کی تعلیم نہ ان میں علمی قابلیت پیدا کرسکتی ہے نہ عملی صلاحیت جو اکثر پیشوں میں درکار ہوتی ہے - اس بحث کا ما حصل یہ ہے کہ جب تک ثانوی تعلیم کی تنظیم نو اس طرح نہ کی جائے کہ طلبہ چند مضامین کا گہرا مطالعہ کرکے ان میں واقعی قابلیت حاصل کریں فنی تعلیم میں کامیابی نہیں ہوسکتی - تعلیمی مقصد اس وقت بھی معلم کی نظر میں پیش پیش رہنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی معلم اور متعلم دونوں کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایک عملی دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے جہاں محض لفظی اور سطحی علم سے کام نہیں چلتا بلکہ کم از کم کسی ایک چھوٹے سے شعبے میں ٹھوس معلومات اور مہارت کی ضرورت ہے -

اسی ضمن میں ایک بات ماہرین تعلیم سے زیادہ ارباب حکومت اور اہل سیاست کی توجہ کی محتاج ہے - پیشوں کی تعلیم کے لئے ایک خاص اہتمام کی ضرورت ہے - ایک طرف جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں طلبہ کی صلاحیتوں اور رجحانات کا امتحان کرنا لازم ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ وہ کن مشاغل اور پیشوں کے لئے فطرتاً موزوں ہیں - اس تفتیش میں ہمیں ان " آزمائشوں " (Tests) سے مدد ملے گی جو گذشتہ سالوں میں ماہرین فن نے ترتیب دی ہیں - اس کام کو نظم اور ترتیب سے کرنے کے لئے جابجا ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جن میں وہ تمام مواد جمع کیا جائے جس کا اس مسئلہ سے

معلق ھے یعنی تمام مقامی طلبہ کے متعلق ان کے والدین اور اساتذہ کی
رائیں، ان کے مدرسوں کی رپورٹیں، آزمائشوں کے نتائج وغیرہ - پھر
ان اداروں کا یہ فرض ھو کہ ان تمام چیزوں کی بنا پر طلبہ کو پیشہ
اختیار کرنے کے بارے میں معقول اور معتبر مشورہ دیں - لیکن یہ
تصویر کا ایک رخ ھے - ھم کسی ملک کی معاشی تنظیم محض افراد
کی صلاحیتیوں کی بنا پر نہیں کرسکتے - ھمارا دوسرا فرض یہ ھوگا کہ
ھم باقاعدہ تحقیق کر کے معلوم کریں کہ ملک میں مختلف پیشوں اور
کاروبار میں کہاں کہاں اور کس قدر گنجائش ھے - کہاں ایک خاص پیشے کے
امید واروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ھے اور کس شعبے میں ایسے مواقع
ھیں جن سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا - ھندوستان جیسے وسیع ملک
میں اس کا انتظام کرنا یقیناً بہت مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ھے
اور ممکن ھے کہ ان لوگوں کو جو تمام مفید تحریکوں کا مضحکہ اڑایا
کرتے ھیں یہ نا ممکن معلوم ھو - لیکن اب جب کہ تعلیم کا مسئلہ تمام
و کمال صوبجاتی حکومتوں کے سپرد کردیا گیا ھے ھر صوبے کے تعلیمی اور
مالی محکموں کا فرض ھے کہ وہ اپنے اپنے صوبے میں اس قسم کا عام معائنہ
کرائیں اور وقتاً فوقتاً اس کا اعادہ اور تصحیح کرتے رھیں اور مناسب
تعلیم اور وسائل معاش کی تنظیم کے ذریعہ رفتہ رفتہ کام کرنے والوں اور
کسب معاش کے مواقع میں صحیح نسبت قائم کریں - موجودہ صورت
حال کسی طرح قابل اطمینان نہیں ھے کیونکہ مروجہ تعلیمی پالیسی کا
حال بالکل ایسا ھی ھے جیسے کوئی اندھی مشین بغیر بازار کی طلب
اور خریداروں کی ضروریات کا خیال کئے کسی ایک قسم کی چیز بے
تحاشا بنائے چلی جائے، اور اس سے بحث نہ ھوکہ یہ تمام پیداوار
کس مصرف میں آئیگی - لہذا اس حالت کی اصلاح کے لئے اولاً صوبوں

کو علیحدہ علیحدہ کوشش کرنی ہوگی اور اس کے بعد تعلیم کے لئے وفاقی نظام میں جو محکمہ بھی قائم کیا جائے اس کو ان انفرادی کوششوں میں ربط اور تعاون قائم کرنا پڑیگا کیونکہ اگرچہ بہت سے معاشی وسائل ایسے ہیں جن کا تعلق محض علیحدہ علیحدہ صوبوں سے ہوگا لیکن بعض ایسے مسائل اور مشکلات بھی ہوں گی جن کا حل تمام ہندوستان کے لئے ایک ہی طرح پر سوچنا پڑیگا - آج کل نہایت سرعت کے ساتھ تمام صوبوں میں یہ پالیسی مروج ہوتی جاتی ہے کہ روزگار کے معاملے میں پنجاب پنجابیوں کے لئے ہے بنگال بنگالیوں کے لئے بمبئی بمبئی والوں کے لئے اور علی ھذالقیاس ایک حد تک یہ نقطہ نظر صحیح اور جائز ہے اور ہر صوبے کو حق ہے کہ وہ اپنے باشندوں کو اپنے یہاں کی ملازمتوں اور پیشوں کے لئے ترجیح دے لیکن اندیشہ یہ ہے (بلکہ یہ بات اندیشہ کی حد سے آگے بڑھ چکی ہے اور واقعہ بن گئی ہے) کہ مختلف صوبے ریوڑی بانٹنے والے اندھے کی طرح اس پالیسی پر اس قدر سختی کے ساتھ عامل ہوں کہ اس سے ملک کے بہترین تعلیمی مفاد اور ترقی کو نقصان پہنچے - بعض کام اور پیشے ایسے ہیں جن میں معمولی قابلیت، ذہانت اور تعلیم کی ضرورت ہے یا جن میں کوئی خاص فنی مہارت درکار نہیں ہوتی - ان کے لئے تقریباً تمام اُمیدوار صوبے کے اندر سے حاصل ہوسکتے ہیں - لیکن ان پیشوں اور نوکریوں میں جن کے لئے مخصوص قابلیت اور تربیت کی ضرورت ہے یا جن میں شخصیت کا عنصر سب سے زیادہ اہم ہے حلقۂ انتخاب کو محدود کردینا اور تنگ نظری اور صوبجاتی تعصب سے کام لینا سراسر حماقت اور نادانی ہوگی - ظاہر ہے کہ وہاں انتخاب کا صحیح معیار سکونت نہیں بلکہ قابلیت ہے - بہترین اُمیدوار جہاں سے ملیں بلا کر مقرر کرنا چاہیئے - اس کے مصداق سول سروس سے

زیادہ تعلیم کے عہدے، علمي تحقیق و تعیش کے کام، صنعت و حرفت کے ماہروں کي جگہیں، غرض وہ تمام خدمات ہیں جن کے لئے موجد، مخترع، محقق اور غیر معمولي طور پر ذہین لوگ درکار ہیں -

ہم نے پیشوں کے متعلق جس قسم کے عام معائنے کي ضرورت بتائي ہے وہ یورپ اور امریکہ کے بعض ممالک میں بارہا کیا جاچکا ہے اور روز بہ روز زیادہ احتیاط کے ساتھہ کیا جاتا ہے - وہاں ایسے ادارے قائم ہیں جن میں ماہرین نفسیات، ارباب صنعت و تجارت اور سرکاري محکموں کي مدد سے طلبہ کو ان کے مستقبل کے متعلق مفید مشورہ دیتے ہیں - اس کا نتیجہ نہ صرف طلبہ کے لئے اچھا ہے کہ وہ بے روزگاري اور پریشاني سے محفوظ رہتے میں اور غیر موزوں کاموں میں اپني صلاحیت اور زندگي کو برباد نہیں ہونے دیتے، بلکہ ملک کے لئے بحیثیت مجموعي یہہ بات بہت اطمینان بخش ہے کہ اس کے افراد کي قوتیں صحیح مصرف میں لائي جائیں اور انہیں تخریبي مشاغل میں پڑنے سے بچا لیا جائے - کسي ملک، میں بے روزگاري کا بڑہ جانا مرض کي علامت ہے اور اس کے تدارک کے لئے مناسب وسائل اختیار کرنا حکومت اور جمہور دونوں کا فرض ہے - حال ہي میں جرمني نے استادوں کي تعلیم کا جو جدید نظام رائج کیا ہے اس کا ایک جز و لازم یہہ ہے کہ ہر علاقہ کا ترینگ کالج مقامي حکام کي مدد سے یہہ اندازہ کرے کہ مثلاً آئندہ پانچ سال میں کتنے نئے معلموں کي ضرورت ہوگي - کالج میں ہرسال طلبہ کو اسي اندازے سے داخل کیا جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معلموں کي تعداد ضرورت سے بہت بڑہ جائے اور محکمہ تعلیم میں ان کے لئے گنجائش نہ نکل سکے - حال ہي میں ہندوستان کے ایک صوبے میں ایک تریننگ کالج کو اپني معمولي تعداد دفعتاً نصف کر دیني پڑي کیونکہ تریننگ کے بعد معلموں کے لئے مدرسوں میں

اساماں نہیں نکلتی تھیں - لیکن فوری حالات سے بالکل مجبور ہوکر یہہ طرز عمل اختیار کرنا اور بات ھے اور دور اندیشی کے ساتھہ مستقبل پر نظر ڈال کر ایک مناسب شاہراہ عمل اختیار کرنا دوسری بات ھے - ھندوستان میں آج کل، تعلیم یافتہ طبقے میں بے روزگاری اور بےکاری کا مسئلہ روز بروز زیادہ مشکل ھوتا جاتا ھے - اس کی اصلاح کے لئے ہر صوبے میں وسائل معاش اور پیشوں کے امکانات کا ایک باقاعدہ جدول تیار کرنے کی ضرورت ھے تاکہ ان کے مطالبات اور مواقع کے مطابق لوگوں کو مختلف راستوں پر لگایا جائے - اس میں یقیناً ایک حد تک انفرادی آزادی کی روک ضرور ھے لیکن یہہ روک افراد اور معاشرے دونوں کے فائدہ کے لئے ھے اور موجودہ زمانے میں ہر متمدن حکومت ایک حدتک افراد کی آزادی کو روکتی ھے تاکہ اجتماعی زندگی کے نظام میں فرق نہ آئے - اس کی وجہہ سے افراد کا باھمی بے قید مقابلہ بھی کم ھوجائے گا جو ممکن ھے انتخاب طبیعی کے ناسمجھہ حامیوں کو برا معلوم ھو لیکن ہر تمدنی نظام کا کام انتخاب طبیعی کے سخت گیر اور نقصان‌دہ اصول کی ترمیم کرنا ھے - لہذا ان کا اعتراض قابل توجہہ نہیں - ھماری سمجھہ میں یہہ بات نہیں آتی کہ کیوں ملک کی تمام یونیورسٹیاں ہرسال ہزاروں کی تعداد میں وکلاء پیدا کر رھی ھیں جب ہر شخص کو معلوم ھے کہ اس پیشے میں پہلے ھی ضرورت سے زیادہ لوگ بھرے ھوئے ھیں اور تعداد کی یہہ روز افزوں اور غیر مناسب زیادتی نہ صرف اس پیشے کے اراکین کے لئے مضر ھے بلکہ ان کی اندرونی زندگی اور باھمی مسابقت پر ایسا اثر ڈالتی ھے جو اخلاقاً اور عقلاً ہر طرح قابل اعتراض ھے - اس بد نظمی کا ایک ادنیٰ سا نتیجہ یہہ ھے کہ آئے دن کئی کئی سال کا تجربہ رکھنے والے وکلا ناکامی سے عاجز آکر معلمی اختیار کرنے کی کوشش کرتے ھیں اور معلم جو اپنے پیشے میں زیادہ

توقعات نہیں پاتے وکالت کا امتحان پاس کرکے اس اُمید موہوم پر
عدالتوں کی خاک چھانتے پھرتے ھیں کہ شاید وہ وھاں کامیاب ھوسکیں -
ایسی ھی اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ھیں لیکن ان سب کا
ماحصل یہی ھے کہ ملک کی معاشی تنظیم نہایت ابتر ھے - یہ ابتری
نہ صرف بے انتہا اقتصادی نقصان اور عام افلاس کا باعث ھے بلکہ اس
کی وجہہ سے بے شمار افراد مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم
ہوگئے ھیں- ھمارے نظام تعلیم کو جو مسائل در پیش ھیں ان میں
سب سے اھم غالباً یہی مسئلہ ھے کہ یہ تنظیم کس طرح درست کی
جائے تاکہ پیشہ شخصیت کی تربیت میں سدراہ ہونے کے بجائے اس
میں معین ھو -

باب پنجم

حکومت اور تعلیم

ہم اب تک کئی تمدنی اداروں سے بحث کرچکے ھیں جو بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم اور ان کی زندگی کی تشکیل پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالتے ھیں اور جن کی وجہہ سے بہت سے اھم تعلیمی مسائل پیدا ھوتے ھیں - اب ھم ایک ایسے منظم ادارے کی طرف متوجہہ ھوتے ھیں جو ان سے زیادہ وسیع ھے اور جس میں یہ مقابلتاً چھوٹی جماعتیں شامل ھیں ' یعنی کسی ملک کی حکومت کا نظام جس کے ذریعے سے کوئی قوم یا جماعت اپنی عمرانی زندگی کی تنظیم کرتی ھے اور افراد کے لئے مشترک اور متمدن زندگی بسر کرنے کے اسباب اور وسائل مہیا کرتی ھے - ھمیں یہاں حکومت کے عام مقاصد اور اغراض سے بحث نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ھے کہ تعلیم کی اشاعت اور رھنمائی کے ضمن میں حکومت پر کیا فرائض عائد ھوتے ھیں اور حکومت اس میں کس طرح اور کس حد تک دخل دے سکتی ھے - اس زمانے میں جب حکومت کا اثر اور مداخلت بڑھتی جاتی ھے اس کے اور تعلیم کے باھمی تعلقات کو سمجھنا اور ان کی مداخلت کے حدود معین کرنا نہایت ضروری ھے -

حکومت افراد کی زندگی میں کیوں دخل دیتی ھے ؟ اس کو انفرادی آزادی میں حائل ھونے کا کیا حق ھے ؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ھمیں یہ سمجھہ لینا چاھئے کہ حکومت کے قیام کی غرض یہی ھے کہ وہ افراد کی کوشش کو مجتمع اور منظم کرکے ان کے مقاصد کے حصول میں امداد دے جو ان سب میں مشترک ھیں - افراد کا دائرہ عمل جد جدا رہے

تو وہ بہت سے بڑے بڑے کام مثلاً ذرائع آمد و رفت ، وسائل معاش کی فراهمی وغیرہ کے انجام دینے سے قاصر رهیں گے - لهذا اس قسم کے کاموں کو حکومت خود اپنے هاتهہ میں لیتی هے یا ان کے انجام دینے میں امداد کرتی هے - اس کے علاوہ جب افراد میں یا جماعتوں میں باهم اشتراک عمل یا مسابقت هو تو ان کے اغراض و مقاصد میں اکثر اختلاف پیدا هوتا هے اور ان میں انصاف کرنے اور سمجهوتا کرانے کے لئے کسی ایسے ادارے کی ضرورت هے جو ان سب پر حاوی هو اور قوی کو محض قوت کی وجهہ سے کمزور پر غالب نہ آنے دے - اسی لئے حکومت افراد کے معاملات اور کار و بار میں دخل دیتی هے اور ان کو باقاعدگی اور انتظام کے ساتهہ چلانے کے لئے قوانین بناتی هے ؛ سزائیں معین کرتی هے ، افسر اور حکام مقرر کرتی هے جو قانون کی پابندی کراتے هیں اور امن قائم رکهتے هیں - غرض اس کی یہ کوشش هوتی هے کہ افراد اور جماعتوں کی زندگی کا ایسا نظام بن جائے جس کے ماتحت وہ اطمینان کے ساتهہ اپنے جائز مشاغل میں مصروف رهیں اور ان کی جائز انفرادی جد و جهد میں دقتیں اور مجبوریاں حائل نہ هوں - مگر شرط یہ هے کہ حکومت کا یہ دخل انهیں مشاغل اور کار و بار تک محدود رهے جو هماری مشترکہ زندگی پر اثر ڈالتے هیں اور اس میں معین یا سد راہ هیں - وہ افعال جو همارے ذاتی افعال هیں ، جن کا تعلق اور اثر هماری ذات تک محدود هے ان سے عموماً حکومت کو براہ راست نہ کوئی واسطہ هوتا هے نہ هونا چاهئے - همارے خیالات اور جذبات ، همارا مذهب اور عقیدہ هماری اپنی چیز هیں - ان میں حکومت کا کوئی حصہ نهیں اور جب تک هم ان کے اظهار میں یا ان پر عمل کرنے میں دوسروں کے ساتهہ بے جا تعرض نہ کریں حکومت ان میں کسی طرح دخل نهیں دے سکتی - اگر حکومت اس شعبہ زندگی میں بهی دست اندازی

شروع کردے گی تو افراد کی جائز آزادی سلب ہوجائیگی اور حکومت کی مداخلت صحیح حد سے، جو صرف اس قدر ہے کہ افراد اور جماعتوں کی ترقی میں جو رکاوٹیں حائل ہوں انہیں دور کرے، تجاوز کر جائے گی - پروفیسر سمتھ (Smith) اپنی کتاب "Nation's Schools" (قوم کے مدرسے) میں لکھتے ہیں -

"حکومت کی مداخلت کا اثر یہ ہونا چاہیئے کہ ہماری آزادی میں اضافہ ہو نہ یہ کہ اس میں اور کمی ہو جائے - اس کی بدولت ہمیں (اپنے کاروبار کے لئے) ایک ایسا ماحول ملنا چاہیئے جس میں بے کھٹکے، بے تکلف رہنا سہنا چلنا پھرنا ممکن ہو - مثلاً ایک منظم حکومت میں تمام افراد کو سیاسی آزادی حاصل ہوتی ہے - علاوہ بریں چونکہ حکومت کے تمام افعال کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے باشندوں کی اخلاقی قدر میں اضافہ ہو، اس کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ خود ایسے کام انجام دے کر، جو افراد اس کے برابر یا اس سے بہتر انجام دے سکتے ہیں، ان کی قوتوں کو معطل کردے - حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کی ذاتی کوششوں کے لئے مناسب مواقع فراہم کرے نہ یہ کہ ان کے بجائے کام کرے یا ان کی کارکردگی اور حوصلے کو پست کردے" [ا]

یہ اصول حکومت کی مداخلت کی جائز حدود کا تعین کرتا ہے لیکن تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ دراصل حکومتوں نے کبھی خود کو

[ا]

ان حدود کے اندر نہیں رکھا بلکہ ہمیشہ اپنے امکان بھر یہ کوشش کی ہے
کہ افراد کے افعال اور خیالات دونوں کو اپنے قابو میں رکھیں - چنانچہ
اس مقصد کے لئے انہوں نے نہ صرف قوانین حکومت کا استعمال کیا
بلکہ تعلیم پر حاوی ہو کر اس کے ذریعے لوگوں کے خیالات کو خاص سانچوں
میں ڈھالنا چاہا - اس کی بہت سی مثالیں قدیم زمانے سے لے کر آج تک
تاریخ میں مل سکتی ہیں - سپارٹا (Sparta) کی تعلیم کا نصب العین
علانیہ طور پر یہ تھا کہ ایسے شہری پیدا کئے جائیں جو اپنی جسمانی
طاقت اور تربیت کی بدولت ملک کے لئے مفید ثابت ہوں اور اس کی
سیاسی حکومت کو مستحکم کریں - اسی وجہ سے اسپارٹا میں بچپن ہی
سے لڑکوں کی تربیت خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی تھی اور اس
میں والدین کا حصہ محض برائے نام ہوتا تھا - اس طرح قرون وسطے
میں جب یورپ میں تعلیم کا نظام ملکی حکومتوں کے ماتحت نہ تھا
بلکہ عیسائی کلیسا ' جو اس زمانے میں صرف مذہبی قوت کا مرکز ہی نہ
تھا بلکہ بہت زبردست سیاسی اقتدار بھی رکھتا تھا ' اکثر ملکوں کے
تعلیمی نظام پر حاوی تھا ' اس کی بھی یہی کوشش تھی کہ
اپنے خاص مقاصد تعلیم کے ذریعے حاصل کرے - اس کی سب
سے زیادہ موثر اور کامیاب مثال یسوعیوں (Jesuits) کا نظام تعلیم ہے
جس نے ایک زمانے میں تقریباً تمام یورپ میں اپنا سکہ بٹھا دیا تھا
اور ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کی سر کردگی حاصل کرلی
تھی - اس کے بعد رفتہ رفتہ اس فرقے کا مذہبی اقتدار کم ہوگیا اور
تعلیم بھی بڑی حد تک ان کے قبضے سے نکل گئی - اس زمانے میں
مختلف اسباب ایسے جمع ہوگئے جن کی وجہ سے جماعتوں اور افراد کی
منفرق تعلیمی کوشش قومی مقاصد کے لئے ناکافی ثابت ہوئی اور اس

نظام تعلیم کی بنیاد پڑی جس کو ہم اب تقریباً تمام متمدن ممالک میں رائج پاتے ہیں - یعنی تعلیم کا انتظام حکومتوں نے اپنے ہاتھہ میں لے لیا - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حکومت کا یہ فعل خود مطلبی سے خالی نہ تھا - خصوصاً ابتدا میں اکثر ملکوں کے مطلق العنان بادشاہوں نے مدرسے اسی غرض سے قائم کئے تھے کہ اپنی رعایا کے خیالات کو اپنی رائے اور مقاصد کے مطابق ڈھالیں - نپولین نے اس خیال کو صاف صاف ظاہر کردیا تھا :—

"اس نظام تعلیم قائم کرنے سے میری سب سے بڑی غرض یہی ھے کہ میرے ھاتھہ میں ایک ایسا ذریعہ ہو جس سے سیاسی اور اخلاقی معاملات میں میں لوگوں کی رائے پر اثر ڈال سکوں"

اس تحریک پر جرمن فلسفہ اور خیالات کا خاص طور پر اثر پڑا اور تعلیم ایک ملکی مسئلہ تسلیم کرلی گئی - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اس صورت حال سے اپنی کتاب میں بحث کی ھے اور بتایا ھے کہ اس کی تاریخی وجوہ کیا تھیں - جرمنی کو "نپولین کے ھاتھوں شکست ہو چکی تھی - اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اپنی سیاسی قوت دوبارہ حاصل کرنے اور اپنی بگڑی حالت کو سدھارنے کے لئے تعلیم کو آلۂ کار بنائے اور مدرسوں کا ایک وسیع اور منظم سلسلہ قائم کرے - چنانچہ اس سیاسی صورت حال کا اثر نہ صرف تعلیم کے عملی نظام پر پڑا بلکہ تعلیم کا فلسفہ اور مقاصد بھی اس سے متاثر ہوئے - "جب ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک سارے نظام تعلیم کا مقصد یہی ٹھہرا کہ وطن دوست شہری اور سپاہی اور حکام اور افسر تیار کئے جائیں اور ملک کی

فوجی صنعتی اور سیاسی تحفظ اور استحکام کا اهتمام هو تو لازماً نظر یه تعلیم میں بھی " اجتماعی افادے " (Social Efficiency) کے اصول کو اهمیت دی گئی " [۱]

اس کا ایک نتیجه یه بھی هوا که " اجتماعی افادے " کو نہایت تنگ اور محدود معنی پہنائے گئے اس سے مراد " انسانی " فرائض کی ادائگی نه تھی بلکه ان خاص فرائض کی ادائگی جو ایک انسان پر مثلاً بحیثیت ایک جرمن یا فرانسیسی یا انگریز شہری کے عائد هوتے هیں - تعلیم کا مفہوم بجائے نوجوانوں کی شخصیت اور انفرادی قوتوں کی آزاد نشو و نما میں مدد دینے کے یه قرار پایا که وہ بنے بنائے سانچوں میں ڈھالے جائیں خواہ ان کی نمو پذیر شخصیت ارباب سیاست کے پسند کئے هوئے سانچوں میں سمائے یا نه سمائے - یہی طریقه جمہوری حکومتوں نے اختیار کیا جو شخصی حکومتوں کے بعد قائم هوئیں اور اب جن ملکوں میں جمہوری حکومتیں هیں ان کی بھی یہی کوشش هے که هر نئی نسل کو ان خیالات اور روایات کے مطابق تربیت دیں جن پر جمہوری حکومت کا قیام هے - اس کی ایک عمدہ مثال ممالک متحدہ امریکه کی هے جہاں حکومت نے تمام باشندوں کے لئے عام اس سے که ان کا تعلق کسی مذهب یا طبقے سے هو ' ایک هی نظام مدارس قائم کردیا هے تاکه امیر اور غریب ' عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کو دوش بدوش تعلیم دے کر تمام لوگوں میں ایک مخصوص جمہوری ذهنیت پیدا کی جائے - یہاں همیں اس امر سے بحث نہیں که انہیں اس کوشش میں کس حد تک کامیابی هوئی هے اور یه نظام تعلیم کہاں تک تعصب اور دوسرے نقائص سے پاک هے - همیں تو یه دکھانا هے که جمہوری حکومت کو بھی اپنے

---

[۱] جمہوریت اور تعلیم صفحه ۱۰۹ -

شہریوں کی تعلیم سے کم از کم اتنی ہی دل چسپی ہے جتنی کسی اور نظام حکومت کو - بلکہ ایک وجہ سے بہت زیادہ دل چسپی ہے کیونکہ یہاں ملک کے کار و بار اور فلاح کی ذمہ داری خود جمہور پر ہے - اگر ان میں معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی کمی ہوگی تو تمام کام در ہم و برہم ہوجائینگے - بس فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے زمانے میں بادشاہ بالعموم اپنے ذاتی یا خاندانی مفاد کی خاطر تعلیم میں دل چسپی لیتے تھے اور اب جمہوری حکومت ان مقاصد کی خاطر تعلیم کی رہنمائی کرتی ہے جنہیں وہ اپنے خیال میں عام رعایا کے لئے مفید اور عمدہ سمجھتی ہے، اور جن کے بغیر اس کی بنیادیں مستحکم نہیں ہوسکتیں - مگر بہر حال مدرسہ پروپیگنڈا کا ایک ذریعہ پہلے بھی سمجھا جاتا تھا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے - موجودہ زمانے میں اس کی نہایت واضح مثال روس جدید کا نظام تعلیم ہے جس کے بنیادی اور صریحی اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ مدرسوں کے ذریعے سوویت کے خیالات اور عقائد کی اشاعت کی جائے - پروفیسر پنکےوچ (Pinkevitch) جو موسکو یونیورسٹی کے صدر اور روس کے چوٹی کے تعلیمی ماہرین میں سے ہیں مدرسے کے فرائض سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں [1] -

> " مزدور بچوں کے مدرسہ جدید کی ایک اور خصوصیت امتیازی اس کا یہ مقصد ہے کہ آنے والے انقلاب کے لئے جنگ جو شہریوں کی ایک جماعت تیار کرے اور نئے معاشرے کی تعمیر کے لئے معماروں کی، قابل منتظموں اور انقلاب پسندوں کی تربیت کرے " -

---

[1] New Education in Soviet Republic (ریاست سوویت میں تعلیم جدید) ۱۶۲

دوسری جگھہ وہ اسی ضمن میں لکھتے ھیں :—

" تعلیم عامہ سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کا کام یہ ھوگا کہ وہ نوخیز نسلوں میں اشتمالی (Communist) خیالات پھیلائیں اور اس طرح ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ کریں جو اشتمالی حکومت کے قیام کے لئے جد و جہد کر رھے ھیں یعنی مقصد یہ ھے کہ پرولتاری (Proletarian) فلسفہ کا بیج نوجوانوں کے دل و دماغ میں بریا جائے......اس کا ایک ذریعہ یہ ھوگا کہ نظام تعلیم کی رھنمائی ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اشتمالی اور اشتراکی ھیں اور مزدوروں کے انقلاب سے ھمدردی رکھتے ھیں - دوسرے یہ کہ اخباروں اور بچوں کی کتابوں کے ذریعے اشتمالی خیالات کی اشاعت کی جائے اور تیسرے تعلیم عامہ کی تمام درسگاھوں کی تنظیم اسی اصول پر کي جائے " [۱] -

اسی معاملے میں روسی پالیسی اور دوسرے ملکوں کی پالیسی میں یہہ فرق ھے کہ روس میں علی الاعلان یہ مقصد تسلیم کیا جاتا ھے اور دوسرے ملکوں میں اس پر عمل کیا جاتا ھے لیکن یہ نظریہ تعلیم میں صراحت کے ساتھہ داخل نہیں کیا گیا -

ھندوستان کی تعلیمی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ھوتا ھے کہ زمانۂ قدیم میں حکومت نے تعلیم کے نظام کو اس طرح اپنے مقاصد کا تابع نہیں بنایا جس طرح اوپر کی مثالوں سے ظاھر ھوتا ھے - ھندؤں اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں تعلیم سے زیادہ تر اھل علم کو

[۱] صفحہ ۱۵۱

سروکار تھا جو کبھی بغیر کسی خاص مالی امداد کے اور کبھی اہل ثروت کی سر پرستی میں مدرسے چلاتے تھے - بادشاہ اور رؤسا اکثر تعلیم گاہوں اور عالموں کی سر پرستی کرتے تھے ' شاہی عطیوں سے ان کی امداد کرتے تھے - بعض اوقات ان لوگوں کو با قاعدہ سالانہ وظائف بھی ملتے تھے لیکن حکومت نہ نظام تعلیم قائم کرنے کی ذمہ دار تھی نہ اس کے تمام مصارف کی کفیل - مختلف علوم کے عالم اور ماہر اپنی اپنی جگہہ پر اپنے خاص فن میں درس دیتے تھے - ان کا حلقۂ درس اعلی تعلیم گاہ کا کام دیتا تھا جہاں علم کے پیاسے دور اور نزدیک سے آکر جمع ہوتے تھے اور ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرکے اپنی پیاس بجھاتے تھے - ان درسگاہوں اور یورپ کی قرون وسطی کی یونیورسٹیوں میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے کہ وہاں بھی شائقین علم ملک ملک پھرا کرتے اور جہاں کہیں کوئی جید عالم ہوتا اس کے درس سے مستفید ہوتے - یہاں تمام لوگوں کے لئے تعلیم کا انتظام نہ تھا لیکن مفلسی تعلیم کی راہ میں زیادہ حارج نہ ہوتی تھی اور سچا شوق رکھنے والوں کے لئے تعلیم کے دروازے کھلے رہتے تھے - مذہبی جماعت کو مدارس پر اقتدار ضرور حاصل تھا کیونکہ اکثر علوم میں وہی لوگ اُستادی کا درجہ رکھتے تھے جنھیں علوم دین میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی - لیکن چونکہ ان بزرگوں کو سیاست اور حکومت سے کوئی گہرا اور بلاواسطہ تعلق نہ تھا اس لئے حکومت تعلیم کی آزادی میں سدراہ نہ تھی -

انگریزی عہد حکومت میں تعلیم اور حکومت کے درمیان ایک نیا اور مضبوط رشتہ قائم ہوگیا ہے اور کمپنی کے عہد کی ابتدا سے اب تک کم و بیش واضح طور پر حکومت کی یہی کوشش رہی ہے کہ تعلیمی مدارس کے ذریعے طلبہ کو اپنے مقاصد کے لئے تیار کرے - اس زمانے سے قطع نظر کر لیجیے

جب عیسائی مشنریوں کی تعلیمی کوششیں " کفر اور جہالت میں بھٹکے ہوئے دیسیوں کو راہ ہدایت دکھانے " کے لئے وقف تھیں - ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں جو مراسلات اور تعلیمی ریکارڈ ملتے ھیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ھے کہ انگریزی تعلیم کا نفاذ اس غرض سے کیا گیا تھا کہ کمپنی کے روز افزوں کاروبار کو چلانے کے لئے متعدد اور چھوٹے درجے کے افسر تیار کئے جائیں تاکہ ذرا ذرا سے کام کے لئے کمپنی کو انگلستان سے لوگ نہ لانے پڑیں جو بیش قرار تنخواھوں کے طالب ہوتے تھے - پھر یہ مصلحت بھی تھی کہ کچھہ ایسے لوگ کمپنی کے پاس رھیں جو تجارت اور ملک داری دونوں کے معاملات میں ان کے اور هندستانیوں کے درمیان واسطے کا کام دیں - اس کے ساتھہ ھی لارڈ میکالے (اور بعض اور نیک نیت لوگوں) کو یہ فکر بھی تھی کہ اس وسیع براعظم کے لاتعداد باشندوں کو اس جہالت سے نکالا جائے جس کی تاریکی میں یہ بچارے' ان بزرگ کے نزدیک شہد اور مکھن کے سمندر میں غوطے کھارھے تھے ! اس وقت سے اب تک اگرچہ تعلیمی نقطۂ نظر میں بہت کچھہ تبدیلی ھو چکی ھے اور سرکاری بیانات ' مراسلوں اور تحریروں میں دوسرے اور بہتر مقاصد کی جھلک بھی نظر آتی ھے لیکن عمل کے لحاظ سے تعلیم بحیثیت مجموعی اب بھی متوسط طبقوں کو نوشت و خواند سکھانے اور ان کو سرکاری نوکریوں کے واسطے تیار کرتے تک محدود ھے - علاوہ اس کے سرکاری اور نیم سرکاری دونوں قسم کے مدارس کی تعلیم اور پالیسی حکومت کی دست نگر ھے کیونکہ حکومت ھی بڑی حد تک ان کے مصارف کی ذمہ دار ھے - انگریزی مثل ھے " جو دام دے کر بین بجوائے وھی راگ کی لے بتائے " اگر ملک میں ایسی تعلیم گاھیں

قائم کی جائیں جن کے مقاصد اور پالیسی عام مروّجہ مقاصد سے بالکل یا بہت کچھ مختلف ہو تو ان کا کامیابی کے ساتھ چلنا بہت مشکل ہے - کیونکہ وہ نہ صرف حکومت کی مالی امداد اور ملک کے اہل ثروت کی سرپرستی سے محروم رہینگے بلکہ ان کے فارغ التحصیل طلبہ کو' جن کی اسناد پر سرکاری مہر نہ ہوگی ' وسائل معاش تلاش کرنے میں بھی مشکلات پیش آئینگی - یہی دقّت ان " قومی تعلیم گاهوں " کو پیش آرهی ہے جو گزشتہ پندرہ بیس سال میں جابجا قائم کی گئی ہیں -

اس مختصر سے تبصرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم ازکم اس زمانے میں یہ نا ممکن ہے کہ کوئی حکومت تعلیم میں بالکل مداخلت نہ کرے یعنی اس کی پالیسی اور مقاصد پر اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرے - لیکن اس ناگزیر صورت حال کی وجہہ سے یہ اور بھی ضروری ہے کہ هم اس مداخلت کی حدود کا تعین کریں - ایک حد تک ہر حکومت کو اپنی حفاظت کے لئے اس دست اندازی کی ضرورت پڑتی ہے - لیکن حکومت کا یہ اقتدار اور غلبہ جتنا زیادہ اور قوی ہو اسی نسبت سے اندیشہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے اصلی مقاصد فوت ہو جائینگے - اگر حکومت بہترین قومی روایات اور اخلاقی صفات کا مجسمہ ہوتی تو اس کی مداخلت نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہوتی - لیکن یہ محض ایک خیالی تصویر ہے جس کا وجود کہیں نہیں - دراصل حکومت ہمیشہ ان مختلف جماعتوں اور هم غرض طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے جو کسی خاص وقت میں ملک پر حاوی ہوتے ہیں - یعنی جو جماعت یا طبقہ برسر حکومت ہوتا ہے وہ لازمی طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں اپنے خیالات اور مقاصد کی اشاعت کرے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئی

نسلوں کے خیالات اور دماغوں پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش میں تعلیم کے اولین اور اعلیٰ ترین مقاصد نظر انداز ہوجاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ مدرسہ بچوں کے قوائے ذہنی کی تربیت کرے اور ان کو "صحیح انسانی" زندگی کے قابل بنائے استادوں اور شاگردوں کی محنت اور توجہ دور از کار چیزوں میں صرف ہوتی ہے - تعلیم کا ایک مقصد جیسا کہ ہم پہلے باب میں بتا چکے ہیں ' یہ ہے کہ وہ خود بچوں میں تعلیم اور نشو و نما کو جاری رکھنے کی صلاحیت پیدا کرے یعنی اس کے پیش نظر فرد کی صحیح اور مکمل ارتقا رہتی ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ تعلیم کا عمل آزاد ہو لیکن حکومت کی دست اندازی کی وجہ سے آزادی کا عنصر مفقود ہوجاتا ہے ' تعلیم خارجی مقاصد کی مطیع ہوجاتی ہے ' اور موضوع تعلیم بجائے ایک آزاد اور ارتقا پذیر ہستی کے ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے جو دوسروں کے ارادے سے چلتی ہے -

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کو تعلیم کے میدان میں کس حد تک اور کن کن امور میں دخل دینا چاہئے ؟ جہاں تک تعلیم کی غایت کا تعلق ہے ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ حکومت کو اس پر کوئی دسترس نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس کا انحصار دو ایسے امور پر ہے جو حکومت کے اثر سے بالکل باہر ہیں ایک طرف تو قومی روایات ' قومی سیرت اور قومی ضروریات اور دوسری طرف خود متعلم کی نفسی زندگی ' اس کی طبیعت ' اس کی نشو و نما کے قوانین - انہیں دونوں کے باہمی تعامل اور اثر سے تعلیم کے مقاصد کا تعین ہوتا ہے - اگر حکومت ایک منظم اور با اختیار جماعت ہونے کی حیثیت سے تعلیم کے مقاصد کو جزوی و کلی طریقہ پر متعین کرے گی تو اس سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ خالص تعلیمی مقاصد سیاسی اور خارجی مقاصد کے لئے قربان کردیئے

پڑیں گے - عملاً اس خرابی کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ ملک کے تمام مختلف مدارس جن کے ماحول اور روایات اور ضروریات مختلف ہیں حکومت کے مقرر کئے ہوئے یکساں مقاصد کے حصول میں کوشاں ہوتے ہیں اور ان میں آزادانہ نشو و نما کی فضا پیدا نہیں ہوتی - اسی طرح مدرسے کے اندرونی معاملات یعنی طریقہ تعلیم اور نظام و نسق میں استادوں اور تعلیمی جماعتوں کو آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق کام کریں اور نئے تجربوں کے ذریعے تعلیمی ترقی اور اصلاح ہوتی رہے - جب کبھی مدرسے کے تعلیمی معاملات میں حکومت کی دل چسپی ' مشورے ' ہمت افزائی ' عام نگرانی اور انفرادی کوششوں کی تنظیم کی حد سے آگے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم بے جان اور بے روح ہوکر رہ جاتی ہے - اس کی ایک جدید مثال یہ ہے کہ انگلستان میں جس قدر تعلیمی ترقی گزشتہ عرصے میں ہوئی وہ سب اس وقت سے جب حکومت کے تعلیمی محکموں اور افسروں نے مدرسوں پر سے اپنی آھنی گرفت ڈھیلی کردی - اس وقت مدرسوں کو ایک گو نہ آزادی نصیب ہوئی کہ خود اپنی تعلیم اور زندگی کی تعمیر کریں اور " بورڈ آف ایجوکیشن " کی حیثیت محض ایک مشورتی ادارے کی قرار پائی - ہمارا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ حکومت ' جو قومی زندگی کا سب سے منتظم اور زبردست ادارہ ہے ' نظام تعلیم سے بالکل سبکدوش ہو جائے - رفتار زمانہ کا تقاضا تو اس سے بالکل مختلف ہے یعنی یہ کہ حکومت ان تمام تعمیری کاموں میں پہلے سے زیادہ حصہ لے جو ملک کی بہبودی کے لئے ضروری ہیں - لیکن جہاں تک تعلیم کے میدان کا تعلق ہے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس مداخلت کی نوعیت بہت مختلف ہونی چاہئے

اور حکومت کے لئے لازم ہے کہ اسے معقول اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے چند مخصوص فرائض انجام دے -

حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ تعلیم کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائے اور وہ تمام انتظامات کرے جو ایک وسیع نظام تعلیم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ضروری ہیں - ایک نہایت ضروری کام مدرسوں کے لئے موزوں عمارتیں اور وہ سامان مہیا کرنا ہے جس کے ذریعے بچوں کی تعلیم موثر اور خوشگوار بنائی جاسکے - گذشتہ سو سال میں اس لحاظ سے اکثر متمدن ممالک میں نہایت زبردست ترقی ہوئي ہے کیونکہ حکومت اور ماہرین تعلیم دونوں نے اس کوشش میں شرکت کی ہے کہ مدرسے کو ایک ایسا ماحول بنائیں جہاں بچے خود بخود خوشی سے کام کریں ، کھیلیں ، مختلف مشاغل میں شریک ہوں اور اس طرح ان کی جسمانی اور دماغی نشو و نما آزادی کے ساتھ ہوسکے - مدرسے کے ماحول کی تشکیل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے لئے طرح طرح کے اہتمام کی ضرورت ہے - اس کا ایک جز و طبیعی ماحول کی درستی ہے - "مدارس عمل" (Activity Schools) قائم کرنے کی جو تحریک گذشتہ چند سال میں یورپ اور امریکہ کے بعض ملکوں میں جڑ پکڑ چکی ہے اس کا ایک نمایاں عنصر ان مدرسوں کا طبیعی ماحول ہے - ڈاکٹر فیریر (Ferriere) نے جو سوئستان اور وسطی یورپ میں اس تحریک کے قائدین اعظم میں سے ہیں اپنی کتاب "L'Ecole Active" (مدرسہ عمل) میں پورا ایک باب اس بحث کی نظر کیا ہے کہ مدارس جدید کا طبیعی ماحول کیسا ہونا چاهئے - اسی طرح بلجیم کے ایک مشہور ماہر تعلیم واس کونسلو (Vasconcellos) جنہوں نے جنگ یورپ سے چند سال پیشتر ایک تجربی مدرسہ قائم کیا تھا

اپنی کتاب [۱] میں اسی مدرسے کا حال لکھتے ہوئے نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ مدرسے کی عمارت ' ساز و سامان آلات تعلیم اور گرد و پیش کی فضا بچوں کے جسم اور سیرت کی نشو و نما پر کیا اثر ڈالتی ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی چھوٹی سی کتاب (School and Society) (مدرسہ اور معاشرہ) میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے اسکول کے فرنیچر کی اهمیت معلوم ہوتی ہے - بہت سال گزرے ایک معلم نے نیو یارک کی تمام بڑی بڑی دوکانوں کا گشت لگایا جہاں اسکول کا فرنیچر فروخت ہوتا تھا - اور ایک خاص قسم کے ڈسکوں اور کرسیوں کی تلاش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی - ایک دوکاندار نے جو دوسروں سے زیادہ سمجھدار تھا معلم موصوف کا مطلب سمجھہ کر جواب دیا - " اچھا آپ کو ایسے ڈیسکوں کی تلاش ہے جس پر طلبہ کام کرسکیں لیکن ہم لوگ جو ڈسک بناتے ہیں وہ تو اس لئے ہوتے ہیں کہ طلبہ ان پر بیٹھہ کر اُستاد کے لکچر سن سکیں "- اس قصے سے پروفیسر موصوف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کچھہ عرصہ پہلے مدرسوں میں اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ طلبہ خود کوئی عملی کام کرسکیں بلکہ وہ اُستاد کی سزا کے خوف سے چپ چاپ اور بے حس و حرکت بیٹھہ کر اس کے سبق کو سنتے تھے یا سوالات کا جواب دیتے تھے اور جب موقع ملتا تھا تو اس خلاف فطرت خاموشی کے بدلے میں بے تحاشا اودھم مچاتے تھے - بہر حال اس وقت سے اب تک امریکا کے مدرسوں میں بہت کچھہ تبدیلیاں ہوگئی ہیں اور ان کے فرنیچر تک میں اس قدر ترقی ہوگئی ہے کہ ایک ناواقف شخص کو ' جو نئے تعلیمی خیالات سے

---

[۱] Une Ecole Nouvelle in Belge جس کا ترجمہ انگریزی میں A New School in Belgium کے نام سے شائع ہوا ہے -

آگاہ نہیں ہے کسی جدید مدرسے کو دیکھکر یہ پہچاننے میں بھی دقت ہوگی کہ یہ عمارت کسی تعلیم گاہ کی ہے یا بچوں کے کھیلنے، تفریح کرنے اور دستکاریاں سیکھنے کے لئے ہے - اس لحاظ سے ہمارا ملک بہت پیچھے ہے کیونکہ ہمارے مدرسے کیا بہ لحاظ عمارت کے اور کیا بہ لحاظ سامان کے بالعموم نہایت ابتر حالت میں ہیں - اس کی ایک وجہہ تو یقیناً ملک کا افلاس ہے لیکن اس کے ساتھہ اس کی ذمہ داری پبلک اور محکمہ تعلیم کی بے حسی پر بھی عائد ہوتی ہے کیونکہ ان کو یہ احساس ہی نہیں کہ بچوں کی نشو و نما میں ایک موزوں ماحول کو کس درجہ دخل ہے - ورنہ باوجود روپئے کی کمی کے بھی یہ ممکن ہے کہ شہری اور دیہاتی مدرسوں میں بہت کم خرچ سے ایسی چیزیں مہیا کی جائیں جو طلبہ کے لئے مفید اور آرام دہ ثابت ہوں - مگر بالعموم سوائے خال خال خوش قسمت مدرسوں کے، اور کہیں ہمیں سوائے ٹوٹے پھوٹے ڈسکوں، بنچوں اور چند نقشوں اور سیاہ تختوں کے کچھہ بھی نہیں ملتا - پھر ہم کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ ایک ایسی عمارت میں بچے دل چسپی کے ساتھہ ہر روز نئی گھنٹے گذار سکیں اور ان مدرسوں کے گرد ایسی روایات مجتمع ہو جائیں جن کو نوجوانوں کی نسلیں یکے بعد دیگرے عزیز رکھیں ؟ وہاں ان کے مذاق کی اصلاح اور تربیت کیسے ہوسکتی ہے ؟ تعلیمی اصلاح کا ایک اہم تقاضا یہہ ہے کہ مدرس اور محکمہ تعلیم دونوں اس جانب توجہہ کریں اور مدرسوں کی مادی حالت کو بہتر بنائیں اور حکومت کا فرض ہے کہ اس کوشش میں ان کی مدد کرے -

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت کے فرائض میں قومی تعلیم کے مصارف کامہیا کرنا بھی شامل ہے - گزشتہ دو

صدیوں کے اندر اندر اکثر حکومتوں نے یہ ذمہ‌داری قبول کرلی ھے اور ان کے سالانہ بجٹ کا مطالعہ کرنے کے لئے معلوم ھوتا ھے کہ اُن کے تعلیمی اخراجات سال بہ سال نہایت تیزی کے ساتھہ بڑھتے جاتے ھیں کیونکہ انہوں نے محسوس کرلیا ھے کہ تعلیم پر خرچ کرنا ایک ضروری مصرف ھونے کے علاوہ قومی کفایت کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ھے - اگر صحیح قسم کی تعلیم ملک میں رائج ھو تو اس بے شمار رقم میں بہت کفایت ھو سکتی ھے جو اس وقت مختلف قسم کے جیل خانوں ' اسپتالوں ' مجرموں کی بستیوں اور دیگر تعزیری انتظامات پر صرف ھوتی ھے - پہلی نظر میں یہ دعوی بہت مبالغہ آمیز معلوم ھوتا ھے اور اس کی تردید میں ایسے اعداد و شمار پیش کئے جاسکتے ھیں جن سے ثابت ھوتا ھے کہ بعض ملکوں میں تعلیم کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ تعداد اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے جرائم بہت بڑھ گئے ھیں - لیکن اس اضافے کی ذمہ‌داری ناقص اور نا مکمل تعلیم پر ھے اور اس غفلت پر ھے جو تربیت کی طرف سے برتی جاتی ھے نہ کہ نفس تعلیم پر ! ڈاکٹر کرشن اشٹائنر (Kerschensteiner) نے جو جرمنی کے ایک نہایت زبردست تعلیمی مفکر اور منتظم تھے اور جن کا انتقال حال ھی میں ھوا ھے اپنی کتاب "Schools and the Nation" (مدرسے اور قوم) میں تعلیم کے اس اصلاحی اور کفایتی پہلو پر زور دیا ھے - ھندوستان میں بھی گذشتہ پچاس سال میں مقابلتاً تعلیمی بجٹ میں بہت اضافہ ھوا ھے لیکن ضروریات کے لحاظ سے موجودہ تعلیمی بجٹ بالکل ناکافی ھے اور ھندوستانیوں کو حکومت سے ایک عام شکایت یہ ھے کہ وہ فوجی مصارف میں ملک کے مداخل کا تقریباً نصف خرچ کر دیتی ھے اور تعلیم پر اس کا بہت تھوڑا حصہ صرف ھوتا ھے - مالی دقتوں کی وجہہ سے حکومت نے

اب تک نہ تعلیم کی توسیع کے لئے کافی وسائل بہم پہنچائے ہیں نہ موجودہ تعلیم کی اصلاح ' بہتری اور استحکام میں اسے کامیابی ہوئی ہے - اُس ذمہ‌دار ہندوستانی حکومت کو جو جدید آئینی اصلاحات کے نافذ ہونے پر وجود میں آئے گی بہت جلد اس مسئلہ سے سابقہ پڑے گا اور بجٹ بنانے کے تمام پرانے اصولوں کو بدلنے کے بعد اس میں تعلیمی مصارف کو وہ نمایاں حیثیت حاصل ہوگی جس کے وہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستحق ہیں - یہ سوال قومی زندگی اور فلاح کے لئے نہایت درجہ اہم ہے اور اگر ہمیں ترقی کی دوڑ میں معاصر اقوام سے پیچھے رہنا گوارا نہیں تو ہمیں بھی تعلیم کی اشاعت اور ترقی کے لئے اسی مستعدی اور یک جہتی کے ساتھہ جدوجہد کرنی پڑے گی جس طرح مثلاً روس میں انقلاب کے بعد سے ہو رہی ہے - ہم اپنی موجودہ حالت کا مقابلہ تیس چالیس برس پہلے کی حالت سے نہیں کرسکتے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس زمانے میں دوسرے ملک جن کے دوش بدوش ہمیں چلنا ہے ' کیا کر رہے ہیں اور تعلیم پر کس قدر صرف کر رہے ہیں - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حکومت کے تعلیمی مصارف میں محض یہی خرچ شامل نہیں کہ اعلیٰ اور ثانوی مدارس قائم کئے اور چلائے جائیں اور غیر سرکاری مدرسوں کو امداد دی جائے - تمام متمدن ممالک میں لازمی ابتدائی تعلیم کا اجرا ہوچکا ہے یا ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھہ یہ شرط بھی ہے کہ یہ تعلیم مفت دی جائے تاکہ ملک کے تمام بچے اس سے مستفید ہوسکیں - اس خرچ کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے - مگر یہ ذمہ داری یہیں ختم نہیں ہوجاتی - ایک فرض شناس حکومت کا کام یہ بھی ہے کہ مالی امداد کے ذریعے سے جہاں تک ممکن ہو ان رکاوٹوں کو دور کرے جو غریب طلبہ کی راہ میں حائل ہیں تاکہ

وہ اپنی تعلیم کے زمانے میں اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہ سکیں اور امیر و غریب کا فرق کم سے کم مدرسے میں ان کو حتی الامکان محسوس نہ ہو - اکثر متمدن حکومتوں نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے اور اپنی اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق ایسے انتظامات کئے ہیں جن سے غریب طلبہ اور ان کے والدین کی مشکلات میں کمی ہوگئی ہے - چنانچہ یورپ اور امریکہ کے بعض ملکوں میں جو تعلیمی قوانین حال میں نافذ ہوئے ہیں ان میں یہ امر بھی شامل ہے کہ حسب ضرورت حکومت طلبہ کی خوراک اور لباس کے مصارف میں امداد دے گی تاکہ ناقص یا ناکافی خوراک اور لباس کی وجہ سے ان کی صحت پر برا اثر نہ پڑے - اسی طرح محکمہ حفظان صحت کا تعلق مدرسوں سے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ طلبہ کی نگہداشت کرے اور وقتاً فوقتاً طبّی معائنہ کرکے بیماریوں کی روک تھام اور صحت کے قیام کے لئے مناسب تدابیر عمل میں لائے - بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار سے لگانے کے لئے بھی حکومت نے کوششیں کی ہیں اور جیسا ہم ذکر کرچکے ہیں بعض ملکوں میں ایسے دفتر (Employment Bureaus) قائم کئے گئے ہیں جن کا تعلق ایک طرف مدرسوں، ہیڈ ماسٹروں اور والدین سے ہے اور دوسری طرف صنعت و حرفت کے نظام اور مختلف پیشوں سے، اور وہ اپنی واقفیت اور تحقیق کی بناپر طلبہ کو مناسب کام حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں - علاوہ بریں غریب طلبا کو معقول وظائف دیے جاتے ہیں جس سے نہ صرف ان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں بلکہ ایک حد تک ان والدین کی بھی دستگیری ہوجاتی ہے جو اپنے بچوں کو مدرسے بھیجنے کی وجہ سے ان کی مالی امداد سے محروم ہوجاتے ہیں اور خود معذور ہونے کی وجہ سے اپنی روزی نہیں کما سکتے -

حکومت کے ذمے یہ فرض بھی عائد ہوتا ھے کہ وہ نظام تعلیم کی عام نگرانی اور رھنمائی کرے تاکہ مختلف مدارس کے تعلیمی معیار میں یکسانی رھے - اگر مناسب نگرانی نہ کی جائیگی تو اس بات کا اندیشہ ھے کہ بعض تعلیم گاھیں اپنے تعلیمی فرائض کو محنت اور دیانتداری کے ساتھہ انجام نہ دیں گی اور ان کا معیار بہت گر جائے گا - محکمۂ تعلیم کو ایسی مناسب تجاویز اختیار کرنی چاھیئں جس سے معلموں کے دل میں اپنے فرائض کا احساس تازہ رھے اور انھیں بجالانے کی ترغیب ھو اور نئے تعلیمی تجربوں اور تحریکوں سے واقف ھونے کا موقع ملے - اسے ایسی عام ھدایات اُستادوں کی رھنمائی کے لئے شائع کرنی چاھیئں جن پر اُستاد اپنے اپنے مقام پر عمل کرسکیں لیکن ان کی جائز آزادی میں فرق نہ پڑے - گذشتہ صدی تک انگلستان میں بورڈ آف ایجوکیشن (مرکزی مجلس تعلیم) اور اس کے کارکن گورنمنٹ انسپکٹر اُستادوں اور مدرسوں پر جابر جاسوسوں کی طرح مسلّط تھے - ان کے لئے صدر دفتر سے تفصیلی احکام جاری کئے جاتے تھے جن پر آنکھیں بند کرکے عمل کرنا اُستادوں کا کام تھا - وہ امتحانوں کے نتیجے کی کسوٹی پر کسے جاتے تھے اور ان کا مستقل ھونا اور ترقی پانا سب کچھہ اس بات پر منحصر تھا کہ کسی طرح امتحانوں کا نتیجہ خاطر خواہ رھے اور اس طرح تعلیمی دیوتا خوش رکھے جائیں - لیکن یہ صورت حال اب بالکل بدل چکی ھے - بورڈ کا کام مشورہ دینا اور رھنمائی کرنا قرار پایا ھے - وھاں سے اُستادوں کے لئے مختلف تعلیمی مباحث پر رپورٹیں اور رسالے شائع ھوتے ھیں جو ان کو نئے راستے سمجھاتے ھیں - بورڈ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایک عام معیار تجویز کردیتا ھے جس سے مدرسوں کو اندازہ ھو جاتا ھے کہ انھیں ایک مقررہ مدت میں کم و بیش اس قدر کام کرنا ھے اور پھر وہ

اس کے لحاظ سے اپنے کام کی تنظیم کرسکتے ھیں - اسی اصول پر انسپکٹر بھی کام کرتے ھیں - اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کا نقطہ نظر بہت کچھ اس کی طبیعت اور خیالات پر منحصر ہوتا ھے لیکن بحیثیت مجموعی اب انسپکٹروں کی جماعت کا کام پولیس کے سپاھیوں کی طرح معلموں کے جرائم اور کمزوریوں کی تفتیش کرنا اور سزا دینا نہیں بلکہ ان کو مدد دینا اور ان کو نئے تعلیمی طریقوں سے اور تجربوں سے روشناس کرنا ھے - بقول زمانۂ حال کے ایک مصنف کے " محکمہ تعلیم کا انسپکٹر ھیڈ ماسٹر کے پاس بیٹھ کر سگرٹ کا کش لگائےگا اور دوستانہ گفتگو کے دوران میں اپنا وسیع تر تجربہ اس کے سامنے پیش کردےگا "

ممکن ھے ھندوستان کے بعض " دفتری " ذھنیت رکھنے والے انسپکٹر اور تعلیمی افسروں کو اس تصور سے غش آجائے لیکن امر واقعہ یہ ھے کہ محکمہ تعلیم کے نگران افسروں اور معلموں میں جب تک اس قسم کے امداد باھمی کے تعلقات قائم نہ ھونگے ملک میں تعلیمی اصلاح ممکن نہیں کیونکہ تعلیم بالخصوص ان مشاغل میں سے ھے جن میں دفتری ذھنیت اور بندشیں نقصان دہ ثابت ھوتی ھیں -

اُستادوں کی تعلیم کی ذمہداری بھی حکومت کے سر ھے کیونکہ اس اُھم کام کو تمام تر افراد اور جماعتوں کی مرضی پر نہیں چھوڑا جاسکتا - مدتوں تک لوگوں کا یہ خیال رھا کہ ھر شخص بچوں کو پڑھانے کا کام انجام دے سکتا ھے جو خود تھوڑا بہت پڑھا لکھا ھو - اس کے لئے کسی خاص تعلیم و تربیت یا انتخاب کی ضرورت نہیں - جب تک تعلیم خاص طبقوں تک محدود تھی اور افراد اپنی مرضی اور طبیعت سے تعلیم کے فرض کو اپنے ذمے لیتے تھے اس طرح کام چلتا رھا - طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور معلمی کا فرض اکثر

وہ لوگ انجام دیتے تھے جو کم از کم اپنے خیال میں اس سے کچھہ طبعی مناسبت رکھتے تھے - علاوہ بریں اس وقت مدرسہ یا معلم کا کام یہی تھا کہ اپنے شاگردوں کو علم سکھائے یعنی ان کو درسی کتابیں پڑھا دے - تعلیم کے دوسرے پہلوؤں یعنی کسب معاش اور تمدنی زندگی کی تیاری کی طرف معاشرہ خود توجہہ کرتا تھا - بچے مختلف قسم کے عملی کاموں اور معاشرتی مشاغل میں شرکت کرتے تھے اور اس طرح ان کی درسی تعلیم کی تکمیل زندگی کے مدرسے میں ہوتی تھی - لیکن اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے - تعلیم عام ہوگئی ہے اور کم از کم ابتدائی مدارج تک ہر بچے کے لئے مدرسے جانا ضروری ہے - زندگی کا نظام بہت پیچیدہ ہوگیا ہے اس لئے والدین اور پیشہ ور لوگ براہ راست اکثر کاموں کی تعلیم نہیں دے سکتے - اور بعض ملکوں میں جہاں صنعت و حرفت کی بے اندازہ ترقی نے انسانوں کو مشین اور زندگی کو ایک بندھا ہوا معمول بنا دیا ہے گھر کی زندگی کا قدیم نقشہ بھی بالکل بگڑ چکا ہے - حالانکہ یہی بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مرکز اور ان کی تربیت کا موثر ترین ذریعہ تھا - اس لئے یہ نئے فرائض بھی اب مدرسے کے ذمے پڑگئے ہیں - اور ہم ہرگز یہ توقع نہیں کرسکتے کہ ہرکس و ناکس اس اہم فرض کو بجالائیگا خواہ وہ اس کام کے لئے با قاعدہ طور پر تیار کیا گیا ہو یا نہیں - جب اس تخصیص اور مہارت فن کے دور میں ہم معمولی کاموں کے لئے بھی با قاعدہ تعلیم یافتہ ماہرین کی تلاش کرتے ہیں اور اس امر پر مصر ہوتے ہیں کہ ڈاکٹری، انجینیری، زراعت غرض ہر قسم کے کام کے لئے ایسے آدمی مقرر کئے

جائیں جنھیں ان شعبوں میں خاص مہارت ہو تو یہ کیسے جائز رکھا جاسکتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کو ایک ایسی جماعت کے سپرد کردیں جو اس اہم فرض کی اہلیت نہ رکھتی ہو - ہم جانوروں اور انسانوں کی جسمانی صحت کی نگہداشت اور پھولوں اور پودوں کی نشو و نما کا انتظام جاہل اور نا واقف لوگوں کے سپرد نہیں کرسکتے - مگر یہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ صدیوں تک انسانوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں رکھا جن کو اس فرض کی ادائیگی کی کوئی تعلیم نہیں دی گئی تھی - اگر ان میں سے کوئی اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے اچھا معلم نکلتا تو یہ طلبہ کی خوش قسمتی تھی ورنہ بالعموم وہ لوگ جو دوسرے کاموں میں نا کامیاب رہتے یا ابتدا ہی سے اور کاموں کے لئے نا قابل ہوتے وہ بچوں کو پڑھانے کے لئے مدرسہ کھول دیتے تھے - انگلستان میں گزشتہ صدی تک یہ حالت دیکھنے میں آتی تھی اور مشہور ناول نویس چارلس ڈکنس (Charles Dickens) نے اپنے سحر نگار قلم سے سکویرز (Squeers) کے مدرسے کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں مبالغے کی چاشنی ضرور ہے لیکن نہ وہ خلاف واقعہ ہے نہ غیر معمولی - ہمارے ملک میں بدقسمتی سے اب بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے مدرسے ایسے ہیں جن میں بالکل نا قابل استاد نہایت کم مشاهرہ پر بچوں کو پڑھاتے ہیں - بلکہ پڑھاتے کیا ہیں اپنا وقت اور ان کی عمر ضائع کرتے ہیں - ہر وہ شخص جو کسی شہر یا قصبے میں مقامی اہمیت اور حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے چندے سے تھوڑا بہت روپیہ اکٹھا کرکے ایک مدرسہ کھول دیتا ہے اور اس میں کم سے کم تنخواہ پر اکثر ایسے استاد "معلم" رکھ لیتا ہے جو معلمی تو کیا کسی کام کے لئے بھی موزوں نہیں

ہوتے ۔ حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے مدرسوں کی تعداد کو بڑھنے نہ دے کیونکہ ناقص تعلیم ، جو ایک خراب ماحول میں دی جائے ، ہرگز جہالت سے بہتر نہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ ایک غیر ملکی حکومت کے لئے افراد کی تعلیمی کوششوں کو روکنا خطرہ سے سے خالی نہیں کیونکہ اس میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ تعلیمی جد وجہد اور تجربوں کی جائز آزادی میں فرق آجاے اور ملک میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے ۔ لیکن اب کہ تعلیم کا شعبہ بہت کچھہ ہندوستانیوں کے ہاتھہ میں آگیا ہے اور تھوڑے دنوں میں اس کی تمام تر ذمہ‌داری انہیں پر عائد ہوگی ہمیں اس معاملے میں جرات کے ساتھہ ایک سخت پالیسی اختیار کرنی چاہئیے تاکہ محض جذبات سے متاثر ہوکر اور مروت میں آکر لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کو برباد نہ ہونے دیں ۔ محکمہ تعلیم کو اس بات پر اصرار کرنا پڑے گا کہ بالعموم مدرسوں میں ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جائے جو باقاعدہ معلمی کے کام کے لئے تیار کئے گئے ہوں اس شرط سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہر سند یافتہ معلم لازمی طور پر قابل ہوتا ہے اور جو شخص کسی ٹریننگ سکول یا کالج کی چکی میں سے نہیں گذرا وہ معلمی کا کام کر ہی نہیں سکتا ۔ یہ امر مشاہدے اور تجربے کے خلاف ہے ۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے دل و دماغ اور سیرت میں قدرتاً وہ خصوصیات ہوتی ہیں جو معلم کے لئے لازم ہیں اور بعض لوگ باوجود اعلیٰ درجہ کی فنی تعلیم کے معلمی کے لئے بالکل نا اہل ثابت ہوتے ہیں ۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ امر مسلم ہے کہ اچھا معلم فنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنا کام اور زیادہ خوبی کے ساتھہ اور برا معلم اپنا کام قدرے بہتر کرسکتا ہے ۔ محکمہ تعلیم کو یہ حق

همیشہ حاصل ہونا چاهئے کہ خاص صورتوں میں بہت اچھے معلموں کو فني تعلیم کی شرط سے بری کردے لیکن بالعموم حکومت کو محکمہ تعلیم کے توسط سے تمام معلموں کے لئے یہ تعلیم لازم کردینا چاهئے - جن ملکوں میں گذشتہ پچاس سال میں تعلیمي ترقي ہوئی ہے اور یہاں تعلیمی ترقی سے ہمارا مطلب محض تعلیم کی توسیع نہیں بلکہ تعلیمی اصلاح بھی ہے ' وہاں معلموں کی تعلیم کی اهمیت بہت بڑھ گئی ہے اور اس کی مدت بھي ہمارے ملک سے بہت زیادہ ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ اس تعلیم کو لازم قرار دینے سے پہلے اس کی اصلاح اور تنظیم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ وہ بے روح تعلیم جو عموماً ہمارے نارمل اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے ہرگز اس عظیم‌الشان فرض کے شایاں نہیں جو انہیں انجام دینا ہے - اس لئے کہ استادوں کا کام اس زمانے میں محض بچوں کو چند علوم و فنون سکھا دینا نہیں بلکہ نئی نسلوں کی دماغی نشو و نما اور سیرت کی تربیت کے ذریعے قومی تنظیم میں حصہ لینا ہے - مگر یہ مبحث بجائے خود اس قدر وسیع ہے کہ اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں -

حکومت کو ایک حق یہ بھی حاصل ہے کہ وہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ کرے - اس حق کا جواز کس بناپر ہے ؟ اگر گھوڑے کو اس کی مرضی کے خلاف گھاٹ پر لے جانا اور مجبور کرکے پاني پلانا جائز نہیں تو کیا انسانوں کو جبری طور پر تعلیم دلانا جائز ہوسکتا ہے ؟ حکومت کا فرض اس پر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ملک میں ابتدائی مدارس کا ایک نظام قائم کردے اور لوگوں کو آزادی ہو کہ خواہ وہ اس سے مستفید ہوں یا نہ ہوں - حکومت

معاشرے کے مقاصد اور اغراض کو عمل میں لانے کا ایک آلہ ہے - اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ تمام ایسے ذرائع اختیار کرے جو معاشرے کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری ہوں - اگر حکومت تعلیم کو اختیاری رکھے اور اس بات کو لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دے کہ وہ تعلیم حاصل کریں یا نہ کریں تو اندیشہ ہے کہ بعض لوگوں کی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے تمام معاشرے کے لئے خطرات پیدا ہو جائیںگے - تعلیم نہ صرف افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کی باقاعدہ تنظیم کریں بلکہ حکومت اور معاشرت کے قیام کے لئے بھی وہ ناگزیر ہے خصوصاً جمہوری حکومتوں کے لئے کیونکہ وہاں ملک کا کاروبار چلانے کی ذمہ داری تمام تر لوگوں پر ہے - اگر ملک کے ہر باشندے کو کم از کم اتنی تعلیم نہ دی جائے جو اس کو اپنے شہری اور ملکی حقوق و فرائض سمجھنے میں مدد دے سکے تو اس کو ایک ذمہ دار شہری کا رتبہ کیسے دیا جاسکتا ہے اور وہ اپنے رائے دہندگی وغیرہ کے حقوق کا صحیح استعمال کیسے کرسکتا ہے ؟ اس صورت میں ملک میں جاہل اور ناواقف لوگوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائیگی جو باقی لوگوں کے لئے خطرے کا باعث ہوگی - ہندوستان میں آج کل یہ حالت بہت عام اور بہت اندیشہ ناک ہے ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد نہایت کم ہے اور آبادی کا بہت بڑا حصہ ان لوگوں کا ہے جو خواہ اپنے کام میں مستعد اور اچھے ہوں لیکن ابھی ان حقوق و فرائض سے پوری طرح واقف نہیں جو ہندوستانی شہری کی حیثیت سے انہیں اس وقت حاصل ہیں یا بہت جلد حاصل ہونے والے ہیں - اس وجہ سے وہ بہت آسانی سے مختلف قسم کی نا معقول تحریکوں کا شکار ہو جاتے ہیں - ہر طرف سے سختیاں

اور حق تلفیاں سہتے ہیں اور کچھ نہیں کرسکتے - اس صورت حال کو جمہوری نظام حکومت کے قیام کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں - بلکہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاھئے کہ ملک میں بہت تیزی کے ساتھ صحیح تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ جمہور اپنے نئے فرائض کو عمدگی کے ساتھ انجام دے سکیں - یہ مقصد جمہوری حکومت کے قائم ہو جانے سے جلد تر حاصل ہوگا - عملی طور پر سیاسی اور مدنی تعلیم پانے کا موقع اسی صورت میں مل سکتا ہے -

تعلیم اور حکومت کا باہمی تعلق مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوگیا ہوگا - ہم نے بتا دیا ہے کہ بالعموم حکومت پر تعلیم کے متعلق کیا فرائض عائد ہوتے ہیں - لیکن علاوہ اس ظاہری تعلق کے حکومت اور تعلیم کی ماہیت میں بھی ایک گہرا رشتہ ہے جس کو نظام تعلیم سے زیادہ تعلیم کی روح اور غایت سے سروکار ہے - ہم نے پہلے باب میں صراحت کے ساتھ ظاہر کردیا ہے کہ تعلیم کو اپنے ماحول کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا ہے خواہ وہ سیاسی ماحول ہو یا معاشرتی اور اگر اس ماحول میں تبدیلیاں واقع ہوں تو تعلیم کے منشا اور مفہوم پر اس کا اثر یقیناً پڑتا ہے - گذشتہ دو صدیوں میں حکومت کے نظام اور فلسفہ سیاست میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، جن کو انقلاب فرانس نے استحکام اور قبولِ عام بخشا ہے، انہوں نے تعلیم کے نئے نئے مسائل پیدا کردئے ہیں اور اب ہمیں اس پر غور کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ ان سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے تعلیم میں کیا تبدیلیاں لازم ہوگئی ہیں - ہندوستان میں اس مسئلہ کی فوری اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ہمیں عنقریب نظام

حکومت میں ان تبدیلیوں اور ذمہ داریوں سے سابقہ پڑنے والا ہے جو دنیا کے بیشتر ملکوں میں اس وقت پائی جاتی ہیں -

حکومت کا جو تصور آج کل ہمارے ذہن میں ہے وہ اس مفہوم سے بہت مختلف ہے جو پرانے زمانے میں سمجھا جاتا تھا - افلاطون نے نظام حکومت کا جو تخیئلی خاکہ اپنی ریاست میں پیش کیا ہے اس میں اور موجودہ فلسفہ سیاست میں یہ بات ضرور مشترک ہے کہ دونوں حکومت کو افراد کی فلاح اور بہبود کا ضامن سمجھتے ہیں - لیکن افلاطون کے نظریہ حکومت میں ملک کے تمام افراد کے حقوق یکساں نہیں ہیں - وہ جنگ آزماؤں اور حکم رانوں کے لئے تعلیم کا ایک نظام پیش کرتا ہے جس کے ذریعے ان میں اپنے مخصوص فرائض کی ادائگی کی اہلیت پیدا ہو لیکن اس سب سے بڑے طبقے کا کوئی ذکر نہیں کرتا جس میں مزدور اور دولت کمانے والے لوگ شامل ہیں - وہ تعلیم کو حکومت کے اہم ترین فرائض میں شمار کرتا ہے اور ریاست کو ایک اخلاقي جمیعت مانتا ہے - ڈاکٹر ذاکر حسین خاں افلاطون کي " ریاست " کے مقدمے لکھتے ہیں -

" فلاطون سے پہلے بھی عام طور پر یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمیعت مانا جاتا تھا یعني ایسي جمیعت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کي مالک ہو - اس لئے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اِس مشترک متاع روحاني میں

اپنے سب اراکین کو حصہ دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ بنادے جس میں رہ کر ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاع روحانی کے ذریعہ دوسرے افراد سے رشتہ اتحاد پیدا کرے - اس متاع مشترک سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا - فلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے وہ بھی مانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمیعت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انہیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا ہے " [1]

لیکن ریاست کے افراد کو اس نے دو مختلف جماعتوں میں تقسیم کردیا ہے - اس میں ایک جماعت " فلسفی حکمرانوں " یا " فلسفی باد شاہوں " کی ہوگی جن کو بہترین معاشرتی اور انفرادی تعلیم دی جائے گی ' جو عقل مند ' فیاض اور باخیر ہونگے اور رعایا کی ضرورت اور بہتری کو بخوبی سمجھ سکینگے - ان کا فرض یہ ہوگا کہ وہ قانون بناکر ریاست کے لئے انہیں نافذ کریں اور باقی لوگوں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ بے چوں و چرا

[1] افلاطون کی Republic کا ترجمہ " ریاست " کے نام سے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے شائع کیا ہے - دیکھو صفحہ ۱۸ -

اس قانون کی پابندی کریں - کیونکہ وہ عقل کل فلسفی جو قانون بھی بنائیگا ان کی اطاعت لوگوں کے لئے سراسر بہتری کا باعث ہوگی - اس معاشرے کے لئے اس نے وہی نظام تعلیم تجویز کیا جو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - یعنی کچھہ لوگوں کو جن میں اعلیٰ صلاحیت ہو منتخب کرکے ان کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ حکمرانی کے قابل بنیں اور باقی لوگوں کو اطاعت اور فرما برداری سکھائی جائے تاکہ ریاست کے سب کام عمدگی کے ساتھ چل سکیں - یہ کہنا غلط ہے کہ فلاطون کو تعلیم کی تمدنی اہمیت کا احساس نہیں تھا - اس کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کے ماہرین تعلیم کی نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ معاشرے کے قیام اور اس کی اصلاح میں تعلیم کا کیا درجہ ہے - لیکن وہ وقتی اور مقامی حدود سے باہر نہیں نکل سکا اور اس کے خیالات قدرتی طور پر ان حالات سے متاثر ہوئے جو اس زمانے کے معاشرے میں پائے جاتے تھے - اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے ان جماعت بندیوں اور معاشرتی اور اقتصادی اختلافات کو مستقل اور دائمی سمجھہ لیا تھا جن کی وجہ سے اس کے زمانے میں یونانی معاشرہ مختلف طبقوں میں منقسم ہوگیا تھا - یہی وجہ تھی کہ اس نے مختلف جماعتوں کے لئے مختلف قسم کی تعلیم تجویز کی جس کی بنیاد محض نفسی اختلافات پر نہ تھی -

اُس زمانے کے حالات اور نظام معاشرت کے لحاظ سے ہم اس نظام تعلیم کو غیر مناسب نہیں کہہ سکتے گو ہمارے اخلاقی اصولوں کے مطابق وہ قرین انصاف نہ تھہرے - لیکن اس وقت سے اب

تک جو تبدیلیاں واقع ہوئي ہیں انہوں نے ہماری زندگی نے سیاسی ماحول میں کایاپلٹ کردی اور اس کے لئے یہ نظام تعلیم کسي طرح موزوں نہیں ہوسکتا - یہ صحیح ہے کہ اب تک ہماری معاشرت اور تعلیم دونوں میں ایسے اثرات موجود ہیں جنھوں نے معاشرے کو علیحدہ علیحدہ طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اس میں پوری طرح یک جہتي اور باہمی ربط موجود ہیں - لیکن جوں جوں جمہوري نظام مستحکم ہوتا جاتا ہے اور لوگ اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھتے جاتے ہیں یہ تفرقے کم ہو رہے ہیں اور مروجہ رسمی اختلافات بھی مٹ رہے ہیں - سیاسی نقطہ نظر سے تعلیم کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اس تحریک کو قوت پہنچائے اور جمہوریت کو سطحي معنوں میں نہیں بلکہ حقیقی اور گہرے معنی میں ملک میں رائج کرے -

جمہوری حکومت کا تصور سیاست کی تاریخ میں کوئی جدید تصور نہیں - انقلاب فرانس سے پہلے بھی اس کی مثالیں مختلف زمانوں میں بالخصوص اسلام کے ابتدائی دور میں ملتی ہیں لیکن بحیثیت ایک عملی سیاسی نظام کے اس نے انقلاب فرانس کے بعد ہی رواج پایا ہے - اس کی نمایاں سیاسی خصوصیت اور پہچان کیا ہے ؟ شخصي حکومت میں فرماں روائی کی قوت جو کسی ایک شخص کے ہاتھہ میں ہوتی ہے قوم سے بالکل آزاد ہوتی ہے اور فرماں روا ' قوم سے برتر یا جدا سمجھا جاتا ہے - ممکن ہے یہ بادشاہ یا فرماں روا لوگوں کی مرضی اور رضا جوئی کا خیال کرے لیکن اس پر ایسا کرنا لازم نہیں - اُسے اختیار ہے کہ وہ ایسا کرے یا نہ کرے - برخلاف اس کے جمہوری نظام میں کم از کم نظری طور پر قوم کی متفقہ رائے اور ارادے کی حکومت ہوتی ہے یعنی حکومت بجائے ایک خارجی

ارادے کے ایک داخلی قوت بن جاتی ہے جس کی حامل قوم کی نمائندہ جماعتیں ہوتی ہیں - اور اُن کے مشورے سے اور اُن کی نگرانی میں حکومت کے کاروبار انجام پاتے ہیں - سیاسی آزادی کا موجودہ تصور یہ ہے کہ لوگوں کي قوتوں اور صلاحیتیوں کو بے روک ٹوک نشو و نما کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے تربیت یافتہ ارادے اور آزاد رائے سے وہ راہ اختیار کریں جو اپنے لئے اچھی سمجھتے ہیں - اُن پر جبراً ایسے قاعدے اور قوانین عائد نہ کئے جائیں جو دوسرے لوگ اُن کے حق میں اچھا سمجھیں - البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اس آزادي کے استعمال میں دوسروں کی جائز آزادی میں مداخلت نہ کریں - جب ہم اس اصول کا اطلاق تعلیم پر کرتے ہیں تو اُس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام لوگوں کو اس طرح تعلیم دی جائے کہ وہ خود اپنا برا بھلا سمجھیں اور اپنے ذاتی اور معاشرتی فائدے کو اچھی طرح پہچان کر اس کے حصول کی کوشش کریں - بہ‌الفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ جمہوری حکومت کا کاروبار قوم کے تمام بالغ افراد کي رائے دہندگی پر منحصر ہے اور اس میں براہ راست یا بذریعہ نیابت سب لوگ شریک ہیں اس لئے اس میں ہرگز اُس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک جمہور میں ذمہ‌داری اور سیاسی اور معاشرتی معاملات کی سمجھ پیدا نہ ہو - یہ ممکن ہے کہ شخصی حکومت بغیر رعایا کے تعاون کے' بغیر اُن کو تعلیم دئے ایک حد تک کامیاب ہو جائے لیکن جمہوری حکومت کی کامیابی کے لئے ایک وسیع ہمہ گیر اور مناسب نظام تعلیم شرط لازم ہے - انیسویں صدي کے ایک مشہور انگریز مدبر نے کہا تھا کہ " اب ہمیں اپنے آقاؤں کی تعلیم کی فکر کرنی چاہئیے " - اس کا مطلب یہ تھا کہ اب سیاسی انقلاب کی وجہہ سے جماعتوں کی قوت کا توازن درہم برہم ہو گیا اور حکومت کے اختیارات رفتہ رفتہ چند لوگوں کے ہاتھہ سے نکل کر عوام کے ہاتھہ میں

آگئے ہیں جو صدیوں سے جہالت یا بے حسی میں گرفتار ہیں اور اپنی طاقت سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتے - یہ نقطۂ خیال محض جمہوریت کا پیش خیمہ ہے اصل جمہوریت اس وقت شروع ہوتی ہے جب '' آقاؤں '' اور '' نوکروں '' کا یہ امتیاز جس میں استہزا کی جھلک نظر آتی ہے بالکل اُٹھ جائے -

ایک تعلیمی اصول مدت سے یہ چلا آتا ہے کہ '' تعلیم کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے '' اور اس اصول کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مقصد کے لئے حسب ضرورت استعمال کیا ہے لیکن اس اُصول کے سمجھنے میں اکثر لوگ ایک غلطی کرتے ہیں جس کا صاف کرنا ضروری ہے - ہم یہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ایسا زمانہ تو کوئی بھی نہ ہوا جب تعلیم کو سیاست سے نہایت قریبی تعلق نہ رہا ہو - قدیم زمانے سے اب تک ہمیشہ حکومت کی غالب جماعتوں نے یہی کوشش کی ہے کہ مدرسوں کی تعلیم کے ذریعے نوجوانوں کے سیاسی خیالات پر اثر ڈالیں - اس قسم کی اثر اندازی کو ہم تعلیمی لحاظ سے جائز قرار نہیں دے سکتے - نوعمر لڑکوں کے دماغ میں قبل از وقت جب اُن کی قوت فیصلہ میں پختگی نہیں آتی کسی قسم کے سیاسی خیالات ٹھونسنا سراسر نامناسب ہے کیونکہ وہ ان کی آزادی فکر اور دماغی نشو و نما کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے - لیکن یہ اعتراض اس سیاست پر عائد ہوتا ہے جس کا تعلق کسی خاص پارٹی یا جماعت سے ہوتا ہے اور جو بجائے سیرت کی تربیت میں معین ہونے کے عقل اور دماغ کو چند یک طرفہ اور محدود خیالات میں جکڑ بند کر دیتی ہے - سیاست کا ایک مفہوم زیادہ وسیع اور عام ہے جس کا تعلق تمام قوم سے ہے - اس مفہوم کے مطابق سیاسی احساس صحیح حب وطن کی بنیاد ہے - وہ بچوں اور نوجوانوں کو اُن کے حقوق و فرائض

سے آگاہ کرتا ہے اور اُن کے دلوں میں انحصار باہمی اور ذمہ‌داری کے احساس کو تازہ رکھتا ہے - یہ وہ قوت ہے جو کسی ملک یا قوم کے افراد کو ایک رشتہ میں منسلک کردیتی ہے اور اُن اثرات کو جو انتشار کا باعث ہوتے ہیں روکتی ہے - اس سیاست کو کسی حالت میں تعلیم اور مدرسے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ مدرسوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبۂ کو شہریت کی تربیت دیں اور اُن کی تعلیم کو محض رسمی اور نظری علوم تک محدود رکھنے کے بجائے انہیں معاشرت اور سیاست کے زندہ مسائل سے روشناس کریں جو آج کل کی متمدن دنیا میں عموماً اور خود اُن کے ملک میں خصوصاً نہایت درجہ اہمیت رکھتے ہیں - شخصی حکومت کے دور میں سیاست کو مدرسے میں دخل دینا غیر ضروری اور غیر مفید ہے کیونکہ اس حالت میں بے غرضی کے ساتھ اس کام کو انجام دینا تقریباً ناممکن ہے - مگر جمہوری حکومت کے قیام اور استحکام کے لئے صحیح قسم کی سیاسی تعلیم کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ اسی کے ذریعہ سے آئندہ شہری ان تمام مسائل اور فرائض سے واقف ہوسکتے ہیں جو انہیں پیش آنے والے ہیں - اس میں بھی یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر معلموں کا انتخاب اور نصاب تعلیم کی تدوین بہت احتیاط سے نہ کی جائے گی تو شہریت کی تعلیم کے بھیس میں فرقہ وارانہ سیاست کے اثرات طلبہ پر ڈالے جائینگے - لیکن اول تو ہر کام میں جو کرنے کے قابل ہوتا ہے خطرے ہوتے ہیں - مگر ان کی وجہ سے کوئی دانشمند اس کام کو ترک نہیں کرتا بلکہ ان خطرات کو دور کرنے کی تدبیریں کرتا ہے - دوسرے اگر جمہوری حکومت صحیح اصولوں پر قائم ہو اور رفتہ رفتہ لوگوں میں جمہوری ذہنیت پیدا ہو جائے تو اُن کے اغراض و مقاصد میں اس درجہ ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے کہ سیاسی فرقہ بندیوں کے مضر اثرات مقابلۃً کم ہوجاتے ہیں اور سیاست کو مدرسوں

میں دخل دینے میں نقصان کا زیادہ امکان نہیں رہتا - مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ کی وجہہ سے جو کسی نہ کسی شکل میں آج کل ہر ملک میں جاری ہے، ابھی تک صحیح جمہوری ذہنیت پیدا نہیں ہو سکی اور مثلاً انگلستان میں جہاں کم از کم جمہوری ادارے مدتوں سے قائم ہیں آئے دن یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ مختلف پارٹیاں مدرسوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوششیں کرتی ہیں - مگر باوجود اس کے بھی بعض مقاصد تمام جماعتوں میں مشترک ہیں جو باسلوب مناسب شہریت کی تعلیم کے ضمن میں مدرسوں میں سمجھائے جاسکتے ہیں - اور جب ان زبردست سیاسی حریفوں میں ایک حد تک اغراض کی ہم‌آہنگی پیدا ہوگی تو صورت حال بہت بہتر ہوجائے گی - ہندوستان میں باوجود تمام اختلافات کے بھی یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ شہریت کی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہے اور ابھی گذشتہ چند سال کے اندر مختلف تعلیمی محکموں نے اسے مدرسوں میں رواج دیا ہے - صوبجات متحدہ میں ہائی اسکول کی اعلیٰ جماعتوں میں حال ہی میں مدنیات (Civics) نصاب میں داخل ہوئی ہے -

جمہوری حکومت محض اسی وجہ سے دوسری حکومتوں سے مختلف نہیں کہ اس میں ملک کے انتظام کا طریقہ ، حکم رانوں کا تقرر ، اور اختیارات کی تقسیم مختلف ہوتی ہے بلکہ اس کے ماتحت جو معاشرہ نشو و نما پاتا ہے اس کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی ہے - اس معاشرے کے لئے لازم ہے کہ اس کے افراد اور جماعتوں میں باہمی ربط اور میل جول، تبادل خیالات اور شرکت عمل بہت زیادہ ہو اور وہ تمام بندشیں اور حدود جو انسانوں کو انسانوں سے علیحدہ رکھتی ہیں اور

ان کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف طبقوں میں تقسیم کرتی هیں توڑ دی جائیں - یعنی یہ معاشرہ زیادہ متحرک هوتا هے ' تبدیلیوں کو اور جدید اثرات کو جلد قبول کرتا هے اور اس کے ماحول میں جو نئے حالات اس کی اپنی کوششوں یا خارجی اسباب سے پیدا هوتے هیں ان کے مطابق خود کو ڈھالتا رهتا هے تاکہ وہ زمانے کے دوش بدوش ترقی کرے ' اس سے پیچھے نہ رہ جائے - پروفیسر جیمز وارڈ (James Ward) نے اپنی قابل مطالعہ کتاب " نفسیات تعلیم " [1] میں دو قسم کے ماحول میں تمیز کی هے - ایک ماحول وہ هے جس کی حالت کم و بیش یکساں رهتی هے اس میں ایک ایسا مستقل سکون پایا جاتا هے کہ اس میں زندگی بسر کرنے والے اپنی عادتوں اور افعال میں صدیوں تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے - اس قسم کے افراد اور جماعتوں کو وہ ساکن مثالیں (Stationary types) کہتے هیں - برخلاف اس کے بعض افراد اور جماعتیں ایسی هیں جو اپنے ماحول کے ساتھہ اتنی هم آهنگ نہیں هیں کہ اُن کے نظام اور افعال میں تبدیلی کی ضرورت هی نہ هو - ان کو مسلسل نئے تجربوں اور تبدیلیوں سے سروکار رهتا هے - اور یہ جماعتیں اپنی کوشش اور جد و جہد سے ایک طرف تو اپنے ماحول کو زیادہ پیچیدہ اور معنی خیز بناتی هیں اور دوسری طرف اس ماحول کے ساتھہ هم آهنگ هونے کی کوشش میں افراد کی نشو و نما کے سلسلہ کو جاری رکھتی هیں - اس طرح ان "متحرک جماعتوں" (Dynamic Types) میں ایک حرکت پیهم پائی جاتی هے جس کی وجہ سے ان کے تمام اداروں اور نظام زندگی میں تبدیلی اور نشو و نما هوتی رهتی هے - جمهوری معاشرہ اس قسم کی متحرک

[1] Psychology applied to Education -

جماعت کی بہترین مثال ہے کیونکہ اس میں افراد اور جماعتیں برابر اُوپر نیچے آگے پیچھے حرکت کرتی رہتی ہیں - اس کی زندگی مقررہ راستوں پر اور تنگ حدود کے اندر مقید نہیں رہتی بلکہ آزادی کی فضا میں پرورش پانے کی وجہ سے اس میں نئے راستے تلاش کرنے کی آرزو اور نئے تجربے حاصل کرنے کا جوش ہوتا ہے - اِس لئے اس معاشرے میں جو تعلیم دی جائے وہ لازماً ایسی ہونی چاہئے جو نوجوانوں میں جدت اور اپچ کا مادہ پیدا کرے ، اُن کو نامناسب قدامت پرستی سے بچائے اور اُن کی تمام مخفی قوتوں کے لئے نشو و نما اور اظہار کے مواقع پیدا کرے - شخصی حکومت کی کامیابی کے لئے رعایا کی تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ وہ آنکھیں بند کر کے حاکم کے حکم کی تعمیل کرے اور اپنی سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت کو معطل رکھے - لیکن جمہوری حکومت جس کا دار مدار افراد کی ذاتی جد و جہد اور کاوش پر ہے ایسے لوگوں کی طالب ہے جو اپنی عقل اور قوت عمل دونوں سے کام لیں اور اپنے شوق اجتہاد کی بدولت نئے راستوں اور نئے تجربوں کی تلاش میں رہیں - اس قسم کے معاشرے میں جمود پیدا ہوجانا اس کی خرابی کی صریح علامت ہے - مشہور انگریزی مفکر برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی کتاب " تعلیم " (On Education) میں دونوں قسم کے معاشروں کی مثالیں دیتے ہیں - وہ کہتے ہیں [1] کہ چین کا معاشرہ اور چین کی تعلیم اب سے کچھہ عرصہ پہلے تک سکون اور جمود کی نہایت عمدہ مثال تھی - وہاں کی تہذیب نے اپنی انتہائی ترقی کے زمانے میں دو چیزیں پیدا کیں یعنی سکون و استقلال اور آرٹ - لیکن وہ نہ سائنس پیدا کر سکی نہ ترقی کی خواہش اور قابلیت - اس کا ذہنی میلان ایک

---

[1] دیکھو صفحہ ۳۰ -

قسم کے فلسفۂ تشکیک (Scepticism) کی جانب تھا جس میں عقائد کی پختگی اور جوش و خروش نہ پایا جاتا تھا - جہاں کہیں یہ جوش اور حرکت پائی جاتی ہے وہاں اس کا نتیجہ یا تو انتہائی ترقی ہوتا ہے یا تباہی ؛ سکون ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا - پرانی یونانی تعلیم بالخصوص ایتھنز (Athens) کی تعلیم میں یہ بات پائی جاتی تھی - کیونکہ یونانی لوگ چینیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ صاحب قوت اور صاحب حوصلہ تھے - وہ ان دونوں کا فرق سمجھانے کے لئے ایک دل چسپ مثال دیتے ہیں : '' سیاست اور حب وطن کے جوش میں یونانیوں کو اپنی قوت کے اظہار کے عملی موقعے ملتے تھے - جب کوئی سیاسی لیڈر اپنے وطن سے نکال دیا جاتا تھا تو وہ ایک چھوٹی سی فوج جمع کرکے اپنے وطن پر حملہ کردیتا تھا - برخلاف اس کے اگر کوئی چینی افسر معزول کر دیا جاتا تھا تو وہ پہاڑوں میں کوئی جائے پناہ ڈھونڈھ لیتا تھا اور وہاں دیہاتی زندگی کے مسرتوں اور لطف کے متعلق نظمیں لکھتا تھا '' - موجودہ زمانے میں متحرک سوسائٹی کی مثال امریکہ اور یورپ کی بعض اقوام ہیں جنھوں نے سائنس کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیا ہے اور اس کے ذریعے سے وہ قوت حاصل کی ہے جس کے بغیر آج کل کی دنیا میں جہاں مقابلہ اور جنگ و جدل کا دور دورہ ہے بسر ہونی مشکل ہے - موجودہ زمانے میں کامیابی کے ساتھہ زندگی بسر کرنے کے لئے بقول رسل کے اس قسم کے آدمیوں کی ضرورت نہیں جیسے انگلستان کے پبلک اسکول اور پرانی یونیورسٹیاں پیدا کرتی رہتی ہیں - یہ درسگاہیں اعتماد نفس ؛ اعتقاد راسخ ' مضبوطی اور حوصلہ مندی پر زور دیتی تھیں اور عقل ' ہمدردی اور انسانی احساس کو ان صفات پر قربان کردیتی تھیں - اس زمانے میں ایسے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہے '' جن

میں تخیل اور ہمدردی زیادہ ہو ' جن کی عقل میں زیادہ رسائی ہو ' جو معاملات کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکیں ' جن کو کٹنے کی سی بہادری اور استقلال پر کم اور فنی معلومات پر زیادہ بھروسہ ہو''۔

ہمارے لئے اس وقت یہ سوال در پیش ہے کہ ہندوستان میں اس وقت کس قسم کے حالات پائے جاتے ہیں اور ان سے ہمارے تعلیمی مسائل کے متعلق کیا نتیجہ نکلتا ہے - ہندوستان سیاسی لحاظ سے اس وقت تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے - شخصی غیر ملکی اور دفتری حکومت کا باب اب ختم ہوا چاہتا ہے اور دیر سویر ختم ہو کر رہے گا اور اس کے بجائے ملک میں بہت جلد یا کچھ عرصہ کے بعد جمہوری نظام اور ادارے قائم ہونے والے ہیں - اس تبدیلی اور تغیر کے زمانے میں قدیم رسوم و عقائد اور جدید خیالات اور اداروں میں کشمکش ہو رہی ہے - ایک طرف وہ سکون اور قدامت پسندی لوگوں میں باقی ہے جس کی مثال میں رسل نے چینی تہذیب کو پیش کیا ہے اور دوسری طرف زمانے کے حالات اور تقاضے سے متاثر ہو کر ملک میں حرکت اور قوت عمل پیدا ہوگئی ہے جو نئے سیاسی اور تمدنی تجربوں کے لئے تیار اور آمادہ ہے - اس کشمکش کے عرصے میں تعلیم کو نہایت اہم فرائض انجام دینے ہوں - اگر تعلیم کا اثر اور رحجان جمود اور قدامت پرستی کی طرف ہوگا تو نہ صرف آنے والی جمہوری حکومت کا تجربہ نا کامیاب ثابت ہوگا بلکہ علاوہ سیاست کے میدان کے ہمارا ملک زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ترقی نہ کرسکے گا اور دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائیگا - بر خلاف اس کے اگر تعلیم گاہیں اور معلم اپنا تمام اثر جمہوری حکومت اور جمہوری معاشرے کے مناسب ذہنیت پیدا کرنے میں صرف کریں تو اس کے نتائج بہت گہرے اور وسیع ہوں گے کیونکہ ان کی مدد سے نوخیز

نسلیں ان معاشرتی اختلافات اور تعصبات کو دور کر سکیں نئی جو سوسائٹی میں حرکت اور تموج کو روکتے ہیں اور افراد کی مفید صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتے - موجودہ ہندوستانی سیرت کی ایک قابل افسوس کمزوری یہ ہے کہ اس میں حوصلہ، ہمت، اپچ اور مشکلات کو استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کی قوت کم ہے - وہ اپنی ذمہ داری پر بڑے بڑے کاموں کو شروع کر کے ان کو انجام تک نہیں پہنچاتے ہندوستانیوں کے لئے یہ بات باعث ننگ ہے کہ غیر ملکوں کے لوگ اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر ان کے سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچیں اور ان میں ایسے جان پر کھیلنے والے سیاح موجود نہ ہوں جن کے نصیب میں یہ سرخروئی آے - ان کے لئے یہ شرم کا موجب ہے کہ ان کے یہاں کی بیماریوں اور امراض کا علاج معلوم کرنے کے لئے یورپ اور امریکہ کے ماہرین فن جد و جہد کریں؛ اپنا روپیہ صرف کریں، اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالیں اور وہ خود اس جہاد میں پیش پیش نہ ہوں - ان باتوں کے تاریخی وجوہ جو کچھ بھی ہوں اور اس کی ذمہ داری اور الزام جس کسی پر بھی عائد ہو تعلیم کو بہر حال اس خرابی کا علاج کرنا ہے اور ملک کے افراد کو ان دشواریوں اور ذمہ داریوں سے عہدا برآر ہونے کی تربیت دینی ہے جس سے ان کو آگے چل کر سابقہ پڑے گا اور ان میں سائنس کی تعلیم کے ذریعہ تسخیر فطرت اور ترقی کی صلاحیت پیدا کرنی ہے - جب تک تعلیم میں ایک نئی روح نہ پھونکی جاے اور اس کو ان جدید میلانات سے روشناس نہ کیا جائے جو جمہوری معاشرے کا خاصہ ہیں اس وقت تک ہندوستان کی آئندہ حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی ان میلانات میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہیں - ایک تو یہ کہ افراد میں ان تمام صلاحیتوں کو ابھارا جائے جو

ترقی اور حرکت کے لئے ضروری هیں - دوسرے یہ کہ افراد اور جماعتوں میں اغراض اور مقاصد کا ایسا اتحاد پیدا هوجائے کہ ان میں باهمی همدردی اور باهمی احتیاج کا احساس هردم تازہ رهے جس معاشرے میں حرکت هو هر جدید چیز کی اشاعت کے لئے راهیں کهلی هوئی هوں اسمیں یہ انتظام هونا چاهئے کہ اس کے تمام افراد میں جدت کا مادہ اور خود کو حالات کے مطابق ڈهالنے کی صلاحیت پیدا هو - ورنہ وہ ان تبدیلیوں کے گرداب میں پڑکر رہ جائینگے جو انکے گرد و پیش هو رهی هیں اور جن کی اهمیت سے وہ ناواقف هیں" [1] اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری هے کہ سوسائٹی کے هر فرد کی صلاحیتوں کو پوری پوری نشو و نما کا موقع دیا جائے - تاکہ هر طرح کی صلاحیت اور قابلیت رکهنے والے افراد مل کر معاشرے میں ترقی اور تبدیلی کی گنجائش پیدا کریں - یہ تعلیم افراد میں ایک بےرنگ اور بےروح یکسانی کو رواج نہیں دیگی بلکہ ان تمام قوتوں کو ابهارے گی جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممتاز کرتی هیں تاکہ ان رنگ برنگ کے سروں کے میل سے ایک همآهنگ نغمہ پیدا هو - جمهوری تعلیم انفرادیت پر زور دیگی لیکن انفرادیت کی تربیت ایسے معاشرتی ماحول میں کریگی جهاں ایک دوسرے کے تجربات، خیالات اور مشاغل میں شرکت کرکے اور باهمی داد و ستد کی بدولت اس میں تمدنی قدروں اور تعلقات کا احساس مستحکم هو جائے کا جمهوریت کا ایک طرف تو یہ تقاضہ هے کہ هر شخص کو زیادہ سے زیادہ اظهار خودی کا موقع دیا جائے لیکن دوسری طرف یہ شرط هے کہ یہ اظهار اپنے لئے وہ وہ راستے اختیار کرے جو معاشرے کے اعلیٰ ترین مفاد کے منافی نہ هوں بلکہ ان کے حصول میں مدد دیں - هندوستان کی جدید حکومت کا

[1] Dewey : Democracy and Eduction صفحہ ۱۰۲ -

اولین فرض یہ ہوگا کہ وہ تمام سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی وسائل کا جائزہ لے کر ان کو منظم اور مربوط کرے اور ایک وسیع اور مکمل نظام قائم کرے جسکے دامن میں رفتہ رفتہ ملک کی نوخیز نسل کے تمام افراد آجائیں جن کی تربیت اسی احتیاط اور غور کے ساتھ کی جائے جو آج کل صرف بعض اہل ثروت لوگوں کے حصہ میں آتی ہے - وہ تمام دکاوٹیں جو مفلسی کی وجہہ سے ان کے راستے میں حائل ہیں دور کی جائیں اور انہیں بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے تعلیمی اثرات میں رکھا جائے کہ قوم کے جس طبقے میں جہاں کہیں بھی کوئی جوہر قابل پیدا ہو اس کو اعلیٰ ترین تربیت اور نشو و نما کا موقع ملے اور باقی تمام لڑکے اور لڑکیاں اپنی ذہنی استعداد اور رجحان کے مطابق تعلیم پائیں اور اپنی قوتوں کو ذاتی اور قومی مقاصد کے حصول میں صرف کریں - ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہوگا کہ وہ فلسفہ تعلیم کی اور نظریہ تعلیم کی تشکیل کریں اور نصاب، طریقہ تعلیم، اصول ضبط اور مدرسوں کے داخلی اور خارجی نظم و نسق میں مناسب ترمیم کرکے تعلیم گاہوں کو ایسا ماحول بنادیں کہ جو طلبہ وہاں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلیں وہ ہندوستان کے آزاد شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دے سکیں جو اس نئے جمہوری معاشرے میں ان پر عائد ہونگے جس کی تشکیل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے، اگرچہ کبھی کبھی باہمی اختلافات اور مناقشات کی وجہہ سے فضا اس درجہ تاریک اور مکدر ہو جاتی ہے کہ اس میں مستقبل کا روشن رخ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے -

---

حصہ دوم

" درسی تعلیم "

باب اول - علم اور زندگی -

باب دوم—مدرسہ عمل -

باب سوم—ذہنی تربیت -

باب چہارم—تدوین نصاب -

باب پنجم—جسمانی تربیت -

باب اول

"علم اور زندگی"

موجودہ نظریۂ تعلیم اور اس کے اہم ترین اصولوں کو بخوبی سمجھنے کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم مدرسہ جدید کے اس تصور پر نظر ڈالیں جو اس زمانے میں پیدا ہوا ہے اور جس نے جدید تعلیمی خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے - اگر ہمارا مقصد موجودہ تعلیم کے تاریخی ارتقاء کو دکھانا ہوتا تو ہم اس سے بحث کرتے کہ " جدید " خیالات سے مراد یہ نہیں کہ ان کا قدیم خیالات سے کوئی تعلق نہیں یا تعلیم میں دفعۃً کوئی زبردست انقلاب ہو گیا ہے جس کی وجہ سے تمام پرانے آثار مٹ گئے ہیں اور ان کے بجائے ایک بالکل نئی عمارت کھڑی ہو گئی ہے انسانی معاملات کی ہر تبدیلی علت اور معلول کے ایک اٹل ارتقائی سلسلے میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے جس کا سمجھنا اور سمجھانا فلسفے کے طالب علم کا فرض ہے - یہی صورت تعلیمی تبدیلیوں کی ہے - یہ بھی ایک ایسے ہی ارتقا کا نتیجہ ہیں - ان کی جڑیں ماضی کے واقعات اور حوادث میں پوشیدہ ہیں مگر ان کا فوری سبب وہ حالات ہیں جو اس زمانے میں ہمارے پیش نظر ہیں - لیکن اس کتاب میں ہمارا موضوع بحث تعلیم کا تاریخی مطالعہ نہیں بلکہ اصول تعلیم کا تجزیہ اور تشریح ہے اس لئے ہم اس حصے میں مختلف تعلیمی مسائل سے ان بڑے بڑے اصولوں کی ضمن میں بحث کریں گے جس پر موجودہ زمانے کے بہترین تعلیمی خیالات مبنی ہیں - یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی عملی تجویز یا انسانی ادارہ

اپنے نصب العین سے پوری پوری مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ نصب العین کوئی مقررہ منزل نہیں جہاں ہم واقعی پہنچ جائیں بلکہ ایک رہنما ستارہ ہے جو ہماری دسترس سے بلند ہوتا ہے اور ہماری کوششوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے - حصہ اول میں ہم نے تعلیم کی جو غایت بیان کی ہے اس کی حیثیت ایک آئیڈال (نصب العین) کی ہے جس کو تمام و کمال حاصل کرنا امکان سے باہر ہے لیکن مدرسہ جدید کے تعلیمی اصولوں اور رحجانات پر غور کرنے سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہوسکتا ہے کہ ہماری تعلیمی ارتقا کا کیا رخ ہے اور ہماری تعلیم گاہیں کن مقاصد کو پورا کرنے میں کوشاں ہیں - مثال کے طور پر ہمیں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی طریقوں اور کوششوں کا ذکر کرنا ہوگا اور اس طرح ہمیں ان کے تعلیمی تجربات سے بھی آگاہی ہوجائے گی اور ہم یہ اندازہ کرسکیں گے کہ ہمارے اپنے مدارس جدید تعلیمی خیالات کی رو سے کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں -

مدرسہ جدید کی واقعی اہمیت اور حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کے لئے ہمیں بطور پس منظر کے '' مدرسہ '' یا '' سکول '' کے قدیم تاریخی تصور پر ایک سر سری نظر ڈالنی چاہئے تاکہ ہم دونوں کا مقابلہ کر کے سمجھ سکیں کہ تصور میں کون سے عناصر مستقل اہمیت رکھنے کی وجہ سے قدیم زمانے سے اب تک برابر چلے آتے ہیں اور کن امور میں تبدیلی اور ترمیم ہوگئی ہے - ہم تعلیم اور تمدن کی ابتدائی بحث میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ انسانی زندگی کے نظام میں مدرسہ کا آغاز کس طرح ہوا - ابتدا میں لوگوں نے زندگی کی ضروریات سے مجبور ہو کر اپنی اولاد کو بعض وہ چیزیں بتائیں اور سکھائیں جن کے جانے بغیر چارہ نہ تھا یعنی جن پران کی زندگی کا دار و مدار تھا - مثلاً خوراک حاصل کرنے

کے طریقے ' گرمی اور سردی سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی جائے پناہ تلاش کرنا یا بنانا - لباس کی فراہمی' کاشت کرنے ' شکار کھیلنے اور دوسرے ضروری کاموں کے لئے ہتھیار اور آلات تیار کرنا - اس ابتدائی دور میں ان کی توجہ لازماً مادی اشیا اور ضروریات تک محدود تھی - لیکن کچھ زمانے کے بعد مختلف قبیلوں میں رسوم و عبادات ' قانون معاشرت کے طریقوں ' گیتوں اور بھجنوں کا مجموعہ تیار ہو گیا - اور یہ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بھی والدین یا خاندان کے بزرگوں نے خود ہی براہ راست بچوں کو سکھائی ہوں گی - یہ تعلیم کی وہ منزل ہے جس کو مورخین نے '' بے ضابطہ تعلیم '' [1] کے نام سے موسوم کیا ہے اور ابتدا میں تعلیم کی محض یہی ایک صورت تھی - اس وقت پیشوں اور صنعتوں وغیرہ کی تعلیم نوجوان بلا واسطہ عملی طور پر حاصل کرتے تھے یعنی سوسائٹی کے کار و بار میں براہ راست شریک ہوتے تھے - نظری تعلیم جو ابھی تک اتنی مجرد نہ تھی کہ زندگی کے عملی مشاغل سے اس کا تعلق بالکل نظر سے چھپ گیا ہو ' انہیں خاندان ہی میں دی جاتی تھی - لیکن جب رفتہ رفتہ انسان نے اپنے ذوق تجسس کی وجہ سے گرد و پیش کے مظاہر اور اشیا پر توجہ کی اور ان کی خاصیتوں اور تعلقات پر غور کرنا شروع کیا تو اس کی معلومات کا ذخیرہ بڑھا اور مختلف '' علوم '' کی صورت میں مدون ہوا - تب سوسائٹی کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ علوم با قاعدہ طریقہ پر بچوں اور نوجوانوں تک پہنچائے جائیں کیونکہ اب کام کی وسعت اور ذمہ داری اتنی ہو گئی تھی کہ خاندان کے افراد اپنے اور لازمی مشاغل کے دوران میں ضمناً اس تعلیمی فرض کو انجام نہ دے سکتے تھے - اس ضرورت سے مجبور ہو کر '' مدرسے '' قائم کئے گئے جہاں بعض لوگ '

---

[1] Informal Education

جو اسی غرض سے دوسرے معاشی فرائض سے سبکدوش کردئے گئے تھے خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے کہ انھیں نہ صرف تمام مفید ہنر اور عملی کام سکھائیں جو زندگی کے قیام کے لئے ضروری ہیں بلکہ ان نظری علوم سے بھی روشناس کریں جو برابر نشو و نما پا رہے تھے اور انسان کی واقفیت اور قوت میں اضافہ کر رہے تھے - اس طرح تمدنی زندگی کے نظام میں مدرسے نے اپنے لئے جگہ پیدا کی - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس صورت حال پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :—

"جوں جوں تمدن کو ترقی ہوتی ہے بچوں کی صلاحیتوں اور بڑوں کے کار و بار میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوتی جاتی ہے اور بچوں کے لئے یہ بہت مشکل ہوتا جاتا ہے کہ وہ بجز ان مشاغل کے جو بہت سادہ اور آسان ہیں بالغوں کے کاموں میں براہ راست شریک ہو کر کچھ سیکھ سکیں بالغوں کے کام اکثر اتنے پیچیدہ اور بچوں کی سمجھ سے اِس قدر بعید ہوتے ہیں کہ وہ کھیل میں ان کی نقل اتار کر ان کے منشا اور مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے - اس لئے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بچے بڑے ہوکر سوسائٹی کے کار و بار میں مفید طریقے پر شرکت کریں تو یہ ضروری ہے کہ انھیں پہلے سے اس مقصد کے لئے تعلیم دی جائے — اس غرض کو مدنظر رکھ کر باضابطہ تعلیم گاہیں قائم کی جاتی ہیں تعلیمی وسائل اور نصاب وغیرہ کی ترتیب عمل میں آتی ہے اور ضروری چیزوں کے پڑھانے کا کام ایک خاص جماعت کے سپرد کردیا جاتا ہے........جوں جوں سوسائٹی کے ذرائع اور وسائل زیادہ

وسیع اور اُسکا نظم و نسق زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے
مروجہ باضابطہ تعلیم کی ضرورت بھی بڑھتی
جاتی ہے " [۱]

جب مروجہ مدارس قائم ہو گئے تو انکے نصاب اور داخلی تنظیم میں بھی سوسائٹی کی ترقی اور پیچیدگی کے لحاظ سے تبدیلیاں شروع ہوئیں اور ان میں نئے نئے علوم اور مضامین داخل ہوتے گئے - ابتدا میں ان کی تعلیم یقیناً چند مفید دستکاریوں اور رسم و عقائد کے سکھانے تک محدود ہوگی - لیکن جب علم انسانی میں اضافہ ہوا اور وہ ضبط تحریر میں لایا گیا تو لکھنے پڑھنے کی اہمیت زیادہ ہوگئی کیونکہ نوشت و خواند کی قابلیت اب حصول علم کی کلنجی سمجھی جانے لگی - ویلن ٹائن ڈیوس (Valentine Davis) اپنی کتاب "The School Idea" (مدرسہ کا تصور) میں ان عناصر کے اضافہ کا ذکر کرتا ہے :-

" جب انسان کے علم و عقل میں ترقی ہوئی اور اسکو فرصت ' علمی غور و فکر ' اور تخیل کی بلند پروازی کے مواقع نصیب ہوئے تو ادب موسیقی ' آرٹ اور رقص بطور نئے فنون کے مدرسہ کے نصاب میں داخل کئے گئے - اس کے بعد اُسنے مروجہ ضابطہ عمل (یعنی قانون) ' صحیح یا پسندیدہ طرز عمل (یعنی اخلاق) اور ایمان بالغیب یعنی (مذہب) کو علم و تہذیب کے دائرے میں شامل کرلیا - جب بچوں کو یہ علوم سکھائے گئے اور اونھیں انسانیات کو مناسب طریقے پر سمجھنے اور انکی قدر

---

[۱] Democracy and Education صفحہ ۹ -

کرنے کي تعلیم دی گئی تو مدرسے کے موجودہ تصور کی تکمیل ہوگئي [۲]

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسہ کا ابتدائی تصور کیا تھا - اس سے مراد تھی ایک ایسي درس گاہ جہاں طلبہ وہ مفید علوم حاصل کرتے تھے جو زندگي کي بقا اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے کے لئے ضروری تھے اور جن سے ان کے ذوق تجسس کی بھي تھوڑی بہت تشفي ہو جاتي تھی - جب مدرسہ کے تصور کی تکمیل ہو گئی تو اسمیں طلبہ علم کو بغیر کسی خارجی غرض کے بھی، حاصل کرنے لگے کیونکہ اس سے اُنکے نفس کي تہذیب اور ذہن کی تربیت ہوتی تھی اور زندگی کی معنویت میں اضافہ ہوتا تھا - مختصر یہ کہ مدرسے کی توجہ تین قسم کے علوم کی جانب تھي - ایک وہ جو طلبہ کو حصول معاش اور مادی زندگی کی ضروریات کے لئے تیار کرتے تھے ' دوسرے وہ جو انکی عقلی اور ذہنی تربیت میں معین ہوتے تھے ' تیسرے وہ جو انکی اخلاقی تربیت اور سیرت کی تشکیل میں مدد دیتے تھے - اس تدریجی ارتقاء کے ابتدائی دور میں تعلیم کے افادي پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا کیونکہ اس سے براہ راست زندگي کي مادی ضروریات پوری ہوتی تھیں جب علوم کو ترقی ہوئی اور معلمی نے ایک مستقل پیشے کي صورت اختیار کرلی تو نظری اور ذہنی امور پر زیادہ توجہ ہونے لگی یہانتک کہ موجودہ زمانہ میں '' مدرسہ '' کا لفظ '' جائے درس '' کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور درس کے معنی کتابی اور زبانی تعلیم قرار پاگئے - ہمارے ملک میں ابتک اور گذشتہ صدی کے تعلیمی انقلاب سے قبل تقریباً تمام ملکوں میں مدرسہ کا یہ مفہوم تھا کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں طلبہ کو چلد خاص مضامین پڑھائے جاتے ہیں جنھیں معلم یا والدین

---

[۲] صفحہ ۱۲

اپنے نقطۂ نظر سے ضروری سمجھتے ہیں اور جن میں ان کے خیالات کی نشو و نما اور کسی حد تک زمانے کی رفتار کے مطابق ترمیم اور تبدیلی ہوتی رہتی ہے -

مدرسے کے اس تصور کا انحصار چند ایسے فرضیوں پر ہے جن کی تنقید کرنا ضروری ہے کیونکہ موجودہ نظریہ تعلیم کو ان سے اختلاف ہے - اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ علمی ترقیوں اور انسانی زندگی کی موجودہ تنظیم کو مدنظر رکھتے ہوئے قدیم غیر مرتب تعلیم ہماری ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی - وہ تعلیم جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں عملی زندگی میں براہ راست دیجاتی تھی اور اس کا دائرہ بہت ہی محدود تھا - اس کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجودہ تمدنی ذخیرے اور علمی اور عملی خزانے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرنا ممکن نہیں - آج کل کے باضابطہ مدارس میں جو تعلیم کتابوں اور تحریری علوم کے ذریعے دیجاتی ہے اس سے طلبہ کا تجربہ بہت وسیع ہوتا ہے - وہ نہ صرف اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے بلکہ قدیم تصانیف کے مطالعے کے ذریعے تمام عہد کے بہترین تمدنی علمی اور ادبی کارناموں سے واقف ہوجاتے ہیں - لیکن جہاں مدرسہ کی اس نئی تنظیم سے تعلیم میں وسعت اور باقاعدگی پیدا ہوئی ہے وہاں بعض خطرے بھی پیش آئے ہیں - انسان نے اپنی واقفیت اور علم کو محض اپنے حافظے میں یا عمل کی صورت میں محفوظ نہیں رکھا بلکہ اس کو ضبط تحریر میں لے آیا ہے - اس لئے وہ تمام حقائق اور اصول جو بڑے بڑے طویل تجربوں کا نچوڑ ہیں محض چند اصطلاحات یا علامات کے ذریعے بیان کئے جاسکتے ہیں - جو شخص ان تجربوں کو بذات خود حاصل کر چکا ہے اور ان حقائق کا محرم ہے جنھیں یہ علامات ظاہر کرتی ہیں وہ ان سے بخوبی

فائدہ اٹھا سکتا ہے - اس کی نظر میں ان کی وہی حیثیت ہے جو
ایک ماہر فن کے نزدیک مختصر نویسی کی یاد داشتوں کی ہوتی ہے -
وہ ان اشارات پر نظر ڈالتا ہے اور اسکے ذہن میں وہ تمام تجربات اور
واقعات تازہ ہوجاتے ہیں جن کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لئے اس نے
کاغذ کے ایک پرزے پر چند نشانات بنا لئے تھے - لیکن ہم اس بات کو
تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ شخص جو ان تجربوں سے بالکل محروم
رہا ہو اور جسے ان واقعات کے مشاہدے کا موقع نہیں ملا ان الفاظ اور
علامتوں سے اتنا ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے - ممکن ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربات
کی بنا پر قیاس سے کام لیکر لفظوں اور علامتوں کو ایک حدتک معنی
پہنا سکے لیکن جب تک وہ خود ان نتائج تک پہونچنے کی کوشش
نہیں کریگا جو ان الفاظ و علامات میں ظاہر کئے گئے ہیں اس کے
علم میں اصلیت کا رنگ پیدا نہیں ہوگا - اگر یہ بات صحیح نہ ہوتی
تو قطب شمالی کے ایک تجربہ‌کار سیاح کو وہاں کے حالات کا جتنا حقیقی
علم ہے اتنا ہی ایک نوعمر لڑکے کو ہوتا جو پڑھنا سیکھہ کر اس سیاحت
کا سفر نامہ غور سے شروع سے آخر تک پڑھلے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس
کتاب کا ایک ایک لفظ سیاح کی نظر کے سامنے گوناگوں تجربات کی ایک
دنیا لاکر کھڑا کردیتا ہے اور اس کا ذہن فوراً الفاظ سے حقائق کی طرف
منتقل ہو جاتا ہے - بر خلاف اس کے لڑکا کتاب کو اسی حد تک سمجھتا
ہے جس حد تک اس کا محدود تجربہ ان الفاظ میں جان ڈال سکے اور
اس کے نفس میں وہ ذہنی اور جذباتی کیفیتیں پیدا کر سکے جو الفاظ
کے پردے میں پوشیدہ ہیں - اگر بالفرض اس کو ان حالات کا ذرا سا بھی
واقعی علم یا تجربہ نہیں ہے - تو سفر نامے کے الفاظ اس کے لئے محض
اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ اس کے بعض حواس کو عارضی طور

پر متاثر کرتے ہیں اور بس - زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس کا سابق علم وسیع اور تخیل پر زور ہے تو قیاس کے ذریعے سے چند کم و بیش مبہم تصویریں اس کے دماغ کے سامنے آجائیں - اسی طرح کیمیا کی کتاب میں یہ پڑھ لینا کہ کاربونک ایسڈ گیس کاربن اور آکسیجن کے ایک خاص تناسب سے ملنے سے بنتی ہے بغیر عملی تجربے اور مشاہدے کے ایسا ہی ہے جیسا کوئی جادو کے منتر کو دھرائے - ان مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ ذاتی تجربے کی پشت پناہی کے بغیر لفظی تعلیم بالکل ناکافی ہے - معلومات جب تک برتی نہ جائے اور عمل کی کسوٹی پر پوری نہ اترے اسے علم کا درجہ نصیب نہیں ہوتا -

یہ بات بظاہر اتنی صاف اور سیدھی معلوم ہوتی ہے کہ شاید کوئی شخص اس سے انکار نہ کرے گا - لیکن عملاً مدرسے صدیوں سے اس حقیقت کو نظر انداز کرتے رہے ہیں - انہوں نے ذاتی اور بلا واسطہ تجربے کے بجائے الفاظ کی تعلیم کو اپنا منتہائے نظر بنا لیا ہے بلکہ بالواسطہ تجربے کو بھی اپنے نصاب سے بڑی حد تک خارج کردیا ہے - ابتدائی بے ضابطہ تعلیم کا میدان تنگ ضرور تھا لیکن اس میں فائدہ یہ تھا کہ اس کے ذریعے بچے سوسائٹی کے مشاغل میں براہ راست شریک ہوکر ' یا کھیل میں اس کی نقل اتار کر ' جو معلومات بہم پہنچاتے تھے وہ مستقل طور پر ان کی ملکیت اور ان کی شخصیت کا جزو بن جاتی تھی وہ اس کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کیونکہ وہ ذاتی کاوش اور عملی تجربے سے حاصل کی ہوئی چیز ہوتی تھی - جب کتابی تعلیم کا دور شروع ہوا تو علم کا تعلق روز مرہ کے کاروبار اور تجربات سے کم ہونے لگا ' مدرسے میں الفاظ اور اصطلاحات پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور اس کا یہ اصل مقصود پس پشت ڈالدیا گیا کہ وہ طلبہ

کے لئے مفید ترین اور اہم ترین تجربات کے مناسب۔مواقع بہم پہنچائے - زمانہ حال کے بہت سے تعلیمی مفکرین نے اس خرابی کو محسوس کیا ہے اور تعلیم جدید کی کوشش یہ ہے کہ مدرسے اور زندگی کا ٹوٹا ہوا رشتہ نئے سرے سے جوڑا جائے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے فلسفہ تعلیم کا مقصد تمام تر یہی ہے وہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوے لکھتے ہیں :—

" ترقی یافتہ تمدن میں جو باتیں بچوں کو سیکھنی ہوتی ہیں وہ زیادہ تر اصطلاحی علامتوں کی شکل میں مرتب اور محفوظ ہوتی ہیں انہیں معمولی جانی بوجھی چیزوں اور کاموں کی صورت میں تحویل نہیں کرتے اس قسم کا تعلیمی مواد زیادہ تر سطحی اور اصطلاحی ہوتا ہے اور حقیقی واقعات اور زندگی کے مقابلے میں اصلیت سے خالی نظر آتا ہے اصلیت کا معیار یہ ہےکہ کسی چیز کو عملی معاملات سے کس حد تک تعلق ہے - اس تعلیمی مواد کی ایک علیحدہ دنیا ہوتی ہے جہاں خیال اور اظہار خیال کے عام طریقے کام نہیں دیتے - اندیشہ یہ ہے کہ مدرسوں کے نصاب پر رسمی تعلیم کا مواد حاوی ہو جائیگا ، اس کا ربط زندگی کے تجربات سے قائم نہ ہوگا ، مستقل معاشرتی مقاصد نظر انداز کردئے جائیں گے اور ان چیزوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہو گی جن کی تمدنی زندگی کے نظام میں کوئی جگہ نہیں بلکہ ان کا تعلق محض اصطلاحی علوم سے ہے - اس طرح ہمیں تعلیم کا عام مروجہ تصور حاصل ہوتا ہے جس میں اس کی معاشرتی غرض اور نتائج فراموش کر دئیے جاتے ہیں اور اس کا لحاظ نہیں رہتا کہ تعلیم کا موضوع انسانوں کے وہ تمام باہمی تعلقات اور مراسم ہیں جو

ہماری شعوری زندگی پر اثر ڈالتے ہیں بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم دور از کار معاملات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے اور لفظی علامتوں کے ذریعہ علم سکھانے کا نام ہے گویا وہ محض نوشت خواند تک محدود ہے - لہذا فلسفہ تعلیم کا ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ارادی اور غیر ارادی؛ رسمی اور اصلی تعلیم میں کسی طرح مناسب توازن قائم رکھا جائے - محض معلومات کا ذخیرہ بہم پہنچانے اور اصطلاحی اور ذہنی مشق حاصل کر لینے سے انسان کے نفس میں معاشری احساس پیدا نہیں ہوتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روز مرہ کے تجربات معنویت سے خالی ہوتے ہیں اور مدرسے میں طلبہ جو کچھ سیکھتے ہیں اس سے ان میں محض ایک خاص قسم کی تیزی اور ہوشیاری اور ماہرین خصوصی کی سی خود پسندی پیدا ہوجاتی ہے - جوں جوں مدرسہ محض ایک اصطلاحی درس گاہ بنتا جاتا ہے یہ مسئلہ زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم کے ان دونوں پہلوؤں میں کس طرح تعلق قائم رکھا جائے یعنی اس چیز میں جو لوگوں نے بالارادہ کوشش کرکے سیکھی ہے اور اس میں جو انہوں نے غیر محسوس طریقہ پر دوسروں کے ساتھ میل جول کے ذریعہ اپنی طبیعت اور سیرت کی تشکیل کے دوران میں حاصل کی ہے [1]

ان الفاظ سے واضح ہوجاتا ہے کہ مدرسہ جدید اور مروجہ مدارس کا پہلا نمایاں فرق کیا ہے - مدرسہ محض ایک جائے درس نہیں جہاں ہم سوسائٹی کی زندگی اور مشاغل سے قطع نظر کرکے طلبہ کے دماغوں میں اصطلاحی معلومات کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں جس کا ان کی روزمرہ کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا - مدرسہ در اصل وہ ماحول ہے جہاں بچوں کی زندگی کے گوناگوں اور پیچیدہ تجربات ایک منتخب اور منظم شکل

---

[1] Democracy and Education صفحہ ۱۰

میں حاصل ہوسکتے ہیں - اگر وہ ان تجربات کو براہ راست حاصل کرتے تو اس میں بہت وقت ضائع ہوتا اور یہ باقاعدگی اور نظم پیدا نہ ہو سکتا - مدرسہ جدید کا ایک اساسی اصول تجربے کی اہمیت کا احساس ہے اور موجودہ تعلیمی طریقوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم کی بنیاد ذاتی اور بلا واسطہ تجربے پر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی مکتبی زندگی اصلی اور عملی زندگی بن جاوے -

اس نقطہ نظر سے مدرسہ ایک ایسا ماحول ہے جس کا مقصد اول یہ ہے کہ طلبہ اس میں عمدہ اور خوشگوار زندگی بسر کریں اور ثانوی مقصد یہ ہے کہ اس زندگی کے دوران میں بعض مفید علوم اور ہنر حاصل کریں - مدرسہ میں بچہ محض پڑھنے لکھنے کے لئے نہیں آتا بلکہ اپنا وقت ایسے خوشگوار ، مفید اور محنت طلب مشاغل میں صرف کرنے کی غرض سے جو اس کے شوقوں کو ابھاریں اور ان کی ابتدائی غیر منظم شکل کو بدل کر ان میں تربیت اور تنظیم پیدا کریں - یہ خیال ایک تعلیمی انقلاب کا پیش خیمہ ہے - اس کو تسلیم کرنے سے مدرسے کے مروجہ طریقہ تعلیم نصاب اور ضبط و نظم میں بہت کافی ترمیم لازم آتی ہے - عام طور پر مدرسوں اور تعلیمی افسروں نے مدرسوں کی تنظیم ایک محدود علمی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کی ہے تاکہ طلبہ لکھنا پڑھنا اور چند ضروری مضامین سیکھ لیں - لیکن اگر ہم مدرسے کو زندگی کے تجربات کا مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں بچے آزادی کے ساتھ مختلف قسم کے کام کریں آپس میں ملیں جلیں ، ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے واقفیت حاصل کریں اپنے لئے وہ مشاغل انتخاب کریں جو ان کی طبیعت کے رجحان کے موافق ہوں اور انہیں تنہا یا دوسروں کی مدد سے تکمیل کو پہنچائیں - اس میں ایسے محرکات موجود

ہونے چاهئیں جو خود بخود رفتہ رفتہ طلبہ کو مختلف قسم کے علمی اور عملی مقاصد کی طرف کھینچیں اور وہ وسائل اور ذرائع بھی جو ان مقاصد کو انجام تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوں - اگر ہم یورپ یا امریکہ کے کسی "مدرسہ جدید" کا معائنہ کریں۔ اس قسم کے بہت سے مدارس اس زمانے میں انگلستان، جرمنی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں تو ہمیں اس کی ظاهری حیثیت، ساز و سامان اور عمارتوں ہی سے یہ اندازہ ہوجائیگا کہ قدیم نظام تعلیم بالکل بدل گیا ہے - جہاں پہلے سوائے چند دریوں، یا بنچوں، میزوں یا کرسیوں کتابوں اور نقشوں کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی وہاں اب حسب استطاعت سائنس اور دستکاریوں کے لئے بڑے بڑے معمل مشینیں، جانوروں اور پودوں کے نمونے، باغات، تیراکی کے لئے حوض، ورزش کے لئے جمنازیم، عمدہ عمدہ تصویریں، طلبہ کے آرام کرنے کے لئے کمرے، جلسہ گاہیں، بڑے بڑے کتب خانے جہاں علاوہ درسی کتابوں کے مستند تصانیف، حوالے کی کتابیں، فرصت میں پڑھنے کے دلچسپ قصے وغیرہ، غرض وہ تمام چیزیں ملیں گی جو مدرسوں سے باہر متمدن ممالک کے باشندوں کو نصیب ہیں یا ہونی چاهئیں - اس تکلیف اور اهتمام کا مقصد نمود نہیں بلکہ یہ ہے کہ طلبہ مدرسے کی زندگی کے دوران میں اپنا وقت اس طرح صرف کریں کہ ان کی زندگی تجربات سے مالا مال ہو، جوان کے لئے خوشی کا سرمایہ ہوں، ان کی جسمانی اور ذهنی قوتوں کو نشو و نما دیں اور ان کو آگے چل کر تمدنی زندگی میں شرکت کرنے کے قابل بنائیں - ہم ایک گذشتہ باب میں اس امر کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ بچوں سے کسی مستقبل بعید کی خاطر کام کرنے کی توقع رکھنا سراسر نادانی ہے - نفسیات کی تعلیم اور روزمرہ کا تجربہ دونوں اس کی تردید کرتے ہیں - بالغ، تجربہ‌کار لوگ بھی جو اپنے برے بھلے کو سمجھ سکتے ہیں اور اپنے پختہ تجربے اور تخیل کی وجہ سے مستقبل کا زیادہ

واضح تصور کرسکتے ہیں، بالعموم بعید مقاصد اور اغراض کی خاطر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے - پھر بچوں سے یہ کیسے توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے فوری اور موجودہ شوق اور دل چسپیوں سے منہہ موڑ کر دور و دراز مقاصد اور امیدوں کی خاطر، ایسے کاموں میں اپنا دل لگائیں جو ان کو بذات خود اچھے نہیں معلوم ہوتے "اچھے" سے ہماری مراد یہ نہیں کہ وہ بالغوں کے نقطہ نظر سے اخلاقی خوبی رکھتے ہوں - بچوں کے لئے ہر وہ کام 'اچھا' ہے جس میں انہیں اپنی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے اور اس سے انہیں خوشی اور احساس قوت حاصل ہو - تعلیم کا یہ کام ضرور ہے، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، کہ وہ بچوں کو زندگی کے لئے تیار کرے لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ہمیشہ کسی آنے والے زمانے کی یاد سے بچوں کو بہلاتی رہے - اس کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ بچپن اور نوجوانی کے زمانے میں ان کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں کہ وہ اپنی فطرت اور جبلی خواہشات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مفید عادتیں اور علم و ہنر سیکھیں - معلم کو چاہئے کہ ہمیشہ بچوں کی زندگی اور موجودہ رجحانات کو نقطہ آغاز بنائے کیونکہ فطرتاً ان کی دلچسپی کا مرکز زمانہ حال ہوتا ہے - ان کی نظر میں مستقبل کی کوئی فوری اور شدید اہمیت نہیں ہوتی - اگر ان کے مطالعے اور مشاغل کے لئے ایسی چیزوں کو عمل کا محرک بنایا جائے جو ان کی نفسی کیفیت اور خصوصیات کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کی موجودہ زندگی کو دلچسپ اور معنی خیز بناتی ہیں تو وہ مدرسے میں اپنی پوری جسمانی اور ذہنی قوت کام میں لائیں گے ورنہ وہ پڑھنے لکھنے کا کام بیدلی سے بغیر مقصد کو سمجھے ہوئے کریں گے اور اُن کی ذہنی حالت میں انتشار رہے گا - معلم کو مجبور ہو کر ان

تحریصوں اور ترغیبوں سے کام لینا پڑیگا جو مضرت سے خالی نہیں - کبھی وہ انہیں سزا کی دھمکی دے گا، کبھی امتحان میں ناکامی کی بھیانک تصویر دکھائے گا، کبھی والدین اور دوستوں کی ناراضگی اور شرمندگی اور آگے چل کر خود ان کی پشیمانی اور افسوس کا خیال دلائے گا، یہ نہیں تو طرح طرح کے لالچ سے انہیں پھسلائے گا - نمبروں کا اور درجہ کا خبط جو ہمارے نظام تعلیم پر اس درجہ حاوی ہے، انعاموں کی تقسیم اور اس کی حد سے زیادہ اہمیت طلبہ کی باہمی مسابقت اور اس قسم کی تمام چیزیں جو ہمارے مدرسوں کے نظام کا جزو ہو گئی ہیں جب کی ضرورت اسی وجہ سے پڑتی ہے کہ طلبہ کو اپنے مقررہ کام سے کوئی واقعی نفسی تعلق نہیں ہوتا کیونکہ اس کی بنیاد ان کے شوق اور جبلت، ان کی خواہش عمل اور ان کے ذوق تجسس پر نہیں رکھی گئی - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں کام کو کام کی خاطر کرنے کی خواہش اور اس سے خوشی حاصل کرنے کا مادہ پیدا نہیں ہوتا - ان کی خواہش عمل مردہ ہو جاتی ہے اور وہ تمام عمر اس کا خمیازہ بھگتے ہیں - غرض کام کو کسی خارجی مقصد کی خاطر جبراً طلبہ پر عائد کرنا تعلیمی اور نفسی اعتبار سے سراسر قابل اعتراض ہے - اگر طلبہ کا ماحول ساز گار ہو، جو کام ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے وہ ان کے رجحانات سے مناسبت رکھتا ہو اور مقصد کار ان کی سمجھ اور استعداد سے باہر نہ ہو تو ان کی طبیعت میں مطالعہ کا شوق اور علم و ہنر حاصل کرنے کی خواہش خود بخود پیدا ہوگی - مدرسے کے اندر باہر کے حالات ایسے ہوں کہ ان میں بچے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اُٹھا سکیں تو مستقبل کے لئے اہتمام اور فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں - معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ اُن کے موجودہ مشاغل اور تجربات کو جس قدر پرمعنی اور سبق آموز بنا سکے بنائے، یعنی ان کا سلسلہ تمدنی حالات مواقع اور محرکات عمل سے ملا دے - اور ان کی تربیت

اور تنظیم اس طرح کرے کہ وہ نہ صرف بچوں کی موجودہ خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کر سکیں بلکہ آگے چل کر اپنی مکمل شکل میں افراد اور سوسائٹی دونوں کے لئے مفید ثابت ہوں ۔

مدرسہ کا یہ جدید تصور علم حاصل کرنے کے طریقے پر بھی روشنی ڈالتا ہے ۔ علم اور زندگی میں جو فصل پیدا ہو گیا ہے اس کی وجہ سے مدرسوں میں تحصیل علم مقصود بالذات بنا لی گئی ہے اور اس کے لئے بعض اصطلاحی طریقے تجویز کئے گئے ہیں ۔ وہاں بچوں کا کام ہے پڑھنا ، لکھنا تاریخ ، جغرافیہ ، ریاضی وغیرہ درسی مضامین کا مطالعہ کرنا ۔ انہیں اس سے کچھہ غرض نہیں کہ اس تمام محنت اور کاوش کا جو ان مضامین کے یاد کرنے میں اتھانی پڑتی ہے ان کی موجودہ یا آئندہ زندگی سے کیا تعلق ہے ۔ حروف تہجی کا پہچاننا بھی ان پر اسی طرح فرض ہے جیسے مثلاً پانی پت کی لڑائیوں کی تاریخ یاد رکھنا یا امریکہ کے دریاؤں کے نام جاننا ۔ ہمیں ان مضامین کی اہمیت سے انکار نہیں بلکہ کوئی سمجھہ دار انسان بھی اس سے منکر نہیں ہوگا ۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ یہ سب مضامین ان کی نموپذیر زندگی اور تجسس پسند طبیعت میں خود بخود جذب ہونے کے بجائے ان پر استادوں کی یا محکمہ تعلیم کی طرف سے ایک مقررہ نصاب کی شکل میں عائد کو دئیے جاتے ہیں ۔ طلبہ کے لئے ان کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے ۔ اس صورت میں ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان علوم کو حاصل کرنے سے ان کی عملی یا ذہنی زندگی پر کوئی اثر پڑیگا یا وہ ان کی تحصیل میں اپنی خوشی اور شوق سے محنت کریں گے ۔ موجودہ اصول تعلیم اس بارے میں یہ ہے کہ علم صرف اس صورت میں مفید اور پائدار ہو سکتا ہے جب اس کی ضرورت قدرتی طور پر زندگی کے مشاغل اور

کار و بار کے دوران میں پیدا ہو اور طالب علم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسے حاصل کرے - ہماری روز مرہ کي تمدني زندگي میں یہي اصول کار فرما ہے اور لوگ جو کچھہ سیکھتے ہیں وہ انہیں حالات اور شرائط کے ماتحت سیکھتے ہیں - ہم کسي راہ چلتے شخص کو خواہ مخواہ جبر و مقابلہ یا سائنس کے مطالعے پر آمادہ نہیں کر سکتے - برخلاف اس کے اگر اس کے مشاغل زندگي ایسے ہیں کہ اسے اپنے فرائض کي ادائگي کے لئے جبر و مقابلہ یا سائنس کی ضرورت محسوس ہوتي ہے تو وہ خوشي کے ساتھہ انہیں حاصل کرے گا - اور چاہے جتني محنت کرنا پڑے اس سے جي نہیں چرائے گا - لیکن بغیر ان علوم کي ضرورت محسوس کئے ' بغیر اپني زندگي کے ساتھہ اس کا تعلق پہچانے وہ ہرگز ان کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنائے گا - وہ لوگ بھي جو دراصل " علم کو علم کی خاطر " حاصل کرتے ہیں اپنے ذوق تجسس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس منزل تک پہنچتے ہیں جہاں وہ علم کو مقصود بالذات بنا سکیں اور ان کے لئے کسی علم کے میدان میں جدید تحقیقات کرنا واقعاً ایسا ہی " مفید " اور تشفی بخش ہوتا ہے جس طرح مثلاً کسی موچی کے لئے چمڑا رنگنے کا ایک نیا اور بہتر طریقہ معلوم کرنا - ان کے لئے " افادے " کا مفہوم عام لوگوں سے مختلف ہوجاتا ہے - جب سوائے بڑے بڑے عالموں کے کسی شخص کے لئے بھی یہ بات آسان نہیں کہ تحصیل علم کو اپنا مقصود زندگی بنا سکے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بچے جن کی توجہ بہت منتشر اور نظر بہت محدود ہوتی ہے سالہا سال محض تحصیل علم کو اپنا منتہائے نظر بنا کر مدرسے کے سب کام انجام دیں - مدرسے کے پہلے چند سال میں جب خاص طور پر اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بچوں کے درسی مشاغل ان کے لئے دلچسپ بنائے جائیں اور وہ اس قابل بھي نہیں ہوتے کہ

حصول معاش کی آرزو ان کی محرک عمل بن سکے ' ان کے سامنے بالعموم کوئي ایسا مقصد پیش نہیں کیا جاتا جس کو وہ سمجھہ سکیں عام طور پر لوگ نئی چیزیں اور نئے ہنر اس طرح سیکھتے ہیں کہ وہ کسي کام میں مشغول ہوتے ہیں جو بلمفسه ان کو مرغوب ہے اور اس کے ضمن میں یا اس کے نتیجہ کے طور پر کوئی نئی بات معلوم ہوجاتی ہے -
اس اصول کو واضح کرنے کے لئے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) ایک چھوتے بچے کی مثال دیتے ہیں کہ وہ چلنا یا بولنا کس طرح سیکھتا ہے - بچہ شعوری طور پر یہ ارادہ کرکے بات چیت نہیں کرتا کہ میں گفتگو کا فن سیکھہ لوں یا یہ قصد کرکے نہیں چلتا کہ مجھے چلنا پھرنا آجائے بلکہ اسے خود بخود دوسرے لوگوں کے ساتھہ میل جول کرنے ان سے تعلقات قائم کرنے کي خواہش ہوتی ہے - وہ اس فطری خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں پہلے اپنے توتے پھوٹے الفاظ کے ذریعے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے - اس کے بعد ہستہ آہستہ پیہم کوشش اور مشق کے دوران میں اسے بے تکلف بات چیت کرنی آجاتی ہے - اس طرح اسے خواہش ہوتی ہے کہ بڑھ کر کھلونے کو یا کسي اور چیز کو ہاتھہ میں لے ' یا اپنے کسی عزیز کے پاس جائے یا ایسي ضرورت آپڑتی ہے کہ اپني جگہ سے ہت کر کسي بہتر اور زیادہ محفوظ جگہ پہنچ جائے - اس خواہش یا نفسي ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ حرکت شروع کرتا ہے - پہلے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہے اس کے بعد جب مشق بڑھ جاتي ہے تو کسی قدر تیزی اور رواني پیدا ہو جاتی ہے - یہاں تک کہ چلنا پھرنا اس کا روز مرہ کا معمول ہو جاتا ہے ' جس سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق کام لیتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لئے سیر و سیاحت کرنا خود ایک دلچسپ اور پر لطف مشغلہ بن جاتا ہے - ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ ہم بچوں کی

نفسی کیفیات اور اعمال کا مطالعہ کریں یا بڑوں کی حرکات کو دیکھیں دونوں صورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ کسی عمل یا مشغلے کے دوران میں بطور اس کے ضمنی نتیجے کے سیکھتا ہے وہ کسی خاص ہنر کی تحصیل کو اپنا مقصد نہیں بناتا - برخلاف اس کے ہمارے مدرسوں میں عام طور پر اس قدرتی اور معقول طریقے کے بجائے دور ازکار اور خلاف فطرت طریقے استعمال کئے جاتے ہیں - بچہ کی توجہ ہمیشہ براہ راست ان چیزوں کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے جو انہیں سیکھنی ہیں خواہ وہ بالکل نہ سمجھیں کہ ان کی زندگی اور مشاغل سے ان کا کیا تعلق ہے - نصاب کے مضامین اور معلومات کے ذریعے ان کے ذوق عمل کی تسکین نہیں کی جاتی کہ ان میں مفید عادتیں پیدا ہوں ، ان کی قوت اور بصیرت میں اضافہ ہو اور وہ اپنی دماغی ترقی اور نشو و نما کے احساس سے خوشی حاصل کریں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی معلومات بالکل سطحی اور سرسری رہ جاتی ہیں اور ان کے افعال و اخلاق پر اس کا کچھہ اثر نہیں پڑتا -

مدرسہ جدید کی جو خصوصیت ہم نے اوپر بیان کی ہے اس کی تشریح چند مثالوں سے ہو جائیگی - بچوں کو فطرتاً کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے اور ہر گھر میں ماں یا بہن چھوٹے بچوں کو کہانیاں سناتی ہیں - جب بچہ کسی ایسے مدرسہ میں داخل ہوتا ہے جو معقول تعلیمی اصولوں پر چلایا جا رہا ہے تو معلم اس شوق کو تعلیم کا محور بنا کر اسے طرح طرح کی دل چسپ کہانیاں سناتا ہے جو اس کی معلومات اور رجحانات میں غیر محسوس طور پر وسعت پیدا کرتی ہیں - پھر ممکن ہے وہ بجائے زبانی کہانیاں سنانے کے کسی کتاب میں سے کہانیاں پڑھہ کر سنائے - اگر کہانیوں کا انتخاب صحیح اور موزوں ہے تو بچے کو یقیناً اس سے

دل چسپي پیدا ہوگی ، اور وہ خود انہیں کہانیوں کو یا اپنی بنائي ہوئی کہانیوں کو اپنے ساتھیوں کو سنائے گا اور اس کی بدولت اس کی قوت بیان کی تربیت ہوگی - رفتہ رفتہ اس میں یہ خواہش بھی پیدا ہوگی کہ وہ خود ان کہانیوں کو کتابوں میں پڑھہ سکے تاکہ نئي نئی کہانیاں سننے کے لئے وہ استاد کا محتاج نہ رہے اور اس کا کہانیوں کا ذخیرہ بہت وسیع ہوجائے - لیکن وہ اس خواہش کو اس وقت تک پورا نہیں کر سکتا جب تک پڑھنا نہ سیکھے - اگر اس کي طلب صادق ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بخود پڑھنے کي طرف مائل ہوگا - اس کو زبردستی حروف تہجی اور ان کی ترکیبوں کی دشوار گزار منزلوں میں سے گھسیٹنا نہیں پڑیگا بلکہ وہ اپنی خوشی سے اور محنت کرکے مشکلات پر قابو پائے گا - کیونکہ ان کو سیکھہ لینے سے اسے اپنے ایک ذاتي مقصد کے حصول میں مدد ملے گی - وہ قاعدے کو اور انمل بے جوڑ جملوں کی کتابوں کو اس خیال سے نہیں پڑھے گا کہ اسے پڑھنے کا فن سیکھنا ہے بلکہ اس مقصد سے کہ اس قابلیت کو حاصل کرتے ہی وہ فوراً ان قصوں کو پڑھہ سکیگا جن کی خاطر اس نے یہ تمام محنت اُٹھائی ہے - اس کو معلوم ہوگا کہ میرے مطالعے کا کیا مقصد اور کیا فائدہ ہے اور وہ قدرتاً یہ محسوس کرے گا کہ میں مدرسے میں جو کچھہ سیکھہ رہا ہوں وہ کسی نامعلوم مصلحت یا مستقبل بعید کی خاطر نہیں ، بلکہ خود اپني موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہے - یہي حال نصاب کے اور تمام مضامین کا ہے ان کے مطالعے کو چھوٹے بچوں کے لئے ایک مستقل مقصد بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بد شوق اور بے توجہ ہو جاتے ہیں اور انہیں نصاب بالکل غیر دل چسپ معلوم ہوتا ہے - مدرسۂ جدید کی کوشش یہ ہے کہ وہ بچوں کو ابتدا سے ایسے مشاغل میں لگائے جن کو انجام دینے میں خود بخود اور قدرتی طور پر ان مضامین کو پڑھنے اور سیکھنے کی ضرورت محسوس ہو یعنی وہ اس کے

ذاتی تجربات کو وسیع تر اور با معنی بنانے میں ممد ہیں - یہی وجہ ہے کہ منصوبی طریقے (Project Method) میں مدرسے کے کام کی بنیاد ہمارے مروجہ مدارس کی طرح ''سبقوں'' پر نہیں رکھی گئی - ان سبقوں کے بجائے طلبہ مختلف قسم کے باقاعدہ مرتب کئے ہوئے اور خود ان کے پسند کئے ہوئے کاموں (Occupations) پر لگائے جاتے ہیں - ان مشاغل کے دوران میں انہیں اپنے علم اور واقفیت کو بڑھانے اور ہاتھ سے کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور منصوبے بنانے اور ان کو پورا کرنے کے وسائل سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے - مثلاً مدرسے میں دوکان چلانا ، پوسٹ آفس قائم کرنا ، مکان بنانا ، باغ بانی کرنا - بچوں کو ایسے کاموں سے فطرتاً دل چسپی ہوتی ہے کیونکہ یہ ان کی بعض اہم جبلتوں سے تعلق رکھتے ہیں - اور بالخصوص دو نمایاں ذہنی رجحانات ، یعنی جبلت تعمیر اور جبلت تعاون کو اظہار کا موقع دیتے ہیں - ان کاموں میں ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنے حواس ، اپنے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو ایک مسلسل کام کی تکمیل میں لگاتے ہیں مثلاً کسی تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہیں یا خارجی اشیا اور ذرائع کو مرتب کرکے کوئی مفید اور نئی چیز تیار کرتے ہیں جس سے ان میں مسرت اور کامیابی کا احساس پیدا ہوتا ہے جو شخصیت کی تربیت میں بے حد مدد دیتا ہے - اس میں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس قسم کے کاموں میں ان کو اپنے دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ مل جل کر چیزیں بنانے ، معاملات پر غور کرنے اور منصوبوں کو عمل میں لانے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں جس سے ان کی معاشری تربیت عمل میں آتی ہے - ان تمام مشاغل کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے انہیں مختلف قسم کی معلومات درکار ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے وہ بڑے شوق سے اپنے استادوں اور دوستوں یا کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جس طرح ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ضرورت کے وقت اخباروں ، کتابوں

اور دوسرے لوگوں سے مشورہ لیتے ہیں - اس صورت میں طالبعلم کا ریاضی سیکھنا، یا کسی ملک کا جغرافیہ پڑھنا یا دوکان کا کاروبار چلانے کے لئے تجارتی معلومات حاصل کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی لین دین کرنے والا یا تجارت فروش اپنی کاروباری ضرورت سے اخبار میں بازار کے نرخ کا مطالعہ کرتا ہے - اس پر کوئی شخص جبر نہیں کرتا کہ وہ ان خشک اعداد میں سر کھپائے لیکن چونکہ اسے اپنی دوکان کی کامیابی کی فکر ہے اس لئے اس کے نقطہ نظر سے وہ اعداد و شمار غیر دلچسپ نہیں ہوتے بلکہ نہایت معنی خیز ہوتے ہیں اور وہ ذہنی ان کے مطالعہ میں دماغ سوزی کر سکتا ہے - یہ مثال ان تمام علوم اور معلومات پر صادق آتی ہے جو لوگ عام طور پر اپنی خوشی سے حاصل کرتے ہیں - یہ چیزیں واقعی اور حقیقی طور پر ان کی ملکیت ہو جاتی ہیں اور چونکہ اکثر اور براہ راست استعمال میں آتی رہتی ہیں اس لئے ان کا اثر ان کی زندگی اور سیرت پر بھی پڑتا ہے - یہی حال نو عمر بچوں اور نوجوانوں کا ہے جو بالطبع "مصرف پسند" (pragmatist) اور "افادیت پسند" ہوتے ہیں - وہ ہر چیز کے متعلق یہ سوال کرتے ہیں: اس سے میری ذات کو یا دوسروں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ اس کا مصرف کیا ہے؟ چھوٹے بچے تو ہمیشہ صاف صاف اس قسم کی باتیں پوچھتے ہی رہتے ہیں - یہاں تک کہ شروع میں ان کے ذہن میں ہر چیز کا تصور اس شکل میں قائم ہوتا ہے کہ اس سے کیا کام نکل سکتا ہے - کرسی ان کے لئے کسی خاص مستقل شے کا نام نہیں وہ "بیٹھنے کے لئے" ایک چیز ہے - کلک یا قلم سرکنڈے کا ٹکڑا نہیں جو ایک طرف سے ترشا ہوا ہو بلکہ "لکھنے کے لئے" ایک آلہ ہے - جب وہ سن شعور کو پہنچتے ہیں تو چاہے صاف طور پر اس قسم کے سوال نہ کریں کہ فلاں چیز یا فلاں مضمون ہمارے کس کام کا ہے لیکن ہر چیز کی طرف ان کا ذہن

رویہ یہی رہتا ہے - اس لئے عام مشاہدے اور نفسیات دونوں کا تقاضہ یہ ہے کہ ابتدا میں طلبہ کے سامنے تمام مضامین اس طرح پیش کئے جائیں کہ وہ ان کا "فائدہ" محسوس کریں اور جو کچھہ معلومات حاصل کریں وہ ان کی اپنی زندگی سے بعید اور بے ربط نہ ہوں بلکہ ان کی دل چسپیوں اور مشاغل کے تار و پود میں گتھہ جائیں - علم اور زندگی کا صحیح باہمی تعلق صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے -

ہم نے جو نقطہ نظر اوپر پیش کیا ہے اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ تعلیم کے سب مدارج میں تمام علوم کو اس طرح پڑھانا ممکن یا مناسب ہے کہ وہ کسی عملی مشغلے کا نتیجہ ہوں اور فوراً کسی دوسرے شغل میں یا اسی شغل کی تکمیل میں استعمال کئے جا سکیں - جب طالب علم کی ذہنی عمر زیادہ ہو جاتی ہے ' اس کا تجربہ بڑھہ جاتا ہے اور ایک حد تک اس کے شوقوں کی نشو و نما ہو چکتی ہے تو اسے بعض علوم سے بنفسہ دل چسپی ہو جاتی ہے - مثلاً وہ ریاضی کو اس لئے نہیں سیکھنا کہ گھر کا حساب و کتاب لکھہ سکے ' یا مدرسے کی دکان چلا سکے ' یا آگے چل کر کسی محکمہ میں ملازم ہو جائے بلکہ اسے ان ذہنی قوانین اور اعمال سے ذوق پیدا ہو جاتا ہے جن پر علم ریاضی مشتمل ہے - اسی طرح تاریخ میں وہ براہ راست تاریخی تحریکوں اور ان کے ارتقاء کے مطالعے میں منہمک ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے بصیرت اور عبرت حاصل کرتا ہے - ادب کے مطالعے کی بدولت اسے خیالات و جذبات اور جمالی احساسات کی ایک نئی دنیا نظر آنے لگتی ہے جو اس کو کوئی مادی "نفع" نہیں پہنچاتی لیکن اس کے تجربے میں وسعت، اور گہرائی اور اس کی قوت احساس میں نزاکت اور لطافت پیدا کرتی ہے اور وہ اپنے خیال میں ان سب

چیزوں سے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ "فائدہ" حاصل کرتا ہے جتنا دوسرے آدمی کسی خاص ہنر کو سیکھ کر روپیہ کمانے سے - سائنس کے ایک عالم کے متعلق ' جس نے علم کو طبیعات میں کوئی نیا اور اہم انکشاف کیا تھا یہ قصہ مشہور ہے کہ اس سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کی اس نئی تحقیق کا کوئی عملی فائدہ بھی ہے یا نہیں - اس نے فوراً جواب دیا "خدا کا شکر ہے کہ اس سے کسی طرح کے فائدہ کا امکان ہی نہیں" - یہ علمی محققوں کا مخصوص نقطہ نظر ہے جس کا ہمیں احترام کرنا چاہئے کیونکہ وہ جب تک بالکل بے غرضی کے ساتھ علم کی خدمت نہ کریں اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکتے - مگر یہ ضروری نہیں کہ اس علمی تحقیقات کو دوسرے لوگ عملی مصرف میں نہ لا سکیں - بلکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ محقق اپنی جگہ پر نظری انکشافات کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس کو صنعتی کاموں میں استعمال کرتے ہیں - جہاں تک مدرسے کے طلبہ کا تعلق ہے معلم کو ان کی تعلیم کی ابتدا اس طرح کرنی چاہئے کہ ان کے درسی مشاغل ان کی موجودہ زندگی اور شوقوں میں گھل مل جائیں اور اس کے بعد ان کے شوقوں کی نشو و نما اس طرح ہو کہ وہ ان علوم میں بلحاظہ دل چسپی لینے لگیں اور ان میں بعید مقاصد کی خاطر محنت اور کوشش کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے - ایک اوسط قابلیت کے طالب علم کے لئے شاید کبھی ایسا زمانہ نہ آئے کہ اسے بالکل مجرد اور نظری علوم سے دل چسپی اور انہماک پیدا ہو جائے لیکن پھر بھی عقل مند استاد جو فطرت اطفال سے واقف ہو ' اتنا ضرور کر سکتا ہے کہ طلبہ میں درسی مضامین سے تھوڑا بہت شغف پیدا کر دے - اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ وہ ہر منزل پر انہیں یہ محسوس کرا دے کہ ان کے لئے ان مضامین کی تحصیل اس وسیع تر معنی

میں "مفید" ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے - یعنی وہ ان کے دل و دماغ اور شخصیت کی اس طرح تربیت کرے کہ ان کی معلومات زیادہ وسیع اور واضح، ان کا مذاق زیادہ شائستہ اور ان کی قوت عمل زیادہ موثر اور مستحکم ہو جائے اور وہ علم و زندگی کے باہمی تعلق کو محسوس کرنے لگیں - لیکن اس کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ معلم خود اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ علوم تمدنی زندگی کی ضروریات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور ان کا منشائے حقیقی یہی ہے کہ وہ اس زندگی کی طرف رجوع کر کے اس کو بہتر اور زیادہ معنی خیز بنائیں اور وہ طلبہ کی زندگی میں بھی ان علوم کو انہیں اصولوں کے مطابق جگہ دے جس کے ماتحت وہ تمدنی زندگی میں وجود میں آئے ہیں -

باب دوم

" مدرسہ عمل "

ہم نے گذشتہ باب میں علم اور زندگی کے باہمی تعلق کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مروجہ درسی تنظیم میں یہ تعلق بالکل منقطع ہوگیا ہے جس کی وجہ سے مدرسے کی تعلیم بےجان اور بے اثر ہوکر رہ گئی ہے - اس صورت حال کی اصلاح کے لئے مختلف ملکوں میں بہت سی تعلیمی تحریکیں وجود میں آئی ہیں جن میں بعض جزئیات اور عملی تجاویز کے اعتبار سے اختلاف ہے ، لیکن اس اصول پر وہ سب متفق ہیں کہ مدرسوں کی تعلیم کو بالکل مجرد اور نظری بنانے کے بجائے طلبہ کی عملی زندگی کے ساتھ مربوط کرنے کی ضرورت ہے اور اگر ابتدائی جماعتوں کی تعلیم میں منطقی اصول پر مرتب کئے ہوئے اسباق کی جگہ عملی اور فعالی مشاغل پر زور دیا جائے تو مدرسہ بجائے ایک " انفعالی " درسگاہ کے واقعاً ایک " مدرسہ عمل " بن جائیگا جہاں طلبہ محض کتب بینی یا محرری کے کام کے لئے تیار نہیں کئے جائینگے بلکہ انہیں تمدنی زندگی کی گوناگوں ضروریات اور فرائض کے لئے تربیت دی جائیگی - اس تحریک کا آغاز بھی بہت سی دوسری مفید تحریکوں کی طرح روسو (Rousseau) کے انقلاب آفریں خیالات سے ہوا لیکن اس نے اپنی فطرت کے مطابق صرف منفی اور تخریبی پہلو پر زور دیا یعنی مروجہ تعلیم کی خرابیوں کو اپنی بے پناہ تنقید کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کردیا - اس کے بعد فروئبل (Froebal) اور پستالوتسی (Pestalozzi) وغیرہ نے اس تحریک کو عملی جامہ پہنایا اور اس کے متعلق عملی تجاویز پیش کیں - گزشتہ پچاس سال میں مغربی ممالک کے

ماھرین تعلیم نے اپنی اپنی ضروریات اور نقطہ نظر کے مطابق اس تحریک کی تنظیم کی ھے - امریکہ میں اس کی رھنمائی اور فلسفیانہ تفسیر کا کام پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے انجام دیا ھے - وہ فطرت اطفال، دماغی ارتقا کے قوانین اور اپنے ملک کے معاشری حالات کا مطالعہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے ھیں کہ جب تک مدرسوں میں تعلیم کی بنیاد ان عملی مشاغل پر نہ رکھی جائیگی جو ایک مختصر پیمانے پر مفید تمدنی مشاغل کا نمونہ ھوں، اس وقت تک نہ تعلیم فطرت اطفال کے لحاظ سے موزوں ھوگی نہ تمدنی زندگی کے لئے مفید ثابت ھوگی [۱] - امریکہ میں بہت سے معلموں نے ولیم جیمز (William James) کی نفسیات اور ڈیوئی (Dewey) کے تعلیمی خیالات سے متاثر ھوکر اس تحریک پر مختلف شکلوں میں عمل کیا ھے اور تعلیم کے طریقے اور نظم و نسق کو اس کے اصولوں پر قائم کیا ھے- تعلیم جدید کا مطالعہ کرنے والے ان میں سے بہت سے جدت آفریں معلموں کے نام سے واقف ھیں مثلاً پارکر (Parker) کلپٹرک (Kilpatrick) مس پارکھرسٹ (Parkhurst) واشبرن (Washburn) اور بیگ لے (Bagley) وغیرہ - پروفیسر اوڈولف فیریر (Adolphe Ferriere) نے جو سوئستان کے جید تعلیمی رھنما ھیں اپنی مختلف تصانیف کے ذریعے اس تحریک کی اشاعت کی ھے اور بالخصوص اپنی ایک نہایت اھم تصنیف (L'Ecole Active) (مدرسۂ عمل) کی پہلی دو جلدوں میں اس نئی نظری اور عملی تشریح کی ھے اور تیسری جلد میں اس کی عملی تنظیم سے بحث کی ھے اور مدارس عمل کی مثالیں دے کر اس کے اصولوں کو سمجھایا ھے

---

[۱] ڈیوئی کی تمام تعلیمی تصانیف اسی خیال کی تشریح ھیں بالخصوص ان کی مستند تصنیف Democracy and Education جس میں انھوں نے ھرنقطۂ نظر سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ھے اور تعلیم کا ایک مکمل اور مدلل نظریہ پیش کیا ھے -

[۱] بلجیم کے مشہور معلم ڈکرولی (Decroly) نے اپنے مدرسے میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ھے - [۲] جرمنی میں ڈاکٹر کرشن‌سٹائنر (Kerschensteiner) نے جو وھاں تعلیم جدید اور اصلاح مدارس کی تحریک کے بانی اور سر گروہ ھیں اور ان کے شاگردوں نے اس تحریک کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو بہت قابلیت کے ساتھہ سمجھا اور سمجھایا ھے - اور جنگ عظیم کے بعد سے اس پر کامیابی کے ساتھہ عمل کر کے مغربی تعلیم پر بہت گہرا اثر ڈالا ھے - [۳] انگلستان میں بھی مدارس جدید کے بانیوں اور کار کنوں نے تعلیم جدید کے اس بنیادی اصول پر عمل کیا ھے - مثلاً سینڈرسن (Sanderson) نے اونڈل (Oundle) کے پبلک اسکول میں ' بیڈلے (Badley) نے بیڈیلز (Bedales) کے اسکول میں ' مس میکنڈر (Mackinder) نے مارلبرو (Marlborough) کے اسکول میں اپنے اپنے ماحول کی مختلف ضروریات کے مطابق کتابی مدرسوں کو عملی مدرسوں میں تبدیل کردیا ھے - ھندوستان میں ابھی تک اس تحریک کا عام رواج نہیں ھوا کیونکہ یہاں نہ حکومت اور محکمہ تعلیم نے اس کی سر پرستی کی ھے ' نہ ایسے تعلیمی تجربے کرنے والے معلم موجود ھیں جو اپنی ذاتی کوشش اور شغف سے تجربی مدارس قائم کریں - لیکن جہاں کہیں کسی

---

[۱] ان کی تمام تصانیف فرانسیسی اور جرمن زبان میں ھیں - البتہ "L'Ecole Active" کی ایک جلد کا انگریزی ترجمہ (Activity School) کے نام سے شائع ھوا ھے -

[۲] اس مدرسے کے حالات کئی کتابوں میں شائع ھوئے ھیں جن میں سے (Mlle. A. Hamaide) کی کتاب جس کا انگریزی ترجمہ (Decroly Class) کے نام سے شائع ھوا ھے خاص طور پر قابل ذکر ھے -

[۳] جرمنی کی جدید تعلیمی تصانیف میں سے بہت کم کا ترجمہ انگریزی میں شائع ھوا ھے - کرشن‌سٹائنر کی دو کتابوں کا انگریزی ترجمہ موجود ھے جن میں سے ایک (Education as Citizenship) ھے اور دوسری (School and the Nation) - دونوں میں تعلیم کے عملی مسائل پر بحث کی گئی ھے -

بیدار مغز معلم نے عام راستے سے ہٹ کر بچوں کی تعلیم میں اصلاح کی بنا ڈالی ہے وہاں اسي کا اثر کار فرما ہے - بعض مدارس تو ایسے ہیں جو براہ راست مغرب کے تعلیمی خیالات سے متاثر ہوئے ہیں اور کسی قدر ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ ان پر عمل کر رہے ہیں مثلاً وہ تعلیم گاہیں جن میں طریق ڈالٹن (Dalton) مروج ہے یا موگا کا ابتدائی مدرسہ اور نارمل اسکول جس میں منصوبی طریقہ (Project Methed) آزمایا جارہا ہے - البتہ چند مدرسے ایسے بھی ہیں جن میں ہندوستانی حالات اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایک بہتر تعلیمی ماحول مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - ان میں سب سے زیادہ معروف ٹیگور کا مدرسہ 'شانتي نکتیاں' ہے جہاں اس فلسفی شاعر نے بچوں کی مکمل اور ہم آہنگ تربیت کے لئے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جس میں انہیں فطرت کے مناظر اور اس کی پر اسرار زندگی سے ہر وقت تعلق رہتا ہے اور محنت ' مزدوری باغ باني اور دوسرے عملی کاموں کے مواقع نصیب ہیں :—

'' جب میں کبھی کسي ایسی تعلیم گاہ کا تصور کرتا ہوں جس میں سب سے پہلا اور اہم سبق انسان اور فطرت کا مکمل اتحاد ہو تو میرے دل میں رابنسن کروسو کے جزیرے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے - یہ اتحاد محض محبت کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے عملي ارتباط اور ذہني تعاون کی ضرورت ہے '' [1]

ان تمام مدرسوں میں جزوی اور اکثر اہم اختلافات کے باوجود یہ اصول مشترک ہے کہ ابتدائی تعلیم کی بنیاد عمل پر رکھنی چاہئے اور

---

[1] ملاحظہ ہو ٹیگور کے لکچر جو Religion of Man کے نام سے شائع ہوئے ہیں

علم کو بچوں کے لئے شعوری مقصد نہیں بنانا چاہئے بلکہ اس کو ان کے مرغوب مشاغل کا نتیجہ ہونا چاہئے -

نفسیات کی جدید تحقیقات بھی ہماری رہنمائی اسی نتیجے کی طرف کرتی ہے - پرانے علم النفس میں رسمی طور پر یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ انسانی دماغ بنی بنائی نفسی قوتوں کا مجموعہ ہے جن کی تربیت بعض مخصوص علوم اور درسی مضامین کے ذریعے ہو سکتی ہے اور انہیں کے مطالعے سے یہ قوتیں اس طرح تیز ہو جاتی ہیں جس طرح چاقو پتھر پر رگڑنے سے تیز ہو جاتا ہے - استاد کا محض اتنا کام ہے کہ وہ مشق اور اعادے کے ذریعے ان کی تمام مختلف اور منتشر دماغی قوتوں کو مجتمع اور مستحکم بنائے - برخلاف اس کے نفسیات کا موجودہ نظریہ یہ ہے کہ بچے میں اوائل عمر سے بہت سی مخصوص جبلتیں (Instincts) اور عام فطری رجحانات (General Impulses) ہیں جو ابتدا میں مختلف قسم کی جسمانی حرکتوں اور خواہشوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں ، اس کے بعد نئے کھیلوں اور تجربوں کی صورت میں ، اور رفتہ رفتہ نشو و نما پا کر مربوط اور مرتب ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی شعوری نفسی زندگی پوری طرح منظم ہوجاتی ہے جس طرح انسان کی سیرت اس کو بنی بنائی نہیں ملتی اسی طرح دماغ بھی کوئی مکمل چیز نہیں - بلکہ اس کی اپنی جد و جہد اور تجربات ، اور اس کے ماحول کے باہمی عمل اور رد عمل سے نشو و نما پاتا ہے - یہ جبلی رجحانات جو طلبہ میں ولولۂ عمل ، شوق اور تجسس پیدا کرتے ہیں مجرد اور نظری مضامین کے مطالعے سے تربیت نہیں پاتے بلکہ ان مشاغل اور افعال کے ذریعے جن کو وہ فعالی حیثیت سے اور آزادی کے ساتھ

انجام دیتے ھیں اور جن میں ان کی جسمانی اور دماغی قوتیں متحد ھوکر کام کرتی ھیں - اسی وجہ سے مدارس جدید میں بچوں کی تعلیم کی ابتدا ان کی فطری صلاحیتوں اور رجحانات سے ھوتی ھے - ان کو ایسے کھیلوں اور کاموں میں لگانے کی کوشش کی جاتی ھے جن کی جانب وہ مدرسے سے باھر بھی خود بخود غیر ارادی طور پر متوجہ ھوتے ھیں - ان مدارس نے جو تعلیمی مشاھدات اور تجربات شائع کئے ھیں ان سے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ جب طلبہ کے قدرتی رجحانات کو آزادی کے ساتھ اظہار کا موقع ملتا ھے تو وہ رفتہ رفتہ رسمی مضامین اور نصاب کی تحصیل میں بھی زیادہ دل لگا کر محنت کرتے ھیں - ان میں ضبط نظم کا قائم رکھنا آسان ھو جاتا ھے اور مدرسہ ان کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتا ھے بہ قول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے :—

" ذھنی زندگی کے مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ھے کہ بچوں کی زندگی میں ڈھونڈنے اور دریافت کرنے، اوزاروں اور آلات کو استعمال کرنے، چیزوں کو بنانے اور خوشی کے جذبات کو ظاھر کرنے کی جبلی خواھشوں کی اھمیت بہت زیادہ ھے - جب ایسے مشاغل، جو ان رجحانات کو کام میں لاتے ھیں، مدرسے کے پروگرام کا جزو بن جائیں تو بچے کی پوری شخصیت ان میں منہمک ھوجاتی ھے اور مدرسے کی اندر اور باھر کی زندگی میں جو مصنوعی فصل پیدا ھوگیا ھے وہ دور ھوجاتا ھے - بچوں کو خود بخود یہ تحریک ھوتی ھے کہ وہ ایسے کاموں اور چیزوں کی طرف توجہ کریں جو تعلیمی لحاظ سے مفید ھیں، جن میں باھمی اشتراک عمل کے مواقع

ملتے ہیں اور جن کی وجہ سے ان کی تمام معلومات کا
تعلق معاشری زندگی سے قائم ہوجاتا ہے - مختصر یہ کہ
کھیلوں اور عملی کاموں کو مدرسے میں اس لئے جگہ نہیں
دی جاتی کہ بچے ذرا دیر خوش ہوجائیں بلکہ اس لئے
کہ وہ عقلی اور تمدنی لحاظ سے ضروری ہیں " [۱]

امریکہ کے دو ماہرین تعلیم نے حال ہی میں جرمنی کی تعلیم
جدید کی تحریکوں کا بہت غور سے مطالعہ کیا ہے - وہ اس اصول کی
تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"(تعلیم میں) فعالی اصول اور تجربے کا اصول بالکل ہم پایہ
اور ہم معنی ہے اور نفسیات ترکیبی (Structural
Psychology) کا جزو لازم ہے (اس کے مطابق) فرد کو
تخلیقی افعال (Creative Activity) کا سر چشمہ
سمجھنا چاہئے - انہیں کے ذریعے وہ اپنے تجربات کے مجموعے
کو معنی پہناتا ہے اور انہیں ایک خاص شکل میں ترتیب
دیتا ہے - اس طرح وہ اپنے نفس کے اندر اپنی دنیا تعمیر
کرتا ہے اور جو چیزیں باہر سے حاصل کرتا ہے ان کو اپنے
اندر جذب اور منظم کرنے کے لئے اپنی تخلیقی قوتوں سے
کام لیتا ہے تاکہ وہ بعد میں ان چیزوں کو جو اس کی
روح میں جاگزیں ہیں عمل میں ظاہر کرسکے - تعلیم کا
سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اس تخلیقی قوت کو اُبھارے
اور اس کی تربیت کرے " [۲]

[۱] Democracy and Education صفحہ ۲۲۹

[۲] The New Education in the German Republic
Alexander and Parker : صفحہ ۳۶۰ -

ان مشاغل کو مدرسوں میں رائج کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ طلبہ ذہنی تربیت اور تحصیل علم کی طرف سے غافل ہوکر اپنا تمام وقت ''دست کاری'' سیکھنے میں صرف کریں تاکہ وہ جلد سے جلد روزی کمانے کے قابل ہوجائیں اور تمدنی زندگی کے کار و باری معاملات میں حصہ لے سکیں یا '' غیر مفید '' مضامین کی طرف سے بے پروائی برتنے لگیں نہ اس تجویز سے ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے کسی نہ کسی طرح طلبہ کو مدرسے سے دلچسپی پیدا ہو اور ان کا وقت خوشی اور تفریح کے ساتھہ بسر ہو - اس میں شک نہیں کہ یہ مقاصد بجائے خود مفید ہیں اور یہ بڑی ضروری چیز ہے کہ طلبہ میں عملی کار کردگی اور سلیقہ پیدا ہو ' وہ آئندہ زندگی کے کاموں کے لئے تیار ہوں اور مدرسے کے مشاغل کو دلچسپی اور خوشی کے ساتھہ انجام دیں - لیکن یہ تمام چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں - اس اصول کی علت غائی نہیں ہیں - ہمارا اصل مقصد اس سے کہیں زیادہ اہم ہے - یعنی ہم ان مشاغل کے ذریعے طلبہ کو تمدنی زندگی سے روشناس کرنا چاہتے ہیں - اس لحاظ سے ان کی تنظیم اسطرح کرنی چاہئے کہ ان میں شریک ہوکر طلبہ کی عقلی اور ذہنی تربیت ہو اور ان کی طبیعت میں تمدنی فرائض کا احساس ' تمدنی معاملات کی سمجھہ ' اور ان میں شرکت کرنے کی قابلیت پیدا ہو - یہ تنظیم صرف اس حالت میں ہوسکتی ہے جب چند ضروری نفسی اور تمدنی شرائط پوری کی جائیں - وہ شرائط کیا ہیں ؟ ان کی سب سے زیادہ مفصل اور مدلل تشریح پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی تصانیف میں کی ہے اور ہم اس مسئلے پر ان کی رہنمائی میں بحث کرینگے -

مدرسے کے مشاغل کو تعلیمی لحاظ سے مفید بنانے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ان کا انتخاب اس اصول پر کیا جائے کہ وہ تمدنی زندگی کے

بڑے بڑے شعبوں اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہوں تاکہ ان کے ذریعے طلبہ جو علم یا ہنر حاصل کریں وہ انہیں اس زندگی کو سمجھنے اور اس میں شرکت کرنے میں مدد دے اور جب وہ مدرسہ کی چار دیواری سے نکل کر بیرونی دنیا میں پہنچیں تو ان کی مدرسے کی عادتیں اور معلومات دنیاوی کار و بار اور معاملات میں کام آئیں - سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں ، جب انسانی زندگی کا نظام مقابلتاً بہت سادہ تھا ، طلبہ ان مفید عادتوں اور عملی صلاحیتوں کو روز مرہ کے کار و بار اور اپنے عزیزوں اور ہمسایوں کی صحبت میں حاصل کرلیتے تھے - طباعت کا فن ابھی ایجاد نہ ہوا تھا اس لئے کتابیں کمیاب تھیں اور کتابی علوم بہت مشکل سے حاصل ہوتے تھے اور ان کی قدر بہت زیادہ تھی کیونکہ لوگوں کے لئے اپنے تنگ تجربات اور خیالات کے تنگ اور محدود دائرے سے باہر نکلنے اور ایک وسیع تر ماحول سے آشنا ہونے کا یہی ایک ذریعہ تھا - اس لئے مدرسے بجا طور پر انہیں چیزوں پر زور دیتے تھے جو کتابی اور نظری علوم کے مطالعے سے حاصل ہوتی تھیں اور طلبہ کی ذہنی اور کسی حد تک اخلاقی تربیت میں مدد دیتی تھیں - لیکن اب یہ صورت حال بالکل تبدیل ہوچکی ہے - اب نتیجہ خیز اور پر معنی تجربے کمیاب اور کتابیں بہت عام اور سستی ہوگئی ہیں - ہر شخص جسے پڑھنے کا شوق ہے وہ کتابوں ، اخباروں ، رسالوں وغیرہ کے ذریعے عمر بھر اپنی کتابی تعلیم جاری رکھہ سکتا ہے - لیکن موجودہ زندگی میں جو کشمکش اور جد و جہد سے معمور ہے کامیابی کے لئے جس فعالیت کی ضرورت ہے وہ محض کتابی مطالعے سے حاصل نہیں ہوسکتی - لہذا مدرسہ جدید کو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ محض کتابوں کو اپنا ذریعہ تعلیم نہ بنائے بلکہ تعلیم میں ایسے عناصر کو داخل کرے جن کے ذریعے سے ان صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکے جو صنعت و حرفت ، سائنس اور جمہوریت کے موجودہ دور میں افراد کی کامیابی کے لئے درکار ہیں - اس

خیال کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ لوگ بالعموم جس قسم کے کام کرتے ہیں ان میں ذہنی اور اخلاقی تربیت کے وہ امکانات باقی نہیں رہے جو پہلے زمانے میں پائے جاتے تھے - اس ضمن میں اس تمام بحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں جو تعلیم اور پیشے کے متعلق کی گئی ہے - صرف اتنا یاد دلانا کافی ہے کہ صنعت و حرفت کے کاموں میں جو انقلابی تبدیلیاں یورپ اور امریکہ میں ہوئی ہیں ان کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا ہے اور آئندہ چل کر اور زیادہ پڑے گا - بہت سی مشہور سودیشی دست کاریاں جو زمانے قدیم سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے وسیلہ معاش تھیں اور جن میں انہیں اکثر ذوق جمال اور جدت طرازی سے کام لینے کا موقع ملتا تھا اب یا تو بالکل مفقود ہوگئی ہیں یا ان میں کام کرنے والوں کی کھپت کم ہوگئی ہے؛ کیونکہ اب ویسی ہی چیزیں بہت آسانی اور کفایت کے ساتھ مشین کے ذریعے تیار ہوجاتی ہیں - لیکن جہاں اس طرح قوت پیداوار بڑھ گئی ہے وہاں انسانی اور تعلیمی نقطہ نظر سے کام کی قدر و قیمت بہت گھٹ گئی ہے کیونکہ جیسا ہم حصہ اول باب چہارم میں بتا چکے ہیں کارخانوں میں مزدوروں کی حیثیت مشین کے پرزوں کی سی ہوگئی ہے جو بغیر سوچے سمجھے ایک مقررہ معمول کو پورا کرتے رہتے ہیں جس کے لئے انہیں دماغ سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی - اس مشین گردی سے بچنا مشکل اور اس کو برا کہنا فضول ہے کیونکہ وہ تمدنی زندگی کی مادی اور صنعتی ترقی کی ایک ناگزیر منزل ہے - ہمارا کام شکایت کرنا نہیں بلکہ نئے حالات پر قابو پانا اور ان کے ذریعہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ہے - معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ تعلیم کے ذریعہ ایک ایسی نسل تیار کرے جو ایک طرف صنعت و حرفت کے نئے امکانات سے پورا فائدہ اٹھائے اور دوسری طرف اپنی امتیازی صفات اور انسانی خصوصیات کا تحفظ کرے جو اکثر دوسرے ممالک میں مادی

ترقی کے شوق میں قربان کر دی گئی ھیں - مدرسۂ جدید کی یہ کوشش ھے کہ طلبہ میں کام سے محبت اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے اور اس کے ذریعہ ان کی اخلاقی اور ذھنی قوتوں کی تربیت کرے - لہذا وہ ایسے مشاغل کا انتخاب کرتا ھے جو ان کو تمدنی زندگی کے کاروبار اور نظم و نسق سے روشناس کریں - اس کی غرض یہ نہیں کہ مدرسے کو صنعت و حرفت کے اغراض یا اقتصادی ضروریات کا تابع بنادیا جائے اور قبل از وقت پیشے کی تعلیم شروع کردی جائے بلکہ اس میں معاشرتی احساس اور ذھنی قوتوں کی نشو و نما پر زور دیا جاتا ھے - مدرسے کے مشاغل میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ھے کہ ان میں عقلی تربیت اور سائنس سے واقفیت حاصل کرنے کے امکانات موجود ھوں - سائنس کی جدید ترقی نے اس بات کو بالکل واضح کردیا ھے کہ مختلف علوم و فنون مثلاً زراعت ' ریاضی ' طبیعات ' کیمیا وغیرہ میں ترقی اور توسیع اس طرح نہیں ھوتی کہ ھم اپنے دماغ سے منطقی دلائل کا استخراج کریں بلکہ اس کے لئے تجربے ' مشاھدے اور علمی تحقیقات کے تمام فنی وسائل اور طریقوں کے استعمال کرنے کی ضرورت ھے - اس صورت حال کا اثر مدرسے کے کام پر بھی ھوا ھے - چونکہ اب تمام مفید اور ضروری فنون کی بنیاد سائنس پر قائم کی گئی ھے اور ان کے استعمال اور ترقی کے لئے سائنس سے واقف ھونا شرط ھے - اس لئے ھمیں بہت سے ایسے پیشے مل سکتے ھیں جن کے ضروری اجزا کو مناسب ترتیب کے ساتھ طلبہ کے سامنے پیش کر کے ھم مدرسوں کے لئے موزوں مشاغل تجویز کر سکتے ھیں اس قسم کے مشاغل ھمارے چاروں طرف موجود ھیں اور وہ عقلی اور معاشرتی امکانات سے مالامال ھیں لیکن ھم ایک تنگ درسی نقطۂ نظر کی چار دیواری میں اسی طرح محصور ھوگئے ھیں کہ ھماری نظر ان تک پہنچتی ھی نہیں -

" انسان کے جتنے مشترک اور اهم ترین مشاغل هیں ان کا تعلق خوراک ، مکان ، لباس اور مکان کے ضروری سامان سے ، اشیا کے بنانے ان کا مبادلہ کرنے اور ان کو صرف کرنے کے ذرائع اور وسائل سے ہے - چونکہ یہ تمام چیزیں انسانی زندگی کی ضروریات اور آسائش سے متعلق هیں اسی لئے وہ انسانی جبلتوں کی گہرائی تک پہنچتی هیں - اور ان میں جو معلومات اور اصول پنہاں هیں وہ تمدنی لحاظ سے بہت اهمیت اور قدر رکھتے هیں - اگر هم یہ فرض کر لیں کہ باغ بانی ، پارچہ بافی ، لکڑی اور دھات کا کام ، کھانا ، پکانا اور اسی قسم کے مختلف مشاغل جو انسانی کاروبار میں ایک اهم حیثیت رکھتے هیں اور مدارس جدید میں داخل کئے گئے هیں محض روزی کمانے کا ذریعہ هیں تو هم ان کی واقعی اهمیت سمجھنے سے بالکل قاصر رهیں گے - مانا کہ عام طور پر لوگوں کو صنعت و حرفت کے تمام کاروبار ایک نا گزیر مصیبت معلوم هوتے هیں جس کو وہ محض حصول معاش کی خاطر گوارہ کرتے هیں لیکن یہ قصور ان کاموں کا نہیں بلکہ ان کے حالات کا ہے جن میں یہ کام لئے جاتے هیں - دور حاضرہ کی زندگی میں اقتصادی معاملات کی اهمیت روز بروز زیادہ هوتی جاتی ہے - اس لئے تعلیم کا فرض ہے کہ وہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ تمدنی بہبود کا انحصار ان معاملات پر ہے اور ان کا سائنس پر - مدرسوں میں یہ مشاغل کسی مالی منافع کی خاطر جاری نہیں کئے جاتے بلکہ اپنی داخلی قدر و قیمت کی بنا پر -

جب یہ تمام خارجی اثرات اور دوب[...]ی خواهش سے آزاد هوجاتے هیں تو ان کے ذریعے سے نئے تجربات حاصل هوتے هیں جو بجائے خود مفید هیں - اس وقت وہ واقعاً دماغ کی آزاد تربیت کا باعث هوتے هیں" [1]

اگر اس اصول پر مشاغل کا انتخاب کیا جائے تو ان سے یقیناً وہ تعلیمی فائدے حاصل هوسکتے هیں جو اس تحریک کے حامیوں کے مدنظر هیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے ان مشاغل کی ایک مختصر سی فہرست بھی دی ھے جو بہت سے مدرسوں میں رائج هو چکے هیں اور جن میں سے اکثر کو انہوں نے اپنے مشہور ابتدائی مدرسے " شکاگو ایلمنٹری اسکول " میں جو امریکہ کے بیشتر تجربی مدارس کا پیش رو ھے، آزمایا تھا - وہ ان مشاغل میں جو بچوں کی عام تعلیم کے لئے اور دست کاری سکھانے کے واسطے مفید هیں، مندرجہ ذیل چیزوں کو شامل کرتے هیں :—

مدرسوں میں طلبہ کاغذ، کارڈ بورڈ، لکڑی، چمڑے، کپڑے، سوت، مٹی، ریت اور دھاتوں کا کام کرتے هیں کبھی اوزاروں کی مدد سے اور کبھی ان کے بغیر - اس قسم کے کاموں کو کرتے وقت انہیں بہت سی چیزیں سیکھنی اور کرنی پڑتی هیں مثلاً کاغذ کاٹنا، تہ کرنا، سوراخ کرنا، ناپنا، ڈھالنا، ماڈل بنانا، نمونے کاٹنا، گرم کرنا، ٹھنڈا کرنا، ہتھوڑے، آری، ریتی سے کام کرنا - یہ سب کام مشق کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مختلف دلچسپ مشاغل کے دوران میں کرنے پڑتے هیں مثلاً علاوہ طرح طرح کے کھیلوں کے تفریحی سفر کے لئے جانا، باغ بانی، کھانا پکانا، سینا، چھپائی، جلدبندی، کپڑا بننا، رنگ بھرنا، تصویر کشی، ڈراما کرنا، کہانیاں کہنا، اور لکھنا پڑھنا نہ اس خیال سے کہ ایک خاص فن سیکھنا ھے جو آئندہ چل کر

[1] Democracy and Education صفحہ ۲۳۰ -

مفید ہو گا بلکہ بحیثیت عملی مشاغل کے جن سے ان کے موجودہ مقاصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے مثلاً آپس میں ایک دوسرے کو خط لکھنے یا کہانیاں سنانے کے لئے ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے - اگر طلبہ یہ محسوس کریں کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر انہیں اپنے دلچسپ مشاغل میں کامیابی ہوگی تو وہ ان کو بہت شوق اور توجہ سے حاصل کرینگے -

بڑا تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان مشاغل کو یا ان میں سے بعض کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا قابل قدر جزو کس طرح بنا سکتے ہیں - اس کتاب میں ہمیں زیادہ تر عام تعلیمی اصولوں سے بحث ہے اس لئے یہاں اس کا موقع نہیں کہ ہم ان مشاغل پر تفصیلی نظر ڈال کر بتائیں کہ ان سے مدرسے میں کس طرح فائدہ اُٹھایا جائے - البتہ یہ عام اصول یاد رکھنا چاہئے کہ بحیثیت تعلیمی وسائل کے ان کی کامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک طلبہ کے مفید شوقوں کو اُبھارتے ہیں اور ان کو نئی اور پائدار دل چسپیوں سے روشناس کرتے ہیں - تعلیم کا منشا یہ ہے کہ وہ طلبہ کی شخصیت میں وسعت اور گہرائی پیدا کرے اور مدرسے کے یہ مشاغل اس منشا میں اسی وقت معین ہو سکتے ہیں جب وہ بچوں میں صحیح قسم کی دلچسپیاں پیدا کریں اور مختلف علوم کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے دکھائیں تاکہ وہ اپنے علم سے زندگی کے مسائل پر روشنی ڈال سکیں اور زندگی کے تجربات سے علم میں وضاحت اور صحت پیدا ہو - مدرسے کے معمولی درس پر اس قسم کے مشاغل کو اس وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے کہ ان کے ذریعے سے جو معلومات طلبہ حاصل کرتے ہیں اس میں جان پڑ جاتی ہے اور مختلف مضامین ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہتے بلکہ ایک مسلسل عملی مشغلے کے اجزا بن کر باہم مربوط ہو جاتے ہیں - عام طور پر مدرسوں کی

تعلیم میں یہ خرابی ہے کہ وہاں ہر مضمون اپنی جگہ پر مکمل اور قائم بالذات سمجھا جاتا ہے جس کا نہ دوسرے مضامین سے کوئی تعلق ہے نہ طلبہ کی زندگی اور تجربات سے - تاریخ جغرافیہ ، ریاضی ، ادب ، سائنس وغیرہ سب گویا دماغ کے علحدہ علحدہ خانوں میں بند رہتے ہیں جو کسی خاص موقعے پر مثلاً آموختہ سنانے یا امتحان دینے کے وقت وہاں سے باہر نکلتے ہیں اور بس ! برخلاف اس کے اگر طلبہ کسی با مقصد کام مثلاً باغ بانی میں ، یا تعلیمی سیر و سفر میں ، یا مدرسے کے میدان میں ہندوستان کا ایک بڑا اور مفصل نقشہ بنانے میں مصروف ہیں تو وہ اپنی تمام معلومات سے حسب ضرورت کام لیتے ہیں اور اپنی کوشش اور دوسروں کی مدد سے نئی معلومات حاصل کرتے ہیں اس طرح ان نئی اور پرانی معلومات میں برابر لازمی اور قدرتی طور پر ربط قائم ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے ان کے علم میں استحکام پیدا ہوجاتا ہے اور وہ ضرورت کے وقت استعمال میں آسکتا ہے - جب ہم ان تعلیمی مشاغل کو مدرسوں میں داخل کریں یا معمولی درسی مضامین کے طریقہ تعلیم میں منصوبی اصول پر عمل کریں تو ہمیں ہمیشہ ایسے مشاغل کا انتخاب کرنا چاہئے جن میں مختلف قسم کی معلومات کو مربوط اور منظم کرنے ، ذہنی کاوش اور اجتہاد سے کام لینے اور تجربہ کو زیادہ وسیع اور با معنی بنانے کے امکانات ہوں - یہی اصول منصوبی طریقے کی بنیاد ہے -

اس اصول کی توضیح چند مثالوں سے ہوسکتی ہے جن کا تعلق مدرسے کے مضامین اور مشاغل سے ہے - باغبانی اُن مشاغل میں سے ہے جن کی اہمیت تمام ماہرین تعلیم نے تسلیم کی ہے اور جس کو خود تعلیم کے عمل سے ایک خاص مشابہت ہے - مدرسے میں باغبانی اسلئے نہیں کی جاتی کہ طلبہ کو آئندہ چل کر پیشہ ور باغبان بنانا ہے یا ان

کا وقت خوشگوار طریقے پر گذارنا مقصود ھے - بلکہ اس کی غرض یہ ھے کہ انھیں معلوم ھو کہ انسان کے لئے کاشت کاری اور باغبانی کس قدر ضروری کام ھیں اور موجودہ نظام معاشرت میں ان کی کیا اھمیت ھے - اگر وہ سمجھدار معلموں کی نگرانی میں اپنے مدرسوں میں کاشت کاری اور باغبانی کرینگے تو انھیں اس کے ذریعہ پودوں کی نشو و نما ' مٹی کے کیمیائی اجزا ' روشنی ' ھوا اور رطوبت کے اثرات ' مفید اور مضر کیڑوں کے حالات معلوم کرنے کا موقع ملیگا - علم نباتات کے ابتدائی مسائل میں سے کوئی بات ایسی نہیں جو طلبہ کو پودوں کی نشو و نما اور انکی غور و پرداخت کے سلسلے میں نہایت معقول اور موثر طریقے پر نہ سکھائی جاسکے اسطرح ان باتوں کو سیکھنے کا نتیجہ یہ ھوگا کہ وہ جو کچھہ واقفیت حاصل کرینگے اس کا تعلق ایک خاص مضمون '' علم نباتات '' سے نہ ھوگا بلکہ وہ ان کے روزمرہ کے مشاھدات اور مشاغل کا جزو ھوگی اور اس عام معلومات کے ساتھہ مربوط ھوجائیگی جو وہ زمین کے مظاھر اور انسانی حیوانی زندگی کے متعلق رکھتے ھیں - یہ بھی ممکن ھے کہ جب ان کا شوق زیادہ پختہ اور تجربہ زیادہ وسیع ھوجائے تو بعض طلبہ کو ان میں سے بہت سے مسائل ایسے دلچسپ معلوم ھوں کہ وہ محض علمی تحقیق یا اپنے ذوق تجسس کی تسکین کے لئے ان کا مطالعہ کریں - مثلا بیجوں کی نشو و نما اور پودوں کی خوراک کا مسئلہ ' پھلوں کی پیداوار وغیرہ - اس طرح اکثر عملی دلچسپیاں رفتہ رفتہ ایک موزوں ماحول اور فطرت شناس معلم کی نگرانی میں علمی ذوق میں تبدیل ھوسکتی ھیں - گو بظاھر علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ طریقہ ایک طول عمل معلوم ھوتا ھے لیکن فطرت اطفال اور ذھنی ارتقاء کے قوانین کا تقاضا یہی ھے کہ تعلیم میں یہ لمبا راستہ اختیار کیا جائے - یہ ان مقامات میں سے ھے جہاں وقت اور محنت کی بیجا کفایت دراصل انتہائی اسراف ھے !

باغبانی کا تعلق مروجه درسی مضامین سے نہیں ہے - مگر یه اصول که تعلیم عمل کے ذریعے ہونی چاہئے درسی مضامین پر بھی صادق آتا ہے ہم مروجه نصاب کے تقریباً ہر مضمون کو لیکر یه بات ثابت کرسکتے ہیں که عقل اور تجربے دونوں کے لحاظ سے اس کی تحصیل میں بچوں کو عملی اور تخلیقی کام کرنے کا موقع دینا چاہئے اور صرف اسی طرح ہم ان کی تعلیم کو موثر اور کامیاب بنا سکتے ہیں - لیکن اس مثال کی توضیح کرنے سے پہلے یه بتا دینا ضروری ہے که مدرسه عمل کے نقطه نظر سے طلبه کے عملی ، فعالی اور فرحت بخش مشاغل مثلاً باغبانی اور مروجه درسی مضامین میں جو فصل قائم ہو گیا ہے وہ بالکل غیر ضروری اور نقصان دہ ہے اور موجودہ نظریه تعلیم کی رو سے مطلق جائز نہیں - بہر حال اگر ہم مختلف علوم خصوصاً علوم صحیحه کی تاریخ کا مطالعه کریں تو ہم پر یه حقیقت واضح ہوجائے گی که ان سب کی ابتدا مفید اور عملی پیشوں ، صنعتوں اور دست کاریوں کی شکل میں ہوئی ہے - علم طبیعیات (Physics) کے باقاعدہ طور پر مدون ہونے سے صدیوں پہلے لوہار اور نجار بہت سے وہ اوزار استعمال کرتے تھے جنہوں نے اس علم کی ترقی میں نمایاں حصه لیا ہے مثلاً ہتوڑی ، برما ، پیه ، بھٹی وغیرہ - پہلے انسان نے ان چیزوں کے استعمال سے عملی واقفیت حاصل کی اس کے بعد جوں جوں اس کا تجربه اور مشاہدہ وسیع اور منظم ہوتا گیا یه عملی واقفیت علم کی صورت اختیار کرتی گئی - واقعه یه ہے که علم اور عمل دونوں اپنی ترقی اور تکمیل کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور رہیں گے - اوزار اور آلات کے استعمال سے عملی واقفیت پیدا ہوتی ہے جو اصطلاحی معنی میں علم کا پیش خیمه ہے اور عام کی ترقی کی بدولت بہتر اوزار اور آلات ایجاد ہوتے ہیں اور استعمال میں آتے ہیں -

پھر ان بہتر آلات کے ذریعے انسان کی قوت مشاہدہ بہت بڑھ جاتی ہے تجربات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور علم میں اور زیادہ اضافہ ہوتا ہے - علت ومعلول کا یہ سلسلہ یوں ہی قائم ہے - اسی طرح علم کیمیا کی ابتدا وہ بہت سے مفید اور ضروری کام ہیں جو لوگ صدیوں سے اپنے عملی تجربے کی بنا پر کرتے چلے آئے ہیں مثلاً رنگ سازی ، دھاتوں کا کام ، دوائیں بنانا وغیرہ -

زراعت کو ایک مدون علم کی شکل اختیار کئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے لیکن بحیثیت ایک اہم ترین عملی مشغلے کے وہ ابتدائے تمدن سے جاری ہے علم زراعت میں انہیں تجربوں ، مشاہدوں اور دریافتوں کو ایک مرتب شکل میں پیش کیا جاتا ہے جو انسان نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کاشتکاری کے دوران میں کی ہیں - یہی حال اور تمام علوم کا ہے جو نصاب میں پائے جاتے ہیں - اگر طلبہ ان کی تحصیل کی ابتدا مناسب عملی مشاغل کے ذریعے کریں تو گویا وہ ایسا راستہ اختیار کرینگے جس پر نسل انسانی چل چکی ہے اور جس پر چل کر اسے کامیابی حاصل ہوئی ہے اس صورت میں مختلف سائنسوں کی حیثیت ان کے لئے مجرد اور نظری علوم یا چند ناقابل فہم اصولوں کے مجموعے کی نہ ہوگی بلکہ وہ واقعی یہ دیکھیں گے اور محسوس کرینگے کہ ان کا زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ نسل انسانی کے نقش قدم پر چلنے میں انہیں وہ تمام غلطیاں اور تضیع اوقات نہیں کرنی چاہئے جو گزشتہ زمانے میں ہمارے آباؤ اجداد کو مجبوراً کرنا پڑی تھی - مدرسے کے باضابطہ ماحول کی بدولت وہ بہت سی صریحی غلطیوں سے بچ جائیں گے جن میں پڑکر بعض مرتبہ انسانوں نے چھوٹی چھوٹی دریافتوں میں صدہا برس لگائے ہیں - اور ان کی علمی ترقی زیادہ یقینی اور اس کی رفتار تیز تر

ہو جائے گی - یہی فطرت کی تعلیم اور انسانوں کی ارادی تعلیم کا فرق ہے -
مگر جہاں مدرسہ جدید ان کے لئے ایک حد تک محفوظ ماحول مہیا کرے گا وہاں وہ اس بات پر بھی زور دے گا کہ طلبہ ان علوم کی تحصیل میں پوری پوری کوشش کریں ' ان عملی مشاغل میں حصہ لیں جن کا ان علوم سے تعلق ہے ' روز مرہ کی زندگی سے ان کا رشتہ پہچانیں اور یہ دیکھیں کہ نسل انسانی کس طرح آہستہ آہستہ جہالت اور عطائی واقفیت کی منزل سے گزر کر علم اور عقل کی منزل تک پہنچی ہے اس قسم کے عملی مشاغل کا استعمال صرف علوم صحیحہ تک محدود نہیں بلکہ معاشری علوم کی تحصیل میں بھی ان سے اسی طرح کام لیا جاسکتا ہے - مدارس جدید کا تجربہ اس خیال کی تصدیق کرتا ہے اور حال میں تعلیمی تجربات کے جو حالات شائع ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جا بجا معلموں نے یہ کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہوئے ہیں کہ تاریخ ' جغرافیہ ' ادب وغیرہ کو بطور '' رسمی مضامین '' کے نہ پڑھائیں بلکہ ان سے طلبہ کی گردوپیش کی زندگی کی تشریح کا کام لیں اور انہیں عملی مشاغل کی شکل میں پیش کریں -

'' مبتدیوں کے لئے معاشیات اور مدنیات کے علوم تک رسائی حاصل کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ معاشری زندگی میں صنعتی مشاغل اور کاروبار کا کیا درجہ رہا ہے - بلکہ اونچے درجوں کے طلبہ کے لئے بھی ان علوم کی حیثیت بالکل مجرد اور رسمی علوم کی نہ رہے گی جیسی کہ اب ہے اگر ہم اُن کو بجائے باضابطہ علوم کے طور پر پڑھانے کے ان کا مطالعہ اس نظر سے کریں کہ ان کے اصول اور مسائل ان تمدنی گروہوں کی زندگی میں

کس طرح ظاہر ہوتے ہیں جن میں طلبہ خود شریک ہیں "

اس عبارت سے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کی مراد یہ ہے کہ تاریخ ' عاشیات ' مدنیات انسانی جغرافیہ وغیرہ کو بھی اسی طرح نہ پڑھانا چاہئے گویا وہ مخصوص فنون ہیں جو ایک خاص منطقی ترتیب کے مطابق مدون کئے گئے ہیں اور جن کی تحصیل طلبہ پر کسی نا معلوم مصلحت کی وجہ سے فرض کردی گئی ہے - بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے گرد و پیش کے انسانی مشاغل تعلقات اور کاروبار کو اپنا نقطہ آغاز بنائیں اور بچوں کو مشاہدے ' عملی تجربے اور تقلیدی مشاغل کے ذریعے ان سے اچھی طرح روشناس کریں - اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کے تجربات اور مشاہدوں کی بنیاد پر ان " علوم " کی عمارت قائم کریں - تعلیم کے بنیادي عناصر دو ہیں - انسان اور اس کی زندگی اور طالب علم اور اس کے فطری رجحانات - علوم کی مروجہ ترتیب و تنظیم ایک ثانوی چیز ہے جو محض بالغوں کے دماغ کی مخصوص منطق کا عکس ہے - یہ ہر شخص کے لئے ضروري ہے کہ خود اپنی کوشش کے ذریعے اپنی معلومات میں یہ ترتیب پیدا کرے - ابتدا ہی سے بچوں پر اس خارجی ترتیب کا عائد کرنا ان کی ذہنی تربیت کو روکنا ہے - مروجہ مدارس کی ایک بہت بڑی غلطی یہی رہی ہے کہ انہوں نے علم کے ایک غلط تصور کو بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا اور بچوں کی زندگی کی ضروریات اور اُن کے شوقوں کو اس پر قربان کر دیا -

اونڈل (Oundle) پبلک سکول کے مشہور ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں انگلستان کے ایک مدرسہ عمل کي جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے - اس نے اپنی بلند

نظری اپنی قوت فکر و عمل کی بدولت اپنے اسکول کو جمود کی حالت سے نکال کر ملک کے بہترین ترقی پذیر اسکولوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا - اس کے حالات اور تعلیمی خیالات کے متعلق دو نہایت دلچسپ اور سبق آموز کتابیں حال میں شائع ہوئی ہیں جن کا مطالعہ معلموں کے لئے بہت مفید اور ہمت افزا ہے [1] - ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک شخص اپنے خلوص اور محنت کی بدولت ان رکاوٹوں اور مشکلوں پر قابو پا سکتا ہے جو بالعموم مصلحین تعلیم کو پیش آتی ہیں - اس میں شک نہیں کہ مالی اعتبار سے اس کو بعض آسانیاں حاصل تھیں جو ہمارے یہاں مدرسوں کو نصیب نہیں ہیں اور محکمہ تعلیم کی طرف سے قیود اور قوانین بھی اس قدر سختی کے ساتھ عائد نہیں کئے گئے تھے لیکن پبلک کی مخالفت اور جمود اور قدامت پسندی کے خلاف اس کو بڑی بالکل اسی طرح جنگ کرنی پڑی تھی جس طرح ایک ترقی پسند معلم کو ہمارے ملک میں کرنی پڑتی ہے - اس نے ایک مرتبہ لندن میں تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کے تصور میں مدرسے کا جو نقشہ ہے اس میں کن چیزوں پر زور دیا جائیگا اور تعلیم اور قومی ضروریات میں کس طرح ربط قائم ہوگا :—

" میں جس تبدیلی کی اہمیت پر زور دے رہا ہوں اس کے لئے ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت ہوگی - نئی قسم کی عمارتیں بنانی پڑینگی اور درسی مضامین کی اضافی

[1] ان میں سے ایک کتاب ویلز (Welis) نے The story of a great School · master (ایک بڑے معلم کی کہانی) کے نام سے لکھی ہے اور دوسری جو زیادہ ضخیم اور مفصل ہے ' سینڈرسن کے شرکائے کار نے اپنی متفقہ کوشش سے مرتب کی ہے اس کا نام "Sanderson of Oundle" ہے - دونوں میں سینڈرسن کی تحریروں اور تقریروں سے کافی اقتباسات دئے گئے ہیں -

قدر میں بہت بڑا انقلاب ہوجائیگا - سائنس جو ایک
نیا مضمون ہے اور جدید صنعت و حرفت جو اس سے
پیدا ہوئی ہے دونوں کو مدرسے کے تمام شغل میں ایک
نمایاں اہمیت حاصل ہوگی - اب یہ کہنا کافی نہیں
کہ مدرسے میں سائنس پڑھانی چاہئیے - اس کا وقت
گذر چکا ہے - ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس کو مدرسے
کی زندگی کا روح رواں بنا دینا چاہئیے - سائنس کا امتیاز
یہ ہے کہ اس میں تخلیق اور اشتراک عمل لازم ہے - اس
کی نظر ہمیشہ مستقبل پر یعنی ترقی اور تبدیلی کی
طرف رہتی ہے - اس کے معنی ہیں تلاش حق جس
کے لئے عملی تحقیق اور تجربے کی ضرورت ہے - اس کی
بنیاد تقلید پر نہیں ہے - اس نئی تعلیمی روح کے زیر
اثر ہمیں تمام مضامین یعنی تاریخ ' ادب ' آرٹ بلکہ
زبانوں کو بھی از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے -

اس تبدیلی کی وجہ سے مدرسوں میں نئے قسم کے سامان و
آلات اور عمارتوں کی ضرورت پیش آئے گی جن میں صرف
"پڑھائی" کے کمرے شامل نہ ہوں گے بلکہ عملی کام کرنے
کے لئے بڑے بڑے فراخ ہال درکار ہونگے - موجودہ مدارس
کے کمروں میں بچے محض "پڑھائے" جاتے ہیں - وہ
گویا ذہنی وزر تیز کرنے کی جگہیں ہیں جو یقیناً
ضروری ہیں لیکن ان کی اہمیت ثانوی ہے - علمی
تحقیق اور تخلیقی اور اشتراکی کاموں کے لئے بڑے بڑے
ہال درکار ہوں گے ' انجینیری اور نجاری کے لئے بہت

وسیع کمرے جن میں ہر قسم کی مشینیں اور اوزار مہیا ہوں - ایک لوہار خانہ ، ایک دھاتیں ڈھالنے کا کمرہ ، ایک بڑھئی کی کارگاہ ایک ڈرائنگ کا کمرہ جن میں صنعت و حرفت کے مختلف کام کئے جائینگے اور ہر عمر کے طلبہ کے لئے مناسب مشاغل مہیا ہونگے -

" اس کے علاوہ ایک بہت وسیع ادبی اور تاریخی کارگاہ بھی ہوگی جس میں ایک بڑا کتب خانہ ہوگا جہاں جدید علوم کی کتابیں اور کتب حوالہ‌جات موجود ہونگی - اس عمارت کے دونوں پہلوؤں میں کمروں کا ایک سلسلہ ہوگا جن میں مختلف قدیم و جدید علوم ، تاریخ ، اقتصادیات ادب اور سائنس وغیرہ پر غیر زبانوں کی کتابیں فراہم کی جائینگی - ایسی کتابیں جتنی زیادہ ممکن ہوں مہیا کرنی چاھئیں تاکہ طلبہ کے دل میں دوسری قوموں سے ہمدردی اور ان کا احترام پیدا ہو، اُنھیں ان کے متعلق واقفیت حاصل ہو اور اس طرح زندگی کے ایک زیادہ وسیع اور گہرے نصب‌العین کی بنیاد پڑے - اسی طرح ایک اور گیلری میں جغرافیہ ، علم مو‌الید اور علم‌الاقوام کی کتابیں ہوں گی -

" ایک اور عمارت سائنس کے لئے مخصوص ہوگی جس میں انجینیری کا معمل ہوگا ، مشینوں کا کمرہ ہوگا ، طبیعات ، کیمیا اور حیاتیات کے معمل ہونگے جن میں ہر قسم کے ضروری آلات اور سامان اور عملی کام کے لئے مشینیں ہوں گی جن کی مدد سے طلبہ جدید تحقیقات میں

حصه لے سکیں گے مثلاً آلات کو جانچنے کی مشینیں وغیرہ - (علاوہ ان کے علم نباتات کا مطالعہ کرنے کے لئے باغ اور کاشتکاری کے لئے زمین بھی ہوگی -

"ایک اور حصہ میں آرٹ اور موسیقی کے لئے کمرے ہونگے ' تھیٹر کا ہال ہوگا اور ایک ایسا کمرہ ہوگا جس میں طلبہ صنعتی زندگی کے ارتقاء اور صنعت و حرفت کے نمونوں کا مطالعہ کرسکیں گے -

"یہ کوئی خیالی یا ناممکن تجویز نہیں بلکہ ہر شہر اور ہر ملک کے مقدور میں ہے " [1]

"مدرسہ عمل" کی یہ تصویر ہمارے ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے قریب قریب ناممکن‌العمل معلوم ہوتی ہے - اس میں شک نہیں کہ ان تمام سامان اور آلات کا مہیا کرنا سوائے خاص مدارس کے اور کہیں ممکن نہیں لیکن ایک حد تک ہر مدرسہ اس کے تعلیمی اصوں پر یقیناً عمل کرسکتا ہے اور ہم آئندہ چل کر بتائینگے کہ نصاب کی تدوین اور تعلیم اس طرح کی جائے کہ اس سے مذکورہ بالا مقاصد حاصل ہوسکیں - فی‌الحال ہمیں مدرسہ عمل کی اس امتیازی خصوصیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ وہ ' کتاب ' کے بجائے تخلیقی اور اشتراکی ' کام ' کو اپنی تعلیم کی بنیاد بنانا ہے اور طلبہ کو ایسے مشاغل میں لگانا ہے جن میں اُنھیں اپنی جسمانی اور دماغی قوتوں کی ہم‌آہنگ تربیت کا موقع ملے - اس مدرسے میں تہذیب (Culture) کی بنیاد بھی کتابی علوم پر نہیں رکھی جاتی بلکہ طلبہ میں اس حقیقی تہذیب کو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو خود

[1] The Story of a Great School Master صفحہ ۱۴۶ -

کام کرنے اور اس کے معاشری اور اخلاقی نتائج کو سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے - یہ وہ تہذیب ہے جو ممکن ہے ایک مستعد خوش دل مزدور میں یا اس کاشتکار میں جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملکر مفید کام کرتا ہے پائی جائے اور ایک عالم یا ادیب یا فنون لطیفہ کے ماہر کو اس کی ہوا بھی نہ لگی ہو!

باب سوم

"ذهنی تربیت"

ہم نے گذشتہ باب میں مدرسۂ عمل کی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کی بنیاد عملی مشاغل پر رکھنی چاہیے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم طلبہ کو محض دستکار بنانا چاہتے ہیں اور ان کی علمی اور دماغی تربیت کو مقابلۃً غیر اہم سمجھتے ہیں - تعلیم کے عملی پہلو پر زیادہ اصرار کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہمارے مروجہ مدارس میں تعلیم دینے اور کتابیں پڑھانے کو بالکل ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے صلاحیت عمل مفقود ہوتی جاتی ہے - مگر یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہم ان میں ایسی "عملیت" پیدا کرنی نہیں چاہتے جو محض چند مقررہ افعال پر منحصر ہو جن کو وہ بطرز ایک معمول کے انجام دے سکیں - ایک مزدور جو اینٹیں ڈھو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے یقیناً کام کر رہا ہے لیکن اس کام کو سکھانے کے لئے مدرسے کی ضرورت نہیں - وہ ایک مفید خدمت ضرور ہے لیکن اس سے مزدور کو کوئی دماغی تربیت یا فائدہ حاصل نہیں ہوتا - اسی طرح اگر مدرسے میں کوئی بچہ پیشے کے طور پر نجاری کا کام سیکھے یا مشینوں کے چلانے میں یا باغبانی اور کاشتکاری وغیرہ میں ماہر ہو جائے تو گویہ چیزیں بجائے خود مفید اور عمدہ ہیں لیکن ان سے اس کے تعلیمی مقاصد کے حصول میں مدد نہیں ملتی - ہمارے مدارس کو ہر لحاظ سے ایک

تعلیمی ماحول ہونا چاہئے نہ کہ پیشہ آموز درسگاہیں - اور انہیں اپنے تمام مشاغل اور نصاب کی ترتیب و تدوین اس طرح کرنی چاہئے کہ ان کے ذریعے طلبہ کی ذہنی تربیت بخوبی ہو سکے - اس لئے ہمیں انتخاب مشاغل کے بعد اس مسئلے سے بحث کرنی ہے کہ طلبہ کی ذہنی تربیت کن اصولوں کے ماتحت کی جائے -

ذہنی تربیت کے لئے ایک شرط لازم یہ ہے کہ طلبہ جو کچھ کام کریں اس میں ان کو اپنی قوت فیصلہ کو استعمال کرنے ، وسائل اور ذرائع کو کسی مقصد خاص کے ماتحت ترتیب دینے اور اپنی مشکلات کو ذاتی کوشش سے حل کرنے کا موقع ملے - دماغ پر زور ڈالنے اور تدبیریں سوچنے کی ضرورت ہمیں صرف اُس وقت پڑتی ہے جب ہم کسی مشکل مسئلہ سے دو چار ہوں اور اس کا حل ہمیں معلوم نہ ہو - ایسی حالت میں ہم پہلے ایک تدبیر سوچتے ہیں اور اسے آزماتے ہیں ، اگر وہ تدبیر نہیں چلتی تو کسی اور تدبیر سے کام لیتے ہیں اور اس طرح اپنی ناکامیوں سے سبق لے کر رفتہ رفتہ کامیابی حاصل کرتے ہیں - یہ اصول چھوٹے بچوں کی معمولی کوششوں اور بڑے بڑے عالموں کی تحقیق سب پر برابر عائد ہوتا ہے - جب چھوٹے بچے کوئی نئی بات سیکھتے ہیں خواہ وہ کوئی علم ہو یا ہنر تو وہ اس میں یہی طریقہ عمل اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہی ان کی فطرت کے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ ہے - یہ سچ ہے کہ مدرسوں کا طریقۂ تعلیم اکثر اس سے مختلف ہوتا ہے - استاد بالعموم ہر بات کو بالکل صاف اور واضح کر دیتے ہیں اور سبق کو ان کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور بچے انفعالی طریقے پر اس کو سمجھ لیتے ہیں اور یاد کر لیتے ہیں - یہ بھی "سیکھنے" کا ایک طریقہ ہے لیکن

اس طرح سیکھنے میں ذہنی جدت اور تیزی پیدا نہیں ہوتی - اگر ہمارا مقصد طلبہ کی تعلیم سے یہ ہے کہ ان میں مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے اور مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو تو ہم اس قسم کی تعلیم کو کسی طرح مناسب اور تشفی بخش قرار نہیں دے سکتے - اس معاملے میں ہمیں فطرت اطفال اور ان کی نشو و نما کے قوانین سے سبق لینا چاہئے اور یہ مشاہدہ کرنا چاہئے کہ بچے مدرسے آنے سے پہلے اپنی عمر کے ابتدائی چند سال میں کس طرح بہت سی اہم تریں باتیں سیکھتے ہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتی ہے - بچہ کسی کھلونے کو لینا چاہتا ہے جو ایک میز پر رکھا ہوا ہے - وہ اس کی طرف بڑھتا ہے راستے میں پلنگ یا کوئی اور رکاوٹ حائل ہے - وہ اس سے ٹکراتا ہے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوکر یا تو اس چیز کو ایک طرف ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر یہ اس سے ممکن نہیں تو اس کے گرد چکر کاٹ کر میز تک پہنچتا ہے - وہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھلونے تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس کا قد چھوٹا ہے اور میز اونچی ہے اب اسے یہ مسئلہ در پیش ہے کہ کھلونے تک کیسے پہنچے - ممکن ہے وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوکر یا اچھل کر کھلونا حاصل کر لے - اگر یہ ترکیب بھی نہ چلے تو شاید کوئی کرسی یا مونڈھا کھینچ کر لائے اور اس پر چڑھ کر کھلونا میز پر سے اتارے اور اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے - یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس طرح بھی کھلونا نہ پا سکے تو کسی دوسرے شخص سے مدد مانگے یا اپنی پہنچ اور قابلیت کی کوتاہی کا احساس کرکے اس مقصد سے بالکل ہی دست بردار ہوجائے - اب ذرا اس سلسلہ حرکات کا تجزیہ کیجئے - ان کی محرک بچے کی ایک فطری خواہش (یعنی کھیل) ہے جس کو وہ تشفی

کرنا چاهتا هے اس لئے اس کی تمام کوششیں اور ان کی ترمیم اور تبدیلی ایک خاص مقصد ، ایک مستقل ارادے کی تابع هیں - اس کو کسی نے پہلے سے یہ نہیں بتایا کہ اگر کھلونا لینا چاهتے هو تو فلاں طریقہ عمل اختیار کرو - وہ اپنے معمولی مشاغل کے دوران میں ایک مشکل کا سامنا کرتا هے اور اس کو حل کرنے کے لئے اپنے دماغ پر زور ڈال کر ایک تدبیر سوچتا هے اور اس پر عمل کرتا هے - اگر اس سے کامیابی نہیں هوتی تو دوبارہ اُسی تدبیر کو استعمال نہیں کرتا - یا ممکن هے دو تین بار آزمانے کے بعد اسے یہ اندازہ هو کہ یہ تدبیر نہیں چلے گی اور پھر وہ اسے ترک کرے - بہر حال اب وہ کوئی اور تدبیر سوچتا هے اور یہ سلسلہ برابر جاری رهتا هے یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب هو جاتا هے یا اسے یہ یقین هو جاتا هے کہ کامیابی ناممکن هے - اس صورت حال میں شروع هی سے ایسے امکانات موجود هیں جو اس کی جسمانی اور ذهنی قوتوں کو دعوت عمل دیتے هیں اور اس میں کوشش اور جد و جهد کی خواهش کو ابھارتے هیں - اس کو جو کچھ تجربہ اس کوشش کے دوران میں حاصل هوتا هے وہ همیشہ کے لئے اس کی قوت عمل اُور معلومات کا جزو هو جاتا هے - اگر اس طول عمل کے بجائے هم شروع هی میں اِسے یہ بتا دیتے کہ کرسی پر چڑھ کر میز پر سے کھلونا اتار لو یا خود کھلونا میز پر سے لے کر اسے دے دیتے تو اس کو هر گز وہ ذهنی تربیت حاصل نہ هوتی جو اُس صورت میں هوئی - یہی حال علمی تحقیق و تفتیش اور پختہ کار ماهرین کی جد و جهد کا هے - یہ صحیح هے کہ ان کو اپنے ماحول کا زیادہ علم اور اس پر زیادہ قابو هوتا هے - وہ علم حاصل کرنے کے ذرائع سے واقف هوتے هیں اور اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ انہیں حسن اتفاق سے کوئی نیا مشاهدہ یا تجربہ حاصل هوجائے بلکہ وہ خود ایسے حالات

پیدا کرتے ھیں اور واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ھیں کہ نئے مشاھدے اور تجربے کرسکیں - لیکن باوجود اس تمام فرق کے ان کا تحصیل علم کا طریقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بچوں کے طریقے سے کچھہ زیادہ مختلف نہیں - ان کے لئے بھی یہ ضروری ھے کہ وہ اپنے علمی اور عملی مشاغل کے دوران میں کسی ایسے مسئلے یا مشکل سے دو چار ھوں جس کو حل کئے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ھو - اس حل کو دریافت کرنے کے لئے وہ اپنے سابق تجربے اور تخیل کی مدد سے کوئی فرضیہ یا نظریہ قائم کرتے ھیں اور اس کے مطابق حالات کو مرتب کرکے دیکھتے ھیں کہ ان کا متوقع نتیجہ پیدا ھوتا ھے یا نہیں - اگر وہ فرضیہ جو گویا پہلی مثال کی "تدبیر" کا قائم مقام ھے کامیاب نہیں ھوتا تو وہ کوئی دوسرا فرضیہ قائم کرتے ھیں اور اس کے ماتحت مختلف قسم کے آلات اور وسائل کی مدد سے تجربے کرتے ھیں اور اپنی غلطیوں سے سبق لے کر رفتہ رفتہ اس حقیقت تک پہنچ جاتے ھیں جس کی ان کو تلاش تھی - سوائے ان چند بڑی علمی دریافتوں کے جن کی ابتدا کسی اتفاقی تجربے یا مشاھدے سے ھوئی ھے علم کو بالارادہ حاصل کرنے کا یہی طریقہ ھے اور اسی کو موجودہ زمانے میں "علمی طریقے" کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے جو شاید دور حاضرہ کی سب سے اھم اور قابل قدر دریافت ھے اور جس نے انسان کی ترقی کے امکانات کا دائرہ بے حد وسیع کر دیا ھے - تعلیم کا مقصد یہ ھونا چاھئے کہ وہ طلبہ میں ایسی قابلیت پیدا کرے کہ وہ دوسروں کی رائے اور حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بجائے تحصیل علم میں فعالی طور پر حصہ لیں اور خود سوچ سمجھہ کر اپنے افعال کی ذمہ داری قبول کریں اور اپنی رھنمائی کا فرض انجام دیں - عموماً ھر ملک میں جمہور ان صفات سے محروم ھیں - خصوصاً ھندوستان میں تو بدقسمتی سے یہ عالم

ھے کہ لوگ ھر قسم کے معاملات میں بالخصوص معاشرتی اور اخلاقی
مسائل میں ، رسمی عقائد کی پناہ ڈھونڈتے ھیں اور مروجہ طرز خیال
کے سہارے اندھوں کی طرح ایک راستے پر چلتے رھتے ھیں - ان میں
نئے خیالات سے متاثر ھونے اور فکر و عمل کی دنیا میں آزادی اور جرأت کے
ساتھہ نئی راھیں تلاش کرنے کی صلاحیت ھی نہیں - نہ انہیں ابھی
تک تلاش حق کا شوق پیدا ھوا ھے اور نہ تجربی طریقے کی ھوا لگی
ھے - اس کی جہاں اور بہت سی وجوہ ھیں ایک بڑی وجہ یہ بھی ھے
کہ مدرسوں کی تعلیم بالعموم طلبہ کے ذھن کو معطل رکھتی ھے اس میں
ھر بات کے متعلق تحکمی اور قطعی واقفیت ٹھونس دی جاتی ھے جسے
داخل کرنے میں انہیں ذھنی کاوش سے مطلق کام نہیں لینا پڑتا - یہ
طریقہ نہ صرف ان مضامین کی تعلیم میں رائج ھے جن کا مقصد ایک حد
تک مفید معلومات کا مہیا کرنا ھے بلکہ ان مضامین میں بھی جن کا
مخصوص تعلیمی مقصد ھی یہ ھے کہ وہ طلبہ میں ذھنی اجتہاد اور
قوت فکر پیدا کریں -

اس بحث سے معلم کے لئے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ جب وہ اپنے مدرسے
میں تعلیمی مشاغل کو رائج کرے تو اسے یہ نہیں چاھئے کہ وقت
محنت اور سامان کی کفایت کے خیال سے بچوں کو پہلے ھی سے کام کرنے
کا مفصل طریقہ بتا دے بلکہ مسائل اور مشکلات کو ان کے سامنے پیش
کرنے کے بعد ان کا حل کرنا انہیں پر چھوڑدے اور خود صرف ان کی نگرانی
اور ھدایت کرتا رھے اور ان کی دلچسپی کو قائم رکھے - اگر وہ ان کے سامنے
ایک بنا بنایا نمونہ پیش کردے جس سے کام کے تمام مدارج ان کی سمجھہ
میں آجائیں یا وہ خود انہیں کام کرکے دکھا دے تو بچوں کے لئے بس یہی
باقی رہ جاتا ھے کہ وہ بغیر کسی دماغی جدوجہد کے انفعالی طریقے پر

اس کی نقل اُتار لیں - ممکن ہے کہ باربار مشق کرنے سے اس خاص کام میں انھیں مہارت پیدا ہوجائے اور وہ اس کو آسانی اور تیزی کے ساتھ کرنا سیکھ لیں لیکن اس میں انھیں یہ موقع کہاں ملے گا کہ اپنی قوت انتخاب سے کام لے کر فیصلہ کریں کہ انھیں مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاھئے جو سب سے زیادہ مناسب ثابت ہو؟ - اس میں شک نہیں کہ اگر اُستاد اور شاگرد دونوں اس سہل اور محفوظ طریقے کو اختیار کرینگے تو وہ بہت سی غلطیوں سے بچ جائینگے ' سامان اور آلات کا جو صرف بچوں کے عملی کام میں ہوتا ھے اس میں بہت کفایت ہوگی، اور اگر محض نمائشی تعلیم مقصود ہو تو '' نتائج '' بڑی بہت جلد حاصل ہو جائینگے یعنی بچے بغیر سوچے سمجھے چند مقررہ حرکات کو انجام دے سکینگے - لیکن زندگی کی کشمکش اور جدوجہد میں ایسے '' نتائج '' سے کام نہیں چلتا - کیونکہ وہاں ہر ذی شعور انسان کو جس کی زندگی محض نقالی اور احکام کی بجا آوری تک محدود نہیں آئے دن ایسے مسائل اور واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن میں قوت فیصلہ کی اور اپنی آزادانہ رائے قائم کر کے اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ھے - زندگی میں کامیابی کے لئے فعالیت کی ضرورت ھے - اس کی تربیت دینے کے لئے مدرسے کو ایسا طریقہ عمل اختیار کرنا چاھئے کہ طلبہ نئے مواقع اور نئے حالات سے دو چار ہوکر ان سے عہدابرآ ہونے کی تدبیریں سوچ سکیں -

موجودہ علم نفسیات اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ جو دماغی قوت انسان کسی خاص کام کو سیکھنے یا کسی خاص مضمون کے مطالعے سے حاصل کرتا ھے وہ ہر کام اور ہر مضمون میں استعمال ہو سکتی ھے - انسان کا دماغ کوئی چاقو نہیں کہ اگر اسے پتھر پر رگڑلیا جائے تو وہ ہر چیز کو کاٹ دیگا خواہ وہ لکڑی ہو یا کپڑا یا کاغذ - پرانا نظریہ جس کو جدید

نفسیاتی تحقیقات اور مشاهدے نے مسترد کردیا ھے یہ تہا کہ اکتسابی قوت ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع میں جوں کی توں منتقل ہو سکتی ھے یہ نظریہ جس کو انگریزي میں Transfer of Training (انتقال قوت اکتسابی) کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے عرصہ سے ماہرین نفسیات کے درمیان مابہ‌النزاع ھے - اس مسئلے کے متعلق موجودہ نقطہ نظر بحیثیت مجموعي اس طرح بیان کیا جا سکتا ھے کہ وہ مخصوص قابلیتیں جو کسي علم یا فن سیکھنے کے دوران میں حاصل ہوتی ہیں منتقل نہیں ہو سکتیں - مثلاً اگر کوئي شخص ریاضی کی تعلیم اور مطالعے کي وجہ سے ریاضی کے مسائل کو اچھی طرح حل کر سکتا ھے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے بالکل مختلف قسم کے معاملات مثلاً سیاسی یا اخلاقي مسائل پر بھی ذہانت اور قابلیت سے بحث کریگا - البتہ اگر مناسب طریقہ تعلیم اختیار کیا جائے تو بعض عام ذہنی رجحانات اور صلاحیتیں ، تحصیل علم کے گر ، نئے مسائل پر غور کرنے کے طریقے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو سیکھ کر انسان نہ صرف ایک خاص کام کو اچھی طرح کر سکتا ھے جس کو اس نے سیکھا ھے بلکہ جس کام کو بھي کرنا چاہتا ھے اس میں ذہني عادتیں مفید اور معاون ہوتی ہیں فرض کیجئے ایک شخص کو مختلف قسم کے کار و بار اور مشاغل میں یہ عادت پڑ گئی ھے کہ وہ جب کوئی نیا کام کرتا ھے تو اپنے مقصد اور ذرائع کا جائزہ لیتا ھے ، اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کوئی طریقہ عمل تجویز کرتا ھے اور اس کے مطابق اپنے وسائل اور ذرائع کي ترتیب و تنظیم کرتا ھے اور پھر اپنے عمل کے نتائج سے سبق اور تجربہ حاصل کرکے آگے قدم بڑھاتا ھے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ھے یہ تمام طریقہ کار اور اس کے ساتھ جو ذہني عادتیں وابستہ ہیں وہ مختلف قسم کے

بے شمار کاموں اور مواقع میں استعمال ہو سکتی ہیں - اگر کوئی شخص
جنگل میں اپنا راستہ بھول گیا ہے اور چاہتا ہے کہ صحیح راستے پر
پڑ جائے تو یہ طریقہ اس کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا - اگر وہ سائنس
یا صنعت و حرفت کے کسی مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے تو اس کو
یہی سلسلہ عمل اختیار کرنا پڑیگا - اگر وہ کسی بڑے تجارتی کار و بار
میں مصروف ہے تو اُسے اپنی تجارتی پالیسی اسی طرح معین کرنی
ہوگی - اگر وہ کسی کمیٹی یا کونسل میں انتخاب کے لئے امیدوار ہے
تو بھی اس کو لازم ہوگا کہ اپنے تمام وسائل اور ذرائع کا جائزہ لے اور ایک
معین مقصد کی خاطر ان کی تنظیم کرے - غرض بہت سی صورتوں
میں انسان **اس طریق عمل** سے فائدہ اٹھا سکتا ہے - لہذا مدرسہ جدید
کے معلم کو اس غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہئیے کہ کسی خاص درسی
مضمون کے مطالعے سے طلبہ کی مختلف ذہنی قوتوں کی تربیت ہو جائے گی
اور وہ اسی کی بدولت ہر قسم کی مشکلات سے جو زندگی میں پیش
آتی ہیں عہدہ برآ ہوسکیں گے - مثلاً اگر ان کا دماغ منطق اور ریاضی
کے پیچیدہ مسائل میں منجھ گیا ہے تو یہ مخصوص قابلیت زندگی کی
عملی گتھیوں کو سلجھانے اور تمدن و معاشرت کے مسائل کو حل کرنے
میں مدد دے گی - بلکہ اسے یہ کرنا چاہئیے کہ ان کے تمام مسائل
اور اسباق کو اس اصول پر ترتیب دے کہ انہیں مختلف مضامین میں
اور مختلف مواقع پر ذہنی اجتہاد اور قوت فیصلہ کو استعمال کرنے
کی ضرورت پیش آئے ، نئے طریقوں کو آزمانے کے لئے آمادگی پیدا ہو اور وہ
ہر کام کے لئے کسی بنے بنائے راستے ، کسی سیکھے سکھائے قاعدے کے محتاج
نہ رہیں - اس کا ایک بہت اہم فرض یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ طلبہ
کو اپنی مدد اور اپنے سہارے سے بے نیاز کردے اور ان کو خود اپنے
قدموں پر کھڑا ہونا سکھائے - اچھے ڈاکٹر کی طرح ، اچھے استاد کی

پہچان بھی یہی ہے کہ اس کی طرف رجوع کرنے والے کچھ عرصے کے بعد اس کی امداد اور رہنمائی سے آزاد ہوکر خود اپنی نگہداشت کر سکیں - یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب استاد شروع ہی سے طلبہ کو اس طرح تعلیم دے کہ وہ آزادی کے ساتھ کام کر سکیں اور اپنی رائے اور فیصلے پر بھروسا کرنا سیکھیں - البتہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خرد سری سے کام نہ لیں اپنی رائے پر بیجا اصرار نہ کریں اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے اور ان سے سبق سیکھنے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں - ممکن ہے کہ اس طریقے پر عمل کرنے سے ان کو نئے مضامین پر بہت جلد قدرت حاصل نہ ہو یعنی وہ ان کو "جلد یاد نہ کر سکیں یا ان کے ہاتھ میں بہت تھوڑے وقت میں صفائی اور سلیقہ پیدا نہ ہو " جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ نمائشی نتائج نہ دکھا سکیں - لیکن اس کمی کی پوری پوری تلافی اس طرح ہوجاتی ہے کہ طلبہ میں ایک عام ذہنی بیداری پیدا ہوتی ہے اور ان میں تعمیر و تخلیق کا شوق اور جدت و اجتہاد کی صلاحیت تربیت پاتی ہے جو اعلیٰ فوری اور عارضی نتائج سے زیادہ قیمتی اور قابل قدر ہے - مروجہ نصاب کے درسی مضامین کی تعلیم پر اس اصول کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے بعض مضامین تو ایسے ہیں جو صریحاً اس اصول کے تحت میں آتے ہیں مثلاً وہ تمام علوم جن کو شعبۂ سائنس سے تعلق ہے - سائنس علوم انسانی کی وہ شاخ ہے جو تمام تر ہماری کوشش اور تخلیق کا نتیجہ ہے - جب انسان کا دماغ اپنے طبیعی ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور مظاہر فطرت کے پوشیدہ قوانین کو دریافت کرنے کے لئے مشاہدات اور تجربات سے کام لیتا ہے تو وہ گویا سائنس کی تشکیل کر رہا ہے - اس کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اپنی تدوین اور ترقی کے لئے انسان کی دریافت اور

جستجو کی مرہون ملت ہے - اگر مدرسے میں ہم اس خصوصیت کو نظر
انداز کر دیں اور استاد طلبہ کو ہر بات بتا دیا کرے یا زیادہ سے زیادہ
انہیں چند مقررہ تجربات کرکے دکھا دیا کرے تو سائنس کا تعلیمی
مقصد بالکل فوت ہو جائے گا - ان تمام طبعی ، کیمیاوی ، حیاتیاتی
علوم کے پڑھانے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنے مادی ماحول کی
قوتوں اور مظاہر کو سمجھیں اور ان سے کام لینا سیکھیں بلکہ یہ کہنا
چاہئیے کہ کام لینے کے ذریعے سے ان کو سمجھیں - کیونکہ یہ ناممکن ہے
کہ کوئی طالب علم بغیر ذاتی تجربے اور عمل کے سائنس کے کسی
اصول یا حقیقت کو محض لفظی بیان اور تشریح سے پوری طرح سمجھ
جائے - اس کے لئے ہمیشہ یہ ضرورت ہے کہ انہیں براہ راست سائنس
کے آلات اور خواص اشیا کا تجربہ ہو ، وہ ان کو مختلف حالات میں
دیکھیں اور ان حالات کو بدل کر اس تبدیلی کے اثرات پر غور کریں
اور اس طرح رفتہ رفتہ ان نتائج تک پہنچیں جو ممکن ہے ان کے
استادوں اور ماہرین سائنس کے لئے بالکل پیش پا افتادہ ہوں لیکن
خود ان کے لئے بڑی حد تک ایک نئی دریافت کی شان رکھتے
ہیں - اسی اصول سے متاثر ہوکر زمانہ حال میں سائنس کی تعلیم میں
بہت انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں اور تمام مدارس جدید میں پرانی
کتابی تعلیم کو ترک کرکے جو سوائے حافظے کے اور کسی دماغی قوت کی
تربیت نہیں کرتی تھی ، سائنس ایک عملی اور تجربی مضمون بنادی گئی
ہے اور مدرسوں میں باقاعدہ معمل اور کارخانے قائم کئے گئے ہیں جہاں
طلبہ اپنے ہاتھ سے کام کر سکتے ہیں - وہ سائنس کی معلومات حاصل کرنے اور
اس کو مرتب کرنے میں فعالی طور پر شریک ہوتے ہیں اور ایک حد تک
انہیں حالات میں اور انہیں شرائط کے ماتحت کام کرتے ہیں جو سائنس کے
محققین کے لئے درکار ہیں - اس کے عملی پہلو پر زور دینے کے لئے نہ

صرف مدرسوں کے نصاب میں عملی کام کا عناصر بڑھا دیا گیا ہے بلکہ طلبہ کو صنعت و حرفت کے کارخانوں میں اور گرد و پیش کی زندگی میں سائنس کی ایجادات اور ان کے استعمال کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی دیا جاتا ہے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ سائنس اور متمدن زندگی میں کس قدر قریبی تعلق ہے اور انسان نے کس طرح اپنی قوت تسخیر سے کام لے کر فطرت کی قوتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے - معلموں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طلبہ سائنس کو محض چند اصولوں اور قاعدوں کا مجموعہ نہ سمجھیں بلکہ اس کی بدولت ان کے دل میں تسخیر فطرت کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوجائے - اس کوشش کا اظہار کہیں کہیں مخصوص اور مکمل تعلیمی طریقوں کی شکل میں ہوا ہے - مثلاً پروفیسر آرمسٹرونگ (Armstrong) کا " طریقۂ دریافت " (Heuristic Method) - اور کہیں اس کا اثر عام ذہنی تربیت کی اصلاح میں نمایاں ہوا ہے جس نے سائنس کے طریقۂ تعلیم اور اس کی داخلی روح میں انقلاب پیدا کر دیا ہے -

یہی اصول کسی قدر مختلف صورت میں دوسرے مضامین پر بھی عائد ہوتا ہے مدرسے کے نقطہ نظر سے جغرافیہ کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں ایک وہ جو زیادہ تر مظاہر فطرت کے اسباب و نتائج سے بحث کرتی ہے مثلاً یہ کہ بادل کیسے بنتے ہیں ' زمین کی سطح میں تبدیلیاں کیسے ہوتی ہیں - اجرام فلکی کی گردش سے زمین اور پانی پر کیا اثر پڑتا ہے ' آب ہوا اور پیداوار کا باہمی تعلق کیا ہے وغیرہ جغرافیہ کی اس شاخ کو " سائنس " کے مضامین میں شمار کرنا چاہئے - لیکن اس کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کا اصل موضوع انسان اور اس کے طبیعی ماحول کا تعلق ہے یعنی اس طرح کے مسائل کہ پہاڑ ' دریا '

بارش ' زمین کی پیداوار ' صنعت و حرفت وغیرہ انسان کی زندگی پر کیا اثر ڈالتے ہیں اور انسان کس طرح ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کو اپنے قابو میں لاتا ہے - جغرافیہ کے جتلے مسائل اس ضمن میں شامل ہیں وہ مدرسوں میں بالعموم اس طرح پڑھائے جاتے ہیں کہ ہر چیز کے متعلق جتنی واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے وہ بغیر کسی ترتیب کے بہت خشک ' بے مزہ طریقے سے طلبہ کے سامنے بیان کردی جاتی ہے - مثلاً یہ کہ فلاں ملک میں کون سے پہاڑ ہیں ' کتنے دریا ہیں ' کس قدر بارش ہوتی ہے ' کیا کیا پیداوار ہے ' لوگ کس کس قسم کے کام کرتے ہیں اور ملک کی سیاسی تقسیم کس طرح کی گئی ہے - طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان تمام غیر مربوط اور بظاہر بے مقصد معلومات کو کسی نہ کسی طرح حفظ کر لیں یہ بجائے خود مستقل اہمیت رکھتے ہیں - بھلا بتائیے تو کہ حافظے پر اس طرح کا بوجھ ڈالنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ؟ فرض کیجئے طالب علم کو اپنی آئندہ زندگی میں کسی موقع پر کوئی جغرافی امر معلوم کرنے کی ضرورت آپڑے مثلاً وہ کسی غیر ملک میں سفرکرنا یا کسی پہاڑ کی سیاحت کرنا چاہتا ہے اور اس کے متعلق اِسے واقفیت درکار ہے- ایسے موقع پر وہ اس سرسری واقفیت سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جو اس نے جغرافیہ کے سبقوں یا کتابوں سے حاصل کی تھی. ضرورت کے وقت وہ ہر قسم کی معلومات کتابوں اور نقشوں سے حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ مفید مطلب واقفیت کو کتابوں سے نکال سکے - پھر ایسے واقعات اور معلومات کو حافظے میں ٹھونس لینے سے کیا فائدہ جن سے نہ کوئی ذہنی تربیت ہو ' نہ ان کی بذات خود کوئی خاص اہمیت ہو ؟ لہذا جغرافیہ کی تعلیم میں بھی ہمیں وہی اصول اختیار کرنا چاہئے جو ہم نے اور تعلیمی مشاغل کے لئے ضروری قرار دیا ہے یعنی مدرسے میں بچوں کے سامنے

مختلف قسم کے جغرافی مسائل پیش کئے جائیں جو ان کے اپنے مشاہدے میں آئے ہوں اور ان کے ماحول سے تعلق رکھتے ہوں، جن کے حل کرنے سے انہیں فطرتی طور پر دلچسپی ہو ۔ اس کی وجہ سے بچوں کو اپنے ماحول کا زیادہ غور کے ساتھ مشاہدہ کرنا پڑے گا انہیں مختلف قسم کی معلومات فراہم کرنی اور اس کی تربیت و تنظیم کرنی ہوگی جو ذہنی تربیت کا بہترین وسیلہ ہے ۔ ان کو اس مضمون میں آسانی کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ انسانی جغرافیے کی تمام معلومات ایک ایسے موضوع کے تحت میں لائی جا سکتی ہے جو بچوں کے لئے فطرتاً دلچسپ ہے یعنی " انسان اور اس کی زندگی اور مشاغل " ۔ یہ مربوط اور دل چسپ موضوع بچوں کے تمام جغرافی مطالعے کا مرکز بن جاتا تو ان کی متفرق معلومات میں ربط اور نظم پیدا ہو گا اور وہ اس کے منشا اور مفہوم کو سمجھ سکیں گے ۔ ہر سمجھدار اُستاد کو یہ چاہئے کہ بجائے اپنے طلبہ کو متفرق اور بے ترتیب باتیں بتانے اور یاد کرانے کے ان کے سامنے ایسے دل چسپ مسائل پیش کرے کہ مثلاً بتاؤ صحرائے افریقہ کے لوگ یا سوئٹزر لینڈ کے باشندے کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کے کیا اسباب ہیں ۔ اب اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ان کے پاس اٹلس موجود ہے جس کو مطالعہ کرکے اور اپنی قوت مشاہدہ سے کام لےکر وہ بہت سے طبیعی حالات دریافت کر سکتے ہیں مثلاً زمین کی ساخت، پہاڑوں اور دریاؤں کی موجودگی یا غیر موجودگی، آب و ہوا وغیرہ ۔ گزشتہ واقفیت کی بناپر یا کسی جغرافئے کی کتاب کی مدد سے انہیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس آب و ہوا اور ایسے طبیعی حالات میں وہاں کس قسم کی پیداوار ہوگی اور کیا حیوانات پائے جائیں گے ۔ اس معلومات کی بنا پر وہ وہاں کے باشندوں کے مشاغل اور طرز زندگی سے بحث کرسکتے ہیں اور اُستاد کے رہنمائی کرنے والے سوالوں کی مدد سے

ان کی توجہ ایسے امور کی طرف رجوع ہو سکتی ہے جو اس معاملے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم سے جس میں ذاتی مشاہدے اور تجربے، باہمی مشورے اور کتابوں سے استفادے کا موقع حاصل ہوگا ان کو مختلف انسانی مسائل اور مظاہر فطرت کا باہمی تعلق سمجھنے میں مدد ملے گی، ان کی غور فکر کی قوت اور نتائج اخذ کرنے کی قابلیت نشو و نما پائے گی اور وہ جغرافیے کے مطالعے سے عام ذہنی تربیت حاصل کریں گے جو ان کی زندگی میں بہت سے موقعوں پر مفید ثابت ہوگی یہ تعلیمی اصول جس کی توضیح ہم نے ایک معمولی سی مثال کے ذریعے سے کی ہے - جغرافیے کے بہت سے مباحث پر عائد ہو سکتا ہے -

اسی طرح اگر ہم تاریخ پر بحیثیت ایک درسی مضمون کے نظر ڈالیں تو اس میں بھی اصلاح اور تبدیلی کی بہت گنجائش نظر آتی ہے - اس کے مطالعے کی ایک صورت تو وہ ہے جو ہمارے اکثر مدارس میں پائی جاتی ہے جس میں طلبہ کو چند ضروری اور غیر ضروری ناموں اور سنوں اور تاریخی واقعات یاد ہو جانے کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا - اس طرح کے مطالعے کی حیثیت اگر اس کے لئے "مطالعے" کا وقیع لفظ استعمال کرنا جائز ہو بالکل وہی ہے جو اور بہت سے ارتسامات (Impressions) کی جن سے انسان کے بعض حواس متاثر ہوتے ہیں لیکن اس کے دماغ یا اس کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا - فرض کیجئے ایک ناواقف اور ناتجربہ کار شخص کسی غیر ملک کے ایک بہت بڑے تجارتی مرکز میں جاتا ہے جہاں کی زبان وہ نہیں جانتا اور وہاں بہت سی غیر مانوس آوازیں سنتا ہے اور اجنبی لوگوں، غیر مانوس چیزوں اور کاروبار کو دیکھتا ہے - اس پر ان تجربات کا کیا اثر ہوگا؟ یہ سب آوازیں اور نظارے محض اس کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ کو متاثر کرتے ہیں اور بس -

اگر وہ ان کے باھمی تعلق اور مفہوم سے واقف نہیں ، اگر وہ اس مقصد
کو جو ان میں ربط پیدا کرتا ھے نہیں سمجھتا تو یہ تمام متفرق
تاثرات نہ اس کے علم میں اضافہ کر سکتے ھیں نہ اس کے عمل میں
کوئی تبدیلی پیدا کر سکتے ھیں - اس کا ذھن انفعالی طریقے سے ان
تاثرات کو قبول کر لیتا ھے لیکن ان کا ادراک نہیں کر سکتا - یہی
حال اس ناواقف طالب علم کا ھے جس کو بغیر کسی ذھنی تیاری
بغیر ذاتی تجربے اور مشاھدے کے تاریخ کے ناپیدا کنار سمندر میں
چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس کی لہریں گنا کرے جن کا نہ وہ باھمی تعلق
سمجھ سکتا ھے نہ اپنی زندگی کے ساتھ ان کی وابستگی کو محسوس
کرتا ھے - جب تاریخ کے واقعات بے ربط اور بے جان معلومات کی حیثیت
سے طالب علم کے سامنے پیش کئے جاتے ھیں جن کو کسی بیرونی دباؤ
یا اثر کی وجہ سے اپنے حافظے میں محفوظ رکھنا ھے تو تاریخ کا مطالعہ
نہ اس کے تجربے کو وسیع بنا سکتا ھے نہ معنی خیز - وہ ماضی کے
ارتقائی سلسلے کا تصور نہیں کر سکتا اور نہ یہ محسوس کر سکتا ھے
کہ آج جو کچھ ھے وہ گذشتہ زمانے کے لوگوں کی متعدد کوششوں
کا نتیجہ ھے - اس میں حال کی قوتوں اور تحریکوں سے مستقبل
کے لئے کام لینے کی صلاحیت نہیں پیدا ھوتی اس کی روز مرہ
کی زندگی اور مشاغل کا سلسلہ ایک سطح پر جاری رہتا ھے اور ایک
دوسری سطح پر وہ بہت سی ایسی باتوں کے متعلق واقفیت بہم
پہنچاتا ھے جو اس کے ذاتی تجربات کی دنیا سے بالکل بعید اور غیر
متعلق ھیں - مثلاً یہ کہ اب سے کئی ہزار سال قبل اشوک اعظم ھندوستان
کا ایک شہنشاہ تھا جس نے ایک خونریز جنگ کے بعد امن پسندی
اختیار کر لی تھی - یا علاءالدین نے دکن کے بہت بڑے حصے کو فتح
کیا - ظاھر ھے کہ ایسی حالت میں زندگی کی ان دونوں سطحوں کے

درمیان کوئی نتیجہ خیز رابطہ قائم نہیں ہوسکتا یعنی تاریخ کے مطالعے سے طلبہ کے ذاتی تجربات کی معلویت اور اهمیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا - کیونکہ اول تو مباحث کا انتخاب بہت مہمل اور قابل اعتراض ہوتا ہے جس میں سطحی نمائشی اور غیر ضروری چیزوں کو اهم تمدنی مسائل اور معاشری معاملات پر ترجیح دی جاتی ہے - دوسرے طریقہ تعلیم ایسا اختیار کیا جاتا ہے کہ طلبہ جو کچھہ سیکھتے بھی ہیں اس پر پوری ذهنی قدرت حاصل نہیں کر سکتے - اس سے نہ ان کی دماغی تربیت ہوتی ہے نہ وہ اس واقفیت سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں کچھہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں -

تاریخ کے مطالعے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اسے ہم تمدنی معاشری اور سیاسی مسائل کے سمجھنے اور حل کرنے کا ذریعہ بنائیں اور اس کی مدد سے انسان کی ادراک معانی کی قابلیت میں وسعت اور گہرائی پیدا کریں - اگر اس کے مطالعے کی بدولت ہم اپنے ذاتی اور وقتی کار و بار کی حقیقی اور مستقل اهمیت اور ان کے ارتقاء کے سلسلے کو سمجھہ سکیں تو تاریخ ذهنی تربیت کا موثر ترین وسیلہ بن جاتی ہے - تاریخ کی تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ طالب علم کو معلوم ہو جائے کہ اس کے روزمرہ کے کاموں کا تعلق وسیع تر انسانی مشاغل سے کیا ہے اور جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا جائے اس میں یہ استعداد بڑھتی جائے کہ تمدنی امور اور مسائل پر ارتقائی ظر ڈال سکے اور ماضی حال اور مستقبل کی باهمی وابستگی اور ن کی تشکیل میں انسان کی کار فرمائی کو محسوس کرے - اگر تاریخ ، منشا کی یہ تشریح صحیح ہے تو اس سے تاریخ کے نصاب اور ریقہ تعلیم دونوں میں ترمیم لازم آتی ہے - اس کي عملی تفصیل ي یہاں گنجائش نہیں لیکن بعض باتیں بالکل بدیہی اور واضح

ھیں - مدرسوں کے نصاب میں بجائے تاریخ کے سیاسی اور حربی پہلو پر زور دینے کے اس کے انسانی اور تمدنی رخ کو نمایاں کرنے کی ضرورت ھے - ان لڑائیوں کے واقعات اور تفصیلات ھمارے لئے کوئی اھمیت نہیں رکھتے جواب سے سینکڑوں سال پہلے لڑی گئی تھیں - ھمیں اس وقت صرف ان نتائج سے بحث اور سروکار ھے جنھوں نے انسانوں کی زندگی اور جماعتوں کے باھمی تعلقات پر اس طرح اثر ڈالا کہ ھماری اپنی زندگی بھی اس سے بلا واسطہ یا بالواسطہ متاثر ھوئی - ھمیں کم از کم مدرسے کی تعلیم میں ان سیاسی پیچیدگیوں اور ملکی تقسیموں سے بھی زیادہ تعلق نہیں جو مختلف زمانوں میں ھوتی رھی ھیں سوائے ایسی حالت کے جب ان کی وجہ سے ملکی معاشرت اور تمدن میں اھم تبدیلیاں رونما ھوئی ھوں

تاریخ کے انسانی رخ کو نمایاں کرنے سے ھمارا مطلب یہ ھے کہ نصاب میں بعض خاص چیزوں کو زیادہ اھمیت دی جائے مثلاً بڑے بڑے مشاھیر کی سوانح زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے نہ بحیثیت افراد کے کیونکہ اس لحاظ سے ان کا تعلق تاریخ سے زیادہ نفسیات کے علم سے ھے بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ تمدنی تحریکوں کے نمائندے ھیں اور ان کی زندگی اور کارناموں سے ان تحریکوں پر بہت کچھ روشنی پڑتی ھے - یہاں ھمیں ان کی انفرادی زندگی کے واقعات کے ساتھہ ساتھہ ان کے عہد کے معاشرتی اور تمدنی حالات کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ھے جو ان کے خیال اور عمل کے محرک ھوئے اور جنھوں نے ایک طرف ان کی ذات پر اپنا اثر ڈالا اور دوسری طرف خود ان کی ذات سے متاثر ھوئے - دوسرے چھوٹے بچوں کے نصاب تاریخ میں ھمیں ابتدائی زمانے کی تاریخ کا مطالعہ بھی شامل کرنا چاھئے کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے سب سے زیادہ اھم اور مستقل مشاغل اور اداروں کا آغاز

بہت وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے اور بچے سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ تمدن کے پیچیدہ نظام کی ابتدا کس طرح ہوئی اور اس کی بنیادیں کن چیزوں پر قائم ہیں - یہ وہ زمانہ ہے جب نہتا انسان فطرت کی زبردست ' بے رحم اور بے پناہ قوتوں کے ساتھ بر سر پیکار ہے - یہ صورت حال اُس کی فعالیت ' اس کی قوت عمل ' اس کی قوت اختراع کو ابھارتی ہے اور وہ طرح طرح کے آلات اور ہتھیار ایجاد کرکے ان قوتوں کو رفتہ رفتہ اپنے قابو میں لاکر اپنا دوست اور خادم بناتا ہے - اس کی ایک مثال ہم کسی گذشتہ باب میں رابنسن کروسو کے قصے سے دے چکے ہیں - اس حالت میں انسان کو روزی حاصل کرنے کے لئے شکار اور زراعت کی ' گرمی ' سردی اور جانوروں وغیرہ کے خطروں سے بچنے کے لئے مکان ' اور بدن کی حفاظت کے لئے کپڑا جوتا وغیرہ بنانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس طرح ان تمام پیشوں اور مشاغل کی ابتدا ہوتی ہے جن کو ہم آج زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ شکل میں موجودہ تمدن کا جزو پاتے ہیں - ان تمام کاموں کے ذریعے انسان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے سراسر اپنے ماحول کا محتاج ہے اور اس کی وساطت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا - غرض اس قدیم اور ابتدائی انسانی تمدن کا مطالعہ بچوں کے لئے بہت مفید اور دل چسپ ہے - بشرطیکہ اس میں عملی طریقوں سے کام لیا جائے جن کی مختصر سی تشریح ہم ذیل میں کریں گے - تیسری چیز جس کو نصاب میں نمایاں حیثیت دینی چاہئے صنعت و حرفت اور اقتصادی تاریخ ہے - اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ اقتصادی تاریخ بطور ایک علم کے مدرسے کے طلبہ سامنے پیش کی جائے کیونکہ ان میں ابھی اتنی دماغی پختگی نہیں آئی کہ وہ تاریخ کے مجرد تصورات کو ذہن نشین کر سکیں بلکہ انہیں

یہ بتانا چاہئیے کہ ان کے آباؤ اجداد نے کس طرح اس مقام سے ابتدا کرکے ، جس کا حال وہ ابتدائی زمانے کی تاریخ میں پڑھ چکے ہیں ، رفتہ رفتہ صنعت و حرفت اور معاشرت کے موجودہ نظام کو اپنی متعددہ کوششوں کے ذریعہ تعمیر کیا ہے اور کس طرح اس زمانے میں وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر رہتے ہیں تقسیم عمل اور اشتراک عمل کے ذریعے اپنی روزی کماتے ہیں اور دنیا کا کام چلاتے ہیں ، اور انسان کی مجموعی ترقی میں صنعت و حرفت کا کیا حصہ ہے - چوتھی چیز جس کی جانب پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے ہمیں توجہ دلائی ہے اور جس کو ان کے خیال میں معلموں نے عام طور پر نظر انداز کیا ہے وہ علمی اور عقلی ترقی کی تاریخ ہے - تاریخ کے مطالعے سے طلبہ میں اس بات کا صحیح احساس پیدا ہونا چاہئیے کہ انسان کی ترقی میں اس کی دماغی جد و جہد اور کاوش کو کس حد تک دخل ہے اور سائنس اور دوسرے علوم نے تجارتی ارتقاء میں کیا نمایاں خدمت انجام دی ہے - وہ لکھتے ہیں :—

" ہم میں یہ احساس ابھی حال ہی میں پیدا ہوا ہے کہ وہ بڑے بڑے سورما جنھوں نے انسانوں کی قسمت کو بنایا ہے ماہرین سیاست فوجی جرنیل اور ملکی لیڈر نہیں ہیں بلکہ وہ علمی محققین اور موجد ہیں جن کی بدولت انسان کے قبضہ قدرت میں ایسے ذرائع آگئے ہیں جو اس کے تجربے کی توسیع اور تنظیم کرتے ہیں اور وہ صناع اور شاعر ہیں جنھوں نے اُس کی جد و جہد ، اُس کی کامرانیوں اور ناکامیوں کے افسانے کو مصوری کے ذریعے یا مجسموں کی شکل میں یا الفاظ کے پیکر میں ایسے دلکش انداز سے بیان کیا ہے

کہ اس کا مطلب اور مفہوم تمام لوگوں کی سمجھہ میں آجاتا ھے......انسانی دماغ نے زندگی کے ارتقاء میں جو حصہ لیا ھے اس کا صحیح احساس پیدا کرنے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ھو سکتا ھے کہ تاریخ کے مطالعے سے طلبہ پر یہ بات واضح ھو جائے کہ بدویت کے زمانے سے موجودہ دور تمدن تک جس قدر ترقی انسان نے کی ھے اس کا انحصار علمی دریافتوں اور ایجادوں پر ھے اور وہ یہ سمجھہ لیں کہ بہت سے ایسے واقعات جن کو عام طور پر تاریخی تصانیف میں اھمیت دی گئی ھے محض ضمنی حیثیت رکھتے ھیں بلکہ انھوں نے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ھیں جن کو عقل کے ذریعے زیر کرنا پڑا ھے " [۱]

لیکن صحیح نصاب کا تعین بجائے خود کافی نہیں جب تک استادوں کا طریقہ تعلیم اور طلبہ کا طریقہ تحصیل دونوں درست نہ ھوں - کیونکہ ھمارے تعلیمی نظریے کی رو سے نصاب اور طریقہ تعلیم دو بالکل جداگانہ چیزیں نہیں ھیں یعنی ھم یہ نہیں سمجھتے کہ نصاب بجائے خود ایک مکمل اور مرتب چیز ھے جس پر بعض خارجی طریقوں سے طلبہ کو عبور حاصل کرنا ھے - نصاب کی ترتیب و تنظیم در اصل اس طریقے پر منحصر ھے جس کے ذریعے طلبہ اس کا مطالعہ کرتے ھیں یعنی ایک معنی میں وہ اپنا نصاب خود بناتے ھیں - مثال کے طور پر تاریخ کو لیجئے - ضرورت اس بات کی ھے کہ تاریخی واقعات طلبہ کے سامنے بطور زندہ مسائل اور معاملات کے پیش

[۱] Dewey : Democracy and Education صفحہ ۲۵۴ -

کئے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو وہ اس کی تحریکوں
کو اسی نظر سے دیکھیں جس سے وہ لوگ دیکھتے تھے جن کو
ان سے براہ راست سابقہ پڑا تھا - جس حد تک ہم تاریخ کے
بظاہر مردہ جسم میں روح پھونک سکیں گے یعنی ماضی کے واقعات
کا ربط اور تسلسل حال کے مسائل کے ساتھہ قائم کر سکیں گے اسی حد
تک تاریخ کی تعلیم میں شگفتگی اور دل چسپی پیدا ہوگی - جہاں
کہیں صاحب نظر اور باتخیل معلموں نے تاریخ کی تعلیم میں
جان ڈالی ہے انھوں نے ہمیشہ اس کو ماضی کے بھولے بسرے افسانوں
کے بجائے حال کی تفسیر بنا دیا ہے اور طلبہ کو یہ محسوس کرایا
ہے کہ افراد اور جماعتوں کی زندگی کے تمام واقعات ایک دوسرے سے
وابستہ ہیں اور علت و معلول کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں -
پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنے شکاگو کے تجربی مدرسے کے کچھہ
حالات Elementary School Record کے نام سے شائع کئے تھے - ان میں
سے چند ضروری اقتباسات اور مضامین کو پروفیسر فنڈلے (Findlay) نے
مرتب کرکے اپنے دیباچہ کے ساتھہ "School and the Child" کے نام سے
شائع کیا ہے - اس کے ایک باب میں مصنف نے تاریخ کے طریقۂ تعلیم سے
بحث کی ہے اور اس کے اصولوں کو مختصر طور پر بیان کرکے بتایا
ہے کہ انھوں نے کس طرح اپنے اسکول میں ان پر عمل کیا - اس مدرسے
کے طلبہ تاریخ کے مطالعے کی ابتدا سیاسی تاریخ کی درسی کتابوں
سے نہیں کرتے بلکہ سب سے پہلے اپنے گرد و پیش کی معاشری اور
اقتصادی زندگی کے مشاغل اور انسان کی ابتدائی زندگی یعنی عہد
حجری اور عہد فلزی کے اور وحشیوں کے طریقہ بود و باش وغیرہ کا
مطالعہ کرتے ہیں - اپنے قریبی ماحول کو سمجھنے کے لئے وہ ذاتی
مشاہدوں تعلیمی سیر و سفر اور عملی تجربوں سے کام لیتے ہیں -

بازاروں ، دوکانوں ، کارخانوں ، صنعتی کارخانوں وغیرہ کو غور سے دیکھتے ہیں اور جہاں تک ان سے ممکن ہے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ کس طرح ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اپنی ضروریات فراہم کرتے ہیں قدیم زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک طرف تو وہ خود اسی قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زمانے کے مشاغل مثلاً گھر بنانے ، آگ جلانے ، کپڑا بننے ، کاشتکاری وغیرہ کی تقلید کرکے اس جگ بیتی کو آپ بیتی بنا دیتے ہیں اور دوسری طرف تصویروں ، عجائب خانوں کے نمونوں اور کتابوں وغیرہ کے ذریعے اپنی معلومات اور تخیل میں وسعت اور وضاحت پیدا کرتے ہیں - اس طرح وہ اپنی موجودہ زندگی کے سادہ اور عام فہم مظاہر کو سمجھنے میں اور ابتدائی زندگی کے حالات معلوم کرنے میں عملی اور فعالی طور پر شریک ہوتے ہیں اور تاریخ کے اس اہم ترین مسئلے کو ذاتی تجربے اور مشاہدے سے حل کرتے ہیں کہ انسان کی صنعت و حرفت اور معاشری زندگی کی تنظیم کس طرح ہوئی اور اس نے اپنی تمام ضروریات کیونکر پوری کیں - ان باتوں کو سیکھنے کی ذمہ داری زیادہ تر خود طلبہ پر ہے - معلم کا کام اس میں صرف اتنا ہے کہ وہ ان کے ذوق تحقیق و تجسس کو ابھارتا رہے اور مدرسے میں کتابوں ، نقشوں ، تصاویر وغیرہ کی مدد سے اور اپنی شخصیت کی اثر آفرینی اور نصاب کی معقول تنظیم کے ذریعے ان کے لئے ایک ایسا ماحول مہیا کردے کہ ان میں تاریخی ارتقا کا احساس بیدار ہو اور وہ تاریخ کے اس مرکزی مسئلے میں دل چسپی لیں کہ انسانی سوسائٹی کس طرح اپنی ابتدائی حالت سے موجودہ حالت کو پہنچی -

ابتدائی تاریخ کی تعلیم کا یہ نظریہ صرف ایک ہی تعلیمی مفکر تک محدود نہیں بلکہ دوسرے ماہرین تعلیم نے بھی اپنی

مقامی اور ذاتی ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی کرکے اس طریقہ کو استعمال کیا ہے - مثلاً ڈاکٹر فیریر نے "مدرسہ عمل" کے متعلق اپنی ضخیم تصنیف کی تیسری جلد [۱] (مدرسہ عمل کی عملی تنظیم) میں تاریخ کی ابتدائی تعلیم کے لئے جو طریقہ تجویز کیا ہے اس میں بھی بچوں کے ذاتی مشاهدے اور عملی کام پر زور دیا ہے - ان کی تجویز یہ ہے کہ بچوں کو سب سے پہلے اس موضوع کا مطالعہ کرنا چاهئے جو ان کی دل چسپی کا قدرتی مرکز ہے یعنی "انسان کی ضروریات زندگی اور ان کا پورا ہونا" - بچے فطرتاً یہ بات معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں انسانوں نے اپنی اہم ترین ضروریات یعنی لباس، خوراک، حفاظت ذات وغیرہ کے لئے کیا انتظام کیا ہے - اس مبحث کے متعلق طلبہ مختلف ذرائع سے معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور ان کو ایک خاص طریقہ سے کارڈوں پر درج کرتے ہیں جن کا نام مصنف موصوف نے "اسباق حیات" رکھا ہے - استادوں کی نگرانی میں وہ ان تمام معلومات کو عنوانات بالا کے ماتحت مرتب کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذاتی کوشش اور دوسروں کی مدد سے حاصل کی ہوئی واقفیت میں نظم و ترتیب قائم کرنا سیکھتے ہیں اور یہی واقفیت آگے چل کر تاریخ اور انسانیات کے دوسرے شعبوں کی سنگ بنیاد بن جاتی ہے - پروفیسر فاریادی واسکونسلو (Faria de Vasconcellos) نے بھی اپنے بلجیم کے مدرسے کے حالات میں لکھا ہے [۲] کہ تمام مضامین کی تعلیم میں عملی مشاغل اور طلبہ کی ذاتی کوشش کو نمایاں اہمیت دینی چاهئے - اس مدرسے میں طلبہ جب

---

[۱] La Pratique de l'ecole active یہ کتاب فرانسیسی زبان میں ہے - اس کا ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا -

[۲] ان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ A New School in Belgium کے نام سے شائع ہوا -

تاریخ کا مطالعہ کرتے ھیں تو وہ خود اس کی تحصیل میں جسمانی جد و جہد اور ذھنی کاوش سے کام لیتے ھیں اور حتی‌الامکان کسی بات کو استاد سے سن کر یا کتاب میں پڑھ کر بغیر غور اور تنقید کئے قبول نہیں کرتے - اونچی جماعتوں میں خاص کرکے یہ کوشش کی جاتی ھے کہ طلبہ کے لئے ایسے مواقع فراھم کئے جائیں کہ وہ خود اپنی قوت فکر و عمل اور اجتہاد سے کام لے سکیں اور استاد ان کو ھر کام کے لئے ایک بنے بنائے راستے پر نہ ڈال دے جس پر وہ بغیر سوچے سمجھے ' بغیر اپنے دماغ پر زور ڈالے چلتے رھیں - اسی خیال سے متاثر ھوکر اور طلبہ کو تاریخ کے مطالعے میں فعالی حیثیت سے شریک کرنے کے لئے پروفیسر کیٹنگ (Keatinge) نے ' جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے پروفیسر ھیں ' اپنا Source Methed مرتب کیا ھے [1] جس کی بنیاد یہ اصول ھے کہ مدرسے میں طلبہ کو ایک حد تک مورخ بننے کا موقع دیا جائے یعنی ان کے لئے کم و بیش ایسے حالات مہیا کئے جائیں جن میں مورخ تاریخ کو ترتیب دیتا ھے - عام طور پر مدرسوں میں یہ ھوتا ھے کہ طلبہ معمولی درجے کے کم علم مولفوں کی درسی کتابوں کو پڑھ کر نہ صرف تاریخی معلومات حاصل کرتے ھیں بلکہ ان کی رائے اور خیالات اور نزاعی مسائل میں ان کے فیصلوں کو بھی تسلیم کر لیتے ھیں - ظاھر ھے کہ اس طریقہ پر تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ان میں نہ کوئی بصیرت پیدا ھوسکتی ھے نہ آزادی رائے نہ ذھنی تربیت - چنانچہ کیٹنگ (Keatinge) کی تجویز جس پر انھوں نے عمل کرکے دیکھا ھے یہ ھے کہ انھیں چشم دید حالات کے لکھنے والوں اور مستند مصنفوں کے بیانات مطالعے کے لئے دئے جائیں اور بالعموم ایک ھی واقعہ کے متعلق مختلف ھم عصر مورخوں کی رائے بتائی

[1] اس طریقہ پر انھوں نے تفصیلی بحث اپنی کتاب Teaching of History میں کی ھے ۔

جائے - اس تمام تاریخی مواد پر جو طلبہ کے سامنے رکھدیا جاتا ھے چند سوالات قائم کئے جاتے ھیں جن کا جواب دینا ان کا کام ھوتا ھے - اگر یہ سوالات سوچ سمجھہ کر بنائے جائیں تو ان کا صحیح جواب دینے کے لئے انھیں اپنی سمجھہ اور قوت فیصلہ سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ھے - مختلف مورخوں کی ذاتی خصوصیات اور کمزوریوں اور ان کے تعلقات اور حالات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ھے - ان کے تعصب یا جانبداری کی وجوہ کو سمجھنا ؛ خلاف قیاس باتوں کو مسترد کرنا ، جہاں تک ممکن ھو اپنے آپ کو گذشتہ زمانے کے لوگوں کا ھم خیال بناکر ان کے نقطہ نظر سے معاملات کو جانچنا ، یہ تمام مطالبات طالب علم کو ذھنی جد و جہد اور غور و فکر پر مجبور کرتے ھیں - متضاد اور مختلف بیانوں میں سے حقیقت امر معلوم کرنے کے لئے اسے ایک حد تک وھی کد و کاوش اور رد و قدح کرنی پڑتی ھے جس سے ایک انصاف پسند مورخ کام لیتا ھے جب وہ مختلف قسم کا مواد بہم پہنچا کر کسی زمانے کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ھے - لیکن یہ مشابہت بہت محدود ھوتی ھے کیونکہ ظاھر ھے کہ ایک نو عمر ، خام کار طالب علم ایک مستند مورخ کی طرح کام نہیں کرسکتا - وہ گذشتہ زمانوں کی زندگی اور لوگوں کے خیالات اور جذبات اور ان کے محرکات عمل کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اس کے لئے نفسیات کا نظری علم اور عملی تجربہ درکار ھے جو اسے حاصل نہیں - وہ معلومات حاصل کرنے کے ان غیر مرتب ذرائع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو مورخ کے لئے کارآمد ھوتے ھیں - مثلاً پرانی عمارتیں ، سکے ، کتبے وغیرہ لیکن باوجود ان تمام نقائص اور کوتاھیوں کے اس طریقہ تحصیل کی بدولت طالب علم کو تاریخ کی تدوین کے مشکل عمل کا جو تجربہ حاصل ھوتا ھے وہ ذھنی اور اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بہت قابل

قدر ہے - ایک طرف تو اسے شہادتوں اور روایتوں کے جانچنے اور پرکھنے کی عادت پڑتی ہے اور اس کی طبیعت میں احتیاط کا مادہ اور معاملات کو تولنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف (بشرطیکہ معلم صحیح طور پر رہنمائی کرے) اپنی روز مرہ کی زندگی میں مبالغے ' تعصب ' بےجا طرفداری اور غلط بیانی کو ترک کرکے صداقت کا احترام کرنا سیکھتا ہے جو اخلاقی سیرت کا ایک نہایت قابل قدر عنصر ہے - اس میں شک نہیں کہ مدرسے میں تاریخ کی تعلیم تمام تر اسی اصول پر نہیں ہو سکتی کیونکہ علاوہ وقت اور وسائل کے محدود ہونے کے تاریخ کے بہت سے مباحث ایسے بھی ہیں جن میں یہ طریقہ استعمال نہیں ہو سکتا - لیکن مدرسہ جدید کو اپنے اصل اصول کی بنا پر اس طریقے سے اور اس قسم کے تمام فعالی طریقوں سے جو تعلیم میں جان ڈالتے ہیں حسب امکان ضرور استفادہ کرنا چاہئے - اس طرح کسی حد تک تاریخ کے مطالعے میں بھی ایک علمی اور عملی " مشغلے " کی شان پیدا ہوجائے گی اور طلبہ خود اپنی ذاتی جد و جہد اور ذہنی کاوش کے ذریعہ علم حاصل کریں گے -

اس اصول کی توضیح کے لئے ہم ایک اور درسی مضمون کو لیتے ہیں جس کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک مفید ہنر سیکھنا ہے جس کے ذریعے بچوں کو اظہار خودی کا موقع ملتا ہے اور خوشی نصیب ہوتی ہے یعنی ڈرائنگ - مدرسے میں جتنے مختلف ہنر سکھائے جاتے ہیں خواہ ان کا تعلق فنون لطیفہ سے ہو یا دست کاری سے ' سب پر کسی قدر ترمیم کے ساتھ وہی اصول عائد ہوتے ہیں جو ہم ڈرائنگ کے ضمن میں بیان کریں گے - ڈرائنگ کی تعلیم کا مروجہ طریقہ مدارس میں یہ رہا ہے کہ پہلے بچوں کو خطوط اور خطوط کو جوڑ کر آسان شکلیں کھینچنے کی مشق

کرائی جاتی ھے ' پھر رفتہ رفتہ وہ زیادہ مشکل شکلیں بناتے ھیں ھر قدم پر استاد کی خواھش یہ ھوتی ھے کہ وہ ایک خاص مشق کا اس قدر اعادہ کرائے کہ بچہ اس میں ماھر ھوجائے اور اس کو بغیر کسی دقت کے نہایت صفائی کے ساتھہ بنا سکے - بظاھر یہ طریقہ بہت معقول معلوم ھوتا ھے اور اس مروجہ اصول کے مطابق ھے کہ تعلیم میں تدریجی ترقی اور منطقی ترتیب کو پیش نظر رکھنا چاھئے - لیکن نفسیات اطفال کے اعتبار سے اس پر غور کیا جائے تو یہ سراسر غلط ھے کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ ان کو ڈرائنگ سے وہ ذوق پیدا نہیں ھوتا جو ھونا چاھئے - بچوں کی تعلیم میں ڈرائنگ (اور اس قسم کے دوسرے مضامین) کی اھمیت یہ ھے کہ اس میں ان جذبات و خیالات کو اظہار کا موقع ملتا ھے اور یہ اظہار ایک مرئی اور خوش‌نما شکل میں ھوتا ھے - ھر بچے میں فطرت کی طرف سے تعمیر اور اظہار خودی کا جذبہ ودیعت ھوتا ھے اور مدرس کا فرض یہ ھے کہ وہ اس جذبے کی نشو و نما اور تربیت کرے - یہ اسی صورت میں ھوسکتا ھے کہ بچے کو شروع ھی سے آزادی کے ساتھہ اپنے رجحانات کے اظہار کا موقع دیا جائے - ھم دیکھتے ھیں کہ اگر بچے کو موقع ملے تو وہ کاغذ پر رنگوں یا پنسل کی مدد سے اپنے تاثرات کو ظاھر کرتا ھے - شروع میں یہ اظہار بہت غیر منتظم اور بے ڈھنگا ھوتا ھے لیکن رفتہ رفتہ اس آزاد شغل میں اس کو اپنی انگلیوں کی حرکت اور ڈرائنگ کے آلات پر زیادہ قابو حاصل ھوجاتا ھے - بر خلاف اس کے اگر ڈرائنگ کو بجائے ایک آزاد اور مسرت بخش مشغلے کے جس میں بچے کو اپنی اندرونی کیفیتوں کو خارجی شکل میں ظاھر کرنے کا موقع ملتا ھے ' محض بے روح تقلید اور مشق تک محدود رکھا جائے تو وہ ڈرائنگ کو ھرگز اظہار خودی کا موثر وسیلہ نہ بنا سکیں گے خواہ انہیں بعض اشیا

کی صحیح شکلیں بنانے میں پوری مہارت کیوں نہ حاصل ہوجائے - وہ ان شکلوں کو جن کی انہیں مشق ہے بنا سکیں گے لیکن ان میں جدت اور انفرادی ذوق کی کوئی جھلک نہیں ہوگی - وہ چیزوں کو دیکھ کر ان کی اچھی نقل اتار لیں گے لیکن ان کو اس فن سے اتنی دل چسپی اور شوق نہ ہوگا کہ وہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی اس کو اپنی فرصت کا مرغوب مشغلہ بنائیں - لہذا مدرسہ جدید ڈرائنگ کی تعلیم میں بھی انفرادی کوشش اور آزادانہ اظہار کی قدر کرتا ہے اور سب بچوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے سے احتراز کرتا ہے - بچوں کی تعلیم میں سب سے پہلے ضرورت ہے ان کی ہمت افزائی کی ' ان کے شوق اور تجسس کے ابھارنے کی ' انہیں آزادانہ اظہار خودی کا موقع دینے کی ان کے رجحان طبع کو ان کا رہنما بنانے کی تا کہ ان میں جو تخلیقی جذبات اور قوتیں ہیں وہ زور شور سے کام کرنے لگیں - بقول ڈاکٹر بیلارڈ (Ballard) کے چھوٹے بچوں کی تعلیم میں " کاٹ چھانٹ سے زیادہ سینچنے " کی ضرورت ہے [1] بچوں کے طریقہ اظہار میں ضبط و نظم پیدا کرنے اور صحت عمل پر اصرار کرنے کا مناسب وقت وہ ہے جب ان کے شوق کے پر لگ چکے ہوں اور وہ بغیر کسی خارجی دباؤ کے اپنی خوشی سے رنگوں اور شکلوں کے ساتھ کھیلنا شروع کردیں اور خود ہی یہ محسوس کریں کہ اس کھیل کو زیادہ با معنی اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے معلم کی ہدایت اور اپنی قوتوں کو تربیت کرنے کی ضرورت ہے - اگر ابتدا ہی سے ہم صحت عمل کی خاطر یا وقت کی کفایت کا خیال کرکے یا نمائشی نتائج کو جلد از جلد حاصل کرنے کے لئے رسمی مشق اور اعادے پر زور دینگے تو بچوں کا وہ جذبہ تخلیق افسردہ ہو کر رہ جائے گا جو ہر قسم

Teaching the Mother Tongue [1]

کے آرٹ کے لئے قوت محرکہ کا کام دیتا ہے اور انسانی شخصیت کا ایک نہایت قیمتی عنصر ہے -

ذہنی تربیت کا جو نظریہ ہم نے اس باب میں پیش کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذہنی تربیت چند مخصوص علمی مشقوں کے ذریعے نہیں ہوسکتی - بچے کے دماغ میں ایسی متفرق اور بے ربط قوتیں نہیں ہوتیں جن کی تربیت خاص خاص مضامین کے ذریعے کی جائے - اس کی جبلتوں کو نشو و نما دینے اور ان کو مرتب کرکے ذہانت کو بیدار اور آمادۂ عمل کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کو مختلف علمی اور عملی مشاغل میں لگایا جائے جن کی تکمیل کے دوران میں انہیں پیچیدہ مسائل اور مشکلات سے سابقہ پڑے اور کسی مقصد کو پیش نظر رکھکر اپنی قوتوں اور وسائل و ذرائع کو منظم کرنے کی ضرورت پیش آئے -

ذہنی تربیت کے لئے ذاتی کاوش اور جد و جہد ناگزیر ہے - اگر نصاب محض منطق کے لحاظ سے مرتب کئے ہوئے سبقوں کا مجموعہ ہوگا اور طریقہ تعلیم میں تجربہ فعالیت اور عمل کو اہمیت نہیں دی جائے گی تو طلبہ کی دماغی تربیت ہرگز نہ ہوسکے گی - یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض غیر معمولی حافظے کی مدد سے بہت سی معلومات فراہم کرلیں اور ان میں ایک قسم کی "علمیت" کی شان نظر آنے لگے لیکن وہ ذہنی بیداری جو ان کو معاملات کے سمجھنے، ماحول سے فائدہ اُٹھانے اور اس پر قابو پانے میں مدد دیتی ہے جو علم کو عمل میں تبدیل کرتی ہے اور حاصل کردہ واقفیت کا استعمال سکھاتی ہے اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک ہم مدرسے کے تمام تعلیمی کاروبار کو ان اصولوں پر از سر نو مرتب نہ کریں گے جن کی تشریح ہم نے اس باب میں کی ہے - علم کا خزانہ

جب تک عمل کے سر چشمے سے ابل کر دریائے مواج نہ بن جائے کشت حیات کو سیراب نہیں کر سکتا - دماغ کو ربط وبےابس معلومات کا ذخیرہ بنا لینے کا نام تعلیم نہیں - بقول غالب :

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے ؟

باب چہارم

تدوین نصاب

ہم نے سابقہ ابواب میں ضمناً مسئلہ نصاب کا ذکر کیا ہے اور گذشتہ باب میں یہ بتایا ہے کہ اگر ہم درسی مضامین اور مدرسے کے دوسرے مشاغل سے طلبہ کی ذہنی تربیت کا کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں ان کے سامنے کس حیثیت سے پیش کرنا چاہئے - اب ہم زیادہ تفصیل اور تسلسل کے ساتھ اس امر سے بحث کریں گے کہ نصاب کے مضامین کا انتخاب اور ان کی ترتیب و تدوین کس طرح کرنی چاہئے کہ ان سے فوائد حاصل ہو سکیں جن کی توقع ہے - یہ مسئلہ عملی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے کیونکہ اگر مدرسے کے مشاغل کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نصاب کی تعلیم ہی اس کا سب سے بڑا کام ہے - تعلیم کے دوسرے وسائل مثلاً استادوں کی شخصیت اور مدرسے کی عام فضا کا اثر اپنی جگہہ پر مسلم ہے لیکن سب سے زیادہ جو چیز طلبہ کے ذہن اور اخلاق کو متاثر کرتی ہے وہ ان کا روزمرہ کا کام ہے جس کو وہ دن میں پانچ چھہ گھنٹے انجام دیتے ہیں - تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کی تحصیل میں بھی استاد زیادہ تر نصاب کی ترتیب و تنظیم سے مدد لیتا ہے اور مدرسے کی عام فضا بھی اسی وقت تک تربیت کا وسیلہ بنتی ہے جب طلبہ شوق اور محنت سے اپنے مقررہ نصاب کو پورا کریں اور اسی کے سلسلے میں دوسرے علمی، تفریحی اور تخلیقی مشاغل کی بنا ڈالیں - علاوہ بریں طلبہ کو اپنے کام میں اس وقت تک انہماک اور دل چسپی پیدا نہیں ہوگی جب تک

نصاب کو نفسیات اطفال کے ساتھہ ھم آھنگ نہ کیا جائے اور انھیں اس کے ذریعے نظام تمدن کی معرفت نہ حاصل ھو - اس لئے بعض لحاظ سے نصاب کا مسئلہ تعلیم کا مرکزی مسئلہ ھے - اور گذشتہ پچاس سال میں ماھرین تعلیم نے اس پر بہت توجہ صرف کی ھے - اور اس کے متعلق بہت کچھہ تحقیقات کی ھے - لیکن ھمارے ملک میں اب تک نصاب کی باقاعدہ تنقید اور اصلاح نہیں کی گئی اور اس میں طلبہ کی نفسی ضروریات اور تمدنی مطالبات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی نہیں ھوئی - بلکہ ھندوستان میں انگریزی تعلیم کے اجرا کے وقت جو نصاب تجویز ھوا تھا اس میں بعض نئے مضامین کے جوڑ اور پیوند لگا دئے گئے ھیں - لیکن نصاب میں کوئی بنیادی تبدیلیاں ھوئی ھیں نہ اس کی تنظیم نو کی کوشش کی گئی - لہذا ھم اس باب میں ان اصولوں سے بحث کریں گے - جن کے مطابق ھمیں نصاب کی ترتیب و انتخاب کرنا لازم ھے -

تعلیم کے تمام مباحث، بالخصوص مسئلہ نصاب پر مدتوں تک، '' نفسیات انشعابی '' [1] کا تسلط رھا ھے اور جیسا ھم نے گذشتہ باب میں بیان کیا ھے نفسیات کے عالم اور مدرسوں کے معلم دونوں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے تھے کہ انسان کا دماغ مختلف ذھنی قوتوں کا مجموعہ ھے جو گویا اس کے دماغ کے مختلف گوشوں میں جاگزیں ھیں اور اپنی ترتیب و تنظیم میں ایک دوسرے سے بے تعلق اور آزاد ھیں - اس نظریہ کے مطابق مختلف درسی مضامین نصاب میں اس لئے داخل کئے جاتے تھے کہ وہ خاص خاص ذھنی قوتوں کی تربیت اور تکمیل کریں گویا وہ قوتیں فطرت کی طرف سے بلی بنائی موجود ھیں صرف ان کو تیز کرنے، مشق اور

Faculty Psychology [1]

استعمال کے ذریعے ان میں زیادہ مضبوطی پیدا کرنے کی ضرورت ہے - برخلاف اس کے ہم نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق انسان کا نفس ایک بسیط وحدت ہے ؛ جس کی تمام قوتیں انسانی جبلتوں کی بنیاد پر تجربے یعنی فرد اور ماحول کے باہمی و عمل کے ذریعے سے نشو و نما پاتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھہ اس طرح مربوط ہیں کہ ہر تجربہ کا اثر دماغ کی تمام قوتوں پر پڑتا ہے اور وہ ان سب کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے - لہذا نصاب کے مشاغل اور مضامین علحدہ علحدہ دماغی قوتوں مثلاً ادراک یا حافظے یا تخیل کو تیز نہیں کرتے بلکہ بحیثیت مجموعی ذہنی تربیت کے مسلسل عمل میں حصہ لیتے ہیں بشرطیکہ ان کی ترتیب و تنظیم مناسب اصولوں پر کی جائے اور طریقہ تعلیم ارتقائے ذہنی کے قوانین کے ساتھہ ہم آہنگ ہو - ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تمام مضامین کی تحصیل اور مشاغل کی انجام دہی میں طلبہ کو فعالی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے کیونکہ صرف اسی صورت میں ان کی ذہانت بیدار ہوکر مصروف عمل ہوسکتی ہے - محض انفعالی طریقے پر بہت سی معلومات حاصل کر لینا اور اس کو کسی نہ کسی طرح حافظے میں محفوظ رکھنا تعلیم نہیں کہلا سکتا - یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کو تاریخ ، جغرافیہ سائنس ادب وغیرہ کے متعلق بہت سی واقفیت ہو لیکن اس کا دماغ ذہنی تربیت سے عاری ہو یعنی اس نے یہ ساری معلومات ایسے بے ربط طریقے سے بغیر ذاتی جد و جہد کے حاصل کر لی ہو کہ اس سے اس کے ادراک اور احساس پر کوئی اثر نہ پڑا ہو اور وہ ان سے زندگی میں کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے -

علاوہ ذہنی تربیت کے نصاب کا دوسرا مقصد ، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ، یہ ہے کہ وہ طلبہ کو ان کے گرد و پیش کی

زندگی اور اس کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دے - اصل میں نصاب کا موضوع ھمارا طبیعی اور ماشرتی ماحول ھے - ھم نصاب کے مختلف عناصر اسی سے اخذ کرتے ھیں اور ان اجزا کا گھرا مطالعہ نو عمر بچوں کو کل کائنات کے سمجھنے میں مدد دیتا ھے - اگر مدرسے کا نصاب کسی وجہ سے تمدنی زندگی سے بےتعلق ھو جائے یا ان دونوں کا باھمی رشتہ بہت کمزور ھو جائے تو مدرسے کی تعلیم بے مغز و بے روح ھو جاتی ھے - اور بجائے زندہ مسائل سے بحث کرنے کے الفاظ و علامات کے چکر میں پڑ جاتی ھے -

ھم تعلیم اور تمدن کے تعلق سے بحث کرتے ھوئے اس خرابی کی طرف اشارہ کرچکے ھیں - اس کے پیدا ھونے کا سب سے زیادہ امکان نصاب کی ترتیب و تنظیم میں ھے جہاں معلموں اور مدرسوں کے لئے ھمیشہ یہ خطرہ ھے کہ اپنے اپنے خاص مضامین میں ایسے محو ھو جائیں کہ انھیں اس تعلق کا جو یہ مضامین بچوں کی فطرت اور معاشرے کی زندگی سے رکھتے ھیں ، احساس ھی نہ رھے - لہذا نصاب کی بحث میں یہ یاد رکھنا ضروری ھے کہ اس کے مضامین کے انتخاب اور ان کی ترتیب دو چیزوں کی پابند ھے نفسیات اطفال کی خصوصیات اور تمدنی زندگی کی ضروریات - اس کے بعد ھم یہ سمجھ سکیں گے کہ مدرسوں کا مروجہ نصاب کس حد تک ان معیاروں پر پورا اترتا ھے جو ھم نے ان کے لئے مقرر کئے ھیں -

ھم بتا چکے ھیں کہ مدرسہ جدید کا تعلق جماعتی زندگی سے بہت قریب کا ھے - وہ کوئی قائم بالذات ادارہ نہیں ھے جس کو گرد و پیش کی اقتصادی ، سیاسی ، معاشرتی اور اخلاقی زندگی سے کوئی واسطہ نہ ھو - موجودہ نقطہ نظر یہ ھے کہ مدرسے کو اپنی اندرونی زندگی کی تشکیل معاشرے کی زندگی کے نمونے پر کرنی چاھئے اور

ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں جن سے فائدہ اٹھاکر طلبہ عمرانی مشاغل اور مقاصد کو سمجھہ سکیں اور ایک حد تک ان میں شریک ہوسکیں - اگر مدرسہ بیرونی زندگی سے رابطہ قائم نہیں رکھے گا تو وہ عمرانی ترقی کے لئے بیکار ثابت ہوگا اور جو کچھہ علم و هنر اور استعداد طلبہ وهاں حاصل کریں گے وہ اس کی چار دیواری تک محدود رہے گی اور جب وہ اس چار دیواری سے باهر قدم رکھیں گے تو اس سے کچھہ فائدہ نہ اٹھا سکیں گے - اس ضمن میں "مدرسے" کے اس جدید مفہوم کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جس کو هم نے باب اول میں بیان کیا ہے - کیونکہ اس کے بغیر تدوین نصاب کی موجودہ تحریکوں کو سمجھنا مشکل ہوگا -

هم نے بتایا تھا کہ مدرسہ ' بقول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے ایک "مخصوص ماحول" ہے جہاں تمام تعلیمی اثرات اور نصاب اور مشاغل کی بالارادہ تنظیم کی جاتی ہے تاکہ طلبہ کی نشو و نما ارادی کے ساتھہ ہو اور ان کی اخلاقی اور ذهنی تربیت کے لئے بہترین حالات اور عناصر مہیا ہو سکیں - طلبہ کو "آزادی" دینے کے یہ معنی نہیں کہ معلم نگرانی اور هدایت سے بالکل دست بردار ہو جائیں اور انہیں ان کی جبلتوں کے هاتھہ میں چھوڑ دیں اس امید پر کہ وہ خود بخود تمام اعلیٰ صفات اور قوتیں حاصل کرلیں گے - همارا مشاهدہ اور علم نفسیات دونوں روسو (Rousseau) کے اس خیال کی تردید کرتے هیں کہ اگر هم مدرسوں کو بچوں کی خواهشات اور ضروریات کا تابع بنا دیں تو ان کی عقل و دانش اور سیرت خود بخود صحیح طریقے پر نشو و نما پاکر پختہ ہو جائے گی - روسو کا یہ عقیدہ در اصل اس زمانے کے معلموں کی تنگ خیالی اور سخت گیری کے

خلاف ایک رد عمل تھا - ایک طرف یہ شدت تھی کہ لوگ گناہ آدم کے عقیدے کی بدولت بچوں کو بھی فطرتاً گناہ میں آلودہ سمجھتے تھے اور ان کی نجات کے لئے ہر قسم کی تعزیر و تادیب کو ضروری جانتے تھے - دوسری طرف یہ غلو کہ ہر بچے کے اندر گویا ایک ولی اور حکیم پنہاں ہے جو پردے کو ہٹاتے ہی خود بخود ظاہر ہو جائے گا ! بہر حال تعلیم جدید ان دونوں نظریوں میں سے ایک کو تسلیم نہیں کرتی - کیونکہ اس کے نزدیک فطرت انسانی کی بنیاد ان جبلتوں پر ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں محض امکانات عمل کی حامل ہیں خود کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتیں - البتہ آگے چل کر مختلف اثرات کی بدولت اچھی یا بری صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اس لئے بچوں کی صحیح تربیت اور ان جبلتوں کی مناسب نشو و نما کے لئے تعلیمی ہدایت اور نگرانی ضروری سمجھی جاتی ہے - لیکن یہ ذمہ داری جس سے ہم اخلاقی تربیت کے ذیل میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کرینگے کہ بچوں کی جبلتیں مناسب تادیب و تشویق کے ذریعے صحیح راہ پر لگائی جائیں صرف معلموں ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ مدرسے کے تمام ماحول پر جس میں نصاب طلبہ کی اجتماعی زندگی ان کا کھیل کود ، ان کے فرصت کے مشاغل استاد کی شخصیت وغیرہ سب شامل ہیں - اس لئے تعلیم کا سب سے بڑا عملی مسئلہ یہ ہے کہ اس " مخصوص ماحول " کی تنظیم کس طرح کی جائے کہ بچوں کی جبلتیں ان کے انفرادی نشو و نما میں بھی مدد دیں اور عمرانی مقاصد کے حصول میں بھی کام آئیں - اس ماحول کی تین خصوصیات جو پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے بیان کی ہیں نصاب کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالتی ہیں اس لئے اس کا مختصر سا اعادہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے - مدرسے کے ماحول میں موجودہ تہذیب و تمدن کے مشکل اور پیچیدہ عناصر زیادہ

آسان اور سادہ شکل میں طالبہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کو اس تحلیل کے بغیر اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے - اسی نقطہ نظر سے تدوین نصاب کا مسئلہ یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ تمدنی زندگی کو نصاب کا موضوع مان کر اس میں سے اہم ترین مضامین مشاغل اور دل چسپ اور سبق آموز تجربات کا انتخاب کیا جائے اور انہیں نفسیات اطفال کی مناسبت سے ترتیب دی جائے تاکہ ان کے ذریعے سے طلبہ رفتہ رفتہ ان عناصر سے واقف ہو جائیں جن پر تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے - اگر ایسا نہ کیا جائے تو کاروبار سیاست ' آرٹ ' سائنس ' مذہب سب بیک وقت طالب علم کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں گے اور اس کا نتیجہ ایک عام انتشار کی صورت میں رو نما ہوگا - لہذا اس معاشرتی ادارے کا جسے ہم مدرسہ کہتے ہیں پہلا فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کے لئے ایک سادہ ماحول مہیا کرے اور زندگی کے ان عناصر کو منتخب کرے جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کو نو عمر طالب علم سمجھ سکتے ہیں - اس کے بعد وہ ان میں ایک خاص ترتیب قائم کرتا ہے - ابتدا میں آسان چیزیں سکھاتا ہے اور ان کی مدد سے آگے چل کر زیادہ مشکل اور پیچیدہ امور کی تشریح کرتا ہے ' [1]

دوسری خصوصیت اس ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تہذیب و تمدن کے وہی عناصر منتخب کئے جاتے ہیں جو بچوں کی تربیت پر عمدہ اثر ڈال سکتے ہیں - تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ سوسائٹی نسلاً بعد نسل تمام رسوم و قوانین منتقل کرتی چلی جائے بلکہ اصلاح اور ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جو صریحاً مفید ہیں اور مستقل اہمیت رکھتی ہیں - اور انہیں پر مدرسے میں پوری توجہ صرف کی

---

[1] Democracy and Education صفحہ ۲۲

جائے - اس طرح مدرسہ طلبہ کو ایک اعلی تر معیار تمدن سے روشناس کر دیتا ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر معاشرے کے مضر اداروں اور طریقوں کی تنقید اور اصلاح کر سکیں - اس خصوصیت کی تشریح ایک مثال سے ہو جائیگی - موجودہ زمانے کا تمام اقتصادی اور معاشرتی نظام مقابلے اور مسابقت باہمی کی بنیاد پر قائم ہے - لوگوں میں باہمی وابستگی کے احساس سے کہیں زیادہ یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے ذاتی فائدے کی کوشش کرنی چاہئے خواہ اس کے لئے کیسے ہی قابل اعتراض ذرائع اختیار کرنے پڑیں اور اس کے نتائج دوسروں کے حق میں کتنے ہی خوفناک ہوں - بالخصوص بین الاقوامی سیاست اور تجارت میں اس اصول کی کارفرمائی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے خطروں کا عام لوگ پوری طرح اندازہ نہیں کر سکتے - اگرچہ ہندوستان میں تجارت اور صنعت و حرفت میں اس حد تک ترقی نہیں ہوئی کہ مغرب کے ممالک کا سا مہلک مقابلہ روح پکڑ جائے لیکن معاشری زندگی میں ایک فرد دوسرے فرد سے ایک جماعت دوسری جماعت سے بر سر پیکار رہتی ہے اور کسی کو یہ احساس نہیں کہ ہماری اغراض میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ محض سطحی اور عارضی ہے ورنہ ہم سب کا حقیقی مفاد مشترک ہے - کیا مدرسے کے لئے بھی یہ لازم ہے کہ وہ اپنی تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو انہیں خطرناک اصولوں پر چلائے ؟ افسوس ہے کہ ملک کے حالات سے متاثر ہو کر مدرسے میں بھی طلبہ کے باہمی مقابلے کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور استاد بجائے اسکے کہ ان کو تعاون کا شوق دلائیں ان میں رقابت اور سابقت کے جذبات کو ابھارتے ہیں - اس کے ثبوت میں مروجہ تعلیم کے بہت سے طریقے اور رجحانات پیش کئے جاسکتے ہیں مثلاً امتحانوں کو تعلیم کا منتہائے نظر بنا کر نمبروں کی پرستش کرنا ، مقابلہ میں " اول " آنے والے طلبہ کی حد سے زیادہ قدر و منزلت ایسے مضامین پر زور دینا جن میں علحدہ علحدہ

کام کرنا پڑتا ہے۔ ان مشاغل کی طرف سے بے پروائی جن میں مل جل کر کام کیا جا سکتا ہے - اگر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ تمدنی خرابیوں کی اصلاح کرے اور لوگوں کے اصول عمل اور معیار نظر کو بہتر بنائے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ طلبہ نہ صرف ان بہتر اصولوں اور معیاروں سے نظری طور پر رو شناس کئے جائیں بلکہ انہیں ان پر عمل کرنے کا بھی موقع ملے - مندرجہ بالا مثال میں اس اصول کے معنی یہ ہوں گے کہ مدرسہ اپنی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں تعاون عمل پر زور دے - نصاب میں ایسے مضامین اور طریقہ تعلیم کو داخل کرے کہ بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا موقع ملے اور وہ تقسیم کار کے ذریعے مشکل امور کو انجام دینا سیکھیں - ان میں باہمی اتحاد اور وابستگی کا احساس مستحکم ہو اور وہ اس حقیقت کو پہچانیں کہ وہ ایک جماعت کے رکن ہیں اور اس حیثیت سے ان پر بعض اخلاقی اور معاشری فرائض عائد ہوتے ہیں - اگر وہ ان فرائض کو پورا نہ کرینگے تو عمرانی زندگی کا شیرازہ بکھر جائیگا اور اس سے وہ فوائد حاصل نہ ہو سکینگے جن کی توقع ہے - اس خیال کا اثر نہ صرف طریقہ تعلیم اور مضامین کے انتخاب پر پڑیگا بلکہ ہر مضمون کی داخلی تنظیم میں اور مباحث کی ترتیب میں اسکی وجہ سے تبدیلی لازم آئیگی - کیونکہ ہمیں سائنس، ادب، تاریخ، جغرافیہ علوم کے ان پہلوؤں پر زور دینا ہوگا جو انسانی زندگی کے معاشرتی رخ کی تشریح کرتے ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں بنی نوع انسان کی متحدہ جد و جہد کا نقشہ دکھاتے ہیں - اگر نصاب کی مناسب ترتیب و انتخاب اور مدرسے کے عام مشاغل کے ذریعے بچوں میں یہ عقیدہ عملی طور پر راسخ ہو گیا کہ انسانی زندگی کا نظام امداد باہمی کے اصول پر قائم ہونا چاہئے تو ہم یہ

توقع کر سکتے ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد افراد اور جماعتوں کی خود غرضانہ کشمکش ایک حد تک دور ہو جائیگی -

تیسری خصوصیت مدرسے کے ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تمدنی زندگی کے منتخب شدہ عناصر ایک خاص توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ مرتب کیئے جاتے ہیں تاکہ تمدنی زندگی کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کی کشاکش میں نو عمر بچے اور نو جوان راہ سے بھٹک نہ جائیں اور اپنے آپ کو کسی خاص طبقے یا خیال کے ساتھ وابستہ کر کے قومی تمدن کے مجموعی نظام سے بے خبر نہ ہو جائیں - لہذا مدرسے میں فرقہ پرستی کی تنگ فضا کی جگہہ قومی روایات کا فراخ تر ماحول مہیا کرنا چاہئے اور اسے اتنی وسعت دینا چاہئے کہ اس کی حدود عالمگیر انسانی تمدن سے مل جائیں - اسطرح قوم کے افراد میں ایک ہم آہنگ اور یکساں ذہنیت پیدا ہوتی ہے - وہ ایک ہی قسم کے نصاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور اسکی بدولت اُن کے خیالات میں یک جہتی اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے - اس فرض کا دوسرا نفسی رخ یہہ ہے کہ طلبہ کی سیرت اور طبیعت پر جو اثرات تمدنی زندگی کے مختلف شعبوں میں شریک ہونے کی وجہ سے پڑتے ہیں اُن میں ہم آہنگی اور تنظیم پیدا کی جائے تاکہ ان کے نفس میں وحدت اور اجتماع قائم رہے - اسکی تشریح ہم پہلے کر چکے ہیں - یہاں اس کا ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس سے تدوین نصاب کے ایک اہم اصول پر روشنی پڑتی ہے - ہم نصاب کو محدود اور یک طرفہ نہیں بنا سکتے - اگر اسکی وساطت سے ہم طالب علم کا تعارف تہذیب و تمدن کے مکمل نظام سے کرنا چاہتے ہیں تو نصاب میں ان تمام اقدار اور مقاصد کی نمائندگی ہونی چاہئے جو اس نظام میں مستقل اہمیت رکھتے ہیں - اگر اس میں سائنس پر حد سے زیادہ زور دیا جائے اور ادب کو نظر انداز کیا جائے یا نظری

علوم کو جگهه دیجائے اور عملی مشاغل اور دست کاریوں کا خیال نه رکھا جائے تو طلبه کی تربیت ناقص اور یک طرفه رهے گی اور وه زندگی کے بعض اهم مسائل اور معاملات کا صحیح احساس نه کر سکینگے - اس خصوصیت سے دوسرا نتیجه یه نکلتا هے که نصاب کے مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے بے تعلق نه هونا چاهئے ورنه ان کے اثرات طالب علم کی طبیعت پر جدا جدا پڑکر منتشر هو جائینگے اور اس کی مجموعی نشو و نما پر کوئی نمایاں اثر نه ڈال سکینگے ان کی تربیت اس خوش اسلوبی سے کرنا چاهئے که گو ان میں سے هر ایک طالب علم کو تمدنی زندگی کے کسی خاص شعبے سے روشناس کرے لیکن وه سب مل کر اسے ایک مجموعی فلسفه زندگی کی تشکیل میں مدد دیں - اگر تعلیم انسان کو حقیقت کے مختلف پہلو دکھانے تک محدود رهے اور اسکی مکمل تصویر پیش نه کر سکے تو گویا اس نے اپنے اعلی ترین مقصد کو فراموش کر دیا -

تدوین نصاب کی تحریک نے گذشته تیس سال میں مغربی ممالک میں بہت اهمیت حاصل کرلی هے اس کے متعلق مختلف ماهرین تعلیم نے اپنے نظریے پیش کئے - حال میں مدرسے کے معلموں اور ماهرین تعلیم دونوں نے نصاب کے مسئلے میں بہت تحقیق و تفتیش کی هے جس کی وجه سے مدارس جدید کے نصاب میں بہت کچهه تغیر و تبدل هوا هے اور هوتا جاتا هے - امریکه میں هیرلڈرگ (Harold Rugg) تهارن ڈائک (Thorndike) بوبٹ (Bobbit) اور سنیڈن (Sneddon) وغیره کی سرکردگی میں اس کے متعلق بہت سا کام هوا هے - بعض مدارس نے بھی اپنے تجربات شائع کئے هیں جن سے معلوم هوتا هے که درسی مضامین کی تقسیم و ترتیب اور ان کے موضوع میں کس قدر انقلاب هو گیا هے - حال هی میں امریکه کی ایک مقتدر تعلیمی انجمن[1] نے تدوین نصاب کی تاریخ

[1] National Society for the Study of Education -

اور اسکی موجودہ تحریکوں اور بنیادی اصولوں کے متعلق دو ضخیم جلدیں بطور اپنے چھبیسویں سالنامے کے شائع کی ھیں اس کتاب میں اس تمام علمی تحقیقات کا خلاصہ اور تنقید موجود ہے جو گذشتہ چالیس سال میں نصاب کے متعلق کی گئی ھے اور اس پر بحث کر کے بعض اہم نتائج اخذ کئے گئے ھیں - ان تمام نتائج کا لب لباب یہ ھے کہ معقول اور مکمل نصاب تعلیم بنانے کے لئے پہلی شرط یہ ھے کہ اسکی بنیاد طلبہ کی زندگی اور تمدنی ضروریات پر رکھی جائے تاکہ وہ انکی جبلی وجدانات کی تربیت کر سکے اور ان کو موجودہ تمدن کے سب سے اہم اور بہتر عناصر سے روشناس کرے - پروفیسر تھارن ڈائک نے (Thorndike) نے تدوین نصاب کے نو اصول بیان کئے ھیں جن میں سے زیادہ ضروری اصولوں کو ہم ذیل میں درج کرتے ھیں [۱] ان سے بھی ھمارے اس خیال کی تائید ھوتی ھے جو ھم نے یہاں پیش کیا ھے -

۱ ــ نصاب میں ایسے مضامین اور مشاغل کو ترجیح دینی چاھئیے کہ جنکے ذریعے طلبہ میں وہ معلومات اور عادات وہ مہارت ، وجدان اور مذاق پیدا ھو جو انہیں ان کے طبیعی ماحول اور ان کی خاندانی شہری اورمعاشرتی زندگی کے مطالبات پورا کرنے میں مدد دے اور انکے جسم و دماغ میں صحت اور توازن قائم رکھے اور ان کے تفریحی اخلاقی ، مذھبی اور علمی وسائل کو ترقی دے - یہ وہ مرکزی معیار ھے جس پر اور تمام معیاروں کا انحصار ھے -

۲ ــ عام طور پر وہ معلومات اور عادات وغیرہ زیادہ قابل قدر ھوتی ھیں جو براہ راست زندگی کی کسی واقعی ضرورت کو پورا کرتی ھیں -

---

Thorndike and Gates : Elementary Principles of Education. [۱] صفحہ ۱۸۲

ان کے ضمن میں طلبہ جو کچھ سیکھتے ہیں اس کو وہ زیادہ اچھی طرح استعمال کرسکتے ہیں -

۳—اگر اور سب باتیں یکساں ہوں تو مقابلتاً وہ علوم و فنون زیادہ قابل قدر اور تعلیمی لحاظ سے زیادہ مفید ہیں جن کے استعمال کے موقعے انسان کی زندگی میں کثرت سے پیش آئیں -

۴—نصاب میں ایسے مضامین اور مشاغل کو ترجیح دینی چاھئے - جو مفید اور فعالانہ عادتوں کو نشو و نما دیں - مثلاً غور و فکر کی قوت ، جُدت اپچ ، میل جول کی صلاحیت ، اعتبار وغیرہ -

۵—وہ مضامین اور مشاغل نصاب کے لئے مقابلتاً زیادہ موزوں ہیں جو نہ صرف موجودہ ضروریات کو پورا کرتے ہیں بلکہ آئندہ پیش آنے والے مسائل اور غیر متوقع حالات کے لئے بھی تیار کرتے ہیں - برخلاف اس کے جو مضامین محض ماضی کے حالات پر مشتمل ہوتے ہیں یا عارضی اور فوری مفاد اور دلچسپیوں سے تعلق رکھتے ہیں یا محض ان علمی شوقوں کو قائم رکھتے ہیں جو مدرسے کی روایتی تعلیم کا نتیجہ ہیں ان کی اہمیت بہت کم ہے -

ان اصولوں اور نصاب کے متعلق دوسری تحریکوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصاب کی ترتیب و انتخاب میں ہمیں طالب علم اور اُس کے ماحول کے تعلق پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنا ہے وہ تمدنی زندگی کے مواقع سے ، جو اس تعلق کی بدولت پیدا ہوتے ہیں پوری طرح فائدہ اُٹھانے کے لئے اسے کس قسم کی معلومات اور تجربے کی ضرورت ہے - نصاب کے مسئلے کو معاشرتی زندگی سے جدا کرنا اور اسمیں محض دماغی قوتوں کی تربیت کا لحاظ رکھنا کسی طرح جائز نہیں -

صدیوں تک نصاب کی تنظیم جس غلط نفسی عقیدہ کی بنا پر ہوتی رہی ہے اس کی تردید ہم اوپر کرچکے ہیں - نصاب کے لئے مضامین کا انتخاب اس اصول پر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دماغ کی مختلف، مستقل اور غیر مربوط قوتوں کی تربیت کرتے ہیں - مثلاً یہ کہ ریاضی کے ذریعہ قوت استدلال کی تربیت، سائنس کے ذریعے قوت مشاہدہ کی، ادب قدیم کے ذریعے قوت تنقید، تخیل اور ذوق حسن کی - موجودہ عام نفسیات سرے سے اسی کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کے ذہن میں اس طرح کی مستقل اور قائم بالذات قوتیں موجود ہیں جن کی نشو و نما خاص مضامین کے ذریعے کی جاتی ہے - اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ طلبا کی فطری اور ابتدائی صلاحیتوں کی نشو و نما کرکے ان کو دماغی قوتوں میں تبدیل کرنے کے لئے انہیں ایسے مشاغل میں شریک کرنا چاہئے جن کو انجام دینے میں استدلال، مشاہدہ، تخیل وغیرہ سبھی چیزوں کی ضرورت پڑے اور وہ اپنی خواہش اور جبلت کے تقاضے سے مجبور ہو کر ان سے کام لیں - لہذا مدرسہ جدید میں درسی مضامین اور مشاغل دونوں کو اس اصول پر منتخب کرنا چاہئے کہ ان کے واسطے سے طلبا کو انسانی زندگی اور کار و بار کے مختلف شعبوں کو غور سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے وہ اپنی قوت مشاہدہ سے کام لیں، چیزیں بنائیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تدبیریں سوچیں اور ان کو آزما کر دیکھیں کہ وہ کامیاب ہوتی ہیں یا نہیں - اس میں شک نہیں کہ اس کا تعلق بہت کچھ طریقہ تعلیم سے ہے لیکن جب تک نصاب ایسا نہ ہو جسمیں ان تجربوں اور کاموں کا موقع مل سکے طریقہ تعلیم بجائے خود کافی ہیں - موجودہ زمانے میں دست کاری کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی مختلف شکلوں میں ان تمام تجربات کو حاصل کرنے کا امکان ہے اور اس کے

ذریعے بچوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی تربیت ہوسکتی ہے - بشرطیکہ اسے صحیح اصولوں پر مدرسے میں رائج کیا جائے اور اس کا مقصد تنگ اور محدود نہ ہو بلکہ وہ طلبہ کی پوری شخصیت کو دعوت عمل دیتی ہو -

کچھہ عرصہ سے نصاب میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ زیادہ تر زمانۂ حال کی تمدنی ترقی اور انقلابات کا نتیجہ ہیں - مدرسوں کا شمار بالعموم قدامت پسند اداروں میں ہوتا ہے یعنی وہ حتی الامکان ان طریقوں میں جو پہلے سے چلے آتے ہیں کسی قسم کا تغیر پسند نہیں کرتے - اس لئے وہ بالعموم معاشرتی زندگی کے ساتھہ ساتھہ نہیں چل سکتے بلکہ پیچھے رہ جاتے ہیں - لیکن جب ضروریات زمانہ انہیں بالکل مجبور کردیتی ہیں تو وہ بے دلی سے رفتہ رفتہ ' اپنے نصاب اور نظم و نسق میں تبدیلیاں کرتے ہیں - اس کی تشریح چند مثالوں سے ہوسکتی ہے - گذشتہ دو سو برس کے اندر مغربی ممالک کی صنعت و حرفت میں ایک زبردست انقلاب ہوا ہے جس نے انسانی معیشت کے قدیم نظام کو درہم برہم کرکے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی ہے - جیسا ہم ایک گذشتہ باب میں تفصیل کے ساتھہ بیان کرچکے ہیں اس نظام کا دار و مدار زیادہ تر سائنس کی تحقیقات اور ایجادات پر ہے - یہاں تک کہ اس زمانے میں زندگی کے ہر شعبے میں سائنس کو دخل ہو گیا ہے - کوئی شخص جو سائنس کی کم از کم ابتدائی اور ضروری باتوں سے واقف نہیں اپنے موجودہ ماحول کو نہ پوری طرح سمجھہ سکتا ہے نہ کامیابی کے ساتھہ اسمیں حصہ لے سکتا ہے - لہذا مدرسوں کے لئے یہ لازم ہوگیا کہ وہ اپنے نصاب میں سائنس کو نمایاں اہمیت دیں تاکہ طلبہ شہریت کے نئے فرائض کو اچھی طرح ادا کرسکیں - لیکن اس وقت تقریباً تمام ملکوں میں ' بالخصوص انگلستان میں ' دو

اور یونان کا علم و ادب مدرسوں کی تعلیم پر حاوی تھا۔ علوم قدیمہ کے حامیوں کا دعویٰ تھا کہ ذہنی تہذیب و تربیت کا کوئی ذریعہ ان کے سوا ہو ہی نہیں سکتا۔ برخلاف اس کے وہ لوگ جو جدید اقتصادی اور صنعتی تحریکوں سے متاثر ہو چکے تھے سائنس کی اہمیت پر زور دیتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ نہ صرف افادی نقطہ نظر سے اس کو نصاب میں داخل کرنا ناگزیر ہے بلکہ اس کے بغیر اہم ترین دماغی قوتوں کی نشوونما ناممکن ہے۔ چنانچہ اُنیسویں صدی کا بیشتر حصہ انگلستان کی تعلیمی تاریخ میں جدید سائنس اور قدیم (یونانی اور رومی) علم و ادب کے درمیان جنگ کا زمانہ تھا جس میں سائنس کا سب سے بڑا اور سب سے ممتاز مددگار ہربرٹ سپنسر تھا۔ جب رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصاب میں سائنس کو وہ حصہ مل گیا جس کی مستحق تھی اور اس کے طریقہ تعلیم میں اصلاح ہو گئی تو معلموں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہوا کہ سائنس کی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں کہ تمام صنعت و حرفت اور اکثر پیشوں کا دارومدار اس پر ہے بلکہ وہ دماغی تربیت اور تہذیب نفس کا بھی ایک نہایت موثر اور قابل قدر وسیلہ ہے۔ لہذا اب نصاب میں سائنس محض اس بنا پر داخل نہیں کی جاتی کہ اس سے مثلاً قوت مشاہدہ کی تربیت ہوتی ہے بلکہ اس کا خاص وصف یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے ہم زندگی کے نظم اور ربط کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور اس میں عمدگی اور قابلیت کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں۔ اسی طرح نصاب تعلیم پر ان سیاسی تغیرات اور انقلابات کا اثر بھی پڑا جن کی بدولت قومی ریاستیں اور جمہوری حکومتیں وجود میں آئیں، سیاسی اختیارات ایک محدود طبقے کے ہاتھ سے نکل کر رفتہ رفتہ قوم کے تمام افراد کو

حاصل ہوئے اور معاشرتی فرقہ بندیوں کے ٹوٹنے سے لوگوں میں باہمی یک جہتی کا احساس پیدا ہوا - اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم جو پہلے چند خاص طبقوں تک محدود تھی باقی طبقوں میں پھیلنی شروع ہوئی اور حکومت نے یہ تسلیم کرلیا کہ کم از کم ابتدائی تعلیم حاصل کرنا ہر آزاد شہری کا حق ہے - جب تک تعلیم خوش حال اشراف کے لئے مخصوص رہی جن کے فرائض میں حصول معاش محنت اور مزدوری کاشتکاری صنعت و حرفت کے مشاغل شامل نہ تھے اور جو زیادہ تر علمی اور ادبی تفریح اور ایک قسم کی سطحی تہذیب کی خاطر تعلیم حاصل کرتے تھے نصاب تعلیم کا قدیم علوم و ادب تک محدود ہونا سمجھ میں آسکتا تھا - اول تو اس وقت تک واقعی یونانی اور رومی زبانیں ہی علم و تہذیب کے بہترین عناصر کی حامل تھیں اور دوسری زبانوں میں علوم کا اتنا سرمایا نہ تھا - جدید علوم یعنی سائنس، اقتصادیات، معاشیات وغیرہ ابتدائی حالت میں تھے اور ان کی تعلیمی قدروقیمت قدیم علوم کے مقابلے میں بہت کم تھی - دوسرے یہ محدود نصاب جس میں گہرائی زیادہ اور وسعت کم تھی اس جماعت کی ضروریات کو بڑی حد تک پورا کرتا تھا جس کے لئے وہ مرتب کیا گیا تھا - لیکن اب جب کہ تعلیم نے امیر اور غریب بیکار اور مشغول علمی اور عملی ہر قسم کے لوگوں کو اپنے وسیع دامن میں لے لیا ہے ہم کسی طرح اس محدود نصاب کو کافی نہیں سمجھ سکتے - لوگوں کی ضروریات مختلف اور متنوع ہیں - ان کے طبائع میں فرق ہے موجودہ زمانے کی ضروریات بدل گئی ہیں - قدیم علوم کی اہمیت اپنی جگہہ مسلم ہے لیکن جدید علوم زندگی کے مسائل حاضرہ سے بہت زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں - آج کل حصول معاش کا مسئلہ اور مختلف تمدنی اور معاشرتی روایات رکھنے والے

فرقوں کو ایک قومی شیرازے میں منسلک کرنے کا سوال یہ دونوں چیزیں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں - ان حالات میں نوخیز نسلوں کی تعلیم کے لئے نہ علوم قدیم کافی ہیں نہ ریاضی ' تاریخ ' جغرافیہ وغیرہ کا سطحی اور رسمی مطالعہ - ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ہمہ گیر نصاب کی وساطت سے طلبہ زمانہ حال کی تمدنی زندگی سمجھیں اور ان میں تمدنی احساس پیدا ہو - وہ فرد اور جماعت کے صحیح تعلق کو نہ صرف نظری طور پر سمجھیں بلکہ عملاً بحیثیت ایک جماعت کے رکن کے وہ اپنے حقوق و فرائض سے واقف ہوں اور ان کو ادا کرنا سیکھیں - اسی وجہ سے تاریخ اور جغرافیہ کے نصاب اور طریقہ تعلیم میں وہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور خود معلم کا نقطہ نظران کے متعلق بدل گیا ہے - اس کی کوشش ہے کہ طلبہ کو معلوم ہو کہ نوع انسان نے کس طرح متحدہ طور پر جدوجہد کر کے دنیا کے تمام ذرائع اور وسائل سے کام لیا ہے اور کس طرح ہر نئی نسل پرانی نسلوں کے کارناموں اور علمی اور عملی ذخیروں سے فائدہ اٹھاتی ہے - اس طرح طلبہ دنیا کے تمام لوگوں کی باہمی وابستگی کو محسوس کرتے ہیں اور ماضی حال اور مستقبل کے ربط و تسلسل کا اندازہ کرسکتے ہیں - تاریخ کے ذریعے یہ احساس بالواسطہ پیدا ہوتا ہے - اس کو مستحکم کرنے کے لئے بعض ثانوی مدارس میں درسی اور عملی طور پر مدنیات کی تعلیم دی جاتی ہے - یعنی ایک طرف تو مدنی اور سیاسی زندگی کے نظام اور اس کے حقوق و فرائض کی تشریح کی جاتی ہے اور دوسری طرف طلبہ کو عام تقریبوں جلسوں ' تہواروں اور مدنی کاروبار مثلاً حفظان صحت ' صفائی تعلیمی پروپگنڈا وغیرہ میں شرکت کا موقعہ دیا جاتا ہے - مدرسے کی داخلی تنظیم حکومت خود اختیاری کے نمونے پر کی جاتی ہے اور طلبہ میں

فرائض اور ذمہ داریاں تقسیم کردی جاتی ہیں - اس طرح طلبہ کو اپنے روز مرہ کے کام میں انہیں اصولوں پر عمل کرنا سکھایا جاتا ہے جو معاشرتی زندگی میں کار فرما ہیں - ان مخصوص انتظامات کے علاوہ مدارس جدید میں تمام درسی مضامین کی تعلیم میں یہ خیال پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ طلبہ معاشرے کے نظام اور انسانوں کے باہمی تعلقات کو سمجھیں ، انہیں مل جل کر رہنے اور کام کرنے کا موقع ملے اور وہ اس جمہوری اور تمدنی زندگی میں بطور مفید اور مستعد اراکین کے شریک ہو سکیں جس کی تشکیل جدید سیاسی اور صنعتی اثرات کے ماتحت ہو رہی ہے -

اب ہم بحیثیت مجموعی نصاب کی تنظیم کے مسئلے پر نظر ڈال سکتے ہیں ۔ نصاب کے مضامین کا انتخاب تمدنی زندگی کی ضروریات اور مطالبات کو مدنظر رکھ کر کرنا چاہئے ان کی ترتیب اور تعلیم میں بچوں کی نفسیاتی نشوونما اور قوانین کو اپنا راہبر بنانا اور ان سے اس طرح کام لینا چاہئے کہ طلبہ نہ صرف مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کرکے بیٹھ رہیں بلکہ ان میں نئے مسائل اور معاملات کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ مستعدی کے ساتھ زندگی کے کار و بار میں حصہ لیں - مدرسوں کا قدیم نصاب جن حالات میں مرتب ہوا تھا وہ اب تبدیل ہوچکے ہیں - یورپ میں یونانی اور لاطینی علم و ادب کا دور دورا تھا - ہندوستان میں سنسکرت ، فارسی اور عربی زبانیں تہذیب اور تعلیم کا سرچشمہ تھیں - تہذیب کا مفہوم بجائے خود محدود اور یکطرفہ تھا - اسی میں ان تمام مشاغل کو کوئی جگہ نہ دی جاتی تھی جن کا تعلق انسان کی مادی ضروریات کے پورا کرنے سے ہے - لیکن اب نئے علوم ، نئی زبانیں ، نئے سیاسی اور معاشرتی حالات پیدا

ہوگئے ہیں - تہذیب کا مفہوم وسیع ہو گیا ہے اور اس کو اور زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں کے لئے موزوں ہو - لہذا ضرورت یہ محسوس ہوئی ہے کہ نصاب میں نئے مضامین کو داخل کیا جائے ' اس کے نیم مردہ قالب میں نئی روح پھونکی جائے تاکہ وہ جدید تمدن کے راستوں میں طلبہ کی رہبری کر سکے - اس تحریک نے جس کو توسیع نصاب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے دو شکلیں اختیار کیں اول تو بعض قدیم مضامین کو ترک کر کے یا ان کے نصاب کو کم کر کے جدید علوم و فنون کو مدرسوں میں جگہ دی گئی - اس کی مثالیں ہم نے اوپر دی ہیں مغرب میں یونانی اور لاطینی زبانوں اور ہندوستان میں عربی فارسی ' سنسکرت کا بوجھ ہلکا کیا گیا اور نصاب میں دیسی زبانیں سائینس ' تاریخ ' جغرافیہ ' دست کاری ' امور خانہ داری وغیرہ شامل کرلئے گئے - ان مضامین کی وجہ سے نصاب نہ صرف زیادہ 'مفید' بن گیا بلکہ اس میں وسعت اور جامعیت پیدا ہوگئی اور اس کے دائرے میں تمدنی زندگی کے جدید شعبے بھی آگئے جن کو قدیم نصاب نظر انداز کرتا تھا - لیکن نصاب میں محض چند مضامین کے اضافے سے کوئی پائدار تعلیمی اصلاح نہیں ہوسکتی تھی - اصلاح نصاب کی تحریک کا دوسرا رخ قدیم اور جدید دونوں طرح کے مضامین کی داخلی ترتیب اور تنظیم سے تعلق رکھتا ہے - یعنی ماہرین تعلیم کی توجہ اس طرف راجع ہوئی کہ ان تمام مضامین کا از سرنو جائزہ لیا جائے اور اس میں جس قدر غیر ضروری اور غیر مفید مباحث شامل ہو گئے ہیں ان کو خارج کر کے ایسے مباحث داخل کئے جائیں جو مستقل اور دائمی اہمیت رکھتے ہیں یا جن کا موجودہ تمدن سے لازمی تعلق ہے - نصاب تعلیم کے معاملے میں ہمیشہ یہی مشکل پیش آتی ہے کہ جب وہ بہت عرصے تک رائج رہتا ہے اور اس

پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تو اس میں بہت سی فضول چیزیں شامل ہوجاتی ہیں - چنانچہ یہی صورت مغربی تعلیم کے نصاب کو پیش آئی - اس میں تاریخ ' جغرافیہ ' ریاضی وغیرہ داخل تو ہوگئے لیکن تاریخ خشک اور بے ربط وقعات اور ناموں اور سنوں کے مجموعے کا نام تھا جن کو یاد کرنے سے نہ ذہنی تربیت ہو سکتی تھی نہ ماضی کی تعبیر ' نہ حال کی تفسیر ' نہ مستقبل کے لئے تیاری - جغرافیہ بھی علیٰ ہذاالقیاس دریاؤں اور پہاڑوں اور شہروں اور آبادیوں وغیرہ کے متعلق بے شمار غیر ضروری معلومات سے بھرا پڑا تھا - اس کے مطالعے سے نہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کا تعلق سمجھہ میں آتا تھا نہ علت اور معلول کے اس سلسلے پر روشنی پڑتی تھی جس میں کائنات کے تمام مظاہر جکڑے ہوئے ہیں - ریاضی کے تمام مضامین یعنی ہندسہ ' جبر و مقابلہ حساب وغیرہ بالعموم اس غرض سے پڑھائے جاتے تھے کہ ان سے قوت استدلال کو ترقی ہو اور مجرد نظریات اور مسائل کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو - اس لئے اس کے مباحث زندگی کے واقعی امور اور معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ اکثر طلبہ کے سامنے ایسے سوالات پیش کئے جاتے تھے جن کے مفروضات کسی طرح عقل میں نہیں آتے تھے - اسی طرح سائینس بھی ابتدا میں ایک نظری علم بنا دی گئی تھی جس میں طلبہ کو اصطلاحوں کی تعریفیں ' اشیا کے خواص اور قوانین فطرت کے ضابطے یاد کرائے جاتے تھے - ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے اور زندگی کا تعلق جو تعلیم کی جان ہے قطع ہو گیا - لہذا مصلحین تعلیم نے کوشش کی کہ تمام درسی علوم کے متعلق یہ دریافت کریں کہ تمدنی زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے کیا چیزیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور کیا چیزیں ایسی ہیں جو محض رسماً اور روایتاً چلی

آتی ھیں - اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے - بعض لوگوں نے تمدنی ضروریات کا تجزیہ کیا اور ھر مضمون کے بس اُتنے مسائل جتنے ان ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر تھے منتخب کرلئے - بعض نے زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھا ، بالخصوص امریکہ والوں نے - یعنی نصاب کے متعلق بہت سے سوالات تیار کر کے معلموں ، بچوں کے والدین ، کارخانوں کے مالکوں ، سرکاری حکام وغیرہ کے پاس بھیجے گئے اور ان کے جوابوں کا مطالعہ کرکے نتائج نکالے گئے - بعض نے اپنے اپنے مدرسوں میں طلبہ کے شوق اور ان کی پسند کو اپنا راھبر بنایا اور یہ دیکھا کہ کون سے مباحث اور موضوع ایسے ھیں جو ان کی زندگی کے ساتھہ ربط رکھتے ھیں - اور جن میں ان کا دل خود بخود لگتا ھے - اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات کوششیں مناسب حدود سے آگے نکل جاتی تھیں اور ایک آزمائشی طریقے کو لوگ حکمی اور قطعی سمجھنے لگتے ھیں - لیکن ان کا مجموعی نتیجہ یہ ھوا کہ تمام درسی مضامین میں بہت مفید ترمیم و تنسیخ ھوئی اور ھوتی جارھی ھے . بعض مدارس جدید نے کئی سال تک تجربے کرنے کے بعد اپنے نصاب شائع کئے ھیں - ان کے مطالعے سے معلوم ھوتا ھے کہ اس میدان میں بہت کچھہ کام ھوچکا ھے اور وہ نظری بحث کرنے والوں نے نہیں بلکہ زیادہ تر اُن لوگوں نے کیا ھے جو خود معلمی کرتے ھیں انہوں نے سب مضامین میں اس قدر تبدیلیاں کی ھیں کہ گویا ان کی قلب ماھیت کردی ھے - اس کے لئے خاص طور پر ونٹکا (Winnetka) کے نصاب کا مطالعہ کرنا چاھئے جو پروفیسر رگ (Rugg) کی نگرانی میں تیار ھوا ھے کیونکہ وہ دوسرے نصابوں کی طرح محض ایک اسکول میں جہاں کے حالات غیر معمولی طور پر ساز گار ھوں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ ایک پوری ریاست کے تمام مدارس میں جاری ھے -

نصاب جدید میں تاریخ ، جغرافیہ ، سائنس ، ادب وغیرہ غرض ہر مضمون میں زندہ مباحث شامل کئے گئے ہیں یعنی وہ چیزیں جو ایک طرف بچوں کی دل چسپی اور شوق کو ابھارتی ہیں اور دوسری طرف تمدنی زندگی کے مسائل حاضرہ میں ان کی رهنمائی کرتی ہیں - تاریخ ارتقائے انسانی کی تفسیر ہے جو بچوں کے تجسس پسند دماغ کو وہ زبردست ڈراما دکھاتی ہے جس کا ہیرو انسان ہے اور سٹیج عالم فطرت اور جس کا ہر ایکٹ اس کی تہذیب و ترقی کے کسی دور کا نقشہ دکھاتا ہے - جغرافیہ بے ربط واقعات اور معلومات کا مجموعہ نہیں رہا - اس کا کام اب یہ ہے کہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کا عمل اور رد عمل دکھائے اور بچوں کو ایک طرف تو یہ احساس دلائے کہ انسان اور فطرت قوانین طبیعی کے ذریعے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور دوسری طرف یہ دکھلائے کہ انسان نے انفرادی اور اجتماعی کوشش کے ذریعے کس طرح رفتہ رفتہ ان قوانین کو سمجھ کر اور ان سے کام لیکر عالم فطرت کو مسخر کر لیا ہے اور صنعت و حرفت اور کاشتکاری کا یہ زبردست نظام قائم کیا ہے - جغرافیہ بحیثیت ایک انسانی علم کے اور بحیثیت ایک سائنس کے یہ فرائض انجام دیتا ہے - عمرانی علوم اور سائنس دونوں اپنی جگہ پر اس مقصد کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں اور اپنے رنگ میں طلبہ کی نظر میں وسعت پیدا کرتے ہیں اور انہیں یہ دکھاتے ہیں کہ لوگ کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں کن حالات اور قوانین کے ماتحت اپنے کار و بار چلاتے ہیں اور ہر شخص کی بھلائی برائی ، کامیابی اور ناکامی کس طرح اور کس حد تک دوسروں پر منحصر ہے - طریقہ تعلیم اور مواد تعلیم دونوں کی نفسیاتی تنظیم کرنے اور انہیں موجودہ جمہوری معاشرے کے لئے موزوں بنانے کی غرض سے اسی اصول پر عمل کرنے کی

ضرورت ہے - سائنس کا نصاب اس لحاظ سے بھی معین کیا جاسکتا ہے اور اکثر اسی خیال سے کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے طلبہ کو کچھہ واقعات اور حقائق معلوم ہو جائیں اور وہ سائنس کے مخصوص طریقۂ عمل سے روشناس ہوجائیں - لیکن اس کا ایک دوسرا اور اہم تر مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں میں معاشری احساس اور نظر پیدا کرے جس کے ذریعے سے ان میں تمدنی زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو - اس لئے کہ موجودہ معاشرت اور تمدن کے اصول سائنس سے ماخوذ ہیں اور ن کو سمجھانے کے لئے ہمیں مدرسے میں سائنس ہی سے کام لینا پڑے گا اور اس کی تعلیم کو اس طرح مرتب کرنا ہوگا کہ ہمارے طلبہ ان نئے معاشرتی مسائل سے جو سائنس کی ترقی کا نتیجہ ہیں عہدہ برآ ہو سکیں - پروفیسر بوڈ (Bode) سائنس کے امکانات اور اس کے تعلیمی اثرات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"جیسا کہ ہمیں معلوم ہے سائنس نے ہمارے روز مرہ کے ماحول دو بالکل بدل دیا ہے - اگر ہم غور کے ساتھہ اس کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس تبدیلی کی وسعت کا صحیح اندازہ ہوگا........سائنس کی ایجادات مثلاً آلات حرب مبادلہ خیالات کے ذرائع ، وسائل نقل و حمل ، مشینوں کی صنعت و حرفت وغیرہ کی بدولت معاشری نظام کے جدید نمونے قائم ہوگئے ہیں - مختلف طرح سے لوگوں میں باہمی وابستگی کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں جن کی وجہ سے باہمی مفاہمت اور اتحاد عمل کا دائرہ وسیع تر ہوگیا - اس کے ساتھہ ہی یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ سائنس ہی نے ہمیں یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ کائنات پر قوانین قدرت کا

تسلط ہے اس لئے ہمیں اپنے مذہبی اور اخلاقی تصورات
کی تنظیم نئے سرے سے کرنا چاہئے - معاشری نظر سے
ہماری یہی مراد ہے کہ اگر ایک ہوشیار اور عقل مند معلم
سائنس پڑھائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ طلبہ
کے دل میں انسانوں کا احترام بحیثیت انسان ہونے کے راسخ
ہو جائیگا اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں -
اس مقصد کے لئے معلم اس اصول کو اپنا رہبر بنائے گا کہ
انسان اپنے ماحول کا مالک ہے اور وہ ایک ایسی دنیا تعمیر
کر سکتا ہے جس میں نہ افلاس ہوگا ' نہ جہالت ؛ نہ مرض '
نہ بے انصافی - مختصر یہ کہ ہر مضمون کے ذریعے سے جس کو
نصاب میں جگہہ دی جائے وہ طرز خیال پیدا کرنا چاہئے
جو انسانوں پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے
ماحول کی تعمیر جاری رکھیں اور اپنے لئے ایسے معیار عمل
بناتے رہیں جو احترام انسانیت یعنی جمہوریت کے ساتھہ
ہم آہنگ ہوں " [1]

ہمارے ہندوستانی مدارس میں سائنس کی تعلیم اس قدر ابتدائی اور ناقص حالت میں ہے کہ اس سے نہ وہ محدود علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں جو عام طور پر استادوں کو مرغوب ہیں ' نہ وہ وسیع تر معاشری اغراض جن کی تشریح بوڈ (Bode) نے اپنی کتاب میں جا بجا کی ہے - یوں تو ہمارے تمام درسی مضامین میں اصلاح اور ترتیب جدید کی ضرورت ہے لیکن تاریخ اور سائنس کا نصاب تو ایک سرے سے بدلنا ہے کیونکہ انہیں دونوں مضامین کے ذریعے ہم ہندوستانیوں میں اجتماعی

[1] Bode : Modern Educational Theories صفحہ ۷۰

احساس کو مستحکم کرسکتے ھیں اور فرقہ دارانہ تعصبات کو مٹا کر ان کی جگہہ قومیت کا جذبہ پیدا کر سکتے ھیں - بعض خاص سیاسی حالات میں مثلاً جب ایک ملک کے لوگ کسی غیر قوم کے محکوم ھوں اور اس کے جبر و تشدد سے عاجز آجائیں تو قومی اتحاد اور وطنیت کا جوش جذبہ منافرت یا جذبۂ انتقام کی وجہ سے بھی پیدا ھو جاتا ھے لیکن وہ عارضی ھوتا ھے - ان وقتی اثرات کے دور ھوتے ھی باھمی اختلافات پھر عود کر آتے ھیں اور اتحاد مفقود ھو جاتا ھے کیونکہ اس کی بنیاد کسی مضبوط عقیدے پر نہیں ھوتی - اگر ھم کسی ملک کے افراد میں اغراض و مقاصد کا مستقل اتحاد اور باھمی ھمدردی کا پائدار جذبہ پیدا کرنا چاھتے ھیں تو اس کی تدبیر یہ ھے کہ ھم مدرسے کی چار دیواری میں نو عمر بچوں اور نوجوانوں پر اثر ڈالیں تاکہ وہ وھاں سے قومی اتحاد کے پکے رنگ میں رنگے ھوئے نکلیں - اس میں تاریخ کا کام یہ ھے کہ وہ انھیں رفتہ رفتہ لیکن نہایت موثر طریقے سے یہ محسوس کرا دے کہ ھر قسم کی ترقی کے لئے ' تمام بڑے بڑے کاموں کو انجام دینے کے لئے ؛ ھر زمانے میں اشتراک عمل کی ضرورت رھی ھے اور وہ تمام جنگ و جدل کے واقعات ؛ بادشاھوں کی لڑائیاں ' جماعتوں کے اختلافات ' جن کی داستانوں سے مروجہ درسی کتب بھری پڑی ھیں سطحی چیزیں ھیں - ان کی مثال طوفانوں کی سی ھے یہ آتے ھیں اور چلے جاتے ھیں مگر اصل چیز جو دریا یا سمندر کی ھستی کو قائم رکھتی ھے وہ اتصال یا کشش ھے جو ناچیز قطروں کے مجموعے کو ایک بحر ذخار ایک غیر محدود قوت کا خزانہ بنا دیتی ھے - ان سیاسی مخالفتوں کی تہہ میں وہ اتحاد عمل پوشیدہ ھے جس کی بدولت معاشرتی زندگی قائم ھے جس کی وجہ سے زراعت صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ کے سارے کام چلتے رھے ھیں اور چلتے رھیں گے - اس

مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں تاریخ کے اقتصادی ، معاشرتی اور عقلی پہلوؤں پر زور دینے کی ضرورت ہے - اسی طرح ہمارے موجودہ قومی حالات میں سائنس کی اہمیت بہی بہت زیادہ ہے - اس کی صحیح تعلیم کے ذریعے ہم نہ صرف اس باہمی وابستگی کی تشریح اور تفسیر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کر سکتے ہیں بلکہ طلبہ میں وہ علمی طرز خیال پیدا کرسکتے ہیں جس کی ہماری قوم میں بہت کمی ہے - لوگوں کے جوش ، حوصلے اور امنگ کو ابہارنے کے لئے انہیں تقدیر پرستی کے بجائے فلسفۂ عمل کی تلقین کرنے کے لئے ، ان کی خوابیدہ قوت تسخیر کو بیدار کرنے کے لئے ان تک سائنس کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے - دوسری قوموں نے سائنس کے ذریعے نہ صرف فطرت کی قوتوں کو مسخر کرلیا ہے بلکہ ملکوں اور قوموں کو اپنا مطیع بنا لیا ہے - برخلاف اس کے ہم اپنی غفلت اور جمود اور سائنس کی طرف سے بے پروا ہونے کی وجہ سے اپنی قدیم حیثیت کو بہی کہو بیٹھے ہیں - اس حالت کو بدلنے میں سائنس بہت مدد دے سکتی ہے - بے شک اس کا تعلق قومی سیرت کی تشکیل سے ہے جو ایک مشکل اور وسیع مسئلہ ہے جس سے ہم کتاب کے تیسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے - لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس عظیم الشان کام کی بنیاد مدرسے ہی میں ڈالی جاسکتی ہے اور اس میں علاوہ اور چیزوں کے ، نصاب کو خصوصاً سائنس کے نصاب کو بہت بڑا دخل ہے - اس کا مروجہ نصاب جو متفرق مباحث کے متعلق بالکل سطحی اور سرسری واقفیت تک محدود ہے اس مقصد کو پورا نہیں کرتا - اس میں عملی پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ میں فعالیت اور کار کردگی کی نشو و نما ہو - اس کے انسانی پہلو کو زیادہ نمایاں کرنا

چاھئے تاکہ سائنس محض مجرد تصورات اور نظریوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی جد و جہد کا نتیجہ سمجھی جائے - اس مقصد کے لئے سائنس کے بڑے بڑے محققوں اور موجدوں کی سوانح عمری کا مطالعہ مفید ھے تاکہ طلبہ کو معلوم ہو کہ انہوں نے کس قدر مشکلات کا مقابلہ کیا کس طرح طلب میں صادق رھے اور اپنی تحقیقات سے دنیا کو مالا مال کرگئے - اور وہ یہ بھی سمجھہ لیں کہ ان میں سے ہر ایک کی کامیابی ان بے شمار معروف اور غیر معروف کام کرنے والوں پر موقوف تھی جو ان سے پہلے اس میدان عمل میں جد و جہد کرچکے تھے - تیسری چیز جس کو سائنس کے نصاب کا جزو بنانا چاھئے یہ ھے کہ اس سے عمرانی زندگی میں کیا کام لیا جاتا ھے یعنی طلبہ کو اس کا موقعہ ملنا چاھئے کہ سائنس کے اصولوں کا استعمال روز مرہ کے کار و بار میں دیکھیں - وہ اپنے مدرسے کے معمل میں ایک محدود پیمانے پر سائنس کے قوانین اور اصولوں کے استعمال کو دیکھہ سکتے ھیں لیکن یہ کافی نہیں - انہیں یہ بھی معلوم ھونا چاھئے کہ ان قوانین کو انسان نے کس طرح بہت بڑے پیمانے پر اپنے مادی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا ھے - اس لئے جہاں کہیں موقع ھو انہیں بڑے بڑے کارخانوں اور مشینوں کا اور روز مرہ کی زندگی میں سائنس کے کرشموں کا مشاھدہ کرانا چاھئے تاکہ ان کی نظر میں وسعت پیدا ھو اور وہ سائنس کے غیر محدود عملی امکانات سے روشناس ھوں - ورنہ یہ اندیشہ ھے کہ وہ سائنس کو ایک ایسا علم سمجھینگے جو کتابوں تک یا مدرسے کے معمل اور اس کے چھوٹے چھوٹے آلات تک محدود ھے - بلکہ سچ پوچھئے تو ھمارے طلبہ میں سے اکثر کے ذھن میں سائنس کا یہی غلط اور محدود تصور ھے - اگر سائنس کے نصاب کو مجوزہ اصولوں پر مرتب کیا جائے تو اس سے یقیناً طلبہ کے

علم اور واقفیت میں مزید اضافہ ، ہوگا اور وہ موجودہ نظام تمدن کو جو بڑی حد تک سائنس کے اشاروں پر چلتا ہے زیادہ اچھی طرح سمجھہ سکینگے اور اس کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہوکر زیادہ کامیابی حاصل کرینگے - یہاں اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ خواہ تاریخ کی تعلیم ہو یا سائنس کی یا کسی اور مضمون کی ، اخلاقی مقاصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں کہ وہ ہر وقت طلبہ کے پیش نظر رکھے جائیں اور ان کی جا و بیجا تلقین کی جائے - ایسا کرنے سے طلبہ میں بد دلی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے - پائدار نتائج صرف اسی صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب معلم خود تو ان مقاصد کو پیش نظر رکھے مگر طلبہ کو اس بات کا احساس نہ ہونے دے کہ ان کی اخلاقی تعلیم ہو رہی ہے - اخلاقی تلقین اور تبلیغ سے زیادہ موثر وہ بالواسطہ تربیت ہے جو معلم اپنی اثر آفرینی ، اپنے طریقہ تعلیم ، اور نصاب کی مناسب تدوین کے ذریعے دیتا ہے -

نصاب میں ایک طرف یہ علوم شامل ہیں جن کے ذریعے سے بچے تمدنی زندگی کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں اور مفید معلومات حاصل کرتے ہیں - دوسری طرف اس میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو علم سے زیادہ تربیت ذوق سے تعلق رکھتے ہیں اس میں ادب ، فنون لطیفہ یعنی موسیقی ، مصوری ، ڈرائنگ وغیرہ اور دست کاری شامل ہیں - تحصیل علم اور تربیت ذوق کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کیونکہ ایک حد تک انسان کی شخصیت میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں - لیکن بعض مضامین عملی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور بعض حسن ذوق پیدا کرنے پر - نصاب میں ان مضامین کی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا ، خصوصاً بچے

کا جذبہ تخلیق کسی معنی اور خوشنما شکل میں ظاہر ہونے کے لئے بیقرار رہتا ہے - وہ اپنے گرد و پیش کی اشیا کو ایسی ترتیب دینا چاہتا ہے کہ ان میں حسن پیدا ہو - وہ مادے کو صورت بخشنا چاہتا ہے - ادب میں وہ انسانی جذبات اور خیالات کا نظم و نثر کی خوشنما شکلوں میں مطالعہ کرتا ہے اور خود اپنے جذبات کو اسی انداز میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے - ہمیں ادب کی اعلیٰ معاشری قدر سے انکار نہیں کیونکہ اکثر ادب کے شاہکار انسانی زندگی کے مسائل اور محرکات کو سمجھانے میں سائنس اور تاریخ کے خشک اور علمی بیانات سے کہیں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے ہمجنسوں کی خوشی اور غم کامیابی اور ناکامی میں شریک کرکے ہمارے جذبۂ انسانیت کی توسیع اور تہذیب کرتے ہیں - کسی اعلیٰ درجے کے شاعر کا کلام یا کسی جید ادیب اور افسانہ نگار کی بلند پایہ تصانیف حقیقی معنی میں زندگی کی تفسیر اور تمدن کی تنقید ہوتی ہیں - لیکن کسی تحریر یا تقریر، کسی نظم یا نثر کو ادب کا درجہ اسی وقت ملتا ہے جب وہ ہمارے ذوق حسن کی تسکین کرے - اسی طرح نصاب میں دست کاری اور فنون لطیفہ کو اس غرض سے جگہ دینی چاہئے کہ بچوں میں جذبۂ تخلیق بیدار ہو، آرٹ کے عمدہ نمونوں کو دیکھ کر ان کا مذاق پاکیزہ اور شستہ ہو اور انہیں ایسے مشاغل میں دلچسپی ہو جن کو وہ آئندہ زندگی میں اپنی فرصت کا خوشگوار مشغلہ بنا سکیں - ہمارے ملک میں شاید سو میں سے ننانوے طلبہ کا خانگی ماحول ایسا ہوتا ہے جو ان کے مذاق کی صحیح تربیت میں کسی طرح معین نہیں ہوسکتا - ان کو اپنے چاروں طرف بھدی اور بے ڈھنگی چیزیں ؛ تنگ و تاریک مکان ؛ خراب اور میلی سڑکیں ؛ ادنیٰ درجے کی تصویریں ؛ مشین کی بد نما مصنوعات

نظر پڑتی ہیں جن کا مجموعی اثر ان کی طبیعت اور مذاق پر بہت خراب ہوتا ہے - مدرسے کا یہ کام ہے کہ انہیں حسین چیزوں سے روشناس کرے ، اپنی چار دیواری کے اندر ہر چیز میں صفائی ، سادگی اور حسن ذوق کو دخل دے - اس کی عمارت صاف ستھری ہونی چاہئیے - فرنیچر اور سامان کا قیمتی ہونا ضروری نہیں لیکن سڈول اور خوش نما ہونا نہایت ضروری ہے - تصویروں ، دست کاریوں وغیرہ کے عمدہ نمونوں ، طلبہ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی خوبصورت چیزوں اور مختلف قسم کے تعلیمی نقشوں سے کمروں کو سجانا چاہئیے تاکہ ان سب کا اثر غیر محسوس طریقے پر طلبہ کے مذاق پر پڑے - اسی طرح مدرسے میں جہاں کہیں ممکن ہو ، باغ یا چمن لگانا چاہئیے کہ وہ حسن فطرت کا نہایت عمدہ نمونہ ہے اور جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں کم خرچ میں خوبصورت پھولوں کے گملوں اور بیلوں کی مدد سے مدرسے میں خوش نمائی پیدا ہو سکتی ہے - طلبہ کے لئے تعلیمی سیر و سفر کا اہتمام کرنا چاہئیے تاکہ جہاں کہیں فن تعمیر یا مصوری یا قدیم صنعتوں وغیرہ کے خوبصورت نمونے موجود ہوں وہاں جاکر وہ استاد کی نگرانی میں ان کا مطالعہ کریں اور ان کی نظر میں حسن شناسی پیدا ہو - معمولی طالب علم کو اس کے بد نما اور بے کیف ماحول سے نکالنے کا ، بلکہ یہ کہنا چاہئیے کہ اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کا سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں کہ مدرسوں کو گویا اس وحشتناک صحرا کے بیچ میں ایک دلکش نخلستان بنا دیا جائے جس کی فضا میں پرورش پاکر ان کے مذاق کی اصلاح ہو وہ خوشنما اور بد نما چیزوں میں تمیز کرسکیں ، عالم فطرت اور عالم صنعت میں جہاں کہیں کوئی خوب‌صورت چیز دیکھیں اس کی قدر کریں اور اس سے لطف اندوز ہوں اور اپنی صلاحیت اور میلان

کے مطابق خود بھي تخليق حسن میں حصہ لے سکیں - اس کا طریقہ وھي ھے جو ھم اوپر بیان کر چکے ھیں یعني طلبہ کو حسن صورت اور حسن ذوق کے ماحول میں رکھا جائے جو غیر محسوس طریقے پر ان کے ذاتی مذاق کو سدھارے اور نصاب میں ایسے مضامین شامل کئے جائیں جو ان کو عملی یا انفعالی طور پر جذبۂ تخلیق کے اظہار کا موقع دیں - ادب اور فنون لطیفہ کا ایک بڑا فائدہ یہ ھے کہ جس شخص میں ان کا صحیح مذاق پیدا ھو جاتا ھے وہ گھٹیا چیزوں اور بد نما حرکتوں سے نفرت کرنے لگتا ھے - مثلاً ادنیٰ درجے کے ناولوں اور قصوں ' بری تصویروں ' بے جا نمائش اور مبالغے سے اسے وحشت ھوتی ھے اور وہ خود بخود ان سے دور رھتا ھے - اس کے لئے کسی عقلی دلیل یا غور فکر کي ضرورت نہیں ھوتی - کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں مہذب نہیں ھوسکتی جب تک عوام کے مذاق کا معیار بلند نہ کیا جائے اور اس کی ذمہ داري بھی ' اور بہت سی ذمہ داریوں کی طرح مدرسوں پر عائد ھوتي ھے - ھمارا یہ دعویٰ نہیں کہ ھر شخص میں اعلیٰ احساس جمال پیدا ھوسکتا ھے یا ھر شخص صناع بن سکتا ھے - لیکن ھمارے نزدیک ھر شخص کا مذاق ایک حد تک اصلاح پذیر ھے اور بے شمار خوبصورت مناظر اور صنائع میں سے کسی نہ کسی سے ضرور لطف اندوز ھوسکتا ھے - ساری قوم کے احساس جمال کی تربیت کے لئے مدرسے کے ساتھہ اور بہت سے بیرونی اداروں کا اشتراک عمل ضروری ھے لیکن جہاں تک نو عمروں کا تعلق ھے مدرسے بہت کچھہ کرسکتے ھیں بشرطیکہ معلموں میں اس بات کا احساس ھو اور خود ان میں ذوق جمال مفقود نہ ھو - ذوق ایسی چیز ھے جو سکھا یا نہیں جاسکتا بلکہ اس کا اثر براہ راست دل پر پڑتا ھے -

ھندوستانی مدارس کے نصاب کی بحث میں ھمیں مادری زبانوں اور ان کے ادب کا ذکر کرنا ضروری ھے کیونکہ بہت سے داخلی اور خارجی

اسباب کی وجہ سے ہمارے یہاں اپنے زبان اور ادب کی کماحقہ قدر نہیں کی جاتی - بہت سے ناواقف لوگوں کا جنہوں نے صرف مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور تمام علوم انگریزی زبان میں پڑھے ہیں یہ خیال ہے کہ ہندوستانی زبانیں ابھی بہت کم مایہ ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کا بار اُٹھا سکیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگ سیاسی اور اقتصادی حالات سے مجبور ہوکر اپنی زبان اور اپنے علوم سے بیگانہ ہوگئے ہیں اور اپنی ساری توجہ اور کوشش مغربی علوم انگریزی زبان کے ذریعے سے حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں - اس صورت حال کے جو نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ تعلیمی اور قومی نقطہ نظر سے نہایت مضر ہیں - ایک تو انگریزي زبان پر ضرورت سے زیادہ زور دینے اور دیسی زبانوں سے غفلت برتنے سے ان زبانوں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی جس کو نا سمجھ لوگ ان کے خلاف بطور ایک دلیل کے پیش کرتے ہیں ! دوسرے ' چونکہ ابتدا میں تقریباً تمام تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی تھی اور اب بھی ثانوي تعلیم بڑی حد تک اور اعلیٰ تعلیم تمام تر انگریزی میں ہوتی ہے اس لئے ملک میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں کے درمیان بیگانگی پیدا ہوگئی جس کے اثرات دونوں کے لئے بہت برے ثابت ہوئے - یعنی ان کے اغراض ومقاصد میں جو اختلاف تھا وہ اور بڑھ گیا اور معاشری معاملات میں اتفاق رائے اور اتحاد عمل ناممکن ہو گیا - گزشتہ چند سال میں سیاسی اسباب اور تحریکوں کی بدولت اس کی کسی قدر اصلاح ہوئی ہے - لیکن ابھی تک ان طبقوں میں یکجہتی پیدا نہیں ہوئی خالص تعلیمی نقطہ نظر سے انگریزي زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان تمام طلبہ کا علمی معیار بہت کم ہوگیا ہے جنہیں غیر زبانوں کی تحصیل سے کوئی خاص مناسبت نہیں اور چونکہ بہت بڑي تعداد ایسے ہی طلبہ کی ہے اس لئے مدرسوں کے عام معیار پر نہایت

خراب اثر پڑا - ایک اوسط قابلیت کے طالب عام کے لئے یہ بہت مشکل ھے
کہ وہ کسی مضمون مثلاً تاریخ ' جغرافیہ یا سائنس کا مطالعہ ایک غیر
زبان میں کرے - اس کی آدھی توجہ مطالب پر ہوتی ھے اور آدھی ان الفاظ
پر جن کا صحیح مفہوم سمجھنے کی وہ کوشش کرتا ھے اور اکثر کامیاب
نہیں ہوتا - یا ہوتا بھی ھے تو بڑی محنت سے اور بہت سا وقت ضائع کرنے
کے بعد - لوگ بہت سے ہندوستانیوں کو صحت اور روانی کے ساتھ انگریزی
بولتے اور پڑھتے دیکھتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ لاکھوں طلبہ میں
سے مشکل سے سو دو سو کو یہ بات حاصل ہوتی ھے اور اگر بالفرض طلبہ کی
بہت بڑی تعداد انگریزی پر عبور حاصل کر لے تب بھی کوئی وجہ سمجھ
میں نہیں آتی کہ وہ وقت جو مختلف سائنسوں اور عمرانی علوم کی
تحصیل میں صرف ہوسکتا ھے اور جس کی وجہ سے طلبہ کی
علمی قابلیت کا معیار بہت بڑہ سکتا ھے کیوں محض ایک زبان
کی تحصیل میں ضائع کیا جائے ؟ اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ
انگریزی زبان نصاب سے خارج کر دی جائے کیونکہ ہمیں اس کی اہمیت
کا پورا احساس ھے - اس وقت تو وہ سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے ایک
خاص حیثیت رکھتی ھے جس کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے - لیکن
جب ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی تسلط نہ رہے گا تب بھی تجارت
اور بین‌الاقوامی سیاست کے لئے 'ہم اس کے محتاج رہیں‌گے اور اس سے
بھی زیادہ اہم یہ بات ھے کہ ہمارے اور مغربی تہذیب و تمدن کے درمیان
انگریزی زبان ہی واسطے کا کام دے سکتی ھے - لہذا اس کی مستقل
اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا - لیکن ہمیں تعلیمی نقطہ
نظر سے اس امر پر اعتراض ھے کہ وہ نصاب پر بالکل حاوی ہو گئی ھے
اور اس کی تحصیل میں طلبہ کو بے اندازہ وقت اور محنت صرف

کرنی پڑتی ھے - ھمارے خیال میں اس کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے اب کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جا سکتی - کیونکہ ملک کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں اتنا علمی اور ادبی ذخیرہ موجود ھے اور وہ اس تیزی سے ترقی کر رھی ھیں کہ نہ صرف ثانوی بلکہ اعلیٰ مدارج میں بھی یہ زبانیں ذریعہ تعلیم کا کام دے سکتی ھیں - انگریزی زبان کو ھائی اسکولوں اور کالجوں دونوں میں ایک نہایت اھم اختیاری زبان کی حیثیت دینی چاھئے جس کو وہ تمام طلبہ حاصل کریں جن کو تجارت یا سرکاری نوکری یا مغربی علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے یا مغربی تہذیب و ادب سے مستفید ہونے کے لئے اس کی ضرورت ھے - ابتدا میں اس کو اختیاری زبان بنا دینے سے کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ھوگی کیونکہ بیشتر طلبہ اقتصادی اور سیاسی وجوہ سے اور مغربی تہذیب کے ذھنی تسلط سے مجبور ھوکر انگریزی پڑھینگے لیکن رفتہ رفتہ لوگ جن کو ایسے پیشے اختیار کرنے ھیں جن میں انگریزی زبان کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً کاشتکاری، یا چھوٹے پیمانے پر دوکانداری یا صنعت و حرفت اس کو چھوڑ دینگے اور اس کی تعلیم اس مختصر جماعت کے لئے مخصوص ھوجائے گی جن کو علمی مشاغل یا سیاست یا بڑے پیمانے پر صنعت و حرفت اور تجارت میں زندگی بسر کرنی ھے - اس وقت خود اس زبان کی تعلیم بھی بہت بہتر ھوجائے گی - کیونکہ معلموں پر یہ بار نہیں ھوگا کہ وہ ھر کس و ناکس کو خواہ قدرت نے اسے اس قابل بنا یا ھو یا نہ بنا یا ھو، زبر دستی ایک مشکل غیر ملکی زبان پڑھائیں - وہ اپنی پوری توجہ اور محنت ان طلبہ پر صرف کرینگے جو واقعی اس زبان سے مناسبت اور شوق رکھتے ھیں - عام طلبہ کو یہ فائدہ ھوگا کہ وہ اس بوجھ سے سبکدوش ھوکر اپنی مادری زبان اور مادری ادب کی طرف زیادہ توجہ کر سکیں گے اور اس کے ذریعے نہ صرف

ان کی علمی استعداد بڑھے گی بلکہ ان میں ذوق ادب بھی پیدا ہوگا - کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کے لئے اس زبان کے ادبی نکات اور خوبیوں سے لطف اندوز ہونا قدرتاً زیادہ آسان ہے جو گویا بچپن سے ان کی گھٹی میں پڑی ہے اور جس کے اصول سے وہ غیر محسوس طریقے پر باتوں باتوں میں واقف ہوجاتے ہیں علاوہ اپنی زبان اور اپنے ادب میں طلبہ کو ایسے جذبات اور خیالات ایسے واقعات اور مناظر ملتے ہیں جو ان کے تجربے کے اندر ہیں یا جن کو وہ اپنے تخیل کی مدد سے بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں اس لئے انہیں قدرتی طور پر اس سے زیادہ دل بستگی ہوتی ہے - خود قومی زبانوں کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ جب وہ یونیورسٹی میں دوسرے علوم و فنون کی ہم پلہ ہونگی اور ان کے ذریعے تمام علوم و فنون پڑھائے جائنگے تو ان کا معیار بلند ہوجائے گا اور تعلیم یافتہ جماعت میں سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو اپنے آپ کو ان کی خدمت کے لئے وقف کر کے انہیں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مرتبے پر پہنچا دے گا - اس ضمن میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا تجربہ گو ابھی اس کی عمر چند ہی سال کی ہے بہت امید افزا ہے - اس کی بدولت بہت سی علمی تصانیف اردو زبان میں منتقل ہوگئی ہیں اور منتقل ہوتی جاتی ہیں اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اردو زبان کے ذریعے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم دی جا سکتی ہے - مادری زبان میں تعلیم دینے کی ضرورت کو ایک حد تک تعلیمی محکموں نے تسلیم کرلیا ہے اور سوائے چند جمود پسند یونیورسٹیوں کے تقریباً سب جگہ ہائی اسکولوں کی تعلیم صوبے کی زبان یا زبانوں میں دی جاتی ہے - اور غالباً چند سال کے اندر اندر کوئی یونیورسٹی ایسی نہ رہے گی جہاں ثانوی تعلیم انگریزی کے ذریعے دی جائے - لیکن اس کے بعد دیسی زبانوں کو ایک اور تعلیمی جہاد کرنا پڑے گا جس کا مقصد کالجوں اور یونیورسٹیوں

کی تسخیر ہوگا - اس جہاد کی ابتدا بھی ہوچکی ہے اور کہیں کہیں سرکاری طور پر تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں کہ وہ اس معاملے کے ہر پہلو پر نظر ڈال کر رپورٹ پیش کریں - اسی قسم کی ایک کمیٹی جو ناگپور یونیورسٹی کی طرف سے مقرر ہوئی تھی اس کی رپورٹ بحیثیت مجموعی اس اصول کی موید ہے کہ کالجوں میں طلبہ کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے اور گو اس پر ابھی تک عمل در آمد نہیں ہوا لیکن بطور ایک علامت کے اس کی بہت اہمیت ہے - اور اس سے ہوا کے رخ کا اندازہ ہو سکتا ہے - پنڈت مدن موہن مالویہ نے حال ہی میں بنارس یونیورسٹی کے ایک اہم اجلاس میں اس بات کا اعلان کیا ہے کہ عنقریب وہاں انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم ہندی میں دی جائے گی -

اب یہ امرواضح ہو گیا کہ یہ نصاب جدید جس کے اہم عناصر سے ہم بحث کر چکے ہیں مدرسے کے مروجہ نصاب سے بہت زیادہ وسیع اور متنوع ہوگا اور اس میں طلبہ کی مکمل تربیت کے بہت زیادہ امکانات ہوں گے - ان کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں جن کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں :—

اول درسی مضامین جن میں زیادہ تر وہ مروجہ علوم ہوں گے جو اب بھی مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں مثلاً سائنس ، تاریخ ، جغرافیہ ، ریاضی ، مادری زبان ، قدیم زبانیں ، انگریزی وغیرہ - ان مضامین کا نصاب بالکل وہی نہیں ہوگا جو اب ہے گو نام یہی رہیں گے - ان کے مواد کی اچھی طرح تنقید کرنی ہوگی اور غیر ضروری چیزوں کو نکال کر زندہ مسائل اور دل چسپ مباحث شامل کئے جائیں گے جو طلبہ کے ذہنی معیار اور میلان کے مطابق ہوں اور ان کو معاشرتی زندگی کے نظام سے آگاہ کریں -

دوسرے وہ مضامین اور مشاغل جن کا تعلق ہاتھہ اور آنکھہ کی تربیت سے ہے اور جن کے ذریعے قوت تخلیق اور حسن ذوق پیدا ہوتا ہے یعنی مختلف قسم کی دستکاریاں مصوری ' موسیقی اور ادب بحیثیت ایک فن لطیف کے - ہمارے مروجہ نصاب میں یہ شعبہ بہت ناقص ہے - اکثر مدارس میں تو ان مضامین کی تعلیم کا بالکل ہی انتظام نہیں ہے اور اس نقص کی وجہ سے طلبہ کی تربیت نامکمل اور یک طرفہ رہتی ہے - بعض مدارس میں صرف ڈرائنگ یا کہیں کہیں لکڑی کا کام نصاب میں شامل کیا گیا ہے لیکن اس کے واقعی مفہوم اور اہمیت کو خود معلموں نے بھی نہیں سمجھا - کیونکہ وہ اس کو محض ہاتھہ کا ہنر سمجھہ کر سکھاتے ہیں نہ اس طرح سے کہ طلبہ کو تخلیق کے ذریعے اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع ملے - اگر ہم مدرسے کو بجائے ایک غیر دل چسپ " درسگاہ " کے بچوں کی " تربیت گاہ " بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں ان مضامین کی تعلیم پر زیادہ زور دینا پڑے گا -

تیسرے وہ بہت سے مشاغل ہیں جو براہ راست نصاب سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ان کے ذریعے طلبہ اپنے فرصت کے وقت میں ' خواہ مدرسے میں یا گھر پر ' اپنے شوقوں کو جو اکثر نصابی مشاغل کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں پورا کرتے ہیں - اس قسم کے مشاغل میں ' جو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں ' طلبہ کو نہایت قابل قدر تربیت اور واقفیت حاصل ہوتی ہے - ان میں اعتماد ذات ' صلاحیت عمل اور ذوق سلیم پیدا ہوتا ہے اور وہ مل جل کر تقسیم عمل کے اصول پر کام کرنا سیکھتے ہیں - ہر اچھے مدرسے میں اس قسم کے بہت سے مشاغل خود بخود بچوں کے اپنے شوق اور اہتمام سے رائج

هوجاتے هیں - مثلاً مدرسے کا میگزین نکالنا ، مختلف قسم کی علمی اور ادبی انجمنیں قائم کرنا ، تعلیمی سیر و سفر کا اهتمام کرنا ، مجلس مباحثه کو چلانا ، حکومت خود اختیاری کا انتظام ، فرصت کے اوقات میں دست کاری کا مشغله ، اپنے شوق سے فنون لطیفه میں سے کسی فن کي مشق -

ایک زنده مدرسے کی سب سے بڑی پہچان یہی هے که اس کے طلبه اپنے شوق سے کتنے مشاغل جو نصاب سے باهر هیں یا اس میں محض ضمنی طور پر شامل هیں رائج کر سکتے هیں اور انهیں استقلال کے ساتھه جاری رکھه کر مدرسے کی زندگی کو خوش گوار ، مفید اور عملی بناتے هیں - نصاب کي تدوین کرنے میں معلم اس قسم کے مشاغل کو بالاراده پیش نظر نهیں رکھتا لیکن اس کی کوشش یہی هونی چاهئے که وه هر مضمون کی تعلیم اس طرح دے که طلبه کے شوق مختلف صورتوں میں ظاهر هوں اور وه ان شوقوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے اهتمام سے مدرسے میں جماعتیں اور انجمنیں قائم کر لیں - مثلاً اگر تاریخ کا معلم اپنے مضمون میں ذوق اور قابلیت اور انہماک رکھتا هے اور اپنی تعلیم کے دوران میں طلبه کو اس کے معاشری پہلو سے آگاه کرتا هے ، تاریخي عمارتوں سے دل چسپی دلاتا هے ، مشاهیر کی شخصیت ان کے سامنے جیتے جاگتے الفاظ میں پیش کرتا هے تو یقیناً جماعت کے بعض طلبه پر اس کا اثر ضرور پڑے گا - ممکن هے که ان میں سے چند کو فن تعمیر سے دل چسپی پیدا هو جائے اور وه اس کا محنت اور شوق کے ساتھه مطالعه کرنے لگیں - تاریخي عمارتوں کو دیکھیں ، ان کے نقشے بنائیں ، مختلف زمانوں کے فن تعمیر کا مقابله کریں اور اپنی واقفیت سے نه صرف خود مستفید هوں بلکه استاد

کی تھوڑی سی ہمت افزائی سے اپنے ہم جماعتوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچائیں - اسی طرح ممکن ہے کسی طالب علم کو کسی بڑی تاریخی شخصیت مثلاً اکبر ' یا اشوک یا علاءالدین کے حالات سے خاص دل چسپی پیدا ہوجائے اور وہ کتب خانے کی کتابوں سے مدد لے کر اس کے متعلق کوئی مبسوط اور قابل قدر مضمون لکھے - یا چند طلبہ مل کر تاریخ کے کسی عہد کا مطالعہ اس طرح کریں کہ اس کے مختلف شعبوں کو آپس میں تقسیم کرلیں اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد ایک تاریخی مقالہ تیار کریں - اس طرح اگر مادری زبان کے تعلیم دینے والے استاد طلبہ میں تحریر کا صحیح مذاق پیدا کر دیں اور دوسرے اساتذہ ان کے ساتھ تعاون کریں تو یقیناً ان میں یہ خواہش پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور اپنے روزمرہ کے تجربات اور دل چسپ مشاغل کو تحریر میں لانے کے لئے مدرسے کا میگزین نکالیں - پھر اس اشاعت کے ضمن میں اور بہت سے کام نکل سکتے ہیں مثلاً خبروں کی فراہمی ' انجمنوں کی رپورٹیں لکھنا ' میگزین کی کتابت یا طباعت کا انتظام کرنا ' اس کے لئے سرمایہ کا فراہم کرنا وغیرہ وغیرہ - ان سب کاموں کو باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دینا بہت بڑی علمی اور عملی تربیت ہے جس کا بدل درسی مضامین کی تعلیم نہیں ہوسکتی - ہمارے مدارس میں اول تو اس قسم کے مشاغل رائج ہی نہیں اور اکثر استاد ان کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں اور جہاں کہیں خال خال پائے جاتے ہیں وہاں ان کا مقصد بالعموم نمائش یا انسپکٹر کو خوش کرنا ہوتا ہے - ایسی حالت میں ان سے پورا تعلیمی فائدہ ہرگز نہیں اُٹھایا جاسکتا کیونکہ وہ استاد کی طرف سے کم و بیش جبراً عائد کئے جاتے ہیں طلبہ

کی روز مرہ زندگی سے خود بخود پیدا نہیں ہوتے اور ان کے جبلی شوقوں کو ظاہر نہیں کرتے - مدرسہ جدید کے اس پہلو کی تنظیم کے لئے استادوں میں تخیل اور بیدار مغزی اور اشتراک عمل درکار ہے اور جب تک وہ سب ان مشاغل کی اہمیت کو نہ سمجھیں اور انہیں فروغ دینے کی کوشش نہ کریں ان کے مدرسے میں زندگی اور عمل کی فضا پیدا نہیں ہوسکتی - اس بحث کے ضمن میں ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھہ لینا چاہئے کہ نصاب کی یہ تقسیم محض مضامین اور مشاغل کی نوعیت کے اعتبار سے کی گئی ہے - دوران تعلیم میں اس کو قطعی سمجھہ کر ان شعبوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا نہایت سخت غلطی ہوگی - نفسی اعتبار سے ان سب میں نہایت گہرا اور لازمی تعلق ہے کیونکہ وہ سب ایک ہی فرد کی علمی اور عملی تربیت کے وسائل ہیں اور ان کے مجموعی اثر سے اس کے دماغ اور اس کی صلاحیت عمل کی نشو و نما ہوتی ہے - اس لئے معلم کو ان کے درمیان ربط اور تعلق قائم رکھنا چاہئے یعنی درسی مضامین اور دستکاری کی تعلیم میں کوئی حد فاصل نہیں ہونی چاہئے بلکہ دستکاری کی خواہش اور شوق سے درسی مضامین کے پڑھانے میں کام لینا چاہئے - مروجہ مضامین میں سے کوئی مضمون بھی ایسا نہیں جس میں دستکاری اور فنون لطیفہ سے کام لینے کے مواقع موجود نہوں - ادب کی تعلیم میں مصوری ، ڈرائنگ اور موسیقی : جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم میں نقشہ کشی ، مصوری ، عمارتوں اور لباس اور سامان کے نمونے تیار کرنا ، سائنس میں آلات کے نقشے کھینچنا ، عملی تجربوں کے لئے سامان تیار کرنا ، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعے نہ صرف بچوں کے جذبہ تخلیق کا اظہار ہوگا بلکہ انہیں اپنے درسی مضامین سے پہلے سے کہیں زیادہ دل چسپی اور رغبت پیدا ہوجائے گی -

علی ہذالقیاس تیسرے شعبے میں ہم نے جن مشاغل کا ذکر کیا ہے ان کو مدرسے کے واقعی کاموں سے بے تعلق نہیں سمجھنا چاہئے - جیسا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ان میں سے اکثر کي ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ کوئي اثر آفریں معلم طلبہ میں اپنے مضمون کے کسی خاص پہلو سے گہری دل چسپی اور ذوق پیدا کر دیتا ہے اور وہ اس کی تسکین کے وسائل تلاش کرتے ہیں اور اسے تکمیل تک پہنچاتے ہیں - اگر درسي تعلیم اور ان آزاد مشاغل میں ربط پیدا ہوجائے گا تو اس سے دونوں کو فائدہ پہنچے گا - طلبہ اپنے اختیاري مشاغل کے انتخاب میں ان کی تعلیمی قدر کا لحاظ رکھیں گے یعنی انہیں مشاغل کو پسند کریںگے جو ان کی تعلیم میں بلا واسطہ یا بالواسطہ مدد دیتے ہوں اور جب طلبہ ان مشاغل کو اپنی خوشی اور اپنے شوق سے انجام دیں گے تو ان کی عام ذہنی بیداری اور قابلیت کا معیار بلند ہوگا اور اس کا اثر ان کے درسی مشاغل پر پڑے گا - ہر سمجھدار معلم کو اس بات کا تجربہ ہوگا کہ جب کوئی طالب علم کوئی کام اپنے شوق سے انجام دیتا ہے اور اسے اس میں کامیابی ہوتی ہے تو اس میں اعتماد نفس زیادہ ہوجاتا ہے اور وہ اپنا روز مرہ کا کام بھی پہلے سے زیادہ انہماک اور مستعدی سے کرنے لگتا ہے - لہذا معلموں کي متفقہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ مدرسے کے تمام درسی مضامین اور دوسرے مشاغل کو ایک دوسرے کے ساتھ ربط دیں تاکہ ان کے ذریعہ طلبہ کی شخصیت کی مکمل اور ہم آہنگ تربیت ہوسکے -

اسی طرح مروجہ درسي مضامین میں بھی ربط اور تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس ربط کی اہمیت موجودہ زمانے میں خاص طور پر زیادہ ہو گئی ہے کیونکہ کل علوم جو مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں سائنس کی مثال سے متاثر ہو کر مختلف شعبوں میں تقسیم ہوگئے ہیں

اور ہر شعبے کی حد بندی اس طرح کی گئی ہے کہ نہ صرف بچوں کے خام کار دماغوں کو بلکہ اکثر استادوں کو بھی وہ اپنی جگہ پر مکمل اور دوسرے مضامین سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے - لیکن ہم نے علم اور زندگی کی باہمی وابستگی کی بابت جو بحث کی ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تفریق نہ صرف علوم کی تاریخی ارتقاء کے لحاظ سے غلط ہے بلکہ تعلیمی نقطہ نظر سے نہایت مضر ہے - اس صورت حال کی اصلاح کے لئے ماہرین تعلیم نے مختلف کوششیں کی ہیں جن کو مجموعی طور پر " ربط مضامین نصاب " کی تحریک کہا جاتا ہے - اس کا منشا یہ ہے کہ نصاب کو معاشرتی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لئے مضامین کی قطعی اور مصنوعی تقسیم کو مٹا کر وہ ربط و تعلق پیدا کر دیا جائے جو ان میں قدرتی طور پر موجود تھا - اگر اس اصول کے جانچنے کے لئے ہم وہی معیار اختیار کریں جس سے ہم نے پہلے کام لیا ہے یعنی مدرسے کے باہر تمدنی زندگی کے کاروبار پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں علم کی ایسی تقسیم نہیں پائی جاتی جیسی مدرسوں میں تنگ نظر معلموں اور تعلیمی محکموں نے اپنی آسانی کی غرض سے رائج کردی ہے - جب ہم اپنے مختلف تمدنی اور معاشرتی فرائض انجام دیتے ہیں یا صنعت و حرفت ' تجارت ' زراعت اور دوسرے پیشوں میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں کام کے لئے تاریخ کے علم کی ضرورت ہے فلاں کے لئے جغرافیہ کی ' فلاں کے لئے سائنس کی - ہمیں اِن مشاغل میں مختلف قسم کی معلومات اور واقفیت درکار ہوتی ہے اور ہم حسب ضرورت بغیر کسی منطقی تحلیل کے ان سب علوم و فنون سے کام لیتے ہیں جنھیں ہم نے حاصل کیا ہے - مثلاً ایک شخص اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کا ممبر ہے اور وہ اس کے جلسے میں شریک ہوتا ہے - وہاں مختلف قسم کے مسائل

درپیش ہوتے ہیں - کسی کا تعلق تعلیم سے ہے ' کسی کا شہر کی مالی حالت سے ' کسی کا حفظان صحت سے ' کسی کا شہر کی عمارات سے - ان تمام امور کے متعلق معقولیت کے ساتھہ رائے دینے کے لئے ہمیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم علیحدہ علیحدہ علوم سے مدد لیں جو ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں بلکہ اپنی مجموعی معلومات ' واقفیت اور تجربے کی بنا پر ہم ایک رائے قائم کرتے ہیں مثلاً اگر زیر غور مسئلہ صحت عامہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو سمجھنے اور اس کا حل سوچنے میں ہمیں ایک حد تک اس واقفیت سے مدد ملے گی جو ہمیں اپنی درسی تعلیم کے دوران میں علم حفظان صحت کے مطالعے سے حاصل ہوئی تھی - اس کے ساتھہ ساتھہ ہمیں اپنے عام تجربے اور مشاهدے سے کام لینا ہوگا جو روز مرہ کی زندگی میں حاصل ہوتا ہے اور اس میں مدرسے کی تعلیم کو کوئی خاص دخل نہیں - علاوہ بریں مجوزہ تجویز کا ایک مالی پہلو بھی ہوگا جس پر غور کرنے میں ہمارا تجربہ اور مخصوص اقتصادی واقفیت کام آئے گی - یہی صورت ہر شخص کو روز مرہ کے کاروبار میں پیش آتی ہے - یہاں تک کہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین خصوصی بھی جن کو بظاہر علم کے ایک خاص شعبے سے تعلق ہوتا ہے اپنا کام اس وقت تک عمدگی سے نہیں کرسکتے جب تک انہیں دوسرے متفقہ علوم سے کافی واقفیت نہ ہو اور وہ اپنے عام تجربات اور مشاهدات سے فائدہ نہ اٹھائیں - اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ارباب‌فکر کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ ان کی واقفیت اور دل چسپی صرف اپنے مخصوص علم تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسرے علوم و فنون اور عملی مشاغل سے بھی ذوق رکھتے ہیں - اگر ان تمام دلچسپیوں میں مناسب تنظیم قائم رکھی جائے تو یہ ان کے مخصوص علمی مشاغل میں مخل نہیں ہونگی بلکہ ان میں مدد دینگی کیونکہ وہ اپنے کام

کو وسیع نقطہ نظر سے یہ سمجھہ بوجھہ کر انجام دینگے کہ اسے زندگی کے دوسرے مسائل سے کیا تعلق ھے - ان کے دماغ کی مثال ایک مکمل اور پیچیدہ مشین کی سی ھے جو بہت سی کلوں کو چلاتی ہے اور ان سے حسب ضرورت کام لیتی رھتی ھے - برخلاف اس کے اکثر ھمیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ھے جو بہت کچھہ معلومات رکھتے ھیں لیکن اسے ضرورت کے وقت استعمال نہیں کرسکتے - اس کی وجہ یہ ھوتی ھے کہ ان کی معلومات میں ربط اور نظم اور حرکت نہیں ھوتی -

ھر قابل معلم کی یہ خصوصیت ھوتی ھے کہ وہ جب کوئی مضمون پڑھاتا ھے مثلاً کسی تاریخی یا ادبی مسئلے سے بحث کرتا ھے تو وہ اپنے درس کو محض تاریخ یا ادب ھی کے دائرے میں محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنی عام معلومات اور ذاتی تجربے سے مدد لے کر بہت سی ایسی چیزیں مثال کے طور پر یا مقابلے اور تشریح کے لئے پیش کرتا ھے جن سے زیر بحث مسئلے پر روشنی پڑتی ھے - وہ تاریخی مسائل کے ضمن میں دنیا کے مختلف قوموں اور ملکوں کے تمدنی اور معاشرتی حالات ' بلی نوع انسان کی جد و جہد کامیابیوں اور ناکامیوں اور آرزوں کا ذکر کریگا ' اس طرح نہیں کہ وہ غیر متعلق مباحث معلوم ھوں بلکہ اس طرح کہ وہ خاص مسئلہ جس کا مطالعہ طلبہ کر رھے ھیں انسانی تاریخ کے عظیم‌الشان سلسلے میں اپنے مناسب مقام پر نظر آئے - اس طرح اس کی تعلیم میں جان پڑ جاتی ھے - وہ طلبہ میں ذوق اور انہماک پیدا کردیتا ھے اور انہیں محسوس ھوتا ھے کہ علم چند درسی مضامین کا نام نہیں جن کو امتحان کی خاطر پڑھنا پڑتا ھے بلکہ زندگی کی ایک مربوط اور مسلسل تفسیر ھے جس سے انسان نے بہت کچھہ فائدہ اُٹھایا ھے اور وہ خود بہت فائدہ اُٹھا سکتے ھیں - برخلاف اس کے جس استاد

میں علم یا تخیل کي کمی ہوتی ہے یا یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ مختلف قسم کے واقعات اور معلومات میں ربط پیدا کرے اور کسی ایک مسئلے پر مختلف سمتوں سے روشنی ڈال سکے اس کی تعلیم ہمیشہ بے لطف اور بے جان ہوتی ہے - طلبہ جو کچھہ علم حاصل کرتے ہیں اس کو ان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں پیدا ہوتا - ہمیں اکثر ایسے اُستادوں سے سابقہ پڑتا ہے جو پڑھاتے وقت گویا گھوڑوں کی طرح آنکھوں پر اندھیری لگا لیتے ہیں یعنی اگر وہ کوئی ادبی کتاب پڑھا رہے ہیں تو اس کے دوران میں انہیں یہ خیال تک نہیں آئیگا کہ کسی تاریخي یا جغرافی واقعے کا حوالہ دیں جس سے ممکن ہے مضمون کی دل چسپی کئی گنی زیادہ ہوجائے - یا وہ جغرافیہ پڑھا رہے ہیں اور مثلاً کسی نئے ملک کا حال شروع کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ بات نہ آئیگی کہ طلبہ میں اُس ملک کی طرف سے دل چسپی پیدا کرنے کے لئے ان کی عام واقفیت سے کام لیں یا کسی ایسے امر کي طرف اشارہ کریں جو جغرافیہ کے رسمي مفہوم میں داخل نہ ہو - فرض کیجے کوئی اُستاد مصر کا جغرافیہ اپنے طلبہ کو پڑھانا چاہتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ مصر کی قدیم تہذیب اور اس کی یادگاروں ، مصر کے مشہور عالم اہرام اور ان جدید انکشافات اور دریافتوں کا ذکر نہ کرے جن کا حال بہت سے یا کم سے کم بعض طلبہ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا ؟ -

انگلستان کے مشہور معلم اور ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں - اس نے اپنے مدرسے میں مضامین کي مصنوعی تقسیم بڑی حد تک مٹا دی تھی تاکہ طلبہ مختلف علوم کی باہمی وابستگی اور زندگی سے ان کے تعلق کو سمجھیں - جب وہ خود کسی مضمون پر گفتگو کرتا ، خواہ جماعت کے کمرے میں یا سائنس کے

معمل میں یا گرجا گھر میں ' تو اس کے خیالات کی رو میں سائنس ' ادب ' فلسفه ' انسانی ارتقا کی تاریخ ' اخلاقیات کے مسائل سبھی کچھه آجاتا تھا - تاریخ کی تفسیر میں وہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور اس کے نتائج سے بحث کرتا ' سائنس کی اهمیت سمجھانے کے لئے وہ تاریخ تمدن پر نظر ڈالتا اور هر مضمون کا تعلق تمدنی زندگی کے وسیع تر مسائل اور مقاصد سے دکھاتا - اس طرح اس کے طلبه هر سبق کے بعد زندگی کے متعلق ایک زیادہ وسیع ' زیادہ باریک نقطه نظر لے کر اُتھتے اور یه محسوس کرتے که انهوں نے جو کچھه اس گفتگو میں سیکھا ہے وہ ان کے حافظے پر بار نهیں هے بلکه ان کے خیالات اور ان کی زندگی میں گھل مل گیا هے اور اس کی وجه سے ان کی دلچسپی کا دائرہ بہت بڑہ گیا هے اور وہ اپنے درسی مضامین کا ربط پہلے سے بہتر سمجھه سکتے هیں - یہی بات رگبی پبلک اسکول کے هیڈ ماسٹر آرنلڈ (Arnold) کے تاریخی درس کے متعلق بیان کی جاتی هے - اور یه شان هندوستان کے مشهور قدیم معلموں میں بھی پائی جاتی تھی جن کا مطالعه بہت وسیع اور متنوع هوتا تھا اور جو اپنی زبردست علمیت سے اپنے شاگردوں کی شخصیت اور ان کے نظریه حیات کو متاثر کرتے تھے - لیکن اس زمانے میں جب زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم بھی قواعد اور ضوابط کی پابندیوں میں جکڑ دی گئی هے اور معلم کی فنی تربیت کے لئے آتھه نو مهینے کی قلیل مدت کافی سمجھی جاتی هے یه صفت استادوں میں بہت کمیاب هے - ان کی ذهنی دلچسپیوں میں تنوع اور زندگی نهیں پائی جاتی اور وہ اپنے طلبه میں بھی یه بات پیدا نهیں کرسکتے - البته اب بھی وہ نامور علمی محققین جنهوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے ذریعے اپنے علوم میں انتهائی قابلیت حاصل کرلی هے اور نه صرف ان

کے فنی پہلو پر حاوی ہیں بلکہ ان کے معاشرتی اور فلسفیانہ نتائج سے بھی واقف ہیں ' یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ زندگی کا مطالعہ ایک مربوط اور منظم کل کی حیثیت سے کرسکیں - اس امر کو سمجھانے کے لئے اور زیادہ تصریح کی ضرورت نہیں کہ عملی زندگی کی ضروریات اور انسان کی ذہنی ترقیات دونوں کے اعتبار سے درسی مضامین کی مصنوعی تقسیم بہت مضر ہے - مدرسے کی تعلیم ختم کرنے کے بعد لوگ جو کچھ علم حاصل کرتے ہیں وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اور اس کے مختلف عناصر ایک دوسرے کے ساتھ پیوست اور مربوط ہوتے ہیں اور وہ اسی شکل میں اسے استعمال بھی کرتے ہیں - بچوں کے نصاب میں اس قسم کی تقسیم رائج کرنا اور بھی زیادہ قابل اعتراض ہے کیونکہ عام تجربے اور نفسیاتي تحقیقات دونوں کی تعلیم یہی ہے کہ کم از کم ابتدائي چند سال میں بچوں کے ذہن میں نہ اس قسم کی تقسیم پائي جاتی ہے ' نہ اس کو پیدا کرنے کا امکان ہے - اگر جبریہ تقسیم کو ان کے ذہن پر عائد کیا جائے تو ان کی قدرتی، نشو و نما میں حرج واقع ہوگا - ان کے لئے زندگي ایک مسلسل اور لامتناہی تجربہ ہے جس کے تمام عناصر اور کیفیات ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کے لئے بہترین تشبیہ وہی ہے جو مشہور عالم نفسیات ولیم جیمز (William James) نے دی ہے - یعنی بچے کی شعوری زندگي کي مثال ایک بہتے ہوے دریا کی سی ہے جس کے مختلف تجربات لہروں کی مانند ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں کي جاسکتیں - وہ اپنے روز مرہ کے گوناگوں تجربات کو تاریخ ' جغرافیہ ' سائنس ' ریاضی ' ادب وغیرہ کي اصطلاحوں میں تحویل نہیں کرتا - اس کے لئے مینھہ کا برسنا اور زمین پر چھوتے چھوتے ندي نالے بہادینا جن میں وہ کشتي چلا سکتا ہے ' یا خود اس کا متي کے

گھروندے بنانا یا اپنی ماں سے کہانیاں سننا سب ایک مسلسل زندگی کا حصہ ہیں جو تجربات سے پر ہے جن کے ذریعے وہ اپنے ماحول کے واقفیت حاصل کرتا ہے اور اس سے حتی‌الامکان کام لیتا ہے - اگر ہم ان تجربات کو قبل از وقت ایک دوسرے سے علیحدہ کرکے مختلف باضابطہ مضامین میں تقسیم کرنا چاہیں اور مدرسے میں ہر گھنٹے بچوں کی توجہ اور دلچسپی کو ایک شغل سے دوسرے شغل کی طرف منتقل کرتے رہیں تو ان کی حقیقی اہمیت ضائع ہوجائے گی - بچوں کو وہ شوق اور انہماک نہ رہے گا جو اپنے آزاد اور پسندیدہ مشاغل میں ہوتا ہے اور وہ مدرسے کا کام بیدلی کے ساتھ رسمی طریقے سے کرنے لگیں گے - لہذا مدارس جدید میں یہ التزام ہے کہ نصاب کی ترتیب و تدوین میں خصوصاً چھوٹے بچوں کے نصاب میں مضامین کی کوئی قطعی اور مصنوعی تقسیم نہ کی جائے بلکہ ان کے گرد ونواح کی زندگی اور ان کے پسندیدہ مشاغل اور تجربات کو مطالعے کا موضوع بنایا جائے اور اس مطالعے کو رفتہ رفتہ مرتب اور منظم کیا جائے - یہاں تک کہ انہیں خود بخود یہ خیال پیدا ہوجائے کہ وہ اپنے مختلف قسم کے تجربات میں نظم و ترتیب قائم کریں تاکہ ان سے پوری طرح مستفید ہوسکیں - اس ضرورت کا احساس دلانے اور اسے پورا کرنے کے لئے استادوں کی مدد بہت مفید ہے لیکن ابتدا میں یہ خواہش خود طلبہ میں پیدا ہونی چاہئے - استاد کا کام یہ ہے کہ وہ ان کے مطالعے اور طریقہ تحصیل کو بتدریج ایسے راستوں پر ڈالے کہ وہ ترتیب و تقسیم کے فائدے خود بخود محسوس کریں -

کسی قدر ترمیم کے ساتھ اسی اصول پر اونچے درجوں میں بھی عمل کیا جاتا ہے - ابتدائی درجوں میں تو مضامین کی مصنوعی تقسیم کو بالکل ہی مٹا دینا چاہئے - لیکن جب طالب علم اُونچی جماعتوں میں

پہنچتا ھے جن کے نصاب میں مضامین کی تقسیم قدرتی طور پر قائم ہو جاتی ھے اس وقت بھي استاد کے لئے یہ ضروری ھے کہ وہ نصاب کی ترتیب اور اپنی تعلیم کے طریقے میں ان کی باھمی وابستگی اور تعلق کو پیش نظر رکھے اور طلبہ کو بھي سمجھاتا رھے - اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے جاتے ھیں - بعض ماھرین تعلیم نے اس طریقہ کي تائید کی ھے کہ ایک وقت میں صرف چند مضامین پر توجہ کی جائے ' ان کا مطالعہ گھرائي کے ساتھہ کیا جائے - لیکن یہ مضامین ایسے ھوں جن کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے تعلق ھے - چنانچہ بلجیم کے مدرسہ جدید کا بانی واسکونسلو (Vasconcellos) اسی اصول پر زور دیتا ھے - اس کا خیال ھے کہ اگر ایک وقت میں بچے کی توجہ بہت سے مضامین میں منتشر رھے تو نہ صرف اس کی عام دماغی تربیت کو نقصان پہنچے گا بلکہ تحصیل علم میں بھی رکاوٹ پیدا ھوگی - کیونکہ وہ ایک ھي وقت میں بہت سے ایسے مضامین کا مطالعہ کریگا جن میں کوئی لازمی نفسي رابطہ نہیں اور اس وجہ سے اس کا دماغ پریشان اور پراگندہ ھوجائے گا - اپنے مدرسے کے نصاب سے بحث کرتے ھوئے وہ لکھتا ھے :—

" ایک ھی دن میں ریاضی ' لکھنا پڑھنا ' تاریخ ' جغرافیہ ' طبیعات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ممکن ھے ایک جرات آزما مہم کہی جاسکے لیکن اس کا (تعلیمی) نتیجہ صفر ھوگا کیونکہ ان مضامین کے موضوع میں کوئی ربط یا تعلق نہیں ھے - " [1]

اس خرابی سے بچنے کی غرض سے اس نے اپنے مدرسے میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ھر موقات (ترم) کے لئے چند ایسے مضامین منتخب

---

[1] A New School in Belginm صفحہ ۷۷

کر لئے جاتے تھے جو ایک حد تک موسم سے مناسبت رکھتے تھے - مثلاً موسم گرما اور موسم بہار میں سائنس کے شعبے میں سے علم حیوانات اور علم نباتات کا مطالعہ کیا جاتا کیونکہ وہ زمانہ اس کے لئے مقابلتاً زیادہ مناسب ہے - طبیعات اور کیمیا کی طرف اس زمانے میں کم توجہ کی جاتی تھی - بلکہ اُن پر جاڑے اور خزاں کے موسم میں زیادہ زور دیا جاتا تھا - اس تقسیم کی وجہ سے طلبہ منتخب شدہ مضامین کا مطالعہ زیادہ دل چسپی ، گہرائی اور انہماک سے کرتے تھے - مگر یہ اصول صرف انتخاب مضامین ھي تک محدود نہ تھا بلکہ ہر مضمون کے مخصوص موضوع کا انتخاب بھی اسی اصول پر کیا جاتا تھا - ہر روز طلبہ یا تو کسی مضمون کی ایک خاص شاخ کا مطالعہ کرتے تھے یا کئی ایسی شاخوں کا جن سے ایک دوسرے کے مسائل اور مباحث پر روشنی پڑے - اسی طرح ہر موضوع کے مطالعے میں گہرائی پیدا ہوجاتی ہے اور اس پر مختلف پہلوؤں سے اچھی طرح غور کیا جا سکتا ہے - مثلاً کسی روز طلبہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ فرانسیسي زبان کے مطالعے میں صرف کرتے تھے - ان کو یہ مجبوری نہ تھی کہ ہر گھنٹے کے بجنے پر اپنے کام کو نامکمل چھوڑ کر اپنی توجہ کو دفعتاً ایک مضمون سے کسی بالکل مختلف مضمون کی طرف منتقل کریں جس سے نہ صرف وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ ذہن منتشر ہوجاتا ہے - اس خیال سے کہ طبیعت کسی کام کو کرتے کرتے اُکتا نہ جائے وہ مضمون کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کرتے تھے - مثلاً اگر فرانسیسي کا دن ہے تو وہ اس زبان کي کتابیں پڑھتے ، اس کی قواعد سیکھتے ، اس میں مضمون لکھتے ، گفتگو کرتے - اس طرح وہ جس مضمون یا موضوع کو اُٹھاتے اس پر محنت ، صبر اور استقلال کے ساتھ کام کرتے یہاں تک کہ اس کا ایک حصہ مکمل ہوجاتا - سائنس کے مختلف شعبوں میں

جہاں اکثر مسلسل اور طویل تجربات اور مشاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے یہ طریقہ خاص طور پر مفید ہے - کیونکہ اس کی وجہ سے طلبہ کو اتنا وقت اور فرصت مل جاتی ہے کہ وہ بغیر کسی کی مدد کے اپنے بل پر کام کریں اور اپنی غلطیوں کی تصحیح اپنی کوشش اور سمجھ سے کریں - اس اصول پر عمل کرنے سے " خیالات میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور ہر مضمون کے مختلف شعبوں اور مظاہر کے باہمی تعلقات کے مطالعے کا موقع ملتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے علم کی وسعت بڑھتی ہے اور ہم مختلف مضامین کی معلومات کو باہم مربوط کر سکتے ہیں " یہ طریقہ " اجتماع مطالعہ " کہلاتا ہے -

ہر مدرسے میں اس طریقہ پر عمل کرنا مشکل ہے کیونکہ جب تک نصاب کی ترتیب و تنظیم قابل اُستادوں کے ہاتھ میں نہ ہو اور ان کو امتحانوں کی بندشوں سے ایک حد تک آزادی نہ حاصل ہو وہ نصاب کی تدوین اور طریقہ تعلیم میں ترمیم اور اصلاح نہیں کر سکتے - لیکن مضامین میں ربط قائم کرنے کا ایک دوسرا طریقہ ایسا ہے جس پر ہمارے موجودہ مدارس میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے حالانکہ ان میں نئے تعلیمی تجربات کے راستے میں ہر قسم کی رکاوتیں حائل ہیں - وہ طریقہ یہ ہے کہ مدرسے میں کوئی مضمون اس طرح نہ پڑھایا جائے گویا وہ بجائے خود ایک مکمل اور مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس کو سمجھنے یا اس سے پوری طرح فائدہ اُٹھانے کے لئے کسی دوسرے مضمون سے مدد لینے کی ضرورت نہیں - نصاب میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جن کو اپنی نوعیت اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے صریحی تعلق ہے مثلاً جغرافیہ اور تاریخ جن کا مشترک موضوع انسان اور اس کی اجتماعی زندگی ہے اور دونوں اپنے اپنے مخصوص نقطہ نظر سے

اس پر روشنی ڈالتے ہیں - اس اشتراک موضوع کی وجہ سے ان دونوں مضامین میں ہر ہر قدم پر ربط پیدا کرنے کا امکان اور ضرورت ہے - تاریخ انسانی کا ارتقاء اسی عالم آب و گل میں ہوا ہے جس میں بے شمار طبعی قوتیں کام کرتی ہیں جن کو سمجھنا اور سمجھانا جغرافیہ کا کام ہے - جغرافیہ کے مظاہر اور فطرت کی قوتیں انسان کی آزادی کو محدود بھی کرتی ہیں اور اس کو اس کے مقاصد کے حصول میں مدد بھی دیتی ہیں اس لئے ہم تاریخی واقعات کو اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک ان جغرافی حالات سے واقف نہ ہوں جنھوں نے ان پر اثر ڈالا ہے اور ان کی تشکیل میں حصہ لیا ہے - اسی طرح تاریخ کی حقیقی اہمیت اور اس کی روح کو سمجھنے کے لئے ادب کے مطالعے کی ضرورت ہے اس لئے کہ ادبی تصانیف میں ان انسانی آرزوں اور حوصلوں اور کوششوں کی تفسیر نظر آتی ہے جن کی عملی تعبیر تاریخ کے واقعات کے ذریعے ہوتی ہے اِسی طرح سائنس اور ریاضی میں ادب ' تاریخ جغرافیہ اور دست کاری میں نفس مضمون کے اعتبار سے ربط قائم کرنے کے امکانات موجود ہیں جن سے اُستاد کو فائدہ اُٹھانا چاہئے - علاوہ بریں اس تحریک کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر مضمون کے نصاب میں بعض مناسب چیزیں دوسرے مضامین سے شامل کی جائیں جن سے اس کے مطالب پر مختلف پہلوؤں سے روشنی پڑے اور وہ زیادہ مکمل طریقے پر طلبہ کی سمجھ میں آجائیں - سائنس کے مضامین کا نصاب بنانے میں اس طرح ایک دوسرے سے مدد لینا خاص طور پر ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ " بے جان ' بے زبان اور بیکار " ہوکر رہ جاتے ہیں - جب ہم سائنس کے ذریعے مظاہر فطرت کی تفسیر کرنا یا اس کو تمدنی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے اس کی کوئی ایک شاخ کافی نہیں ہوتی بلکہ مختلف شاخوں سے

کام لینا پڑتا ھے - طبیعات ' کیمیا ' حیاتیات وغیرہ کو نظری طور پر سمجھنے اور ان سے عملی طور پر کام لینے کے لئے ان کی باھمی وابستگی اور تعامل کا سمجھنا ضروری ہے ورنہ وہ اپنے ماحول کے مناظر اور مظاھر کی صحیح تفسیر نہ کر سکیں گی - اِس کی تشریح واسکونسلو (Vasconcellos) نے ایک مثال سے کی ھے - وہ کہتا ھے کہ اگر علم حیوانات کے کسی سبق میں ھمیں سانس کی آمد و رفت کو بیان کرنا ھو تو اس کی ضرورت پڑے گی کہ ھم کیمیا کی طرف رجوع کریں اور کاربن اور آکسیجن کے متعلق واقفیت حاصل کریں - اسی طرح اگر ھم انسان کے جسم کے ڈھانچے کی ساخت کو سمجھانا چاھتے ھیں تو ایک طرف طبیعات سے مدد لے کر بیرم (Lever) کا اصول بتانا ھوگا جس کے بغیر ھڈیوں کی حرکت سمجھ میں نہیں آسکتی اور دوسری طرف کیمیا کی مدد سے ھڈیوں کی ماھیت پر روشنی ڈالنی پڑیگی - ان مثالوں سے ظاھر ھوتا ھے کہ کسی ایک علمی یا تمدنی مسئلے کو سمجھنے کے لئے بھی ھمیں مختلف علوم و فنون اور تجربات سے کام لینا پڑتا ھے اور جب تک نصاب کی تدوین میں ھم اس بات کو پیش نظر نہیں رکھینگے ھمارے لئے اپنے علم کی تنظیم اور اس کا استعمال بہت مشکل ھوجائیگا - نصاب کے مضامین کو صحیح معنوں میں مربوط کرنے کے لئے ان کی باھمی وابستگی کو ظاھر کرنے کے علاوہ یہ بھی ضروری ھے کہ وہ نقطہ تلاش کیا جائے جو ان سب کا مرکز ھے اور ان میں سے ھر ایک کا تعلق اس کے ساتھ دکھایا جائے - وہ مرکز ظاھر ھے کہ نظام معاشرت اور بچوں کی فطرت کا اجتماعی رجحان ھے - تمام مضامین کی ترتیب میں ھمیں تعلیم کے معاشرتی اغراض اور تمدنی زندگی کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ضروری ھے تا کہ ھم طلبہ پر یہ بات واضح کرسکیں کہ ان کے اغراض اور ضروریات کے پورا کرنے میں یہ مضامین انھیں کس طرح مدد دے

سکتے ھیں - امریکہ میں اس تعلیمی تحریک نے مدرسں میں انقلاب پیدا کردیا ہے اس کا مقصد یہ ھے کہ طریقہ تعلیم ' نصاب تعلیم اور ضبط و تادیب کے نظام وغیرہ کو مندرجہ بالا مقصد کے مطابق مرتب کیا جائے وہاں کے معلموں نے اس کے لئے "مدرسوں کی تنظیم معاشری" [1] کا نام تجویز کیا ہے - نصاب کے معاملے میں اس تحریک نے دو باتوں پر زور دیا ہے - ایک تو یہ کہ تمام مضامین اور مشاغل ایسے ہوں جو طلبہ کے تمدنی احساس اور معلومات میں اضافہ کریں - دوسرے یہ کہ ان تمام امور کو نصاب سے خارج کردیا جائے جو تمدنی زندگی سے کوئی مفید اور معقول تعلق نہیں رکھتے - جیسا ہم اوپر بتا چکے ھیں نصاب کی یہ تنقید اور محاسبہ اس لئے ضروری ھے کہ وہ اکثر ضروریات زمانہ کے ساتھہ ہم‌آھنگ نہیں ھوتا اور اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے ترقی کی منزلوں میں تمدن کا ساتھہ نہیں دیتا یعنی جو اقتصادی اور معاشرتی تبدیلیاں پیدا ھوتی ھیں ان کا لحاظ نہیں رکھتا - گذشتہ صدی میں سائنس اور قدیم علوم اور زبانوں میں جو جنگ جاری رہی اور اس زمانے میں نظری اور عملی تعلیم کے مطالبات میں جو کشمکش ھے وہ اسی وجہ سے ہے - ماہرین تعلیم کا فرض یہ ھے کہ ان چیزوں کو مقدم اور لازم سمجھیں جو معاشرے کی بقا اور ترقی کے لئے اہمیت رکھتی ھیں اور جو چیزیں محض نمائشی یا آرائشی ھیں ان کو ثانوی حیثیت دیں - مضامین نصاب کی اِضافی قدر و قیمت کا مسئلہ دراصل تہذیب کے مفہوم سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق ابھی تک خود معلمین اور تمدنی مفکروں کے خیالات واضح نہیں ھیں - کیونکہ ایک طرف موجودہ زندگی کے نئے مطالبات ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ھیں اور دوسری طرف تہذیب کا قدیم تصور جو مختلف حالات میں پیدا ہوا

[1] "Socialization of Education"

تھا ان کے ذہن پر مسلط ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) وغیرہ نے اس مسئلے پر بلکہ تعلیم کے تمام مسائل پر اس نقطہ نظر سے غور کیا ہے کہ ایک جمہوری معاشرے کے لئے کس قسم کی تعلیم اور کس قسم کے نصاب کی ضرورت ہے - ان کا خیال ہے کہ اس لحاظ سے نصاب میں ان مضامین اور مشاغل کو ترجیح اور اہمیت دینی چاہئے جن کا تعلق افراد اور معاشرے کے مشترک تجربات سے ہے یعنی وہ تجربات جن میں زیادہ سے زیادہ تعداد لوگوں کی شریک ہوتی ہے - برخلاف اس کے جن علوم و فنون کا تعلق خاص جماعتوں یا مخصوص پیشوں کی ضرویات سے ہے اُن کی اہمیت مقابلتاً کم ہے - لہذا تعلیم کو اولاً عام انسانی ضروریات اور مقاصد کا خیال کرنا چاہئے اور اس کے بعد مخصوص پیشوں کے مشاغل کا - اسی وجہ سے بعض علوم و فنون مثلاً زراعت اور باغبانی کی اہمیت جبر و مقابلہ سے اور دست کاری کی اہمیت ٹائپ نویسی سے کہیں زیادہ ہے - کیونکہ زراعت یا باغ بانی یا دست کاری نہایت قدیم انسانی مشاغل ہیں جن کا تعلق تمدن کی تاریخ اور تشکیل سے بہت گہرا ہے اور جن میں ہر زمانے کے بیشتر افراد نے حصہ لیا ہے برخلاف اس کے جبر و مقابلہ یا ٹائپ نویسی کی اہمیت بہت محدود ہے اور یہ صرف خاص خاص کاموں اور پیشوں کے لئے مفید ہیں - اگر اس طرح ہم تمام مضامین تو تعلیم کے مرکزی مقصد کے لحاظ سے دیکھیں تو ان میں یہ انتشار باقی نہیں رہے گا بلکہ خود بخود ربط قائم ہوجائیگا - اس تحریک کی تفصیل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کا ایک عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام درسی کتابوں کو از سر نو جدید اصول پر لکھنا پڑیگا - مغربی ممالک میں گذشتہ پچاس سال کے اندر درسی کتابوں میں بہت ترقی ہوئی ہے مختلف علوم کی درسیات کی تصنیف تجربہ

کار اور قابل لوگوں کے هاتھہ میں هے جو نہ صرف ان علوم میں مہارت رکھتے هیں بلکہ نفسیات اطفال سے بھی کم و بیش واقف هیں - بعض مدرسوں میں جہاں ایک مستقل اور مقررہ نصاب طلبہ کی تعلیمی ترقی میں حارج سمجھا گیا هے ، معلموں نے خود اپنی اپنی ضروریات کے مطابق هر مضمون کا نصاب تیار کیا هے اور بجائے اس کے کہ ایک هی نصاب هر سال پڑھاتے رهیں وہ اپنے تجربے اور طلبہ کے ذهنی اور عمل کے مطابق اس میں ترمیم اور تبدیلی کرتے رهتے هیں - طریق ڈالٹن (Dalton Plan) کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ هے کہ نصاب میں ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش رکھنی چاهئے اور هر مضمون کے معلم کو اپنے تجربے اور معلومات کے مطابق هر هفتے اور هر مہینے کے کام کے لئے نصاب کے خاکے تیار کرنے چاهئیں اور اگر وہ عملاً کامیاب ثابت نہ هوں تو ان میں تبدیلی کرکے دیکھنا چاهئے کہ کیا نتیجہ هوتا هے - اس طرح کے آزمائشی نصاب کی ایک بہت عمدہ مثال امریکہ کی ریاست ونتکا (Winnetka) کے مدرسوں کی دي جاچکی هے جہاں استاد خود هر مضمون کا نصاب معاشری ضروریات اور طلبہ کے نفسی رجحانات کو پیش نظر رکھہ کر مرتب کرتے هیں ۔ اور اس کو درسی کتابوں کی شکل میں چھپوانے کے بجائے ٹائپ کرا لیتے هیں اور طلبہ میں تقسیم کردیتے هیں - اس ٹائپ میں لکھے هوئے تعلیمی مواد کو ان کے مطالعے کا مرکز یا بنیاد سمجھنا چاهئے جس کے ذریعے وہ هر موضوع کے متعلق ایک صحیح اور دل چسپ نقطہ نظر قائم کرلیتے هیں - اس کے بعد اپنی واقفیت کو بڑھانے اور علم میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے وہ مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتے هیں جن کا حوالہ ان کے اس نصاب میں موجود هوتا هے یا جن کو استاد تجویز کرتے هیں - یا وہ خود اپنے شوق سے لائبریری سے کتابیں

لے کر پڑھتے ہیں - مگر ہمارے مدارس میں جس قسم کی درسی کتابیں بالعموم رائج ہیں وہ تعلیمی ترقی اور تعلیمی اصلاح کے راستے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہیں - جب کبھی کسی نئے تعلیمی تجربے مثلاً طریق ڈالٹن کو رائج کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کے خلاف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اول تو کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بہت ناقص اور نامناسب ہیں اور علاوہ اور بہت سی خرابیوں کے وہ اپنے موضوع کے معاشرتی پہلو کو نمایاں نہیں کرتیں - بیشک تاریخ ' یا جغرافیہ یا سائنس کے معاشرتی پہلو کو واضح کرنے میں طریقہ تعلیم و تحصیل کو بہت دخل ہے لیکن اگر درسی کتابیں اس طرح لکھی جائیں کہ ان علوم کی تمدنی قدر و قیمت پر روشنی پڑے تو معلم کے لئے تعلیم کی معاشرتی تنظیم آسان ہوجائے گی - مثال کے طور پر سائنس کو لیجئے - مدرسوں میں سائنس کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں (اور بالعموم علاوہ استادوں کے پڑھائے ہوئے سبق کے طلبہ کا تمام دار و مدار ان میں سے کسی ایک پر ہوتا ہے) وہ ایسے خشک اور اصطلاحی انداز میں لکھی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن سائنس کے معاشرتی پہلو کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا حالانکہ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس میں بے شمار امکانات موجود ہیں جن سے فائدہ اُٹھا کر ہم طلبہ کے معاشرتی احساس کو مستحکم کر سکتے ہیں مثلاً ہم مشہور سائنس دانوں کے سوانح حیات کو دل چسپ اور موثر طریقے پر پیش کرکے سائنس کے " انسانی " رخ پر روشنی ڈال سکتے ہیں - اس طرح طلبہ کے دل میں بتدریج یہ احساس مستحکم ہوجائے گا کہ سائنس کی ترقی اور تدوین میں انسان کو مسلسل جد و جہد اور کاوش کرنی پڑی ہے اور اس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں

بہت سے ملکوں اور قوموں کی متحدہ کوشش کو دخل ہے - اگر سائنس دان ایک دوسرے سے بے تعلق ہوکر کام کرتے اور خود غرضی کی بنا پر اپنی اپنی تحقیقات کے نتائج کو ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھتے تو سائنس ہرگز اس قدر ترقی نہ کر سکتی جتنی اس نے اب تک کی ہے - سائنس اشتراک عمل کا یہ سبق بہت وضاحت اور خوبی کے ساتھ سکھاتی ہے بشرطیکہ معلم کو اس بات کا احساس ہو اور درسی کتابوں میں اس پر زور دیا جائے - لیکن کتنی درسی کتابیں ایسی ہیں جو اس شرط کو پورا کرتی ہیں ؟ اسی طرح سائنس کے نصاب اور درسی کتب میں اس بات کی توضیح کی ضرورت ہے کہ موجودہ صنعت و حرفت ، زراعت اور تجارت ، حفظان صحت ، علاج امراض ، غرض نظام معاشرت کی بیشتر آسائشوں اور سہولتوں کا دار و مدار سائنس پر ہے - طلبہ کو ہر ہر قدم پر ان کے ذہنی استعداد اور قابلیت کے مطابق یہ بتانا چاہئے کہ جو باتیں وہ سائنس کے نام سے پڑھ رہے ہیں وہ محض امتحان پاس کرنے یا معلومات کا ذخیرہ بڑھانے کے لئے مفید نہیں بلکہ ان کی روز مرہ کی زندگی میں کام آنے والی ہیں اور انہیں کی وساطت سے انسان نے اپنے ماحول کو مسخر کیا ہے -

معاشرتی تنظیم کے اصول بعض مضامین میں بوجہ ان کی نوعیت کے ، زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اور بعض میں کم مثلاً تاریخ ، جغرافیہ ، سائنس ، دستکاری وغیرہ میں ان کو زیادہ دخل حاصل ہے - لیکن اس تحریک کا اثر کسی نہ کسی حد تک نصاب کے ہر شعبے پر پڑا ہے - یہاں تک کہ ابتدائی تعلیم کے مروجہ '' عناصر ثلاثہ '' یعنی لکھنے پڑھنے اور حساب کی تعلیم میں بھی آج کل یہی کوشش کی جارہی ہے کہ ان کو بھی دل چسپ اجتماعی مشاغل کے طور پر سکھایا جائے نہ بطور فنی

مشقوں کے جو بچوں کو با دل نا خواستہ کرنا پڑتی ہیں - اس وجہ سے ریاضی کی جدید کتابوں میں سوالات، مشقوں اور وسائل کے لئے بچوں کی معاشرتی زندگی اور تجربات سے مواد حاصل کیا جاتا ہے - ان سے بعید از قیاس اور مہمل سوالات حل نہیں کرائے جاتے جن کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بچے اس بہانے سے اعداد کے باہمی علاقوں کو سمجھیں - مثلاً جمع یا ضرب یا تقسیم سکھانے کے لئے چند بیلوں اور بکریوں کو چند مربع ایکڑ کے گھاس کے قطعے میں نہیں چھوڑا جاتا جہاں وہ مشین کی طرح ایک مقررہ رفتار سے مسلسل گھاس چرتے رہیں اور بیچارے بچوں کو یہ معلوم کرنا پڑے کہ کتنے دن میں وہ قطعہ بالکل صاف ہوجائے گا - اس کے بجائے وہ مسائل پیش کئے جاتے ہیں جو روز مرہ طلبہ کے تجربے اور مشاہدے میں آتے رہتے ہیں انہیں آئے دن ایسی ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً وہ کسی کھیل کے میدان کی پیمائش کرنا چاہتے ہیں یا مدرسے میں سیونگ بنک کھولنا چاہتے ہیں یا انہیں اپنا گھر بار کا حساب رکھنا پڑتا ہے یا بازار سے سودا خریدنا پڑتا ہے - اس قسم کے معاملات میں ہر طرح کے حسابی قاعدوں اور اصولوں کو سمجھانے کے لئے بے شمار مواقع ہیں - عقل مند معلم اور سمجھدار مصنف کا فرض ہے کہ وہ تمام خلاف قیاس باتوں کو نظر انداز کر کے ایسے معاملات کی طرف توجہ کرے جن میں طلبہ کو فطرتاً دلچسپی ہے اور ان کے ذریعے سے انہیں حساب سکھائے - علیٰ ھذاالقیاس مدرسہ جدید میں لکھنا بطور ایک مخصوص فن کے نہیں سکھایا جاتا کہ طلبہ کو مدتوں حروف اور ان کے مرکبات کی مشق کرائی جائے جن کا مطلب یا منشا سمجھ میں نہیں آتا - بلکہ اس کے لئے اُسی فطری خواہش سے محرک کا کام لیا جاتا ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے سے مبادلہ خیالات کرنے پر

مجبور کرتی ہے - مثلاً ایک طالب علم اپنے کسی دوست یا عزیز کو خط لکھنا چاہتا ہے تاکہ اپنے مدرسے کے کھیلوں کا یا کسی اور دلچسپ شغل کا حال بیان کرے - لیکن وہ خط اُس وقت تک نہیں لکھ سکتا جب تک وہ حروف کی شکلوں سے واقف نہ ہو اور ان کو ملا کر الفاظ کے نقش بنانے کی مشق نہ کرے - جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس فن کی معاشرتی غرض اور فوائد کو سمجھ کر سے سیکھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے - اسی طرح پڑھنے کو موجودہ طریقہ تعلیم نے بجائے ایک ناگوار فرض کے ایک دل چسپ مشغلہ قرار دیا ہے جس کے ذریعے طالب علموں کو مل جل کر عالموں اور ادیبوں کے خیالات اور جذبات سے آگاہ ہونے اور لطف اٹھانے کا موقع ملتا ہے اس لئے بچوں کے مطالعے کے لئے ایسا مواد فراہم کرنا چاہئے جو اعلیٰ درجے کی ادبی حیثیت رکھتا ہو اور اس سے تمدنی معاملات اور مشاغل پر روشنی پڑتی ہو - اور اس کو ایسے طریقوں سے پیش کرنا چاہئے جن میں امداد باہمی اور اشتراک عمل کی گنجائش ہو - اس اصول کی تفصیل کے لئے ادب اور زبان کے تعلیمی طریقوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ایک دانش مند معلم کس طرح پڑھنے کو ایک اجتماعی اور دلچسپ شغل بنا سکتا ہے -

اس بحث کا خاتمہ ہم پروفیسر بوڈ (Bode) کی مندرجہ ذیل عبارت پر کرتے ہیں جس میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ نصاب کے مضامین کی تعلیم کس نقطہ نظر سے دینی چاہئے تا کہ وہ زندگی کے معاشرتی مقاصد میں معین ہوں :—

" (لوگوں میں) صحیح قسم کے خیالات اور مقاصد پیدا کرنے لئے ہمیں کسی اصول ہدایت یا معاشرتی نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے - اس بات کو مد نظر رکھ کر درسی

مضامین پڑھانے میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاھئے ؟
ہر مضمون کو پڑھانے کے دو مختلف طریقے ہو سکتے ہیں - ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اس کی تعلیم اس طرح دیں گویا وہ ایک مخصوص اور جداگانہ چیز ہے جو اور تمام چیزوں سے بے تعلق ہے - اس صورت میں ہمارا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اس خاص علم کے اندر جو معلومات قواعد ، اور قوانین ہیں ان کو استعمال کرنے میں طلبہ کو مہارت اور دسترس حاصل ہوجائے - اس قسم کی تربیت کے ذریعے ہم ماہرین خصوصی یا عملی کاریگر تیار کر سکتے ہیں ، اور اگر طلبہ کی تربیت میں سختی کے ساتھہ اسي قاعدے کی پابندي کی جائے تو تعلیم محض کاریگری کے گروں کا مجموعہ ہوکر رہ جائے گی - بر خلاف اس کے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ نصاب کا ہر مضمون زندگی کے ساتھہ وابستہ ہے اور ہمارا مقصد یہ ہو کہ اس کا اور انسانی تجربے کا وسیع تر تعلق ظاہر کریں کہ اس اصول کی رو سے تعلیم کے فن کی نوعیت اور منشا بالکل مختلف ہو جاتا ہے - اگر ریاضی کو محض اعداد کے مجرد علاقے ظاہر کرنے کے لئے نہ پڑھایا جائے بلکہ اس کے ذریعے یہ بات طلبہ کے ذہن نشین کی جائے کہ ریاضی کا عملی معاملات سے کیا رشتہ ہے اور اس کا تعلق ان بڑي بڑی عملی تحقیقات اور انکشافات سے کیا ہے جنہوں نے ہمارے تصور عالم میں انقلاب پیدا

کردیا ھے ، اگر ریاضی کي تعلیم اس طرح پر دی جائے تو اس کی نوعیت محض فنی اور صوري نه رھیگی بلکه طلبه کو اس سے دلی تعلق پیدا ھو جائے گا - جب طلبه کے سامنے سائنس کو اس طرح پیش کیا جاتا ھے که وہ جدو جہد کے اس مسلسل عمل کو سمجھه سکیں جس کے ذریعے انسان نے فطرت کو مسخر کیا ھے اور توھمات ، تعصب اور تنگ نظری کی بندشوں سے رھائی پائی ھے تو وہ محض عالم فطرت کی کہاني نہیں رھتی بلکه ارتقائے انسانی کے زبر دست ڈراما کا قصه سناتی ھے - جب تاریخ کے ذریعے یه حقیقت منکشف ھوتی ھے که انسانوں نے کن مقاصد کي خاطر جنگیں کی ھیں اور جانیں دي ھیں اور وہ تمام پیچ در پیچ اغراض و حالات کیا تھے جن کی بنیاد پر موجودہ تمدن کی عمارت تعمیر ھوئی ھے تو وہ ماضی کے گڑے مردے کی داستان نہیں رھتی بلکه حال کے زندہ مسائل کی تفسیر بن جاتی ھے - ھمارے تمدن کے جو عناصر ھمارے نصاب کا موضوع بن گئے ھیں ان کو تخیل کے کرشمے سے اس طرح طالب علم کے ذاتی تجربے کا جزو بنایا جا سکتا ھے که وہ قابلیت اور سلیقے کے ساتھه ھر قسم کی انساني ضروریات اور آرزؤں کو سمجھه سکے - اور ان تمام چیزوں کی قدرشناسی کرے جو زندگی کو معنویت اور حسن کی دولت سے مالامال کرتی ھیں - جمھوری سوسائٹی میں تہذیب کا صحیح مفہوم یہی ھے - تعلیم کا جمھوری نصب العین

یہ نہیں کہ ہر شخص کو کسی ایک کام کے قابل بنادیا
جائے بلکہ یہ ھے کہ ہر شخص زندگی سے پوری طرح
لطف اندوز ہو جس کا ترجمہ سیاست کی اصلاح میں
یہ ہوگا کہ فرد کو زندگی ، آزادی اور لطف و مسرت کا
حق حاصل ہو " - [ا]

مختصر یہ کہ نصاب کی تدوین اور درسی مضامین کی تنظیم و ربط کا مسئلہ تنگ اور اصطلاحی معنی میں تعلیمی مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعلق علوم کی ماہیت اور سوسائٹی کے تہذیب و تمدن اور فلسفہ زندگی سے ھے - اس میں ہمیں مختلف تمدنی اور نفسیاتی مسائل کو پیش نظر رکھنا ضروری ھے - ایک طرف تو تمدن کی اہم ترین ضروریات کا تجربہ کر کے دیکھنا چاہئے کہ کن مضامین اور علوم کا مطالعہ نئی نسل کے بچوں اور نو جوانوں کے لئے سب سے زیادہ مفید ھے اور اس نقطہ نظر سے مروجہ نصاب میں ترمیم اور تبدیل کرتے رہنا چاہئے - دوسری طرف فطرت اطفال کا مطالعہ کرنا ضروری ھے تا کہ ہمیں معلوم ہوجائے کہ ہم ان مضامین کو کس ترتیب اور اسلوب سے طلبہ کے سامنے پیش کریں کہ وہ ان کے روز مرہ کے تجربات کا جز و بن کر ان کی ذہنی تربیت میں معین ہوں - لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ھے جب معلموں کی تربیت میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ علوم کے باہمی تعلق کو پہچانیں اور ان سب کو انسانی زندگی کی تفسیر اور تشریح کا ذریعہ سمجھیں - نصاب خواہ کتنا ہی عمدہ ہو لیکن معلم اس غلط فہمی میں مبتلا رہینگے کہ ہر علم بجائے خود ایک مستقل چیز ھے جس کو نظری حیثیت سے حاصل کرنا طالب علم کا فرض ھے خواہ وہ اس کا

[ا] Modern Education Theories صفحہ ۲۱۴ -

مقصد اور مفہوم سمجھے یا نہ سمجھے تو نہ درسی مضامین میں ربط قائم ہوگا نہ ان سے زندگی کے مسائل پر روشنی پڑیگی بلکہ تعلیم جیسی خشک اور بے جان ہے ویسی ہی رہیگی - یہ ظاہر ہے کہ مضامین نصاب کی اضافی قدر و قیمت کا انحصار ہر قوم اور ہر تمدن کے اپنے اپنے معیار اقدار پر ہے لیکن انسانی اغراض و مقاصد اور تمدن کی ضروریات بہت کچھہ مشترک ہیں اور ہم نے اس باب میں جن علوم سے بحث کی ہے وہی ہر ملک میں نصاب کے اہم تریں عناصر سمجھے جاتے ہیں - لیکن اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئیے کہ نصاب کے مسئلے کا کوئی دائمی حل نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ہر نسل اور ہر زمانے میں از سر نو حل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور تعلیم کے متعلق نظری بحث کرنے والوں اور معلموں دونوں کا فرض ہے کہ وقتاً فوقتاً مدرسوں کے نصاب پر تنقیدی نظر ڈال کر اس میں حسب ضرورت ترمیم کرتے رہیں -

باب پنجم

"تربیت جسمانی"

تعلیم جدید نے مدرسوں میں جو مختلف تبدیلیاں پیدا کی
ہیں ان میں سے ایک نہایت اہم تبدیلی تربیت جسمانی کے نظریے کی
ہے - اب یہ امر دوبارہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ انسان کی مکمل تربیت
اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے جسم کی مناسب
نگہداشت اور نشو و نما کا انتظام نہ کیا جائے اور اس کو ذہنی اور
روحانی اعمال کے لئے ایک مستعد خادم اور مفید آلہ کار نہ بنایا جائے -
ہم نے "دوبارہ" کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ تقریباً تمام ملک
اور تمام تہذیبیں ایک ایسے دور سے گزر چکی ہیں جب جسم کی اہمیت
پورے طور پر محسوس کی جاتی تھی اور اس کی پرداخت کا باقاعدہ
انتظام ہوتا تھا - قدیم یونانی تعلیم میں تربیت جسمانی کو وہی اہمیت
حاصل تھی جو عقلی اور اخلاقی تربیت کو - جمناسٹک (جسمانی ورزش)
اور موسیقی یونانی نظام تعلیم کے دو اہم ترین عناصر شمار ہوتے تھے -
یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک جسم کی مکمل اور ہم آہنگ نشو و نما
نہ ہوگی انسانی سیرت میں پختگی نہیں آسکتی اور انسان اپنی
قوتوں کو فعل میں نہیں لاسکتا - ارسطو کا یہ نظریہ تھا کہ انسان کی
شخصیت ایک مکمل وحدت ہے جس کے دو پہلو ہیں، جسم اور دماغ،
اور ان دونوں کی تربیت ہم آہنگ ہونی چاہئے - اسی وجہ سے یونانیوں
نے جسمانی تربیت کو بھی ایک فن لطیف بنا دیا تھا اور ان کی نظر
میں ایک مریض یا کمزور، یا بے ڈھنگے قسم کا آدمی بھی اتنا ہی
ذلیل تھا جیسا ایک جاہل اور بے وقوف آدمی! قدیم روما میں بھی

جسمانی تربیت کی اهمیت تسلیم کی جاتی تهی لیکن رومیوں کے یہاں ' خاص ملکي حالات کی وجه سے اس کا مقصد کچهه اور هو گیا تها یعنی وہ عام انسانی تربیت کا جزو نهیں سمجهی جاتی تهی بلکه تندرست شهریوں کو کامیاب اور جنگ جو سپاهی بنانے کا ذریعه بن گئی تهی - قدیم هندو تهذیب میں ایک حد تک تربیت جسمانی کی ضرورت کا احساس موجود تها چنانچه چهتریوں کے لئے جسمانی اور فوجی ورزش لازمی قرار دي گئي تهی - لیکن ان کے یہاں سوسائٹی مختلف طبقوں میں تقسیم تهی اور هر ایک طبقے کے لئے جداگانه تربیت تجویز کی گئی تهی یعنی برهمنوں کے لئے مذهبي اور ذهني ' چهتریوں کے لئے جسمانی اور فوجی تربیت ؛ اور ویشوں کے لئے کار و باری - اس نظام تعلیم میں اگر صریحاً نهیں تو ضمناً ' جسم اور دماغ کا وہ تناقض تسلیم کیا گیا هے جس کو موجودہ نظریه تعلیم نے مسترد کر دیا هے - قرون وسطی میں ' جب یورپ میں نظام جاگیر داری کا زور تها تو وهاں بهی اسي قسم کی تقسیم رائج تهي - ایک طرف تو روحانی ریاضت کرنے والے راهبوں کي تعلیم تهی جس میں نه صرف جسمانی تربیت کو نظرانداز کیا جاتا تها بلکه جسمانی خواهشات اور ضروریات کو بهی دبانے کی کوشش هوتی تهی اور کم سے کم اصولاً پوری توجه دماغی اور روحانی تربیت پر صرف کی جاتی تهی - دوسري طرف جنگ جو سورماؤں کي تعلیم تهی جس میں ذهنی تربیت کو تقریباً بالکل نظر انداز کرکے سارا وقت جسمانی تربیت اور فوجی ورزشوں میں صرف هوتا تها - اسلامی تهذیب میں ابتدا هي سے جسمانی تربیت کی اهمیت ایک مسلمه امر سمجهی گئی - اول تو اسلام کي نشو و نما ایک ایسے مخالف ماحول میں هوئی تهی که مسلمانوں کو شروع هي سے اپنے بقائے حیات کے لئے جنگ و جدل کرنی پڑی جس کی خاطر ان کو فنون جنگ سے واقف هونا اور اپني

جسمانی طاقت کو قائم رکھنا ضروري تھا - دوسرے مذہب کي حیثیت سے بھی اسلام روح اور جسم کے تضاد کا قائل نہیں بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کا معین اور شریک کار سمجھتا ھے - چنانچہ جب تک اسلامی تہذیب کے عروج کا زمانہ رھا ؛ مسلمانوں نے کبھی جسمانی تربیت کو حقیر و ذلیل نہیں سمجھا - البتہ جب زوال کا دور آیا اور تعلیم تنگ خیال مذھبی گروہ کے ھاتھہ میں آگئی تو اس نے جسم اور روح کے قدیم تناقض کو دوبارہ زندہ کیا اور لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ انھیں جسم کی طرف توجہ نہیں کرني چاھئے کیونکہ وہ نفسانی خواھشات کا گھر ھے اور روحانی ترقی کے راستے میں حارج ھے - لیکن باوجود اس کے ھندوستان میں عہد مغلیہ کے آخر تک شرفا کے طبقے میں بہت سی صحت افزا ورزشیں اور کھیل مروج تھے مثلاً کشتی ' پھری گتکا ' مگدر ' شمشیر زنی اور نیزہ بازی - ان میں لوگ بہت خوشی کے ساتھہ شریک ھوتے تھے اور انھیں اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتے تھے - مگر جب تنزل انتہا کو پہنچ گیا تو درباریوں اور اُمرا اور ان کي دیکھا دیکھی عام لوگوں نے بھی ان مردانہ ورزشوں کو ترک کرکے مرغ بازی ' بٹیر بازي ' اور پتنگ بازی کو اپنا مشغلہ تفریح بنا لیا - جس وقت مغربی تعلیم کا ھندوستان میں رواج ھوا ھے اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مذھبی جماعتوں اور علما نے تعلیم کو محض مذھبی علوم تک محدود کردیا تھا اور جسمانی تربیت کی طرف سے نہ صرف بے پروا بلکہ اس کے مخالف تھے اور عام طور پر مردانہ ورزشوں اور کھیلوں کا رواج اٹھہ چکا تھا اور اس قسم کا " لہو و لعب " رائج ھوگیا تھا جو صریحاً زوال پسندي کی علامت ھے - اس کا نتیجہ وھی ھوا جو ھونا چاھئے تھا یعنی لوگوں کی بالخصوص شہر میں رھنے والوں کی صحت اور جسمانی حالت خراب ھونی شروع ھوئی اور اس کا کوئی بر وقت تدارک نہیں ھوسکا -

مغربی ممالک میں بھی بعض حالات کی وجہ سے گذشتہ صدی میں یہی صورت پیش آئی تھی اور عام لڑکوں کی جسمانی صحت بہت خراب ہونی شروع ہوگئی تھی - اگر اس خرابی کو دور کرنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو وہاں کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر ہوتی - ہمارے لئے اُن حالات کا مطالعہ مفید ہے کیونکہ اس سے ہمارے اپنے مسائل پر روشنی پڑتی ہے - انگلستان میں مثل دوسرے ممالک کے صنعت و حرفت کے لئے نظام نے عوام کی زندگی پر بہت انقلاب آفریں اثر ڈالا تھا جیسا ہم باب چہارم حصہ اول میں بتا چکے ہیں اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے وہ حالات بالکل بدل گئے ہیں جن میں مزدور پہلے کام کرتے تھے - زراعت اور کاشتکاری کو چھوڑ کر بیشتر لوگوں نے کارخانوں اور صنعت و حرفت کے بڑے بڑے مرکزوں میں کام کرنا شروع کردیا - صفائی اور آب و ہوا کے لحاظ سے ان کا یہ ماحول نہایت ہی مضر بلکہ مہلک تھا اور اس میں اُن کی تندرستی کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی - بجائے کھلی ہوا اور فطرت کے صحت افزا ماحول میں کام کرنے کے وہ تمام دن اور بعض اوقات تمام رات تنگ و تاریک مکان اور کوٹھریوں میں بند رہتے تھے پھر کام کی نوعیت بھی ایسی تھی جو ان کی جسمانی صحت، ان کے اعصاب اور نظر بلکہ ان کی دماغی صحت کے لئے بھی مضر ثابت ہوتی تھی - اس پر طرہ یہ کہ عورتیں اور نو عمر بچے بھی اسی مصیبت میں گرفتار تھے اور اس طرح نئی نسلوں کی صحت خراب ہوتی جاتی تھی - اس انقلاب کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ لوگ بجائے دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہنے کے بڑے بڑے صنعتی علاقوں میں آکر بس گئے اور وہاں آبادی کا اس قدر ہجوم ہوا کہ لوگوں کو رہنے کے لئے مناسب مکانات نہیں ملتے تھے - اس کا اثر عام

صحت اور اخلاقی حالت پر بہت برا پڑا - بقول کرشن سٹائنر (Kerschensteiner) کے :---

'' اس زمانے کے شہروں میں ہزاروں ، لاکھوں آدمی نہ صرف فطرت کی پر اسرار زندگی سے ناواقف اور بے تعلق رہتے ہیں بلکہ ان کی جسمانی صحت اور طاقت اور اخلاقی قوت ضبط بھی زائل ہوجاتی ہے '' [۱]

ابتدا میں لوگ صنعت و حرفت کے نئے کمالات اور مادری ترقی سے اس قدر موعوب اور مسحور تھے کہ انہوں نے اس کے تباہ کن نتائج کی مطلق پرواہ نہ کی لیکن رفتہ رفتہ اس کے مجموعی اثرات اس قدر بڑھے کہ لوگوں کو ادھر توجہ کرنی پڑی - خصوصاً جس زمانے میں فوجی حکام بوئروں کی جنگ کے لئے والنٹیر بھرتی کر رہے تھے انہیں یہ اندازہ ہوا کہ قوم کی صحت اور جسمانی طاقت بالکل تباہ ہوگئی ہے [۲] اس صدی کے آغاز میں ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جس کا کام یہ تھا کہ وہ تربیت جسمانی کے مسئلہ پر غور کرکے اپنی تجاویز پیش کرے - اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس امر پر زور دیا کہ قومی صحت اور قوت کے قیام کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ مدرسوں میں بچوں کی تربیت جسمانی کا مناسب انتظام کیا جائے اور یہ رائے دی کہ بچوں کے طبی معائنے اور علاج کا اہتمام نہایت ضروری ہے - طبی معائنے کا انتظام کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ انگلستان کے مدرسوں میں اب بہت سی وہ بیماریاں نہیں پائی جاتیں جو پہلے بچوں میں بہت عام تھیں اور ان کی جسمانی اور دماغی تربیت میں حائل ہوتی تھیں ، مثلاً آنکھ کان ناک اور گلے کی بیماریاں -

---

[۱] Schools and the Nation -

[۲] Mackenzie ; Problems of National Education -

اول تو عام حالات کی درستی کي وجہ سے یہ بیماریاں پیدا ھی کم ھوتی ھیں اور جب ھوتی بھی ھیں تو ان کی طرف فوراً توجہ کي جاتی ھے - لیکن تعلیمی حکام نے محض اس طبی اهتمام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حفظ ماتقدم کو علاج سے بہتر سمجھہ کر اور بہت سے ایسے وسائل اختیار کئے جن کے ذریعے بچوں کی صحت بہتر ھوسکے اور ان کی جسمانی نشو و نما میں کوئی رکاوٹیں حائل نہ ھونے پائیں - چنانچہ رفتہ رفتہ نظام مدارس میں حفظان صحت کا اهتمام شامل کیا گیا - ملک میں جا بجا بچوں کے شفاخانے قائم کئے گئے ' نادار طلبہ کی خوراک کا انتظام کیا گیا ' کھیلوں اور ورزشوں کے لئے میدان مہیا کئے گئے ' چھوٹے بچوں کے لئے تربیت گاھیں اور مریضوں کے لئے کھلی ھوا کے مدرسے قائم کئے گئے جن میں دستکاری ورزش اور صحت افزا مشاغل کو کتابی تعلیم کی نسبت بہت زیادہ اهمیت دی جاتی ھے - ۱۹۱۸ع کے تعلیمی ایکٹ میں ' جو فشر ایکٹ (Fisher Act) کے نام سے موسوم ھے اور جس کو انگلستان کی تعلیمي تاریخ میں ایک معرکةالآرا حیثیت حاصل ھے ' ان سب چیزوں کي ضرورت کو صراحت کے ساتھہ تسلیم کیا گیا ھے اور اگرچہ مالی مشکلات کی وجہ سے تمام تجاویز پر فراخ دلی کے ساتھہ عمل نہیں ھو سکا لیکن حکومت اور پبلک کی متفقہ کوششوں کا یہ نتیجہ ھے کہ انگلستان کی نئی نسلوں کی صحت گزشتہ صدی کي نسبت کہیں بہتر ھوگئی ھے - اس کا ایک نہایت قطعي اور بین ثبوت اس بات سے ملتا ھے کہ جب ۱۹۲۵ع میں لندن کاونٹی کاؤنسل کی تحریک پر وھاں کے تمام ابتدائی مدارس کے طلبہ کا طبي معائنہ کیا گیا اور اِن کي جسماني صحت یعني وزن ' قد ' حواس خمسہ اور عام صحت کے متعلق اعداد وشمار فراھم کئے گئے تو معلوم ھوا کہ اوسطاً ھر لحاظ سے ۱۹۲۵ع میں

طلبه کی صحت ۱۹۱۴ ع کے مقابلے میں بہتر ہے حالانکہ اس دس سال کے عرصہ میں ملک جنگ یورپ کے خوفناک دور سے بھی گذر چکا تھا جس میں بعض اوقات غریبوں کے بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا اور کھلی ہوا میں کھیلنا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا - اس جسمانی ترقی کا سہرا صرف مدرسوں ھی کے سر نہیں ' کیونکہ اس میں حکومت کے قوانین حفظ صحت کو اور کارخانوں وغیرہ کے ماحول کی درستی کو بھی بہت دخل ہے ' لیکن اس میں شک نہیں کہ مدرسوں میں علمی اور فعالی تعلیم کے اثر سے ' کھیلوں پر زور دینے اور بچوں کو کھلی ہوا میں رکھنے کی وجہ سے اور جسمانی امراض اور کمزوریوں کی مناسب نگہداشت اور روک تھام کی بدولت انگریزوں نے باوجود صنعت و حرفت کے ناساز ماحول کے اپنی قوم کی جسمانی حالت کو نہ صرف سنبھال لیا ہے بلکہ اس میں برابر ترقی ہو رہی ہے اور یہی حال کم و بیش دوسری مغربی قوموں اور جاپان کا ہے جنہوں نے جسمانی تربیت کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کے لئے مناسب تدبیریں اور ذرائع اختیار کئے ہیں جرمنی میں جنگ یورپ کے بعد ہمارے دیکھتے دیکھتے اس خاص شعبے میں بڑا انقلاب ہوگیا ہے اور جرمنوں نے فوجی تعلیم کے بجائے جس کی انہیں ممانعت ہوگئی تھی ' اپنے مدرسوں میں کھیل ' ورزش سیر و سفر اور کھلی ہوا میں - رہائش کو اس قدر رواج دیا کہ باوجود تمام مشکلات کے بچوں کی صحت خراب نہیں ہونے پائی بلکہ باقاعدہ علاج اور صحت افزا مقامات میں رہنے کی بدولت ان بچوں کو جو جنگ کے زمانے میں مفلسی اور ناداری کی وجہ سے اپنی صحت اور تندرستی بالکل کھوچکے تھے ' گویا نئی زندگی حاصل ہوگئی -

لیکن اسی زمانے میں جب دوسرے ملکوں میں برابر ترقی ہوتی رہی ہے ہمارے ملک میں لوگوں کی صحت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے - اس کی طرف نہ تو پبلک نے کماحقہ توجہ کی ہے نہ حکومت نے - اور اسی وجہ سے اس شدید خطرے کے تدارک کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا - ہمارے سامنے کسی تعلیمی کمیشن کی تحقیقات کے نتائج اور اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن سے یہ بات ثابت کی جاسکے کہ قوم کی جسمانی حالت کیا ہے - لیکن تجربے اور مشاہدے کی شہادت اور باخبر اشخاص کی رائے اس بارہ میں اس قدر واضح ہے کہ ہمیں اعداد و شمار کی ضرورت نہیں - اگرچہ ہمارے ملک میں ابھی تک صنعت و حرفت کے مضر نتائج اس حد تک ظاہر نہیں ہوئے جس حد تک مغرب میں ہوئے ہیں اور اب بھی ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ گاؤں اور دیہات میں رہتا ہے اور کاشتکاری وغیرہ میں مصروف ہے - لیکن قومی صحت کا زوال برابر جاری ہے - دیہاتوں کی صحت کی خرابی کی وجہ زیادہ تر ان کی جہالت اور ان کے طریقہ بود و باش کی گندگی ہے جس کی بدولت ان میں آئے دن بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں اور بچوں کی صحت بالعموم خراب رہتی ہے - لیکن شہریوں اور بالعموم تعلیم یافتہ طبقے کی خرابی صحت کی ذمہ داری مدرسوں پر بھی عائد ہوتی ہے - بالعموم جو طلبہ ہائی اسکول یا کالج سے فارغ‌التحصیل ہو کر نکلتے ہیں ان کی صحت بالکل خراب ہو جاتی ہے - زرد رنگ، دھنسی ہوئی آنکھیں، وقت سے پہلے ضعیفی کے آثار، بدن میں خون کی کمی، پست ہمتی، افسردہ دلی، محنت اور ہاتھ کا کام کرنے سے جی چرانا زندگی کے معرکوں میں شریک ہونے سے تامل، یہ تمام باتیں آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں - بنگال کے طلبہ کے متعلق سیڈلر کمیشن کو یہی شکایت تھی - جسمانی نشو و نما کے معطل ہوجانے

سے قومی سیرت اور ذہانت پر جو تباہ کن اثر پڑا ہے اس کا پورا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ قوت برداشت ' اور قوت حیات جس کو برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) انسانی سیرت کا جزو لازم قرار دیتا ہے ہندوستانیوں میں بہت کم ہوگئی ہے اور ان میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہی کہ وہ بڑے بڑے کاموں کو ہمت اور حوصلے کے ساتھہ کریں اور ان کے راستے میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی اور مستعدی کے ساتھہ برداشت کریں - موجودہ زندگی جد و جہد اور جفا کشی کی طالب ہے اور اس میں کامیابی کے لئے حوصلہ اور استقلال شرط ہے - ان تمام صفات کی تربیت کا ایک اہم جزو جسمانی نشو و نما اور صحت ہے - اگر لوگوں کی صحت عام طور پر خراب ہوگی یا ان میں جسمانی طاقت نہ ہوگی تو وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور اُن کے سامنے ہمت ہار دیں گے - ممکن ہے کوئی شخص اپنی قوت ارادی کو اس قدر مضبوط ' اپنے عزم کو اس قدر راسخ بنالے کہ باوجود جسم کی کمزوری کے وہ اپنے مقاصد کی تحصیل میں لگا رہے - لیکن ایسا صرف خاص خاص اور مستثنیٰ صورتوں میں ہوسکتا ہے ' عام لوگوں کے لئے جسمانی تربیت ناگزیر ہے -

ہم نے تعلیم کا جو مفہوم اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کی رو سے معلم کو صرف بچوں کی دماغی نشو و نما ہی سے سروکار نہیں بلکہ اسے ان کی پوری شخصیت کی تربیت کرنی ہے جس میں جسم اور دماغ اور روح سب شامل ہیں کیونکہ ان سب کا ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعلق ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ انسان کی ہستی کے ' جس میں وحدت کی کارفرمائی ہے ' مختلف رخ یا پہلو ہیں - لہذا تربیت کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسان کے جسم کی تربیت الگ کی جائے اور

اس کے دماغ کی الگ اور اس کی روحانی تسکین کے ذرائع علیحدہ فراہم کئے جائیں - یہ تو گویا تین جدا گانہ مسئلے ہوجائیں گے - تربیت کا مسئلہ ایک ہے اور اس کو علحدہ علحدہ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا - وہ مسئلہ یہ ہے کہ مدرسے میں اور معاشری دنیا میں ایسے انتظامات کئے جائیں کہ ایک ہی وقت میں بچے کے جسم اور دماغ اور روح کی تربیت ہو یا یوں کہنا چاہئے ان میں سے ہر ایک کی تربیت دوسروں کی تربیت میں معین ہو، رکاوٹ پیدا نہ کرے - اس وجہ سے معلم کے لئے جسم اور دماغ کے صحیح تعلق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ انسانی تربیت کے متعلق کوئی صحیح تصور یا نظریہ قائم نہیں کرسکتا اور نہ درسی مشاغل کی صحیح تنظیم کرسکتا ہے - مدرسین اور ماہرین تعلیم دونوں نے عرصے تک اس تعلق کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ جسم ایک حد تک دماغی تربیت کے راستے میں حائل ہے - اس کا اثر مدرسے کی تعلیم پر بہت برا پڑا - اس کی وجہ سے نہ صرف جسمانی تربیت کے طرف سے غفلت برتی گئی، بلکہ درسی اور دماغی تعلیم بھی بہت ناقص اور ناکامیاب رہی، کیونکہ انہوں نے علم حاصل کرنے کو محض ایک دماغی یا ذہنی فعل سمجھ لیا جس کا جسمانی افعال سے کوئی تعلق نہیں - وہ "علم" کو ایک خاص منطقی تربیت کے ساتھ، کتابوں اور سبقوں کی شکل میں، طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے جو ان کے خیال میں کسی نا معلوم دماغی عمل کے ذریعہ اس کو "حاصل" کرلیتے تھے - واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ اس "تحصیل" میں کسی طرح کامیاب بھی ہوجاتے تھے تو محض اس حد تک کہ وہ تمام معلومات کو ایک انفعالی طریقے پر اپنے حافظے میں جمع کرلیتے تھے - اس تحصیل

کے دوران میں کوئی حقیقی "تجربات" حاصل نہیں ہوتے تھے جو ان کے افعال و کردار پر مستقل اثر ڈالیں - وہ جسمانی اعمال کی اہمیت کو نہیں پہچانتے تھے اور ان کو یہی خیال تھا کہ دماغ ایک مستقل اور قائم بالذات چیز ہے جو عقل اور علم کا گھر ہے اور اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں - اور جسم ایک مادی چیز ہے جو اکثر علم اور معرفت حاصل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے - اس خیال کا عملی اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ اُستاد ہمیشہ طلبہ کو تنبیہ کرتے رہتے کہ وہ مدرسے میں کوئی شور و غل نہ کریں ، بلکہ آواز بھی نہ نکالیں - بالکل خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے رہیں - یہاں تک کہ اُستاد کی صورت پر آنکھیں جمائے بت کی طرح خاموش بیٹھا رہنا توجہ اور انہماک کی علامت سمجھا جاتا تھا - لیکن یہ اصول تعلیم بچوں کے جبلی رجحانات کے بالکل خلاف ہے - کیونکہ جب بچہ مدرسے میں آتا ہے تو اپنا جسم اپنے ساتھ لاتا ہے اور اسے کام کرنے ، نقل و حرکت کرنے ، چیزوں کے توڑنے اور بنانے کی خواہش ہوتی ہے - لیکن مدرسوں کا معمول یہ چاہتا ہے کہ وہ بے حس و حرکت اپنی جگہہ پر بیٹھا لکھتا پڑھتا رہے - اس لئے بچے کے نفس میں ہر وقت ایک کشمکش رہتی ہے - اس کی فطرت میں ولولۂ عمل اور اظہار خودی کی خواہش ہوتی ہے اور اُستاد یہ چاہتے ہیں کہ وہ اسے دبا کر رکھیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے مقررہ کام پر پوری توجہ نہیں کرتا - اس کا دماغ پریشان اور منتشر رہتا ہے اور اس میں انہماک کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی ۔

یہ صورت حال سب بچوں کے لئے مضر ہے ، کیونکہ جو ان میں سے فطرتاً زیادہ تیز اور چلبلے ہوتے ہیں وہ اکثر اس خلاف فطرت ضبط سے گھبرا کر موقع پاتے ہی اپنی خواہش عمل کا اظہار ایسی شرارتوں میں کرتے

هیں جن کي وجہ فرض شناس اُستادونکي سمجھہ میں نہیں آتي - رهے وہ بچے جن کي طبیعت مقابلتاً سکون پسند اور خاموش هوتي هے وہ اس جمود اور انفعالیت کے اس قدر عادی هو جاتے هیں کہ ان کا ولولۂ عمل هی پژمردہ هوجاتا هے اور وہ کوئي هاتهہ کا کام یا جسمانی فعل اعتماد اور خوش اسلوبي کے ساتهہ نہیں کرسکتے - حقیقت یہ هے کہ تعلیم کا سر چشمہ نہ کتاب هے ' نہ درسي اسباق ' نہ مرتب علوم بلکہ وہ ذاتي اور فعالی تجربات هیں جو هم اپنی زندگی کے دوران میں حاصل کرتے هیں اور جن میں جسم اور دماغ دونوں کی بهک وقت ضرورت هوتي هے - تجربے سے هماری مراد هے کوئی ایسا کام جس کا هم پر ایک خاص اثر هو اور هم اس اثر کو قبول کریں اور اس کي وجہ سے همارے رویے اور اعمال میں کوئی ترمیم یا تبدیلي هوجائے - اس کي وضاحت ایک معمولي سی مثال سے هوسکتي هے - اگر کسی بچہ کي اُنگلی میں ایک کانٹا چبھ جاتا هے تو اسے تکلیف محسوس هوتي هے - یہ تکلیف یا تکلیف دہ " تجربہ " اس کے علم اور عمل دونوں کو مستقل طور پر متاثر کرتا هے - آئندہ جب کبھي وہ اس قسم کے کانٹے کو دیکھے گا تو اس کی جانب اس کا رویہ پہلے کي طرح بے پروائی کا نہ هوگا بلکہ اس کی نظر میں کانٹے میں ایک نئی اهمیت اور نئے معنی پیدا هو جائیں گے - اس طرح اسے جس قدر مختلف تجربات کانٹوں کے متعلق هونگے اسي قدر وہ ان کے خواص اور اثرات کو بہتر سمجھے گا اور اس کا یہ حقیقي علم اس کے رویہ پر اثر ڈالے گا - جب هم کہتے هیں کہ تجربہ بہترین معلم هے تو اس سے یہ مراد هوتی هے کہ اس کے ذریعے همیں اپنے افعال اور ان کے نتائج کا تعلق سمجھہ میں آجاتا هے - جب هم کسي طرح اپنے ماحول پر کوئی عمل کرتے هیں تو ماحول کي طرف سے هم پر

اس کا رد عمل ہوتا ہے جس کا نتیجہ ہمارے دماغ میں محفوظ رہتا ہے اور اس طرح ہم نئی بانیں اور نئے کام سیکھتے ہیں - پس معلوم ہوا کہ تجربہ محض ذہنی یا دماغی چیز نہیں بلکہ جسم اور دماغ دونوں کو اس میں برابر کا دخل ہے - یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے کہ تجربہ مثل ایک نقش کے ہے جو خارجی ماحول ہمارے دماغ پر براہ راست ، بغیر جسمانی افعال کے واسطے کے ، ثبت کردیتا ہے - تجربے کے لئے ہمیشہ یہ شرط ہے کہ ہم کسی مقصد کو پیش نظر رکھہ کر اپنے ماحول کی اشیا کے ذریعے کوئی کام کریں - اس عمل میں دماغ ہمارے جسمانی افعال کي رهنمائی کرتا ہے اس کو انجام دینے میں ہمیں ماحول کی مزاحمت اور اشیا کے قدرتی خواص سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کا رد عمل ہمارے جسم اور دماغ دونوں پر ہوتا ہے - اس رد عمل کا نام تجربہ ہے - اس کی مثال ایک بڑھئي کے کام سے مل سکتی ہے مثلاً وہ ایک کرسی تیار کرنے کے لئے لکڑی کاتتا ہے ، اس کو صاف کرتا ہے اپنے اوزاروں کے ذریعے مناسب شکل کے تکڑے کاتتا ہے ، ان کو جوڑتا ہے اور اپني تیار کی ہوئی کرسی کا مقابلہ کرسی کے ذہنی تصور یا نمونے کی کرسی کے سانهہ کر کے اس میں ترمیم یا تبدیلی کرتا ہے - اس تمام سلسلۂ افعال میں اسے مفید تجربات حاصل ہوتے ہیں جن کی تحصیل میں جسم اور دماغ دونوں شریک ہیں - اس طرح اس کو لکڑی کے خواص کا جو علم ہوتا ہے وہ بے جان اور بیکار نہیں ہوتا جس کو وہ استعمال نہ کرسکے بلکہ اس کے ذریعے وہ اوزاروں سے کام لینے میں زیادہ ماہر ہوجاتا ہے ، آئندہ کرسیاں بنانے میں اُسے زیادہ سہولت ہوتی ہے اور اس کی سمجھہ میں اضافہ ہوتا ہے - کس قدر کمزور اور بے فیض ہے اس کے مقابلے میں وہ علم جو ایک بچہ مدرسے میں " اسباق اشیا " (Object lessons) کے ذریعے حاصل کرتا ہے !

لہذا ہم جسمانی تربیت کے متعلق کوئی ایسا نظریہ قائم نہیں کرسکتے جس کا تعلق محض جسم کی تربیت سے ہو بلکہ ہمیں قدیم یونانی عقیدے کی طرف رجوع کرنا پڑیگا جس کے مطابق جسم کی موزوں تربیت عقلی اور روحانی تربیت کے لئے لازم ہے - اس خیال کو حال کی تحقیقات سے بہت تقویت پہنچتی ہے اور نفسیات اور علم‌الاجسام دونوں کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نفسی اور جسمانی اعمال کا ایک دوسرے سے بہت قریبی اور گہرا تعلق ہے - اِس بحث کی تفصیل کی گنجایش نہیں - یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہے کہ نفسی اعمال کا انحصار بڑی حد تک جسم کے اُس حصے سے ہے جس کو دماغ کہتے ہیں اور یہ دماغ نظام اعصاب کے ذریعے باقی تمام جسم کی حرکات اور اعمال پر کچھہ اس طرح حاوی ہے جس طرح بجلی گھر کا بٹن تختہ شہر کی تمام روشنی پر حاوی ہوتا ہے - اگر نظام اعصاب کی مناسب اور موزوں تربیت نہ کی جائے گی تو دماغ جسمانی حرکات کی نگرانی بہ خوبی نہیں کرسکتا - دماغ کا کام یہ ہے کہ وہ جسمانی افعال اور ان محرکات کے درمیان رابطہ قائم کرے جو حواس کے ذریعے ماحول سے حاصل ہوتے ہیں - مثلاً ہم سڑک پر جارہے ہیں کہ سامنے سے ہمیں ایک موٹر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے - ہماری قوت باصرہ موٹر کی شکل کو جو ماحول کا ایک جزو ہے محرک عمل بنا کر نظام اعصاب کے ذریعے دماغ تک پہنچاتی ہے - وہاں سے دماغ ہمارے اعضا کو (اس خاص موقع پر پیروں کو) یہ حکم بھیجتا ہے کہ وہ ہمیں موٹر کے راستے سے ہٹا کر ایک طرف کردیں - اگر جسم اور ذہن کے درمیان دماغ کا واسطہ نہ ہوتا تو ہمارے افعال و اعمال اور ماحول کے درمیان وہ تعلق ہرگز قائم نہ ہوسکتا جس کی وجہ سے ایک طرف ہم ماحول پر قابو حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے افعال کو منظم کرتے ہیں - اس کی توضیح کسی دستکاری کے

ذریعے ہو سکتی ہے - فرض کیجئے ایک طالب علم کسی لکڑی کے ٹکڑے کا ایک قلم دان بنانا چاہتا ہے - وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے پہلے لکڑی کاٹتا ہے - اس کو چھیل کر ہموار کرتا ہے ' پھر مختلف شکلوں اور لمبائی کے ٹکڑے کاٹ کر ان کو جوڑتا ہے - اس شکل کے دوران میں دماغ برابر افعال و حرکات کے درمیان واسطے کا کام دیتا ہے - ہر ہر قدم پر حواس کے مشاہدات اور تاثرات کی مدد سے وہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ اب لکڑی کس حالت میں ہے اور اس کے ساتھ کیا کرنا چاہئے - اس علم کی بنا پر وہ آگے بڑھتا ہے اور مختلف اوزاروں کو استعمال کر کے لکڑی کی شکل بدلتا ہے - ساتھ ہی وہ اپنے افعال سے لکڑی میں جو تبدیلیاں کرتا ہے ان کی وجہ سے حواس کے مشاہدات بھی بدلتے جاتے ہیں - پہلے لکڑی کھردری تھی ' اب ہموار ہوگئی - پہلے ٹکڑا لمبا تھا اب گول ہوگیا ہے وغیرہ - ان نئے مشاہدات کے مطابق وہ آگے بڑھتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے افعال میں تسلسل قائم رکھنا اور ان میں حالات کے مطابق تبدیلی کرنا دماغ کا کام ہے جس کو وہ اسی صورت میں انجام دے سکتا ہے جب ایک طرف نظام اعصاب کی صحیح تربیت کی جائے - کیوں کہ اسی کے ذریعے ماحول کی خبریں حواس کی وساطت سے دماغ تک اور دماغ کے احکام اعضائے جسمانی تک پہنچتے ہیں ' اور دوسری طرف دماغ کو ایسے مواقع ملتے رہیں کہ وہ جسمانی افعال کی نگرانی اور نگہداشت کر سکے - جو لوگ بچپن اور نوجوانی میں کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے ' کسی قسم کی دستکاری یا عملی مشاغل میں شریک نہیں ہوتے وہ بڑے ہوکر نہ صرف جسمانی حیثیت سے "بے دست و پا" ہو کر رہ جاتے ہیں بلکہ اکثر عملی معاملات اور کارو بار میں ' جو دنیاوی زندگی کا جز و اعظم ہیں ' ان کا دماغ بھی اچھی طرح کام نہیں دیتا خواہ وہ کتنے ہی عالم اور پڑھے

لکھے کیوں نہ ہوں - اس وجہ سے زمانہ حال کے تعلیمی مفکرین '' علم '' اور '' عمل '' جسم اور دماغ جاننے اور کرنے کے باہمی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں اور مدرسوں کی تعلیم میں ایسے مشاغل کو نمایاں اہمیت دیتے ہیں جن میں جسم اور دماغ کی نشو و نما ساتھہ ساتھہ اور ہم آہنگ طریقے سے ہو سکے -

تربیت جسمانی کے وسیع تر مفہوم میں انسانی حواس کی تربیت بھی شامل ہے اور جیسا ہم اوپر بتا چکے ہیں حواس کی صحیح تربیت کے بغیر دماغی تربیت ناقص رہ جاتی ہے - ہمارے مروجہ مدارس میں بھی ' باوجود اس بات کے کہ تعلیم بالکل انفعالی طریقہ پر دیجاتی ہے ' طلبہ کو اپنے حواس سے کام لینا پڑتا ہے مثلاً معمولی درسی کاموں میں آنکھہ اور کان دونوں ہر وقت کام آتے ہیں اور لکھنے میں ڈرائنگ اور نقشہ کشی میں ' دست کاری میں ہاتھہ کو استعمال کرنا پڑتا ہے - لیکن مدرسے کا کام جن اصولوں پر منتظم ہے ان کی وجہ سے ان حواس کی تربیت بھی مناسب طریقے پر نہیں ہوتی کیونکہ طلبہ ان کو اپنے پسند کئے ہوئے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے دماغ کی نگرانی اور ہدایت میں استعمال نہیں کرتے - استاد اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مختلف حواس گویا علم کو دماغ تک پہنچانے کی نالیاں ہیں - علم کتاب میں موجود ہے اور آنکھہ کے ذریعے طالب علم کے دماغ میں پہنچ جاتا ہے - یا وہ الفاظ میں پوشیدہ ہے اور کان کے ذریعے ان کے ذہن میں سرایت کرجاتا ہے - ہم نے علم کا جو مفہوم اس کتاب میں پیش کیا ہے وہ اس خیال کے بالکل خلاف ہے - علم اس طریقہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا جس طرح کوئی پیاسا آدمی نل کی ٹوٹی کھول کر اس میں جمع کیا ہوا پانی پی لیتا ہے - بلکہ اس کو اپنے جسم اور دماغ کی

محنت اور کاوش کے ذریعے زمین سے کھود کر نکالنا پڑتا ھے - کبیر نے اپنے ایک دوھے میں بڑی پتے کی بات کہی ھے جو سارے اصول تعلیم کا نچوڑ ھے :—

پد جو ڑے ' ساکھی کھے
سادھن پری گئی آوس
کاڑھا جل پیوے نہیں '
کاڑھہ پین کی ھوس

(پد جوڑتا ھے ' ساکھی کہتا ھے ' اس کی عادت پڑ گئی ھے ' بھرا ھوا پانی نہیں پیتا ' بھر کر پینے کی ھوس ھے)

حواس علم کو ماحول سے دماغ تک اور دماغ سے ماحول تک لے جانے کا بنا بنایا ذریعہ نہیں ھے تحصیل علم اور تربیت حواس دونوں کا صرف ایک ھی طریقہ ھے اور وہ یہ ھے کہ طالب علم کسی با معنی اور دلچسپ شغل میں حصہ لے - بچہ اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال میں جو مفید اور پائدار علم حاصل کرتا ھے وہ محض دوسروں کی باتیں سنکر یا ان کے کام دیکھہ کر نہیں سیکھتا بلکہ وہ اپنے گردوپیش کے دلچسپ اور گونا گوں مشاغل میں حصہ لیتا ھے ' ھاتھہ پاؤں ھلاتا ھے ' ضرورت کے مطابق اپنے حواس کے ذریعے مشاهدات اور معلومات جمع کرتا ھے ' اپنی دماغی استعداد کے بموجب فکر اور عقل سے کام لیتا ھے ' اپنی غلطیوں اور تجربوں سے سبق سیکھہ کر اپنے طریقہ عمل کی اصلاح کرتا ھے - اس طرح وہ جن مقاصد یا ضروریات کو پورا کرنا چاھتا ھے ان کے لئے اس کے ھاتھہ پاؤں اور تمام حواس و اعضا اور دماغ مل جل کر کام کرتے ھیں اور وہ نہ صرف ان مخصوص مقاصد کو حاصل کرتا ھے بلکہ اس کی عام دماغی اور جسمانی تربیت بھی ھوتی رھتی ھے - اگر مدرسے میں

بھی یہی تعلیمی اصول اختیار کیا جائے جس پر بچے اپنی جبلت کے تقاضے سے عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس کی تعلیم اس طرح مصنوعی اور بے جان نہ رہے جیسی آج کل ہے - لیکن بد قسمتی سے معلموں نے طلبہ کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جس میں باہم کوئی ربط نہیں - ان کے نزدیک کچھہ کام تو ایسے ہیں جن میں محض حواس و اعضا بالخصوص ہاتھہ اور کان اور آنکھوں کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً لکھنا یا ڈرائنگ یا لکڑی کا کام - ان کے لئے کچھہ ایسی مشقیں مقرر کردی گئی ہیں جن کو طلبہ بغیر کسی دلچسپی کے اور بغیر ان کا مقصد سمجھے دہراتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُن خاص حرکات کو بطور ایک معمول کے سیکھہ لیتے ہیں جن کی مثلاً لکھنے وغیرہ کے لئے ضرورت ہوتی ہے - باقی کاموں میں " دماغ " کی ضرورت پڑتی ہے جن کو ان معلموں کے خیال میں جسمانی اعضا اور ان کی حرکات و افعال سے کوئی تعلق نہیں - ادب ، جغرافیہ ، تاریخ اور سائنس وغیرہ کا مطالعہ اس حصے میں شامل کیا جاتا ہے اور مطالعے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ طلبہ کتابوں کو پڑھیں ، اُستاد کا لکچر سنیں اور اس طرح یہ " علوم " براہ راست ان کے دماغ میں منتقل ہوجائیں - اس تعلیمی پروگرام کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ زندگی کی عملی کشمکش میں بے بس رہتے ہیں اور اپنے جسم و دماغ کی قوتوں کو اپنے عملی مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال نہیں کرسکتے - اس حالت کی اصلاح کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ مدرسے میں ایسے تعلیمی وسائل مہیا کئے جائیں جو طلبہ کی جسمانی اور دماغی قوتوں کو بیک وقت دعوت عمل دیں اور ان کو ایسے مشاغل میں لگائیں جو ان کی خصوصیات جبلی مثلاً تجسس خواہش تعمیر و تخلیق اور اشتراک عمل کو اظہار کا موقع دیں کیونکہ ان کی تسکین کے لئے بچوں کو عملی کام کرنے

پڑتے ہیں جن میں ہاتھ اور دماغ کے درمیان ایک مستقل رشتہ قائم ہوجاتا ہے - اس کی تفصیل ہم تعلیمی مشاغل کی بحث میں کرچکے ہیں - یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جسم اور دماغ کی تربیت ایک دوسرے سے بے تعلق رہ کر نہیں ہوسکتی - جسم کو دماغ کا آلہ‌کار سمجھنا چاہئے جس کی وساطت سے وہ مادی دنیا کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کرتا ہے اور اس کو اپنے قابو میں لاتا ہے - حواس خمسہ اور اعضائے جسمانی کا یہ کام ہے کہ وہ انسانی تجربے کے ارتقاء کی رہنمائی اور اس کے اعمال اور مقاصد میں مطابقت پیدا کریں - مدارس جدید میں سائنس ' عملی کام اور دستکاری کو اسی وجہ سے بہت نمایاں اہمیت دی گئی ہے کہ ان میں جسم و دماغ کے اتحاد عمل کا امکان بہت زیادہ ہے اور باقی تمام مضامین کی تعلیم میں بھی مختلف قسم کے کاموں کو جو بچے کے اظہار خودی میں مدد دیتے ہیں مثلاً نقشہ کشی ' ڈرائنگ ' تحریری مشقوں وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے -

ہندوستان میں تربیت جسمانی کا مکمل اہتمام کرنے کے لئے والدین اُستادوں ' حکومت اور تعلیمی حکام کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے اور جب تک وہ سب ایک مفید مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس عظیم‌الشان تعمیری تحریک میں حصہ نہ لیں گے کامیابی ممکن نہیں کیونکہ موجودہ صورت حال ان سب کی غفلت اور بے توجہی کا نتیجہ ہے - طلبہ کی بیشتر تعداد ایسے مفلس اور نادار گھروں سے آتی ہے جہاں نہ انہیں مناسب غذا ملتی ہے ' نہ ان کے آرام و تفریح کا انتظام ہے ' نہ اصول حفظان صحت کی پابندی ہوتی ہے - لیکن اس کی وجہ محض افلاس نہیں ' جہالت اور عدم احساس بھی ہے ورنہ غریبوں کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے مکانوں کو ایک حد تک صاف رکھیں . اور

مقابلتاً زیادہ مقوی اور زود هضم غذائیں استعمال کریں - اس صورت حال کے پیدا کرنے میں حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس نے وہ تدابیر اور وسائل اختیار نہیں کئے جو دوسرے ملکوں میں صحت عامہ کی تحفظ کے لئے استعمال کئے گئے ہیں یعنی لوگوں کی تفریح اور بچوں کے کھیلنے کے لئے پارک اور میدان بنانا ، شہروں اور گاؤں کی صفائی کے لئے اهتمام اور پرچار کرنا ؛ بیماریوں کے انسداد کے لئے تدابیر سوچنا - ان فرائض کی ذمہ داری مرکزی حکومت سے زیادہ مقامی حکام اور بلدیے پر عائد هوتی ہے - اسی لئے هم نے یہاں حکومت کے لفظ کو اس کی عمومی معنی میں استعمال کیا ہے جس میں یہ سب جماعتیں شامل هیں - همارا یہ مقصد نہیں کہ ان جماعتوں نے اس کام کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں کی - توجہ ضرور کی ہے اور کہیں کہیں ان باتوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے لیکن کسی بڑے پیمانے پر کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھائی گئی کہ اتنے بڑے ملک کے شایاں شان هوتی جس میں حکومت اور جمہور دونوں متفق هوکر اس زبر دست مسئلہ کو بحیثیت مجموعی حل کرنے کی کوشش کرتے - تعلیمی حکام اور معلموں نے مدرسے کے امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا - ایک تو انھوں نے نصاب تعلیم کو اس قدر مجرد اور نظری بنا دیا ہے کہ جیسا هم نے اوپر بتایا ہے بچوں کو وہاں اپنی جسمانی نشو و نما کا موقعہ نہیں ملتا - اس میں عملی اور تخلیقی مشاغل کی بہت کمی ہے اور دستکاری ، جس کے بہت سے تعلیمی فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ان کو صحت افزا کام میں لگاتی ہے ، اس میں بطور ایک اہم عنصر کے شامل نہیں ہے - دوسرے اکثر مدرسوں میں کھیلوں اور ورزشوں کا کوئی مناسب اهتمام نہیں ہے اور باوجود اس تاکید کے جو آج کل

کھیل کے متعلق کی جاتی ھے واقعہ یہ ھے کہ بہت سے مدرسوں میں طلبہ باقاعدگی کے ساتھہ کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے - صرف چند طلبہ جو اچھے کھلاڑی ہوتے ھیں وہ نمائشی اغراض کے لئے کھیلتے ھیں باقی سب کھڑے تالیاں بجاتے ھیں ' یا گپ شپ میں وقت ضائع کرتے ھیں - پھر محکمہ تعلیم کی طرف سے طبی معائنہ غریب بچوں کی خوراک ' سیر و سیاحت وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہیں ' غالباً ان کا خیال یہ ھے کہ یہ تمام باتیں ھندوستان جیسے مفلس ملک کے لئے اسراف میں داخل ھیں گو مغربی ممالک میں یہ نظام تعلیم کا جزو بن گئی ھیں - سچ پوچھئے تو اس قسم کی تعمیری اور اصلاحی کوششوں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت انہیں ممالک میں ہوتی ھے جو افلاس اور جہالت اور امراض کا شکار ھیں اور ان کے لئے یہ تعمیری کام ہرگز فضول خرچی میں شامل نہیں - لہذا جسمانی تربیت کا مسئلہ ایک وسیع مسئلہ ھے جس کے بہت سے پہلو ھیں - اس کے لئے طلبہ کی بلکہ یہ کہنا چاھئے کہ عام معاشری بود و باش کی اصلاح درکار ھے - لوگوں کے ماحول کو زیادہ صحت افزا بنانے کی ضرورت ھے یعنی گاؤں اور قصبوں میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام کرنے کی اور بڑے شہروں میں علاوہ صفائی کے اھل شہر کے لئے تازہ اور کھلی ھوا مہیا کرنے کی ضرورت ھے جہاں وہ اپنی تنگ و تاریک گلیوں اور گھروں سے نکل کر تفریح کرسکیں اور بچوں کو کھیلنے کودنے بھاگنے دوڑنے کے لئے جگہ ملے - مدرسوں کی تعلیم میں عملی اور فعالی عنصر کا اضافہ کرنے کی ضرورت ھے تاکہ وہ اپنے جسم اور دماغ دونوں سے کام کرنا سیکھیں اور دست کاریوں کے ذریعے ان کے ھاتھہ کی تربیت ھو - جو تعلیم حاصل کرنے کا ایک نہایت اھم ذریعہ ھے - طلبہ کے لئے کھیل اور ورزش کا بھی مناسب انتظام ھونا چاھئے تاکہ عمر کے اس نازک زمانے میں ان کی

جسمانی نشو و نما معطل نہ ہونے پائے - درسی زندگی کے دوران میں دو منزلیں ایسی آتی ہیں جب طلبہ کی نشو و نما خاص طور پر تیز ہوجاتی ہے - ایک وہ زمانہ جب وہ شیر خوارگی سے لڑکپن میں داخل ہوتا ہے اور اس کی عمر چھہ یا سات سال کی ہوتی ہے اور دوسرا جب وہ لڑکپن کے زمانے سے گزر کر بلوغ کی منزل میں قدم رکھتا ہے - ان دونوں زمانوں میں اس کی طبیعت کا توازن ڈانواں ڈول ہوجاتا ہے - کیونکہ اس کی زیادہ تر قوت جسم کی نشو و نما میں صرف ہوتی ہے اور وہ اپنے تعلیمی مشاغل کی طرف پوری توجہ نہیں کرسکتا - اس وقت فطرت شناس معلم کا فرض ہے کہ وہ اس نفسی ارتقاء کے عمل کو پہچانے اور درسی کاموں پر زیادہ زور نہ دے - اکثر اوقات ہندوستانی طلبہ کی صحت اس وجہ سے بہت خراب ہوجاتی ہے کہ اس خاص زمانے میں جب جسمانی ورزشوں ' کھیلوں اور کھلی ہوا کی ضرورت ہوتی ہے وہ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے لئے حد سے زیادہ دماغی محنت کرتے ہیں جس سے اُن کی جسمانی نشو و نما رک جاتی ہے اور ان کو بسا اوقات اعصابی امراض لاحق ہوجاتے ہیں - تعلیمی حکام کا یہ فرض ہے کہ وہ علاوہ مندرجہ بالا تدابیر اختیار کرنے کے جن کا تعلق صحت کے قائم رکھنے سے ہے طبی معائنہ اور علاج کا معقول انتظام کریں اور وقتاً فوقتاً یہ معلوم کرائیں کہ کس قدر طلبہ آنکھہ ' کان ' ناک اور حلق وغیرہ کے امراض میں مبتلا ہیں - والدین اور استادوں کو ان بیماریوں کے علاج میں متفقہ کوشش کرنی چاہئے کیونکہ یہ نہ صرف جسمانی صحت کی بیخ کنی کرتی ہیں بلکہ طلبہ کی تعلیمی ترقی میں بھی حارج ہوتی ہیں - اس بحث کو ہم ایک ایسے مدرسے کے ذکر پر ختم کرتے ہیں جہاں بغیر حکام یا پبلک، کی کسی خاص امداد کے ایک دھن کے پکے معلم نے اپنے قائم کئے ہوئے مدرسے کو ایک ایسے ماحول میں تبدیل

کردیا تھا جہاں تربیت جسمانی کے لئے بہترین ذرائع اور وسائل مہیا کئے گئے تھے - بیر جس (Bierges) کا یہ مدرسہ جس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کرچکے ھیں بلجیم کے ایک معلم واسکو نسلو (Vasconcellos) نے قائم کیا تھا - یہ شہروں کے شور و غل اور کشمکش سے دور ایک دیہاتی علاقے میں واقع تھا جہاں طلبہ کو فطرت کے گوناگوں مناظر سے لطف اندوز ہونے اور ان کے سکون بخش اثرات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا تھا - لیکن باوجود اس تنہائی کے وہ صنعتی زندگی اور شہروں کے کاروبار سے ناواقف نہ تھے کیونکہ ان کے استاد انہیں اکثر گرد و نواح کے کارخانوں اور صنعت حرفت کے مرکزوں میں لے جاتے تھے جہاں وہ براہ راست مزدوروں کی زندگی اور تقسیم عمل کا مطالعہ کرتے تھے - مدرسے کے نصاب میں ان مشاغل کو بہت اہمیت دی جاتی تھی جن میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ھے اور وہاں بھی دیگر مدارس جدید کی طرح عملی سائنس کے لئے معمل ، لوہاری اور نجاری کے لئے کارگاہیں ، جلد سازی ، ڈرائنگ اور مجسمہ سازی اور آرٹ کے لئے کمرے موجود تھے - پرندوں ، مچھلیوں اور بہت سے مفید پالتو جانوروں کی رہائش کا انتظام تھا - مدرسے کی عمارت کے چاروں طرف جنگل اور باغات تھے اور کاشت کے لئے زمین چھوٹی ہوئی تھی جس میں طلبہ باغ بانی کرتے ، ترکاریاں بوتے اور انہیں اپنے باورچی خانے میں استعمال کرتے تھے - پھر کیا عجب ھے کہ اس مسرت بخش اور صحت افزا ماحول میں رہ کر ، جہاں ان کو محض کتابوں کے مطالعے میں دیدہ ریزی کرنے کے بجائے ، عملی کاموں کے مواقع نصیب تھے ، ان کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑتا تھا اور ان کی صحت اور تندرستی کو دیکھکر لوگ رشک کرتے تھے - جسمانی ورزش اور کھیلوں کے علاوہ اس مدرسے کی ایک خصوصیت یہ

تھی کہ اس میں دست کاری کی تعلیم بہت احتیاط کے ساتھ منظم کی گئی تھی - بانی مدرسہ خود اس کے متعلق لکھتا ہے : —

"جسمانی ورزش کی تکمیل اس قسم کی دست‌کاریوں کے ذریعے ہوتی ہے جیسے ٹوکریاں بنانا ، برتن اور گتے کی چیزیں بنانا ، جلد سازی ، مجسمہ سازی ، لکڑی اور لوہے کا کام وغیرہ - یہ سب طالب علم کی جسمانی اور دماغی نشو و نما کے نہایت قابل قدر ذریعے ہیں ان سے نہ صرف طلبہ کے اُس ذوق عمل کی تسکین ہوتی ہے جو ان کی عمر کا خاصہ ہے ، بلکہ مشاہدے ، موازنے اور تخیل کی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں اور ایجاد و جدت کی خواہش اُبھرتی ہے......چھوٹے بچوں کو کاغذ اور گتے کی چیزیں بنانا ، ڈرائنگ اور ماڈلنگ سکھائی جاتی ہے - ان کے بیرونی کاموں میں باغ کے روشوں کی صفائی ، کیاریوں کی کاشت اور پالتو جانوروں مثلاً مرغیوں ، خرگوشوں کی نگہداشت شامل ہے - دس سال کی عمر کے بعد وہ بڑھئی کا کام بھی سیکھتے ہیں اور جو زیادہ مضبوط ہوتے ہیں وہ لوہار خانے میں کام کرتے ہیں......"

ہم نے اس باب میں جسمانی تربیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کا خلاصہ کیا ہے ؟ ہم یہ نہیں چاہتے کہ سب طلبہ پہلوان بن جائیں اور اپنے جسم کی پرداخت کو مقصود بالذات سمجھنے لگیں - ہمارے نزدیک جسمانی تربیت کی تکمیل کے معنی یہ ہیں جب انسان تندرست اور طاقتور ہو اور اپنی طاقتوں کو اپنے مقاصد زندگی کی تحصیل میں استعمال کرسکے ، اپنے اعضا اور حواس پر پورا قابو ہو ،

اور وہ ان کے ذریعے سے اپنے ماحول کے ساتھ رابطہ قائم رکھے اور اس سے حسب ضرورت کام لے سکے اور بالخصوص اسے اپنے ھاتھوں کی حرکت پر پوری قدرت ھو اور وہ ان کے بے شمار امکانات عمل میں سے بعض کو مشق کے ذریعے ظاھر کرسکے - جب ھم جسمانی تربیت کا یہ وسیع مفہوم اختیار کرتے ھیں تو اس سے محض جسم کی پرورش مراد نہیں ھوتی بلکہ ان تمام جسمانی قوتوں اور امکانات کی نشو و نما جن سے ھماری دماغی اور عقلی تربیت میں مدد ملتی ھے اور ھم ان تعمیری اور تخلیقی مشاغل میں شریک ھوتے ھیں جو انسان کی خلّاق طبیعت کا اظہار ھیں اور جن کے ذریعے وہ بعض اھم ترین جبلتوں کو تسکین دیتا ھے -

حصہ سوم

باب اول

اخلاق کا حقیقی مفہوم

ہم نے اس کتاب کے دوسرے حصے میں مدرسہ جدید کے تعلیمی اصولوں سے بحث کی ہے اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید تعلیمی نظریوں کی رو سے مدرسہ میں نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کو کس طرح مرتب کرنا چاہئیے کہ طلبہ کی ذہنی تربیت اور جسمانی نشو و نما بہ خوبی ہوسکے - اس ضمن میں ہم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے مدارس کے مروجہ نصاب اور تعلیمی طریقوں میں بہت سے ایسے نقائص ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے طلبہ کی شخصیت کی تربیت صحیح طریقہ پر نہیں کرسکتے - ان کی ذہنی صلاحیتیں اکثر افسردہ ہوکر رہ جاتی ہیں ، ان کے دل میں علمی اور عملی دلچسپیاں پیدا نہیں ہونے پاتیں اور وہ زندگی کے گوناگوں امکانات سے پوری طرح لطف اور فائدہ نہیں اٹھاسکتے - علاوہ اس امر کے کہ مروجہ تعلیم انفرادی نشو و نما کی ضامن نہیں ہے - اس کے خلاف یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ طلبا کو موجودہ تمدنی زندگی کی ضرورتوں کے لئے تیار نہیں کرتی اور اس نے اب تک ان جدید تحریکوں اور اثرات کی اہمیت کو نہیں سمجھا جنہوں نے موجودہ زمانے کی معاشرت اور سیاست ، اس کے نظام صنعت و حرفت ، اس کی علمی جدو جہد کے رجحان کو بدل دیا ہے - تعلیم اور تمدنی رجحانات کو ہم آہنگ بنانے اور مدرسے کے ماحول میں افراد کی تربیت کے لئے بہترین محرکات اور اثرات مہیا کرنے کے لئے ماہرین تعلیم نے ، نفسیات اور تمدنی علوم سے فائدہ اٹھا کر ، جدید تعلیمی تجربوں

طریقوں کو رواج دیا ہے جن میں سے چند اہم تجربات کا ذکر ہم کرچکے ہیں -

اب ہم اس مسئلے کے دوسرے پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں - ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ تعلیم سے مراد صرف علم سکھانا نہیں بلکہ عرف عام میں یہ لفظ مجموعی تربیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے انسان کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کا ابھارنا ، سنوارنا اور منظم کرنا - اس لئے تعلیم کے عملی پہلو سے بحث کرنے کے بعد ، جس کا تعلق زیادہ تر ذہنی نشو و نما سے ہے ، ہمارے سامنے یہ اہم اور نازک مسئلہ در پیش ہے کہ طلبہ معاشرتی زندگی میں حصہ لینے اور اپنے ملک اور زمانے کی بہترین اخلاقی قدروں اور اصولوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے کس طرح تیار کئے جاسکتے ہیں - واقفیت اور علم میں اضافہ کرنا آسان ہے لیکن انسان کے اصول زندگی پر اثر ڈالنا ، اس کے جذبات اور جبلات کو ایک عمدہ اور اعلی نصب‌العین کے تحت میں لاکر مہذب اور منظم کرنا اور اسے اپنی قابلیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دشوار ہے - لیکن یہ کام جس قدر مشکل ہے اسی قدر ضروری ہے اور معلم کو جو گویا ایک انسان برتر کی تخلیق میں مصروف ہے اس فرض کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے اور اس کی بجا آوری میں پوری پوری کوشش کرنی چاہئے - یہاں اسے انسان کی نہایت قدیم اور بنیادی جبلتوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کے خیالات اور افعال پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہیں اور جب تک وہ بہت احتیاط اور ہوشیاری سے ان قوتوں کو راہ پر لگا کر اپنا معین و مددگار نہ بنائے گا اسے کامیابی نہیں ہو سکتی - اس لئے اسے نفسیات اطفال سے اچھی طرح واقف ہونا چاہئے تاکہ وہ ان قوتوں کو صحیح طور پر سمجھ کر رہنمائی کرے لیکن محض علم‌النفس سے واقف ہونا اس کے لئے

کافی نہیں کیونکہ اس کے ذریعہ سے تو اسے صرف اسی قدر معلوم ہو سکتا ھے کہ اسے کس مواد سے کام لینا ھے - یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ وہ کس منزل کی طرف اپنا قدم بڑھائے ، کس نصب‌العین کے حاصل کرنے کی کوشش کرے - مقصد کے تعین کے لئے اسے اخلاقیات اور عمرانیات سے مدد لینے کی ضرورت ھے - اور یہ جاننا لازم ھے کہ وہ کون سے اخلاقی اور معاشرتی اصول زندگی ہیں جن کو بہترین علما اور حکما نے تسلیم کیا ھے ، تا کہ وہ اپنے طلبہ کو ان سے روشناس کرے اور انہیں ان پر عمل کرنے کی عادت ہو -

ہمیں اس موضوع پر نظر ڈالنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاھئے کہ ذہنی اور اخلاقی تربیت کی بحث میں ہم نے جو تقسیم قائم کی ھے وہ نفس امر کے لحاظ سے نہیں ھے بلکہ زیادہ تر اظہار خیال میں سہولت پیدا کرنے کے لئے اختیار کی گئی ھے - تمام تعلیمی مباحث میں ہم نے اس اصول کو پیش نظر رکھا ھے اور اس پر زور دیا ھے کہ طالب‌علم کی شخصیت اور تعلیم کے عمل دونوں میں ایک اندرونی وحدت اور ربط ھے جس کو نظر انداز کرنا بہت بڑی غلطی ھے - اصل میں ہم انسان کی ہستی کو الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کرسکتے - یہ نہیں کہ سکتے کہہ جسم اور دماغ ، عقل اور اخلاق ، روح اور مادہ بالکل مختلف چیزیں ہیں جن کو ایک دوسرے سے سروکار نہیں اور جن کی تربیت اور نشو و نما کے لئے بالکل جداگانہ تدابیر درکار ہیں - جس طرح آرٹ کے ہر بڑے شاہکار میں ایک مرکزی خیال یا جذبہ کار فرما ہوتا ھے جو اسے ایک مخصوص وحدت (Unity) یا بقول ڈاکٹر نن (Nunn) کے " انفرادیت " (Idividuality) بخشتا ھے ، اسی طرح انسان کی زندگی اور اس کی ذات میں جو قدرت کا سب

سے بڑا شاہکار ہے ایک وحدت پائی جاتی ہے جو اس کے مختلف اعمال و افعال : اس کے مختلف عناصر کو باہم مربوط رکھتی ہے - اس خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کا عمل بھی ایک سالم عمل ہے جس کو جسمانی تعلیم ' ذہنی تعلیم ' اخلاقی تعلیم وغیرہ میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا - گو ہم اپنی آسانی کے لئے اور ایک وقت میں کسی خاص پہلو کو نمایاں کرنے کی غرض سے اس تقسیم سے کام لیتے ہیں ؛ لیکن ہمیں یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ تعلیم کے یہ مختلف پہلو واقعی مستقل وجود رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں ڈالتے اور معلم ان میں سے ہر ایک کے لئے علحدہ علحدہ تدابیر اور وسائل سوچ سکتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ انتظام جو مثلاً جسمانی تعلیم کے لئے کیا جاتا ہے محسوس یا غیر محسوس طور پر طلبہ کی دماغی اور اخلاقی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے - اس طرح مدرسے میں جو وسائل ہم طلبہ کی علمی اور اخلاقی تربیت کے لئے اختیار کرتے ہیں وہ ان کی اخلاقی سیرت کی تشکیل میں بھی حصہ لیتے ہیں - مروجہ اخلاقی تعلیم کی خرابی کی ایک بڑی وجہ جس کی توضیح ہم آئندہ چل کر کریںگے یہ ہے کہ بالعموم لوگوں نے اخلاقی تربیت کا جو مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے وہ بہت محدود اور نا کافی ہے - در اصل اس میں علم اور عقل دونوں کو بہت بڑا دخل ہے - اس لئے طلبہ کی علمی اور عقلی تربیت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کی سیرت اور طرز عمل میں تغیر واقع ہو - اس وجہ سے گو اب تک ہم نے فی نفسہ اخلاقی تربیت کے مسئلہ کو نہیں اٹھایا لیکن گذشتہ بحثوں میں ضمنی طور پر بار بار اس کا ذکر آچکا ہے - کتاب کے اس حصے میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ مدرسے کے تمام کار و بار اور مشاغل کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیں کہ وہ کس حد تک اخلاقی تربیت میں معین یا مزاحم ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے ان کی تنظیم کس طرح کرنی چاہئے -

سب سے پہلے ہمیں اخلاق کے صحیح مفہوم اور اس کی حدود کو سمجھہ لینا چاہئے - لوگوں نے عام طور پر اخلاق کو انسانی زندگی کا ایک شعبہ سمجھہ رکھا ہے - ان کا خیال ہے کہ زندگی بہت سے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے - کارو باری، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی وغیرہ - گویا ہر انسان بہت سی مختلف اور غیر مربوط شخصیتوں کا مجموعہ ہے جن کو وہ بہ مشکل ایک ساتھہ تو رکھہ سکتا ہے لیکن ہم آہنگ نہیں بنا سکتا - یہ سچ ہے کہ اس ناقص اور نا مکمل دنیا میں اکثر لوگوں کی حالت ایسی ہی ہے کہ ان کے نفس میں تفریق اور انتشار پایا جاتا ہے - ہر شخص اپنے نفس کے مشاہدے اور دوسروں کی سیرت کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے - چونکہ زیادہ تر لوگوں کے نفس میں یہ تفریق دماغی جنون کی حد تک نہیں پہنچتی اس لئے وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن جب وہ اسے انتہائی صورت میں دیکھتے ہیں مثلاً سٹیونسن (Stevenson) کے مشہور افسانے " ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ " (Dr. Jekyll and Mr. Hyde) میں نفس کی دوئی کی داستان پڑھتے ہیں تو انہیں تعجب ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی غیر طبعی چیز ہے جس کو صحیح العقل انسانوں کے روز مرہ کے تجربات سے کوئی تعلق نہیں - حالانکہ اس شخص میں جو دو بالکل متضاد شخصیتیں رکھتا ہے، اور معمولی آدمیوں میں فرق محض کمیت کا ہے کیفیت کا نہیں - وہ بھی دنیاوی کارو بار اور تجارت میں ایک اصول رکھتے اور برتتے ہیں اور مذہبی امور یا خانگی زندگی میں بالکل دوسرے اصول اور طرز عمل کے تابع ہوتے ہیں - انگریزی کی ایک ضرب المثل اس مروجہ تقسیم کو اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ " ہفتے میں چھہ دن دنیاداری کے ساتواں دینداری کا " - غرض یہ بات تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عملی

حیثیت سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کی شخصیت میں ہم آہنگی پائی جائے اور بالعموم اکثر لوگ اپنی زندگی کو مختلف اور غیر مربوط حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں - مگر یہ تعلیم و تربیت کی خرابی کا ثبوت ہے - ہم اس نا قابل اطمینان صورت حال کو اپنا منتہائے نظر نہیں بنا سکتے - صحیح تربیت کا تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ وہ افراد کی شخصیت میں یہ انتشار پیدا ہونے نہ دے اور ان کی تمام علمی اور عملی قوتوں کو اس طرح مربوط اور منظم کردے کہ وہ اعلیٰ ترین اخلاقی نصب العین کے حصول کے لئے استعمال ہوسکیں جو زندگی کے ہر شعبے میں یکساں طور پر شمع ہدایت کا کام دیتا ہے - لہذا ہمارے نقطہ نظر سے اخلاق کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں اور تمام مشاغل کو محیط ہے اور اخلاقی سیرت کا اظہار انسان کے ہر کام میں ہونا چاہئے خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا تجارت سے یا محنت اور مزدوری سے یا مذہب سے - اخلاق کا یہ مفہوم اس مروجہ مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع اور پر معنی ہے جو آداب نشست و بر خواست اور طریقہ کلام و طعام تک محدود ہے یا کبھی کبھی جنسی تعلقات کے لئے استعمال ہوتا ہے - عام طور پر جب لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا اخلاق اچھا ہے - تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی بات چیت اور برتاؤ میں شائستگی پائی جاتی ہے اور وہ آداب محفل سے واقف ہے لیکن اخلاق کے لفظ کو اس قدر محدود معنی میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسے ہم بیچ سمندر میں غوطہ لگانے کے بجائے محض اس کی سطح کو چھونے پر قناعت کریں - بے شک ایک با اخلاق شخص کی گفتگو میں شیرینی اور اس کے برتاؤ میں حفظ مراتب کا خیال بھی ہونا چاہئے لیکن اگر یہ صفات اس کی تہذیب نفس کا نتیجہ نہیں ہیں تو پھر محض اوپری چیز ہیں جن کو ہم کوئی وقعت نہیں دے سکتے - بہت ممکن ہے کہ ایک، بدباطن اور بدکردار شخص لوگوں کو فریب

دینے کے لئے اس قسم کا جھوٹا اور نمائشی " اخلاق " ظاہر کرے - ہمیں روز مرہ کي زندگی میں اکثر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ھے جو باوجود اس سطحی " اخلاق " میں ماہر ہونے کے نہایت درجہ ذلیل اور بد اخلاق ہوتے ہیں - ممکن ھے کہ بعض لوگ جو وسیع تجربہ اور غائر نظر رکھتے ہیں ان کی ریا کاري کو پہچان سکیں اور کھرے اور کھوٹے سکے میں تمیز کرسکیں لیکن عام لوگ دھوکے میں آجاتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں - اس لئے ہمیں اخلاق کے اس سطحی مفہوم کو یک قلم مسترد کر دینا چاھئے - اسی طرح جو لوگ اخلاق کو جنسی تعلقات کے ساتھہ مخصوص کر دیتے ہیں اور " بااخلاق " کے لفظ کا اطلاق ان لوگوں پر کرتے ہیں جن کي زندگی کا صرف یہ پہلو قابل تعریف ہوتا ھے وہ بھی کل کے بجائے جزو پر قانع ہوجاتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ یہ بھی اخلاق کا ایک نہایت اہم حصہ ھے لیکن اس کو اخلاق کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں سمجھنا چاھئے کیونکہ انسان پر زندگی کی گوناگوں کشمکش میں مختلف قسم کے فرائض عائد ہوتے ہیں - اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو ادا کرے اور باقي کے طرف سے بے اعتنائی برتے تو ہم اس کو اخلاقی اعتبار سے اچھا نہیں سمجھہ سکتے - مثلاً اگر کسی شخص کا کردار جنسي تعلقات کے لحاظ سے بالکل پاک و صاف ھے لیکن وہ نہ سچ بولتا ھے ، نہ جائز ذرائع سے حصول معاش کرتا ھے ، نہ اپنے خاندان والوں اور ہمسایوں کے حقوق ادا کرتا ھے تو اس کو یقیناً بد اخلاق کہنا چاھئے - لہذا ان دونوں معنوں کو چھوڑ کر ہمیں اخلاق کا وہی مفہوم اختیار کرنا پڑیگا جو زندگي کے تمام مشاغل اور معاملات کو محیط ہو -

مدرسے کي خصوصیت یہ ھے کہ وہ خارجی زندگی کے خیالات اور عقائد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - چونکہ سوسائٹی نے اخلاق کا

مفہوم غلط سمجھہ رکھا ھے اس لئے مدرسے میں بھی اخلاق سے متعلق
ایک بہت محدود اور تنگ نقطہ نظر رائج ہو گیا ھے اور اخلاق اور
زندگی کے گہرے رابطے کو فراموش کردیا گیا ھے - مدرسوں میں '' اخلاقی
تربیت '' کے یہ معنی لئے گئے ہیں کہ بچوں کو چند اخلاقی اصول
بتادئے جائیں - بہت سے اُستادوں کو تو اس کی فرصت ھی نہیں ملتی
یا سرے سے احساس ھی نہیں ہوتا کہ اخلاقی تعلیم کا کوئی بندوبست
کریں لیکن جن معلموں کو اس کا خیال ہوتا بھی ھے ان میں سے بھی
اکثر اس بات پر قناعت کرتے ہیں کہ طلبہ کو اچھے اچھے مقولے اور
اخلاقی نصیحتیں سنادیں اور اُن پر عمل کرنے کی تاکید کردیں - بعض
جو زیادہ ایماندار اور محنتی ہوتے ہیں اور احساس فرض کے بوجھ سے
دبے جاتے ہیں وہ ان اصول کی تشریح و تفسیر بھی کردیتے ہیں - اتنا
کرکے وہ یہ سمجھہ لیتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کی مہم سر ہوگئی -
بے شک بعض معلم ایسے بھی ہیں جو اپنی مثال اور شخصیت کے
مقناطیسی اثر سے طلبہ کی زندگی میں سچا اخلاقی احساس پیدا کردیتے
ہیں اور غیر شعوری طریقے پر ان کے معیار فکر و عمل ، ان کے مذاق اور
اخلاق کو بلند اور بر تر کرتے رہتے ہیں - خال خال ایسے روشن دماغ
معلم بھی مل جائینگے جن کو شعوری طور پر یہ معلوم ھے کہ اخلاقی
تربیت کے اصول کیا ہیں اور اس کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں -
لیکن ان مستثنیٰ صورتوں کو چھوڑ کر اخلاقی تربیت کی عام کیفیت
وہی ھے جو ہم نے اوپر بیان کی ھے - اس میں مطلق مبالغہ نہیں ھے - اس
بے توجہی اور بے اصولی کا نتیجہ صرف یہی نہیں کہ معلموں کا مقصد
حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی غلط کوششوں سے ، گو وہ نیک نیتی
پر مبنی ہوں ، بچوں کی قدرتی نشو و نما میں حارج ہوتے ہیں اور اپنی
مداخلت سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچاتے ہیں - ان کی نام نہاد

اخلاقی تعلیم کو بچوں کی روز مرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انہیں اس کا موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ اس تلقین کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنائیں۔ اس لئے اخلاقی نصیحتیں اور مقولے صرف ان کے کانوں تک پہنچ جاتے ہیں، دل میں نہیں اترتے، عمل کی شکل نہیں اختیار کرتے۔ وہ ان کو طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں اور جب ضرورت ہو فر فر سنا دیتے ہیں لیکن قول اور فعل کی علحدگی ان میں بلا ارادہ ریاکاری پیدا کرتی ہے اور مدرسے کی اخلاقی تعلیم سطحی، مصنوعی اور غیر موثر رہ جاتی ہے۔ خود مدرسے کی چار دیواری میں بھی اس کا کوئی خاص اثر ظاہر نہیں ہوتا اور مدرسے کو چھوڑنے کے بعد تو وہ بالکل ہی بیکار اور فضول ثابت ہوتی ہے۔

اس بحث سے ہمیں اخلاقی تربیت کا پہلا بنیادی اصول ہاتھ آتا ہے کہ اخلاق کی تعلیم کو وسیع اور جامع یعنی طلبہ کی پوری زندگی پر حاوی ہونا چاہئے اور اس کی بنیاد ان کے ماحول اور مشاغل اور ان کی فوری ضروریات اور فطری خواہشات پر رکھنا چاہئے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ تعلیم ایسی ہو جو بلا تفریق و امتیاز ان کی کل خواہشات پوری کرے یا ان کی روز مرہ کی زندگی اور مشاغل کی سطح سے بلند نہ ہونے پائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم تمام تر عملی ہو یعنی وہ طلبہ کی زندگی کے گوناگوں تجربات اور مشاغل کو پیش نظر رکھ کر ان میں بہتر تنظیم و ترتیب قائم کرے اور ان کو اخلاقی اصولوں کی تحت میں لائے نہ یہ کہ ان کی عملی ضرورتوں سے قطع نظر کر کے ان پر زبردستی مجرد اخلاقی اصول عائد کردے۔ اس لئے مدرسے میں ہر اصول اور قاعدے کی تشریح، ہر قانون کی مثال طلبہ کی زندگی میں سے مہیا کرنی چاہئے۔ مثلاً فلسفہ اخلاق کا ایک نہایت اہم اصول یہ ہے کہ معاشرتی

زندگی اس وقت تک نہیں چل سکتی اور نہ افراد کو آزادی عمل حاصل ہو سکتی ھے جب تک لوگ اس کے عادی نہ ہوں کہ ایک دوسرے کے ساتھہ رعایت اور رواداری برتیں ' اپنے اپنے حقوق اور فرائض پہچانیں اور دوسروں کے کام میں بے جا مداخلت کرنے سے باز رھیں - طلبہ کو محض اس اصول کا زبانی سمجھا دینا کافی نہیں کیونکہ جب تک یہ ان کے ذاتی تجربے کی مستحکم اور پائدار بنیاد پر قائم نہ ہو ' ان کی اپنی کامیابی اور نا کامی کی مثالوں سے اخذ نہ کیا گیا ہو ان کے عمل کی رہبری نہیں کرسکتا - اس کے لئے ضروری ھے کہ مدرسے میں ایک معاشرتی ماحول مہیا کیا جائے - تا کہ طلبہ اس کے نشیب و فراز سے واقف ہوکر خود اس نتیجے پر پہنچیں کہ حقوق کے ساتھہ فرائض بھی وابستہ ہوتے ہیں اور اگر کوئی شخص چاھتا ھے کہ اسے اپنے مشاغل کے لئے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو تو اسے دوسروں کے مشاغل میں بےجا مداخلت نہیں کرنی چاھئے ورنہ وہ بھی اس کے کاموں میں دست اندازی کریںگے - انفرادی حقوق اور ان کی حدود کی یہ معرفت محض اُستاد کے بیان سے حاصل نہیں ہوسکتی - اس کے لئے بچے کو پڑھائی کے کمروں میں ' بورڈنگ ھاؤس کی زندگی میں ' کھیل کے میدان میں اور تمام مشترک مشاغل کے دوران میں اپنے ہم عمر اور اپنے سے چھوٹے بڑے ساتھیوں کے ساتھہ تعاون عمل کی ضرورت ھے کیونکہ یہ ساتھی براہ راست اپنے مخصوص طریقوں سے یہ سبق اچھی طرح ذہن نشین کرادیتے ہیں - اگر کوئی طالبعلم مدرسے کے بن لکھے قوانین اور روایات کی خلاف ورزی کرتا ھے تو طلبہ خود مجرم کو قرار واقعی سزا دیتے ہیں اور اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ عام روایات اور طریقۂ عمل کی پیروی کرے - یہ سزا اسے ناگوار نہیں

جو اکثر ہوتی یا کم سے کم اتنی ناگوار نہیں ہوتی جتنی استاد کی سزا ' جو اکثر مبہم وجوہ پر مبنی ہوتی ہے جن کو سمجھنے سے وہ قاصر ہوتا ہے کپلنگ (Kipling) نے پبلک اسکول کی زندگی کے متعلق جو دل چسپ اور مشہور کتاب "سٹاکی اینڈ کو" (Stalky and Co.) لکھی ہے اس میں اس حقیقت کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ دکھایا ہے - خصوصاً ایک باب میں جس کا عنوان " اخلاقی مصلحین " ہے اس نے ایک سبق آموز کہانی بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کے لئے جو تدابیر اکثر خود طلبہ اختیار کرتے ہیں وہ کس قدر موثر اور کارگر ہوتی ہیں خواہ استادوں اور والدین کے سنجیدہ نقطہ نظر سے وہ قابل اعتراض ہوں -

تعلیم اخلاق کے متعلق جو غلط فہمیاں رائج ہیں ان میں سے بہت سی ایک غلط نفسیاتی عقیدے پر مبنی ہیں جس کی درستی کئے بغیر ہم اخلاقی تربیت کے اصول قائم نہیں کرسکتے - لوگوں میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ انسان کے نفس میں دو جداگانہ قوتیں ہیں۔ جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی ہیں - ایک طرف اس کی جبلتیں ؛ اس کے جذبات اور اس کی خواہشیں ہیں جو اسے اپنی جانب کھینچتی ہیں اور دوسری طرف اس کی عقل ہے جو ایک مستقل اور آزاد قوت ہے - یہ اس کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتی ہے اور اسے جذبات اور جبلتوں کے فریب سے بچانے کی کوشش کرتی ہے - انسان اور حیوان میں عموماً یہی چیز مابہ‌الامتیاز قرار دی جاتی ہے کہ انسان عقل کا تابع ہوتا ہے اور حیوانات اپنی خواہشوں کے بندے ہوتے ہیں - انسان کی کامیابی اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنی عقل کی ہدایت سے فائدہ اٹھا کر اپنی خواہشات اور جذبات کو زیر کرے

بلکہ اگر ہوسکے تو انہیں بالکل مٹا دے - گویا عقل و ارادہ اور دوسری قوتوں میں لازمی کشمکش ہے اور اخلاقی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ عقل باقی تمام قوتوں پر غالب آجائے - لیکن نفسیات کی جدید تحقیقات اس خیال کی تردید کرتی ہے - جیسا ہم ابھی بتا چکے ہیں انسان کے نفس میں بہ حالت طبعی ہم آہنگی ہوتی ہے - اس بکثرت مشاغل اور افعال میں جو اس کی زندگی میں نظر آتی ہے ایک خاص وحدت پوشیدہ ہے - اس کی تمام جسمانی اور دماغی ' علمی اور اخلاقی قوتیں ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں - ان کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنا غلطی ہے کیونکہ ان سب کی ابتدا انہیں سادہ اور جبلی رجحانات سے ہوتی ہے جو تمام افراد کی فطرت میں پائے جاتے ہیں - نفسیات ہمیں سکھاتی ہے کہ انسان کی تمام اعلیٰ قوتیں رفتہ رفتہ اُن اضطراری افعال ' جبلتوں اور صلاحیتوں کے تعاون اور تعامل سے وجود میں آتی ہیں جو بچے کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں - یہی وہ سرمایہ ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے - اور انہیں چیزوں کی صحیح نگہداشت اس کی آئندہ دماغی اور اخلاقی تربیت کا دار و مدار ہے -

ابتدا میں یہ مختلف قسم کی حرکات بالکل غیر شعوری ہوتی ہیں اور محض ماحول کے رد عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں - انہیں سے شیر خوار کی ابتدائی منزل میں بقائے حیات کا کام انجام پاتا ہے - لیکن ابھی تک اس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ ان حرکات کے ذریعے اپنے جسم کو سنبھالے اور اس کی حفاظت کرے یا اپنے ماحول پر قابو حاصل کرے اور گرد و پیش کے معاملات اور مسائل کو سمجھ سکے - لیکن جوں جوں بچے کو مختلف قسم کے تجربات پیش آتے ہیں وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے ' اس کے مظاہر اور خواص کو سمجھتا ہے اسے روز مرہ نئی مشکلات

اور نئے مسائل پیش آتے ھیں - فرد اور ماحول کے اس باھمی تعامل سے اس کی قوتیں ایک دوسرے سے وابستہ ھونا اور ایک منظم صورت اختیار کرنا شروع کرتی ھیں - تکلیف اور آرام کا احساس جو اس کو مختلف چیزوں اور کاموں سے حاصل ھوتا ھے اس کے دل میں اپنے ماحول کے مختلف اجزا اور عناصر کے متعلق ایک احساس قدر پیدا کرتا ھے یعنی بعض کو وہ پسند کرتا ھے اور ان کو حاصل کرنے یا ان کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ھے - بعض کو ناپسند کرتا ھے اور ان کو دور کرنا یا ان سے دور رھنا چاھتا ھے - اس طرح اوائل عمر ھی میں ایک قسم کا ابتدائی اور فطری معیار اقدار مرتب کر لیتا ھے ، جو زیادہ تر محض اس کے ذاتی تاثرات پر منحصر ھوتا ھے یعنی جس چیز سے اس کے نفس کو تکلیف پہنچتی ھے اس کو ''برا'' سمجھتا ھے جس سے خوشی حاصل ھوتی ھے اسے ''اچھا'' سمجھتا ھے - مثلاً ڈاکٹر جو بچے کو کڑوی دوائیں پلاتا ھے اس کا نام اس کی فہرست میں نہایت ناپسندیدہ لوگوں میں لکھا جاتا ھے اور بیوقوف نوکر جو اس کو وقت بے وقت مٹھائی کھلائے وہ اس کے نزدیک سب سے بہتر شخص ھے - اس طرح جو شخص بھی اس کو اس کے پسند کے برے اور مضر کاموں سے جنھیں وہ کرنا چاھتا ھے روکے وہ اس کو برا معلوم ھوتا ھے اور جو شخص اس کی ضدوں کو پورا کرے وہ اسے محبوب ھوتا ھے - ممکن ھے ان مثالوں پر غور کرنے سے کسی کو یہ خیال ھو کہ یہ معیار بہت ھی ناقص اور ادنیٰ ھے اور محض ذاتی تاثر کی بنا پر چیزوں اور آدمیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا بڑی غلطی ھے - لیکن واقعہ یہ ھے کہ یہ اصول انسانی فطرت کے نہایت مستحکم اور اٹل قوانین میں سے ھے - آگے چل کر اس کی شکل بدل جاتی ھے ، اس کے استعمال کا طریقہ دوسرا ھوجاتا ھے لیکن انسان کی پسند اور ناپسندیدگی میں شخصی رنگ کی جھلک یعنی فلاں کام یا فلاں شخص میرے لئے کیسا ھے ، مجھے

کیسا معلوم ہوتا ہے اس کی شخصیت کی ہر ارتقائی منزل میں پائی جاتی ہے - جب انسان کی عقل اور تجربے اور وسعت نظر میں ترقی ہوتی ہے تو اس کے نزدیک تکلیف اور آرام، رنج اور خوشی کا مفہوم اور ان کے محرکات بھی بدل جاتے ہیں - اس کو بعض نئی چیزیں پسند آتی ہیں اور بعض چیزیں جو پہلے مرغوب تھیں ناگوار معلوم ہونے لگتی ہیں - لیکن ہر حالت میں وہ ان کے متعلق جو رائے یا طرز عمل رکھتا ہے اس کی بنا اسی پر ہوتی ہے کہ آیا ان سے اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے یا رنج - [لیکن نفسیات کی اصطلاح میں خوشی اور رنج کا حقیقی مفہوم وہ نہیں جو عیش طلب لوگ سمجھتے ہیں - خوشی نام ہے اس احساس یا جذبے کا جو شخصیت کی توسیع اور ترقی سے انسان کے دل میں پیدا ہو - ہر وہ چیز جو میری شخصیت کو قوت پہنچاتی ہے، اس میں استحکام اور گہرائی پیدا کرتی ہے، میری خوشی کی باعث ہوگی خواہ اس کے حصول میں مجھے کتنی ہی محنت کرنی اور تکلیف اٹھانی پڑے - برخلاف اس کے جو چیز میری شخصیت کو محدود اور کمزور کرتی ہے وہ رنج پہنچاتی ہے خواہ بہ ظاہر مجھے اس سے آرام اور فائدہ محسوس ہوتا - فرض کیجئے آج میرا خیال ہے کہ کسی کاروبار میں بہت سا روپیہ لگانے سے میری شخصیت کو استحکام اور تقویت پہنچے گی - اس صورت میں میں اپنی تمام کوششوں کو اس مقصد کے لئے وقف کردوں گا - ہر اس چیز کی جو اس میں معین ہوگی دل سے قدر کرونگا اور باقی تمام چیزوں کو اپنے لئے نقصان دہ اور باعث انتشار سمجھونگا - لیکن اگر کل میرا خیال یہ ہوجائے کہ ملک میں مدرسے قائم کرنا نہایت ضروری ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی مفید کام نہیں تو میں اپنے روپے کو بے دریغ اس کار خیر میں صرف کرونگا اور میری نظر میں دولت کی حیثیت صرف اتنی ہوگی کہ وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک

ذریعہ ھے - اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ انسانی افعال کا محرک ھمیشہ وھي ایک جذبہ ھوتا ھے یعنی شخصیت کا فروغ اور استحکام یا عزم للقوۃ - لیکن وہ اغراض و مقاصد جن کے لئے انسان جد و جہد کرتا ھے ' اپني جان جوکھم میں ڈالتا ھے ' اپني قوتیں اور وسائل استعمال کرتا ھے ' بدلتے رھتے ھیں -

اخلاقی تعلیم کا منشا اور منتہا یہ ھے کہ بچوں کے تمام کاروبار اور مشاغل کا رشتہ اعلیٰ ترین اندار اور مقاصد سے جوڑے تاکہ وہ انھیں کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کریں ان کے اندر اپنی شخصیت کو محو کردیں اور اس طرح اس کو زیادہ قابل قدر بنا کر دوبارہ حاصل کریں - بالفاظ دیگر ھم یہ چاھتے ھیں کہ بچے کی توجہ کو اس کی ذات کی فوري اور عارضی ضروریات سے ھٹا کر مستقل اور بلند تر اجتماعی ضروریات کی جانب مائل کریں جن کو پورا کرنے میں اسے تکمیل نفس اور اظہار خودی کے بہترین مواقع مل سکیں - وہ کسي کام کو محض اس خیال سے نہ کرے کہ اس سے اس کا نفس حیواني '' آرام '' پاتا ھے ' نہ کسی کام سے محض اس لئے پرھیز کرے کہ اس میں محنت اور تکلیف اُٹھانی پڑتي ھے بلکہ وہ اپنی زندگي کي راہ کو کسي ایسے نصب العین کی روشنی سے منور کرے کہ اس کو سفر کی صعوبتوں اور تکلیفوں کی پروا نہ رھے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نفس کش زاھدوں کی طرح آرام کي خواھش ھی نہ کرے یا تکلیف اُٹھانے کو فی نفسہ باعث ثواب سمجھے - البتہ اسے جسماني آسائش اور جسمانی خواھشات کي تشفي کو بھي اعلیٰ تر ' مقاصد میں معین بنانا چاھئے - جہاں کہیں جسماني آسائش کے مطالبات ارتقائے شخصیت کے مطالبات سے بر سر پیکار ھوں اسے جسمانی آسائش کو ترک کر دینا

چاهئے - اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ صحت جسمانی کا لحاظ اور خورد و نوش کا اہتمام اسی حد تک ضروری بلکہ اخلاقی فرائض میں شامل ہے جہاں تک اس سے انسان کو اس کام میں مدد ملتی ہو جو اس کا مقصد حیات ہے - جسم روح کا خادم اور آلہ‌کار ہے اس لئے اس کی خبرگیری اور نگہداشت لازم ہے - لیکن تربیت جسمانی کو مقصود بالذات بنا لینا اور بعض جسم پرستوں کی طرح اس خبط میں مبتلا ہوکر زندگی کے اور تمام فرائض اور مطالبات سے غافل ہوجانا سراسر ناجائز ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے بر تر کو کمتر پر قربان کردیا ہے اور وسیلے کو مقصد بنا لیا - اخلاقی تربیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ طلبہ وسیلے اور مقصد میں تمیز کرسکیں اور مختلف مقاصد میں باعتبار ان کی اخلاقی قدر و قیمت کے ترتیب قائم کرسکیں -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ کو اس اخلاقی معیار سے کس طرح روشناس کیا جائے کہ وہ ان کی زندگی میں ایک اثر آفریں قوت بن جائے -

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ ابتدا میں بچے کی پسند اور نا پسندیدگی کا انحصار اس کی اپنی ذات کی نشو و نما اور آرام و آسائش پر ہوتا ہے - یہ اخلاق کی سب سے پہلی منزل ہے - اس کے بعد اسے گرد و پیش کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ اپنے والدین کو پہچاننے اور ان سے محبت کرنے لگتا ہے ، اپنے عزیزوں کے ساتھ رہنا سہنا ہے ، ہمسایوں اور پڑوسیوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہے ، مدرسے میں اپنے ساتھیوں سے ملتا جلتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کے خیالات اور جذبات ، ان کی بود و باش ، ان کی رسوم و روایات کو اپنا بنا لیتا ہے - اس معاشری تجربے کا اثر یہ

ھوتا ھے کہ اب وہ اپنے اعمال اور افعال کو معاشرے کی پسندیدگی کے معیار پر پرکھنے لگتا ھے - اس کی یہ خواھش ھوتی ھے کہ اپنے ھم عمروں اور بڑوں کی خوشنودی حاصل کرے - ان کی ناراضگی اس کے لئے تکلیف کا باعث ھوتی ھے اور اس کے احساس خودی کو کمزور کرتی ھے اور ان کی خوشنودی سے اس کے نفس میں احساس قوت پیدا ھوتا ھے - گویا اس کی ذات روز بہ روز وسیع ھوتی جاتی ھے اور اپنے محدود دائرے سے آگے بڑھکر اپنے متعلقین کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتی ھے - اس طرح اس کے لئے ایک نیا معیار قائم ھوجاتا ھے جو ابتدائی معیار سے بلند تر ھے - اس کے اثر سےاس کو عمرانی زندگی کے اصولوں سے انس اور مناسبت پیدا ھوتی ھے اور وہ بہت سی ایسی باتیں سیکھہ لیتا ھے جو اس کے معاشری ماحول کے مروجہہ اخلاق کا جزو ھیں - وہ عملاً یہ محسوس کرتا ھے کہ ھر فرد کو اپنی نشو و نما کے لئے معاشرے کی اداروں اور انتظامات سے فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ھے لیکن اس حق کے بدلے میں معاشرے کی طرف سے اس پر فرائض بھی عائد ھوتے ھیں جن کی پابندی اس کے لئے ضروری ھے مثلاً یہ فرض کہ وہ دوسروں کے ساتھہ مل جل کر کام کرے لیکن ان کے مشاغل میں بےجا مداخلت سے باز رھے - ممکن بلکہ اغلب ھے کہ ھمدردی ' اشتراک عمل ؛ معاشری کاوکردگی کا نظری مفہوم ابھی تک اس کی سمجھہ سے باھر ھو لیکن عمل کے ذریعے وہ ان عادتوں کو پختہ کرلیتا ھے جن پر اخلاقی زندگی کی بنیاد ھے - اگر اوائل عمر میں ان عادتوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جائے تو آگے چل کر انسان کو اپنی ساری توجہ اور محنت ان جزئیات کی اصلاح میں صرف کرنی پڑتی ھے اور وہ اعلیٰ تر اخلاقی مقاصد کا حق ادا نہیں کرسکتا -

اس کے بعد اخلاقی تربیت کی تیسری منزل آتی ہے. جب طالب علم بچپن کی حدود سے نکل کر شباب کی سرحد میں قدم رکھتا ہے اور نہ صرف جسمانی اور ذہنی اعتبار سے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھتا ہے - اب وہ اپنے ہر فعل کو اس معیار پر نہیں پرکھتا کہ اس سے مجھہ کو آرام و آسائش حاصل ہوگی یا نہیں اور نہ یہ سوچتا ہے کہ اگر میں فلاں کام کرونگا تو میرے دوست اور عزیز میرے متعلق کیا رائے قائم کرینگے ۔ اس وقت تک وہ اپنے ہدایت کے لئے کچھہ اصول اور قاعدے معین کر چکتا ہے اور اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنی راہ چلے اور ان کی مدد سے زندگی کے سارے مرحلے طے کرے بلکہ بلوغ کے زمانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر نوجوان محض اظہار خودی کے لئے اس شاہراہ سے ہٹ کر جس پر دوسرے چلتے ہیں اپنے لئے نیا راستے کرتے ہیں تاکہ خود انہیں اور دوسروں کو یہ محسوس ہو کہ وہ ایک آزاد شخصیت کے مالک ہیں - لیکن یہ مبالغہ آمیز اظہار خودی محض ایک علامت ہے جس سے ہمیں یہاں بحث نہیں - ہمارے پیش نظر وہ مضبوط اور مستحکم اخلاقی سیرت ہے جو اپنے اصولوں کی خاطر آرام و آسائش کو قربان کرنے اور تکلیفیں اٹھانے کے لئے تیار ہو اور محض دوسروں کی خوشنودی یا تعریف کی خاطر اُس طرز عمل کو نہ چھوڑے جو اس کے نزدیک انصاف و صداقت کا تقاضا ہو - یعنی اس منزل میں پہنچ کر نئے سرے سے انسان کی رہنما اس کی اپنی ذات ہوجاتی ہے لیکن اب یہ ذات پہلے کی طرح عارضی اور فوری خواہشوں کی غلام نہیں ہوتی بلکہ تربیت اور تہذیب کی بدولت اخلاقی اقدار مقاصد سے آشنا ہوجاتی ہے - اب وہ ہر بات کا فیصلہ محض جسمانی راحت اور تکلیف کی بنا پر نہیں کرتی بلکہ اُس کا معیار بہت

بلند ہو جاتا ہے اور وہ اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کو اپنی شخصیت کے اظہار اور عزم للقوۃ کی تسکین کا ذریعہ بنا لیتی ہے -

یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اخلاقی تربیت کی ان تینوں منزلوں سے گذر کر اپنی سیرت کی تکمیل کرے - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ پہلی ہی منزل میں رہ جاتے ہیں اس سے آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے - وہ اپنی ساری عمر اس ادنیٰ اور پست سطح پر بسر کرتے ہیں جہاں اعمال و کردار پر فوری خواہشات اور حفظ نفس کی حکمرانی ہوتی ہے - ان کی اخلاقی حالت بچوں کی سی ہوتی ہے بلکہ اس سے بد تر - کیونکہ بچوں کے لئے تو یہ چیز فطرت کے موافق ہے اور ان غلطیوں اور کمزوریوں میں بھی معصومیت کی ایک شان پائی جاتی ہے - لیکن یہ لوگ جن کی اخلاقی نشو و نما مسدود ہو جاتی ہے نہ اپنی عقل سے کام لیتے ہیں نہ تجربے سے ، سوائے اس ابتدائی اور فطری تجربے کے جو انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہے اور انہیں بعض صریحاً مضر اور مہلک چیزوں سے بچاتا ہے - وہ دوسروں کی خوشنودی اور معاشرے کی رائے کا بھی خیال نہیں کرتے - بعض لوگ اس حالت سے آگے بڑھکر اخلاق کی درمیانی منزل تک پہنچ جاتے ہیں - جس میں دوستوں اور ہم چشموں یا اپنے سے بہتر لوگوں کی تقلید اور رضا جوئی کی خواہش زندگی پر حاوی ہوتی ہے ان کی بات چیت ، چال ڈھال ، وضع قطع ، ادب آداب ، غرض سارے ذاتی اور معاشرتی معاملات کا معیار یہی ہوتا ہے کہ کوئی بات ایسی نہ کریں جو دوسروں کی نظر میں کھٹکے - اس قسم کے لوگ سراسر رسم پرست اور تقلید پرست ہوتے ہیں اور معاشرے کے بے بس غلام بن کر رہ جاتے ہیں - ایک عجیب بات یہ ہے کہ نوجوانوں کی نفسی زندگی میں جہاں ایک طرف اظہار خودی اور

نمود کی خواهش بهت نمایاں هوتی هے وهاں بعض باتوں میں وہ معاشرے کے دستور کا حد سے زیادہ لحاظ رکھتے هیں اور کم سے کم اپنے هم چشموں کی مخالفت کرنے میں بهت جھجکتے هیں - ان متضاد رجحانات کا اکثر یہ نتیجہ هوتا هے کہ نوجوان اپنے بزرگوں اور استادوں کے سامنے خواہ مخواہ بڑھ بڑھ کے اپنی شخصیت کا اظہار کرتا هے - هر بات میں ان کی مخالفت اور ان کے بتائے هوئے راستے سے هٹ کر چلتا هے - مگر یهی نوجوان اپنے هم‌عمروں اور دوستوں کے سابقے میں هر معاملے میں مروجہ رسم اور دستور کی تقلید اور حمایت کرکے ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاهتا هے - هم یہ نہیں کہ سکتے کہ ارتقائے نفس کا یہ دور مفید یا اهم نہیں هے کیونکہ کسی شخص کی اخلاقی سیرت اس وقت تک مکمل نہیں هوسکتی جب تک وہ اس منزل سے نہ گزرے - هر معاشرے کے اخلاقی اصول و اقدار اور معیار عمل صدیوں کی جد و جهد اور تجربے کے بعد قائم هوتے هیں اور اس کے افراد کی طبیعت اور زندگی میں سرائت کرتے هیں - کوئی شخص آسانی سے ان تمام موثرات کی تفصیل اور ان کی نشو و نما کو بیان نہیں کرسکتا جن سے کسی قوم کی اخلاقی زندگی کی تشکیل هوتی هے - لیکن یہ حقیقت مسلمہ هے کہ یہ اخلاقی زندگی هر بچے کو ابتدا هی سے اپنے اثر میں لے لیتی هے - اگر معاشرے کی عام اخلاقی حالت قابل اطمینان هے تو ایک نوخیز هستی کی تربیت کا بهترین ذریعہ یهی هے کہ وہ اس ماحول میں زندگی بسر کرے اور اس کے اخلاقی اصولوں کو جذب کر کے ان پر عمل کرنے لگے - یعنی ایک طرف تو ذاتی مطالعے اور مبادلۂ خیالات کے ذریعے گھر میں اور مدرسے میں ان اصولوں کو نظری طور پر سمجھے اور ان کے حسن و قبح پر غور کرے اور دوسری طرف اپنے کردار میں ان کو عملی جامہ پهنائے - چونکہ بعض

لوگوں میں فطری کمزوریوں یا ماحول کی خرابی کی وجہ سے یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ اس منزل سے آگے بڑھکر معاشری معیار اخلاق کو ذاتی طور پر پرکھیں اور معاملات کے متعلق اپنے ضمیر کی روشنی میں آزادی سے فیصلہ کرسکیں - اس لئے مدرسے کا یہی فرض ہے کہ ان کو معاشرے کے بہترین اخلاقی اصول اور عمل سے روشناس کرے اور ان کے کردار کو اخلاق کی معمولی سطح سے نیچے نہ گرنے دے -

لیکن اس صورت حال کو ہم اپنا مطمح نظر نہیں بناسکتے - ہمارے نزدیک وہ اخلاقی تربیت ہرگز مکمل نہیں جس کا مرکز ثقل دوسرے لوگوں کی رائے اور ان کی خوشنودی ہو ' جس میں انسان کے اپنے ضمیر کو کوئی دخل نہ ہو بلکہ ہر معاملے میں معاشری روایات اور تعصبات کی پیروی کی جاتی ہو - تاریخ کے اوراق میں ہمیں جو مثالیں اعلیٰ ترین انسانوں کی ' بالخصوص مذہبی رہنماؤں کی ملتی ہیں ' ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت انسان کی ارتقاء کا کمال یہ ہے کہ انسان نہ صرف اپنی نفسانی خواہشات اور فوری اغراض کی کشمکش سے بلند ہوجائے بلکہ اس کے اندر اتنی قوت ' اعتماد نفس اور بصیرت پیدا ہوجائے کہ اپنے نور باطن کو اپنا رہنما بنائے اور جب کوئی ایسا اہم اور نازک موقع آپڑے کہ ضمیر کی آواز اور حق کا مقتضا معاشرے کے مطالبے کے خلاف ہو اور ضمیر کی پیروی کرنے میں ساری دنیا کی ناخوشی کا اندیشہ ہو تو انسان اپنے آرام و آسائش ' دنیاوی اغراض اور معاشرے کی پسندیدگی کو ٹھکرا کر اپنے عقیدے پر عمل کرے اور اس راستے پر چلے جو اس کے نزدیک سیدھا اور صحیح ہے - نفسیات فلسفہ اور مذہب تینوں کی تعلیم یہی ہے گو ان میں سے ہر ایک اس حقیقت کے اظہار میں مختلف انداز بیان اور اصطلاحیں استعمال کرتا ہے

مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کی روح آزاد ہے اس کو اپنی بھلائی برائی کا اختیار ہے اور وہ خود اپنی قسمت کو بناتا یا بگاڑتا ہے - نفسیات کا نظریہ یہ ہے کہ ہر ذی حیات ہستی میں انفرادیت کی شان اور اپنی رہنمائی آپ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اس کی صحیح نشو و نما صرف اسی حالت میں ہوسکتی ہے جب تمام تعلیمی تدابیر اور وسائل اور ماحول کے اثرات اس کی انفرادیت کو ظاہر ہونے کا موقع دیں اور اسے تقویت پہنچائیں - فلسفہ بھی کانٹ کی زبان سے اس خیال کی تصدیق ان الفاظ میں کرتا ہے -

" ہر انسان بجائے خود ایک مقصد ہے محض ذریعہ نہیں ہے "

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر ایسے نظام یا ادارے کو ناقص اور خلاف انصاف سمجھتا ہے جو افراد کو محض دوسرے لوگوں کے مقاصد اور اغراض کا آلہ کار بنا دے - اس میں شک نہیں کہ ایک لحاظ سے ہر شخص ذریعے کا کام کرتا ہے - وہ ان مشترک اغراض کی تحصیل میں کوشاں ہوتا ہے جو معاشرے کی مادی یا ذہنی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے - لیکن اُس صورت حال کو ہم کسی طرح اخلاق کی رو سے جائز قرار نہیں دے سکتے جو مثلاً لاتعداد انسانوں کو محض کارخانوں کا مزدور بنادے اور ان کے تمام انسانی حقوق اور صلاحیتوں کو بالکل نظر انداز کردے - اسی طرح تمام بڑے بڑے مذاہب نے مختلف پیرایوں میں یہ تعلیم دی ہے کہ انسانی روح کو بہ راہ راست اپنے خالق سے تعلق ہے اور انسان خود اپنے اختیاری افعال و اعمال سے اپنی روح کو عظمت اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے یا ذلت اور پستی میں گرادیتا ہے اس کو خارجی طاقتوں کے ہاتھ میں بے بس سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے -

'' هم نے انسان کو بنایا اور اسے اختیار دیا کہ خواہ وہ (هماری دی هوئی نعمتوں کا) شکر ادا کرے (یعنی ان کو صحیح مصرف میں لائے) یا کفران نعمت کرے (یعنی ان کا غلط استعمال کر کے ان کو ضائع کردے) ''

(قران شریف)

اگر هم انسانی روح اور انسانی شخصیت کی اس قدر مطلق کو تسلیم کرلیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا هے کہ انسان پوری طرح آزاد اور تربیت یافتہ اسي وقت هوتا هے جب وہ اپنے اعمال کی پوري ذمہ داری خود قبول کرے اور اس کی سیرت اخلاقی کمال پر اس وقت پہنچتی هے جب وہ اپنے اهم فرائض کو اپنے علم اور اپنی پسند سے انجام دے نہ اس وجہ سے کہ معاشرے کی نظر میں اچھا سمجھا جائے - ورنہ محض دوسروں کی تقلید میں یا ان کي خوشنودی کے خیال سے تو حیوان بھی بہت سے کام کرتے هیں - بعض جانور مثلاً کتے ، بندر ، گھوڑے وغیرہ اس طرح سدھائے جاتے هیں کہ وہ اپنی طبعی حرکات میں تبدیلی کر کے ایسے کام سیکھہ جائیں جو انسان کے لئے مفید یا مرغوب هوں لیکن اس '' سدھانے '' میں اور انسان کی '' اخلاقي تربیت '' میں بڑا فرق هے - جانوروں کو اپنے ان کاموں کی غرض اور غائت سے کوئی سروکار نہیں هوتا ، نہ وہ اخلاقاً ان کے نتائج کے ذمہ دار هوتے هیں - بر خلاف اس کے انسان ایک مکلف اور ذمہ دار هستی هے اور جب تک اسے یہ بات حاصل نہ هو کہ ضرورت کے وقت معاشرے کی بندشوں سے آزاد هو کر کام کرسکے اس کی ذمہ داری کوئی معنی نہیں رکھتی -

تربیت کو معاشرے کی تقلید تک محدود رکھنے میں بہت بڑا عمراني نقصان یہ هے کہ نظام اخلاق میں ارتقاء اور اصلاح کي گنجائش

نہیں رہتی - تعلیم محض موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس کا یہ مقصد اعلیٰ فوت ہو جاتا ہے کہ وہ "حیات برتر" کی کفیل ہو - ہم نے اس کتاب میں برابر تعلیم کے اس جامد مفہوم کی مخالفت کی ہے جس کی رو سے مدرسے کا فرض محض اتنا ہے کہ فرد اور ماحول میں مطابقت پیدا کی جائے - اخلاقی تعلیم کی بحث میں بھی ہم اس جامد نقطۂ نظر کو قبول نہیں کرسکتے کہ تعلیم مروجہ اخلاق کو اپنا منتہائے نظر سمجھ کر طلبہ کو اسی کے لئے تیار کرے - اگر ابتدائے تمدن سے یہ خیال کار فرما ہوتا تو شاید آج تک انسان اپنی قدیم وحشیانہ حالت سے آگے نہ بڑھ سکتا -

اکثر قوموں اور جماعتوں پر ایسے زمانے گزرے ہیں کہ ان کی اخلاقی حالت بہت ذلیل ہوگئی تھی اور معاشرے نے خوبیوں کو برائیاں اور برائیوں کو خوبیاں سمجھ لیا تھا - ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں نظام تعلیم کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ اس معیار اخلاق کو بچوں اور نوجوانوں میں رائج کرے - معاشری اخلاق کی صحت اور اصلاح کی ضمانت یہی ہے کہ افراد میں اپنے اور دوسروں کے اعمال کا محاسبہ کرنے کی قابلیت ہو اور وہ ہر مروجہ عقیدے اور اصول کو آنکھیں بند کرکے تسلیم نہ کرلیں اگر افراد کے نفس سے یہ صلاحیت جاتی رہے اور معاشرے کی حالت بہت ابتر ہو تو اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی انقلاب آفریں شخصیت پیدا ہو جو دلیری سے کام کر کے موجودہ نظام کو تہہ و بالا کردے اور لوگوں کو بہتر معیار اور اعلیٰ تر قدروں سے روشناس کرے - تاریخ میں بارہا ایسا ہی ہوا ہے - حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے رومی سوسائٹی کی کیا حالت تھی ؟ سب لوگ دولت پرستی اور عیش پسندی میں مبتلا تھے ، انسانوں میں مساوات اور ہمدردی باقی نہیں رہی تھی -

لوگ قوت کو انصاف کا مرادف جانتے تھے - غریب ہونا انتہائی ذلت کا باعث تھا اور انسان کو اس کے انسانی حقوق سے محروم کر دیتا تھا - کیا اس مصلح اعظم نے ان خیالات اور حالات کے سامنے سر تسلیم کردیا؟ نہیں اس نے ہر قسم کی مخالفت کے باوجود اپنا انقلاب انگیز پیغام معاشرے کے سامنے پیش کیا اور اس فرض کے ادا کرنے میں نہ ذاتی مصیبتوں کی پروا کی نہ اپنے زمانے کے تعصبات اور عقائد کا پاس کیا اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم نظام اخلاق کو درہم برہم کردے گی گویا ''! دیوانہ بکارگہ شیشہ گررسید !'' کا معاملہ ہوجائے گا - لیکن محض ان کی شخصیت اور بے خوف جد و جہد کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے ایک ایسے معیار اخلاق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جو مروجہ اخلاق سے کہیں بلند اور برتر تھا -

اسی طرح مہاتما بدھ نے اپنی سیدھی سادھی پاک صاف تعلیم ہندوستان میں پھیلائی اس وقت معاشرے کی اخلاقی حالت بہت خراب ہوچکی تھی - مذہب مہمل رسوم میں مبتلا ہو کر اپنی معنویت کھو چکا تھا اور لوگ ذات پات کی بندشوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ انسان کی بطور انسان کے نہ کوئی حیثیت تھی نہ حقوق - اس زمانے میں بدھ کی تعلیم بہت خطرناک معلوم ہوتی ہوگی اور کہنے والوں نے یقیناً یہ کہا ہوگا کہ اگر ایسے خیالات دنیا میں پھیل گئے تو نظام تمدن برباد ہو جائیگا - لیکن انہوں نے اپنے نور باطن کی ہدایت پر عمل کیا اور معاشرے کے اخلاق میں انقلاب کر دکھایا -

اسی قسم کے اثر کی سب سے زبردست مثال عرب میں حضرت محمدؐ رسول اللہ کی ذات میں نظر آتی ہے جنہوں نے بیس پچیس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی قوم کی کایا پلٹ دی جس کے اندر ہر

قسم کی اخلاقی خرابیاں اور عیوب صدیوں سے رچ گئے تھے - اس کی حالت کا جو نقشہ حالی نے اپنی مسدس میں کھینچا ہے - اس کی زندگی کا شاید ہی کوئی اصول یا عقیدہ ایسا ہو جو ناانصافی ' بد دیانتی اور بد اخلاقی پر مبنی نہ ہو - جب اس قوم کے سامنے حضرت محمدؐ نے اپنی پاک تعلیم پیش کی تو لوگوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا دین و مذہب ' تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل ہوگئی ہیں اور انہوں نے انتہائی شدت کے ساتھ اس نئی تعلیم کی مخالفت کی - لیکن پیمبر اور مصلح کا کام ہی یہ ہے کہ مخالفتوں کا مقابلہ کرے اور لوگوں کو راہ دکھائے خواہ اسے اس فرض کی ادائگی میں اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پڑے - چنانچہ حضرت محمد نے ایسا ہی کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جنگجو قبیلے ایک زبر دست منظم اور با اخلاق قوم بن گئے - ان تمام مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص جو کسی قوم کے لئے مصلح بن کر آتا ہے محض مروجہ اخلاق کی اشاعت پر قناعت نہیں کر سکتا -

اس سے کم درجے پر یہی فرض ہر معلم پر عائد ہوتا ہے - اس کو چاہئے کہ طلبہ میں ایسی صلاحیت پیدا کرے کہ وہ ضرورت کے وقت معاشرے کی قیود اور بندشوں سے آزاد ہوکر رائے عامہ کے خلاف ایسے کام کرسکیں جو ان کے نزدیک صحیح ہوں - یہ سچ ہے کہ عام لوگوں کو ایسے مواقع آئے دن پیش نہیں آتے اور ممکن ہے بعض کو کبھی ایسا موقع پیش ہی نہ آئے لیکن یہ اخلاقی جرات انسانی سیرت کا اعلیٰ زیور ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص انسانیت کی انتہائی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا - مندرجہ بالا مثالیں ایسے زمانوں کی ہیں جن میں معاشرے کی اخلاقی حالت خاص طور پر خراب ہوگئی تھی لیکن جو فرض

وہاں ان مصلحین اعظم کا تھا وہ آج کل بھی ہر ملک اور قوم میں معلموں اور مصلحوں پر عائد ہوتا ہے - دنیا میں کوئی معاشرہ ایسا نہیں جس میں اصلاح کی گنجائش نہ ہو، جس میں ایسے ادارے اور رسوم و قوانین نہ پائے جائیں جو ہر ذی حس اور انصاف پسند آدمی کے نزدیک قابل اعتراض ہیں - لہذا ہر جماعت میں ایسے دل و دماغ کے لوگوں کی ضرورت ہے جو اس کے نظام اخلاق کی تنقید اور احتساب کرسکیں اور ان تمام رسوم اور قوانین کے خلاف بغاوت کریں جو ان کے نزدیک افراد اور معاشرے کے لئے مضر اور انسانیت کے منافی ہیں اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم دنیا کے مختلف معاشروں کے نام لے کر یہ بتائیں کہ وہاں ایسے لوگوں کی کس قدر ضرورت ہے جو آزادی کے ساتھ اپنی عقل اور ضمیر کے مطابق کام کریں اور لوگوں کی نکتہ چینی اور ملامت کی پروا نہ کریں - مثال کے طور پر اگر ہم اپنے ہی ملک کی حالت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی خرابیاں موجود ہیں اور اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے - معاشرے میں عورتوں کا مرتبہ اور ان کی تعلیم، امیروں غریبوں کے باہمی تعلقات، محنت اور مشقت کرنے والوں کے ساتھ تعلیم یافتہ طبقے کا رویہ، دولت کا بےجا استعمال، کارو باری دیانت کی کمی، تعصبات اور توہم پرستی، غرض ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو ہمارے قوم کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں - جب تک نئی تعلیم یافتہ نسلوں میں اتنی اخلاقی جرات نہ ہو کہ وہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کریں اور لوگوں کی مخالفت اور ہنسی کو خاطر میں نہ لائیں عمرانی اصلاح ممکن نہیں - اس وجہ سے معلم کا ایک نہایت اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں اخلاقی جرات پیدا کرے -

باب دوم

اخلاق اور عمل

اب اخلاقي تربیت کا مسئلہ بحیثیت مجموعی واضح ہوگیا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اخلاق کي حدود کس قدر وسیع ہیں اور ایک نوخیز شخصیت کو اخلاقي سیرت کی تحصیل و تکمیل میں کن منازل سے گزرنا پڑتا ہے - ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ ہے کہ مدرسوں میں اخلاقي تربیت کے کیا وسائل اور ذرائع موجود ہیں اور ان سے کس طرح کام لینا چاہئے - اس بحث کے آغاز ہي میں اس بات کو اچھي طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ اخلاقی سیرت محض زبانی تعلیم و تلقین کے ذریعہ مستحکم نہیں ہو سکتی - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسي قسم کي تعلیم و تربیت بھی جس کا انحصار لفظي تعلیم و تعلم پر ہو موثر اور کامیاب نہیں ہو سکتي - جسم کی تربیت کے متعلق تو یہ بالکل ایک بدیہی امر ہے کہ جب تک ہم ورزش نہ کریں اور جسمانی صحت کو قائم رکھنے کے لئے مختلف مناسب ذرائع اور وسائل اختیار نہ کریں جسمانی نشو و نما کا امکان ہی نہیں خواہ ہمیں علم حفظان صحت سے کتنی ہی گہري اور وسیع واقفیت ہو - صحت کو قائم رکھنے کا علم یقیناً ضروري اور مفید ہے لیکن بجائے خود کافي نہیں جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے - یہي حال ذہنی تعلیم کا ہے - جب تک علم عمل کي کسوٹی پر نہ کسا جائے اور قوت سے فعل میں نہ آئے وہ ایک جسد بے جان ہے معلومات کا ایک جامد اور بے روح مجموعہ ہے - جس سے انسان مطلق فائدہ نہیں اٹھا سکتا - اخلاقی تربیت پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے - بلکہ اخلاق تو نام ہی عمل کا ہے - اس لئے یہاں یہ بات اور بھی

زیادہ وثوق کے ساتھہ کہی جاسکتی ہے کہ بچوں کو بہترین اخلاقی اصول اور عقائد کا یاد کرادینا اور سمجھا دینا اس بات کی ضمانت نہیں کہ وہ ان پر عمل بھی کریں گے - واقفیت اور سمجھہ بجائے خود بہت اچھی چیزیں ہیں اور بالغ و راشد ہوجانے کے بعد انسان کو ہر کام سوچ سمجھہ کر اس کی بھلائی برائی دیکھہ بھال کر کرنا چاہئے ورنہ اس کی حالت بالکل ایک مشین کی سی ہوگی - لیکن محض واقفیت کافی نہیں - اس کے ساتھہ قوت عمل کی بھی ضرورت ہے ' جو مشق یا عادت اور جسم اور دماغ پر قابو حاصل کرنے سے پیدا ہوتی ہے ' اور جوش جذبات کی بھی - جب تک یہ تینوں عناصر جمع نہ ہوں انسان ان طرح طرح کی ترغیبوں اور تحریصوں پر فتح نہیں پاسکتا جو اس کو راہ راست سے بر گشتہ کر دیتی ہیں اور اس کی سیرت اخلاقی اصول و اقدار کے مطابق تشکیل نہیں پاسکتی - ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ خیالات میں بجائے خود یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ افعال کو اخلاق کے سانچے میں ڈھال دیں - یعنی اگر ہم کسی بچہ کو اخلاق اور نیکی اور راست بازی کے متعلق چند باتیں بتادیں یا ایمانداری ، سچائی ' ہمدردی کی خوبیاں اس کے ذہن نشین کردیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خود بخود با اخلاق نیک اور راستباز بن جائیگا - یہ صفات اس کی سیرت کا جز و صرف اس صورت میں ہوسکتی ہیں جب اس کو روز مرہ کی زندگی میں اس کی مشق کرائی جائے کہ وہ بے ایمانی سے پرہیز کرے اور ایمان داری سے کام لے - جھوٹ سے بچے اور سچ بولے - اپنے دوستوں اور عزیزوں اور ضرورت مندوں کے ساتھہ ہمدردی کرے اور کسی کا دل نہ دکھائے - واقعہ یہ ہے کہ ذہنی تربیت کی طرح اخلاقی تربیت میں ذاتی اور بلاواسطہ تجربے اور اعادے کی اہمیت بہت زیادہ ہے - اخلاق کے دائرے

میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم محض دوسروں کے تجربے سے سیکھہ سکتے ہیں - یہاں قدم قدم پر خود محسوس کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے - بے شک والدین ' اُستاد اور معاشرے کے دوسرے افراد بچوں اور نوجوانوں کو مختلف طریقوں سے اپنے تجربوں کے نتائج سے آگاہ کرتے رہتے ہیں - لیکن جب انہیں خود سبق آموز اخلاقی تجربے حاصل نہ ہوں وہ ان کی نصیحتوں اور مشوروں کے معنی سمجھہ ہی نہیں سکتے - یہ سچ ہے کہ وہ ہر قسم کے تجربے خود حاصل نہیں کرسکتے لیکن کسی اخلاقی اصول کی تہ تک پہنچنے کے لئے اُنہیں اس نوعیت کے کچھہ نہ کچھہ تجربے ضرور ہونے چاہئیں تا کہ وہ ان کی بنا پر دوسروں کے تجربوں اور ان کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں کو معنی پہنا سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں - اس کی توضیح ایک مثال سے ہوسکتی ہے - فرض کیجئے آپ بحیثیت ایک معلم کے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نوجوان طالب علم کو وطن کی محبت اور وفاداری کا سبق سکھائیں اور یہ اصول اس کے ذہن نشین کریں کہ باہمی ہمدردی اور اشتراک عمل کے بغیر کسی قوم کا کام اچھی طرح نہیں چل سکتا - اس کا ایک پرانا اور مروجہ اصول تو یہ ہے کہ آپ اس موضوع پر لکچر دیں اور نظری طور پر یہ ثابت کر دکھائیں کہ محبت اور ہمدردی نہایت ضروری صفات ہیں جن کا اظہار ہر فرد کے عمل میں اور افراد کے باہمی تعلقات میں ہونا چاہئے - اگر طالب علم کی ذہنی نشو و نما اس حد تک ہو چکی ہے کہ وہ اس بحث اور ان دلائل کو سمجھہ سکتا ہے تو ممکن ہے یہ باتیں اس پر اثر کریں اور وہ اس اصول پر عمل کرنے کی کوشش کرے - لیکن اس کوشش میں کامیابی بہت مشکل ہے - اول تو جب تک اس میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ان مطالب کی تعبیر اپنی ذہنی اور عملی زندگی

ہیں کر سکے وہ ان کی پوری اہمیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا - یعنی اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم اور ملک اور اشتراک عمل وغیرہ کا تصور کرنے کے لئے اپنے گھر اور مدرسے کی زندگی اور اس کے مشاغل اور تعلقات کو پیش نظر رکھے - اور ان چیزوں کے اندر سے ان تصورات کی جھلک دکھائی دے - علاوہ بریں یہ اشتراک عمل کا اصول اس وقت تک اس کی عملی زندگی پر محیط نہیں ہوگا جب تک اسے بچپن اور جوانی کے زمانے میں چھوٹے پیمانے پر اس پر عمل کرنے کا موقع نہ ملے - لہذا مندرجہ بالا مثال میں معلم کو پوری کامیابی اسی صورت میں حاصل ہو گی جب بچوں کی خانگی اور مدرسے کی زندگی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ انہیں ہر روز امداد باہمی مبادلہ خیالات اور تجربات میں شرکت کے مواقع ملیں اور عملاً ان کے دل میں اس جماعت یا گروہ کے ساتھ وفاداری کا احساس پیدا ہو جس کے وہ رکن ہیں اور جس کی رکنیت کی وجہ سے انہیں بہت سے حقوق اور اختیارات حاصل ہوتے ہیں - اگر ابتدائی زندگی میں انہیں مسلسل اس قسم کے واقعی تجربے حاصل ہونگے تو جب وہ آیندہ بڑی جماعتوں کے رکن بنیں گے تو وہ قومیت اور شہریت کا صحیح مفہوم سمجھیں گے اور اس رشتہ کی اہمیت کو پہچانیں گے جو فرد اور جماعت میں ربط پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھ چکے ہیں گے کہ ان کی اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی کامیابی اور قیام کے لئے ایسے ہی تعلقات کی ضرورت ہے - علاوہ بریں وہ ذہنی اور جسمانی عادتیں جو اس اجتماعی زندگی کے بسر کرنے سے قائم ہونگی آگے چل کر بہت کام آئیں گی اور ان کے راستہ میں یہ رکاوٹ حائل نہ ہوگی جو عام طور پر پیش آتی ہے کہ "دل تو آمادہ ہے لیکن جسم ہیں سکت نہیں" -

اس مثال سے ایک اور اهم تعلیمی نتیجہ نکلتا ھے اور وہ یہ ھے کہ بچوں کو ایسے اخلاقي اصول اور قوانین نہیں بتانے چاھئیں جن کی ضرورت انھیں ابھی اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوئی اور جن کا تعلق اُن حالات اور مواقع سے ھے جن سے بچوں کو سابقہ نہیں پڑا - بالفاظ دیگر هم یہ کہ سکتے هیں کہ اگر مدرسے کو ایک اثر آفرین اخلاقی ماحول بنانا مقصود ھے تو اس میں بچوں کے لئے ایسے تمام مواقع اور وسائل مہیا کرنے چاهیں جن میں اخلاقی اصول و قوانین کی ضرورت پڑے اور نو عمر طالب علم بعض صورتوں میں ان کو نظری طور پر سمجھنے سے پہلے هی ان پر عمل کرنے لگیں اور اس طرح ان میں اخلاقی عادتیں پختہ هو جائیں - بعض ماهرین تعلیم اور ارباب فکر کا یہ خیال ھے کہ بچوں کی مطلق کوئی عادتیں ڈالنی هی نہیں چاهئیں - چنانچہ روسو (Rousseau) کا یہ مقولہ بہت مشہور ھے کہ :—

" امیل (Emile) کی صرف یہ عادت ڈالنی چاهئے کہ وہ کوئی عادت نہ ڈالے "

لیکن یہ خیال جو در اصل بعض خاص حالات کے خلاف رد عمل کے دور پر پیدا ہوا تھا ؛ غلط ھے اور نفسیات اطفال کا علم اس کی تائید نہیں کرتا - بچوں کے لئے نہایت ضروری ھے کہ وہ اوائل عمر هی میں مفید اور عمدہ عادتیں سیکھیں جو آئندہ چل کر ان کے لئے سہولت کا باعث هوں - اس معاملہ میں مشہور ماهر نفسیات ولیم جیمز (Willaim James) کی رائے زیادہ صائب ھے - وہ کہتا ھے کہ عمدہ عادتوں کو بطور ایک سرمائے کے سمجھنا چاهئے - کہ جب هم اسے جمع کرلیتے هیں تو اس کا سود همیں عمر بھر ملتا رهتا ھے [1] - ان عادتوں کی وجہ سے

---

[1] دیکھو ان کی مشہور تعلیمی تصنیف " Talks to Teachers " (مطبوعہ سے سو دو بائیں)

انسان اپنے روز مرہ کے معمول اور معینہ فرائض کو بغیر کسی دقت یا تامل کے پورا کر لیتا ہے اور جب کوئی نازک یا نئین موقع آکر پڑتا ہے تو وہ ان عادتوں کے بل پر اکثر بڑے بڑے کام کر جاتا ہے اور عارضی اور وقتی تحریصات پر غالب آجاتا ہے اس لئے موجودہ زمانے کے اکثر ماہرین تعلیم اس امر پر متفق ہیں کہ مدرسے کو ایک خوشگوار ماحول اور خوش اسلوب جماعت کی شکل میں مرتب کرنا چاہئے جس میں حقوق اور فرائض کی باقاعدہ تقسیم ہو جس کو تمام اراکین جماعت خوشی کے ساتھہ قبول کریں ' اور جماعتی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے فرائض محنت اور شوق سے ادا کریں اور اپنے حقوق سے جائز طور پر فائدہ اٹھائیں - اس طرح وہ قدرتی طور پر اخلاقی مسائل اور مشکلات سے دو چار ہونگے اور خود بخود ان کو حل کرنے کی کوشش کریں گے - ان کی کامیابی اور ناکامی ان کے لئے معلم کا کام دے گی اور وہ ایک مصروف عملی زندگی کے دوران میں بعض اہم ترین اخلاقی اصول سیکھہ لیں گے - بہت سے جدید تعلیمی تجربے مثلاً مس ہیلن پارکہرسٹ (Helen Parkhurst) کا طریقہ ڈالٹن (Dalton Plan) اور میڈم مانٹسوری (Montessori) کے مدرسے اسی اصول پر قائم ہیں کہ طلبہ میں احساس فرض اور انفرادی اور اجتماعی قوت عمل اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب انہیں ابتدا ہی سے چھوٹے چھوٹے فرائض کی بجا آوری کی عادت ڈالی جائے جن کو وہ اپنی مرضی اور خوشی سے بغیر بیرونی مداخلت کے انجام دے سکیں - جن مدرسوں میں تقسیم فرائض کا یہ تجربہ کیا گیا ہے وہاں ثابت ہوا ہے کہ اس طرح طلبہ میں نہایت مفید اخلاقی عادتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو انہیں عمر بھر کام دیتی ہیں بشرطیکہ معلم اپنی مثال اور شخصیت کے اثر سے ان میں جوش

اور خلوص کو قائم رکھے - جہاں کہیں منصوبی طریقہ (Project Method) استعمال کیا گیا ہے وہاں بھی یہی تجربہ ہوا ہے کہ اس سے نہ صرف ذہنی بیداری اور قوت اجتہاد پیدا ہوتی ہے بلکہ شخصی ذمہ داری اور امداد باہمی کا احساس بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے جو اخلاقی سیرت کی تکمیل کے لئے بہت ضروری ہے - لہذا معلوم ہوا کہ اخلاقی تربیت کا سب سے موثر اور اہم وسیلہ یہ ہے کہ مدرسے کی معاشری زندگی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ طلبہ عملاً ان تجربوں کو حاصل کریں جن پر اخلاق کا انحصار ہے -

بعض ماہرین تعلیم بالخصوص امریکہ کے تعلیمی مفکرین کا خیال ہے کہ اخلاقی اور معاشری تربیت بالکل ہم معنی ہیں اور ان دونوں کے حدود ایک ہی ہیں - یعنی اگر ہم کسی شخص کو معاشری زندگی کے تمام فرائض سکھادیں اور اسے ان کی ادائگی کے لئے تیار کردیں تو اس کی اخلاقی تربیت بھی مکمل ہو جائے گی - ہمیں اس نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق نہیں - یہ مانا کہ اخلاقی تربیت کا ایک بہت بڑا حصہ ان حقوق و فرائض پر مشتمل ہے جو معاشری زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اخلاق کا دائرہ ان تعلقات کی حدود سے بھی زیادہ وسیع ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے ساتھہ وابستہ کرتے ہیں - مشرق کے معلمین اخلاق نے ان حقوق کو جو کسی فرد پر عائد ہوتے ہیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے - اول حقوق اللہ یعنی وہ حقوق جو خالق کو اپنے بندوں پر حاصل ہیں اور جن کو پہچانے اور ادا کئے بغیر انسان اپنی پوری حقیقت کو نہیں سمجھہ سکتا - دوسرے حقوق العباد یعنی وہ حقوق جو ہمارے ابنائے جنس کو ہم پر حاصل ہیں اور جن کی وجہ سے تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھہ ایک رشتہ میں مربوط ہیں - تیسرے

حقوق النفس یعنی وہ حقوق جو خود ہمارے نفس کو ہم پر حاصل ہیں۔
انسان کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ تینوں قسم کے حقوق کو دیانتداری کے
ساتھ ادا کرے۔ وہ لوگ جو اخلاقی تربیت کو معاشرتی تربیت کا مرادف
قرار دیتے ہیں محض حقوق العباد پر زور دیتے ہیں
باقی دونوں قسموں کے حقوق کی پوری اہمیت تسلیم نہیں
کرتے۔ ممکن ہے کہ نظری طور پر فلسفہ ان تینوں کو ایک ثابت
کردے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ یہ تمام حقوق وفرائض ایک دوسرے سے وابستہ
اور مربوط ہیں، بالکل علاحدہ اور بے تعلق نہیں۔ لیکن عمل کے اعتبار سے
ان کی نوعیت میں فرق ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اپنے
معاشرتی فرائض ادا کرتا ہو لیکن حقوق اللہ اور حقوق نفس کی طرف
سے بالکل غافل ہو؟ مثلاً وہ معاشرتی خدمت انجام دے، ہمسایہ
اور شہر والوں کے حقوق ادا کرے۔ لیکن ان قدروں سے بے اعتنائی برتے جن
کا حامل مذہب ہے۔ یا وہ اپنی جسمانی صحت اور تہذیب نفس کی
مطلق پروا نہ کرے اور اسے اس کا احساس نہ ہو کہ خود اس کی ذات
میں اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں موجود ہیں جن کو قوت سے فعل میں
لانا اس کا فرض ہے۔ علاوہ بریں جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اخلاق کی
تکمیل کے لئے محض معاشرتی محرکات اور موانعات کافی نہیں یعنی کسی
شخص کو اچھے کام محض اس لئے نہیں کرنے چاہئیں کہ معاشرے
کے فرائض اور اخلاقی اصول اس کے متقاضی ہیں۔ نہ برے کاموں سے
صرف اس وجہ سے پرہیز کرنا چاہئے کہ وہ معاشرتی اخلاق کے خلاف ہوں گے۔
مکمل اخلاق کا مقتضا یہ ہے کہ جب انسان بالکل تنہا ہو یعنی سوائے
اپنی ذات یا اپنے ضمیر کے اس کا کوئی نگراں نہ ہو اس وقت بھی اس
کے خیالات اور جذبات میں پاکیزگی پائی جائے اور وہ خیال میں بھی برے
افعال کا مرتکب نہ ہو۔ وہ اس بات کو محسوس کرے کہ ایمان دیانت

داری ، راستی اور پاکبازی نہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ ان کی وجہ سے معاشری کار و بار اچھی طرح چلتے ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کے بغیر وہ اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا اور عزت نفس کو برقرار نہیں رکھہ سکتا ۔ اس طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے خالق کے ساتھہ محبت اور عبودیت کے وہ جذبات رکھے جو اس کی مختصر اور بظاہر بے معنی زندگی کو ابدی اور روحانی قدروں سے وابستہ کرتے ہیں اور اس کا رشتہ سر چشمہ حیات سے جوڑتے ہیں ، اگرچہ ان کا اثر براہ راست معاشری تعلقات پر نہیں پڑتا اور نہ ان کی جڑ معاشری زندگی میں تلاش کی جاسکتی ہے - یہ وہ مقام ہے جہاں اخلاق اور مذہب کی حدیں آکر مل جاتی ہیں اور انسان اپنے اعمال اور خیالات کا محاسبہ محض معاشری اخلاق کی بنا پر نہیں کرتا بلکہ احترام ذات اور قانون الہی کو اپنا رہبر بنا کر ان کی اصلاح کرتا ہے اور جہاں انسانی قانون کا دسترس نہیں وہاں بھی اپنے آپ کو ایک اعلی تر قانون کا پابند جانتا ہے -

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے بعد ہمیں اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اخلاقی تربیت کا بہت بڑا حصہ معاشری زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور طلبہ کی تربیت اس طرح ہوسکتی ہے کہ وہ مدرسے کی معاشری زندگی ، اس کی کشمکش اور جد و جہد میں پوری طرح حصہ لیں اور جو عملی مواقع وہاں بہم پہنچائے گئے ہیں ان سے پورا فائدہ اتھائیں - جس تربیت کی بنیاد بچوں کے گونا گوں معاشری تجربات پر نہ رکھی جائے گی اس کا اثر بہت جلد زائل ہوجائیگا اور اس سے آیندہ زندگی کے معاملات میں کام لینا ممکن نہ ہوگا - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اخلاق اور معاشرت کے قریبی تعلق سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:—

'' اخلاقی تربیت کے متعلق ہمارے جو تصورات اب تک رہے ہیں وہ سب بہت تنگ اور محدود تھے اور ان کی بنا زیادہ تر رسم و دستور پر تھی اور ان کا تعلق محض معاشرت کی حالت مرض سے تھا - ہم نے اخلاق کے مفہوم کو چند مخصوص اعمال کے ساتھ وابستہ کردیا ہے جن کو ہم '' نیکیاں '' کہتے ہیں اور انہیں باقی تمام مشاغل اور کاروبار سے بالکل علحدہ سمجھتے ہیں - یعنی اخلاقی اعمال ' معاشری ماحول سے جدا کرکے دیکھے جاتے ہیں. حالانکہ درحقیقت انسانی زندگی میں سوائے اسکے اور کوئی اخلاقی محرکات اور اخلاقی قوتیں نہیں ہیں کہ انسان میں معاشری عقل ہو' یعنی معاشری معاملات اور حالات کا مشاہدہ کرنے اور ان کو سمجھنے کی قابلیت ' اور معاشری قوت ہو' یعنی ضبط نفس کی تربیت یافتہ صلاحیتیں جو معاشری اغراض و مقاصد کے حاصل کرنے میں استعمال ہوسکیں '' - [۱] -

لیکن مدرسے کو اثر آفریں اخلاقی ماحول بنانے کے لئے ایک شرط نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا اور بیرونی دنیا کا تعلق برابر قائم رہے تاکہ وہ ایک قدرتی ماحول کی شکل اختیار کرے نہ کہ ایک بالکل مصنوعی ماحول کی جس میں بچے گرم خانے کے پودوں کی طرح نشو و نما پائیں - مدرسہ ایک ادارہ ہے جس کو معاشرے نے اپنی حیات اجتماعی کی بقا اور ترقی کے لئے قائم کیا ہے تاکہ جن اصولوں اور قدروں کو وہ عزیز رکھتی ہے اور اہم سمجھتی ہے وہ ایک نسل سے دوسری نسل

---

[۱] Educational Essays صفحہ ۵۷ - ۵۸ -

تک منتقل کی جائیں - اسی وجہ سے مدرسہ پر بہت بڑی اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے - جس سے وہ اس وقت تک عہد برآ نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اندرونی تنظیم انہیں اصولوں کے ماتحت نہ ہو جو بیرونی دنیا میں کار فرما ہیں - اسے اپنے نوعمر طلبہ میں ایسے معاشری عادات اور جذبات پیدا کرنی چاہئیں کہ جب وہ اس چھوٹے سے دائرے سے باہر نکل کر معاشرے کی زندگی کے وسیع میدان میں قدم رکھیں تو انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں - جہاں کے دستور و قوانین بالکل مختلف ہیں - اس سے یہ مراد نہیں کہ مدرسے میں معاشری زندگی کے خراب عناصر کو بھی جگہ دیجائے مثلاً افراد اور جماعتوں کی باہمی نزاع اور مسابقت کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش کو جس کا آج کل دور دورہ ہے - اس لئے کہ جیسا ہم کتاب کے آغاز ہی میں بتا چکے ہیں مدرسے معاشرے کا ایک چھوٹا سا نمونہ تو ضرور ہے لیکن ایک عمدہ اور منتخب نمونہ ہے - لہذا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو بہترین معاشری حالات بیرونی دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ مدرسے میں پیدا کریں - اگر ہمارے مدرسے زندگی کی کشمکش اور اس کے رسم و آئین سے بے تعلق اور نا واقف رہیں گے ' جیسے وہ آجکل بالعموم رہتے ہیں ' تو نہ ان میں بچوں کی مکمل ذہنی تربیت ہوسکے گی نہ اخلاقی - ان کے پیش نظر جو مقاصد ہیں ان کا مطلب اور مفہوم واضح نہیں ہوسکے گا کیونکہ بچوں میں ہم جن قوتوں کو نشو و نما دینا چاہتے ہیں ان کو آیندہ معاشری زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال ہونا ہے - اگر ان قوتوں کی نشو و نما ایک مصنوعی ماحول میں ہو اور ان میں اور زندگی کے واقعی مشاغل میں ربط نہ پیدا کیا جائے تو ہم کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ مدرسے کی تربیت اس

کے باہر بھی کام آئیگی ؟ - اس لئے مدرسے کے مشاغل کی اخلاقی قدر کا
اندازہ کرنے کے لئے ہمیں معاشرے کے مشاغل کو معیار قرار دینا چاہئیے -
اور انہیں کو پیش نظر رکھہ کر نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کا تعین
کرنا چاہئیے - یعنی مدرسے کو ایک زندہ معاشری ادارہ بنانا چاہئیے جس
میں مفید عادتیں اور رجحانات تربیت پائیں - جس طرح تیرنا سیکھنے
کا یہی ایک طریقہ ہے کہ آدمی پانی میں کود پڑے اور ہاتھہ پاؤں مارے اسی
طرح اخلاقی سیرت کی تعمیر بھی صرف اسی طرح ہوسکتی ہے کہ گھر میں اور
مدرسے میں بچہ ایسے کاموں میں مشغول رہے جو اخلاقی اور عمرانی اہمیت
رکھتے ہوں - نہ تیرنا ہوا میں تیراکی کے کرتب دکھانے اور اس کے گر یاد کرنے
سے آتا ہے نہ اخلاقی سیرت کی تکمیل اس زبانی اور نظری تعلیم سے ہو
سکتی ہے - جو طلبہ کی روز مرہ کی زندگی سے بالکل بے تعلق اور بے ربط ہو -
" مدرسہ اس وقت تک طلبہ کو معاشری زندگی کے لئے تیار نہیں کرسکتا جب
تک وہ اپنے گرد و پیش کے خاص خاص اہم ترین معاشری حالات کا نمونہ اپنے
اندر مہیا نہ کرلے " کیونکہ کسی کام کے لئے تیاری کا موثر ذریعہ یہی ہے کہ
اس کام میں عملاً شرکت کی جائے - اس لئے مدرسہ جدید کا تمام نظام اس طرح
مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے طلبہ کے محرکات عمل معاشری ہوں اور
ان کے پڑھنے ، لکھنے ، کھیلنے ، کودنے غرض تمام مشاغل میں امداد باہمی اور
اشتراک عمل کا وہی اصول کارفرما ہو جس پر تمدنی زندگی کا دارمدار ہے -

ہم اس بات پر بار بار زور دے چکے ہیں کہ تعلیم کے ہر شعبے
میں ہمیں اس وحدت کو پیش نظر رکھنا چاہئیے جو طلبہ کے نفس کی
خصوصیت ہے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے
مربوط اور سابستہ رکھتی ہے - ہم ان کی شخصیت کو عملاً دماغی ،
جسمانی ، معاشری اور اخلاقی شعبوں میں تقسیم نہیں کرسکتے - وہ

ہر کام اور ہربات میں اپنی پوری شخصیت کا اظہار کرتا ہے گو یہ ممکن ہے کہ ایک خاص وقت میں اس کا کوئی ایک پہلو مثلاً عقلی یا اخلاقی پہلو زیادہ نمایاں ہو اور باقی سب پوری طرح ظاہر نہ ہوں - اس لئے اس کی شخصیت کی مکمل، متناسب اور ہم آہنگ تربیت اس وقت ہو سکتی ہے جب اسکے ماحول کے تمام اثرات کا رجحان ایک ہی ہو، جب مدرسہ اور گھر دونوں اس کو ایک ہی معیار اخلاق کے مطابق تعلیم دیں اور تعلیمی زندگی کا ہر پہلو، مطالعہ، کھیل، نصاب تعلیم، ضبط و تادیب اپنی اپنی جگہہ پر اس کی سیرت کی صحیح تشکیل میں حصہ لے - مدرسے کے اس مجموعی نظام اور طلبہ کی معاشری زندگی کا اثر ان کی سیرت پر نہایت زبردست اور دیر پا ہوتا ہے - بشرطیکہ اس کے تمام عناصر یعنی اُستادوں کی سیرت اور شخصیت ان کا طرز تعلیم مدرسے کے تعلیمی مقاصد ان کی عام فضا یہ سب چیزیں بچوں کی اخلاقی تربیت میں مدد دیں اور ان کی ذہنی تعلیم ان کی روز مرہ کی زندگی کا جزو بنادی جائے، اس سے اس طرح علحدہ نہ رکھی جائے جیسے اسے اخلاقی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں - ہم ابھی یہ بحث کریں گے کہ ان تمام عناصر کو اخلاقی تربیت میں کہاں تک دخل ہے - لیکن اس بحث کی ضرورت اسی وقت سمجھہ میں آسکتی ہے جب ہم خلاق کے مذکورہ بالا مفہوم ذہن میں رکھیں - اخلاق کا اطلاق ان تمام کاموں اور باتوں پر ہوتا ہے جو ہم روز کرتے رہتے ہیں - جس طرح معاشری زندگی میں ایک بالغ آدمی کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں - اسی طرح مدرسے میں بچہ کی مختلف حیثیتیں ہیں - اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ ان تمام حیثیتوں میں اپنے فرائض کو عمدگی کے ساتھہ اصول اخلاق کے مطابق ادا کرے تو نہ صرف اسکے جذبات کی تربیت ضروری

ہے بلکہ اس کے جسم اور دماغ اور عادات سب کی نشو و نما ایسی
ہم آہنگی کے ساتھہ کرنی چاہئے کہ وہ اس کی زندگی کے انتہائی اخلاقی
مقصد میں معین ہوں - اس لحاظ سے ایک طالب علم کو تاریخ ، ادب
یا سائنس کی مناسب تعلیم دینا ، اس کی طبیعت میں فنون لطیفہ
کا ذوق پیدا کرنا ، اسے علمی تحقیقات اور اختراع کا شوق دلانا اور اس
کے طریقے سکھانا ، مادری زبان یا غیر زبانیں پڑھانا جن کے ذریعہ سے
وہ لوگوں کے خیالات اور جذبات خود سمجھہ سکے اور اپنے خیالات دوسروں
کو سمجھا سکے ، اس کی جسمانی نگہداشت کا اہتمام کرنا ، اس کے آنکھ
اور ہاتھہ کی اس طرح تربیت کرنا کہ وہ اپنے اندرونی جذبات اور
میلانات کو کسی مرئی شکل میں ظاہر کرسکے ، اس کو محنت ، کوشش
اور امداد باہمی کی عادتیں سکھانا ، یہ سب وسیع معنی میں اخلاقی
تربیت کے اجزا ہیں بشرطیکہ بچہ ان تمام صلاحیتوں کو اس طرح
استعمال کرے کہ ان سے نہ صرف اسکی ذات کو فائدہ پہنچے بلکہ عمرانی
مقاصد میں بھی امداد ملے - اگر مدرسہ اپنے ہر کام میں اخلاقی مقصد
کو مقدم رکھے گا تو وہ طلبہ کی شخصیت کو مستقل طور پر جیسا
چاہئے متاثر کرسکے گا -

باب سوم

عقلی اور اخلاقی تربیت کا تعلق

عقل اور اخلاق کا تعلق

مدرسے کی اخلاقی تنظیم کے معاملے میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم عقل اور اخلاق میں کیا تعلق ہے اور عقلی تربیت کس طرح اخلاقی تربیت میں معین ہو سکتی ہے - اس مسئلے میں ارباب فکر کے درمیان اختلاف رہا ہے - مثلاً افلاطون، کانت وغیرہ کا خیال ہے کہ عقل ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی بصیرت پیدا ہوتی ہے اور عقل ہی اخلاقی افعال کی محرک ہوتی ہے - بر خلاف اسکے بعض حکما کا خیال ہے کہ انسان عقل کی بھول بھلیاں میں پڑ کر اکثر سیدھے راستہ سے بھٹک جاتا ہے اور اس قوت کو دوسروں کے نقصان اور تخریب کے لیے استعمال کرتا ہے - بعض نے عقل اور وجدان یا عقل اور عشق کو متضاد ٹھہرا کر انسان کو فریب خرد سے متنبہ کیا ہے - چنانچہ منجملہ اور بہت سے مشرقی شعراء اور فلسفیوں کے اقبال نے بھی اپنے کلام میں جا بجا اس مضمون کو ادا کیا ہے نقش فرنگ [۱] میں " پیام " کے عنوان سے وہ دانایان فرنگ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں :-

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را این بجگرمی زند آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است

[۱] " پیام مشرق " کا ایک حصہ -

چشم جز رنگ گل ولالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
آتش اندوختۂ دل زکف انداختۂ
آہ زاں نقد گرانمایہ کہ درباختۂ !

علاوہ ان فلسفیانہ خیالات کے عام لوگوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ عقل اور اخلاق ایک دوسرے کی ضد نہیں تو کم از کم ایک دوسرے سے بے تعلق ضرور ہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ روز مرہ کے معاملات میں دانشمندی اور تدبر کا تقاضا کچھہ اور ہوتا ہے اور اخلاق کا کچھہ اور کم از کم نظري طور پر وہ اخلاق کے حکم کو عقل کے مشورے سے بہتر اور بر تر سمجھتے ہیں - ہمارے ملک میں عقل اور اخلاق کی یہ تقسیم اور تفریق بہت عام ہے - ہم لوگوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ فلاں شخص بے وقوف تو ہے مگر نیک بہت ہے - یا اس کا دل تو بہت اچھا لیکن دماغ کمزور ہے اور بالعموم اس قسم کے جملے تعریف کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں - یہاں نیکی اور دل کا تعلق اخلاق سے فرض کیا گیا ہے - اور دانشمندی اور دماغ کا تعلق عقل سے ، اور اگر ایک شخص کے اخلاق میں کوئی قابل اعتراض بات نہ ہو تو اس کے بیوقوف یا سادہ لوح ہونے میں چنداں نقصان نہیں سمجھا جاتا - ہم نے انسانی شخصیت کی تہ میں جس وحدت کو کار فرما تسلیم کیا ہے اس کے لحاظ سے ہم اس تضاد کو صحیح نہیں سمجھہ سکتے - اگر بالفرض ہم اس " بیوقوف لیکن نیک " شخص کی نیک نیتی کے معترف بھی ہوں تب بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ایسا آدمی اپنے نیک ارادوں کو عمل میں نہیں لاسکتا کیونکہ ارادے کو فعل میں لانے

کے لئے عقل اور علم درکار ھیں جو اس میں موجود نہیں - اول تو اس کے لئے یہی بہت مشکل ھے کہ زندگی کے پیچ در پیچ معاملات میں صحیح رائے قائم کرسکے اور سمجھہ سکے کہ کس موقع پر کونسا طریق عمل نیک اور '' اخلاق '' کے مطابق ھے اور کونسا اس کے منافی - دوسرے اگر ھم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیں کہ کسی خاص موقع پر وہ یہ سمجھہ سکتا ھے کہ اسے کیا کرنا چاھئے تو اس میں وہ مصلحت بینی ' دور اندیشی اور مشکلات کو حسن تدبیر سے دور کرنے کی قابلیت کہاں سے آئے گی جو اخلاقی افعال کے لئے ناگزیر ھے - اس لئے جس شخص کے افعال و اعمال علم و عقل کی ھدایت سے محروم ھوں گے وہ صحیح معنی میں اخلاقی زندگی بسر نہیں کرسکتا - یہ ممکن ھے کہ وہ ایک مشین کے پرزے کی طرح دوسروں کے اشارے پر چلے ان کی بتائی ھوئی باتوں پر عمل کرے اور اس کے ھاتھہ سے '' اچھے '' کام عمل میں آئیں لیکن اس قسم کے افعال کی وہ اخلاقی قدر نہیں ھوسکتی جو ایک سمجھدار اور معاملہ فہم آدمی کے کاموں کی ھوتی ھے جس کے دل میں ذمہ داری کا احساس ھے اور جس کے اعمال کی محرک اس کی اپنی تربیت یافتہ ذات ھے - علاوہ بریں زندگی میں جدت اور تنوع کی کارفرمائی ھے - اس میں آئے دن نئے مسائل اور نئے مواقع پیش آتے رھتے ھیں - یہاں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کسی ایک معمول کا دھراتے رھنا ھرگز کافی نہیں ھوسکتا - اسی لئے اور بھی عقل کی ضرورت ھے کہ وہ ھر نئی گتھی کو سلجھاتی رھے - اگر ھمارے مشین نما '' نیک آدمی '' کو کوئی ایسا نیا موقع پیش آجائے جہاں وہ اپنے مقررہ طریقہ عمل کو کام میں نہ لاسکے تو وہ بالکل بے بس ھوکر رہ جائے گا اور ممکن ھے وہ کوئی بہت خطرناک غلطی کر بیٹھے - اسی لئے کہا گیا ھے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ھے -

علم اور اخلاق کے اس لازمی رشتے پر جس کا ہم نے ذکر کیا ہے ایک اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے - کہا جاتا ہے کہ علم بجائے خود حسن عمل کے لئے کافی نہیں - تجربہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں بات اچھی ہے اور فلاں بات بری ہے - لیکن وہ اس علم پر عمل نہیں کرتے اور اچھی باتوں کو چھوڑ کر بری باتوں کی طرف راغب ہوتے ہیں - لہذا ان کو ''جاننے'' سے کیا فائدہ ؟ یہ وہی اعتراض ہے جو ارسطو نے سقراط کے اس مشہور قول پر کیا تھا کہ علم '' اور خیر ایک ہی چیز ہے اور کوئی شخص جان بوجھ کر شر کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ انجان پن کی وجہ سے ایسا کرتا ہے - بادی النظر میں سقراط کا یہ خیال بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم آئے دن یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ باوجود خیر کا علم ہونے کے شر کے مرتکب ہوتے ہیں - لیکن یہ اعتراض در اصل علم کے غلط مفہوم پر مبنی ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اخلاق کے نظریوں سے بحث کرتے ہوئے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ '' علم '' سے سقراط کی مراد سطحی واقفیت نہیں جو دوسروں کی وساطت سے حاصل ہو اور ذہن پر محض ایک بار ہوکر رہ جائے - اس کی رائے میں '' نظری طور پر خیر کا مفہوم سمجھنا (یعنی اس کا حقیقی علم حاصل کرنا) اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان سالہا سال ضبط نفس اور عمل کی منزلوں میں سے نہ گزر چکا ہو - خیر کا علم ایسی چیز نہیں جو کتابوں سے یا دوسرے لوگوں سے ہاتھ آسکے - وہ طویل اور مسلسل تربیت کے بعد نصیب ہوتا ہے اور زندگی کے پختہ کارانہ تجربات کا ماحصل ہے '' [1]

[1] Democracy and Education صفحہ ۴۱۲ -

بات یہ ہے کہ ''علم ' کا ایک لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے - اس کے ایک معنی تو وہ ہیں جو افلاطون کے پیش نظر تھے - یعنی وہ مضبوط اور راسخ عقیدہ جو ذاتی تجربے اور تنقید کے بعد حاصل ہو اور انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے - یہ علم کا حقیقی اور گہرا مفہوم ہے - دوسرے معنی وہ ہیں جو بالعموم لوگوں میں اور بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں بھی رائج ہیں یعنی وہ سطحی واقفیت جو دوسروں کے واسطہ سے حاصل ہوجائے ' جس میں ہمیں ذاتی کاوش نہ کرنی پڑے اور ہمارے ذاتی تجربے اور مشاہدہ کو دخل نہ ہو - اگر علم سے ہماری مراد یہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا اثر ہماری سیرت اور ہمارے طرز عمل پر یا تو بالکل نہ ہوگا یا اتنا کم کہ نہ ہونے کے برابر ہو - مدرسے کے طلبہ جو باتیں کتابوں میں پڑھ کر یا استادوں سے سن کر یاد کر لیتے ہیں ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے ' اور اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتا ' کہ وہ ضرورت کے وقت ان باتوں کو دہرا دیں - ان کی وجہ سے ان کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوسکتا - علم کا یہ مفہوم صریحاً بہت ناقص اور محدود ہے اور اُستاد کو ہرگز اس قسم کا علم سکھانے پر قناعت نہیں کرنی چاہئے - وہ ہرگز یہ توقع نہیں رکھہ سکتا ہے کہ اس ''علم'' کو اخلاقی تربیت میں ذرا بھی دخل ہوگا - تعجب یہ ہے کہ ایک طرف ہم تعمیر سیرت کو تعلیم کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف تعلیم کے عقلی پہلو کو جس میں مدرسے کا بیشتر وقت صرف ہوتا ہے ہم نے ایسے غلط اصولوں پر مبنی کیا ہے کہ اس سے اس مقصد اعلیٰ کی تکمیل میں کوئی مدد ملتی - اس دوئی کی وجہ سے اخلاقی تعلیم بالکل بے معنی اور بے اثر ہوکر رہ جاتی ہے - مدرسہ کا معمول اپنی بندھی تکی چال چلتا رہتا ہے

اور اس کو اخلاقی تربیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ البتہ بعض خاص موقعوں پر اُستاد اپنے طلبہ کو اخلاق اور فرائض کے متعلق چند باتیں بتا دیتے ہیں جن کو وہ کم و بیش بددلی کے ساتھ سنتے ہیں اور ضرورت ہو تو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں - ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں وہ اُستادوں یا بزرگوں یا معاشرے کی خاطر ان باتوں پر ایک حد تک عمل بھی کریں - لیکن اس عمل کا محرک ان کی عقل یا ان کا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا بلکہ ایک خارجی اثر ہوتا ہے - کبھی صورت حال اس سے بھی بد تر ہوجاتی ہے یعنی اخلاقی ہدایتیں جبراً ان پر عائد کی جاتی ہیں جن کو وہ بغیر سمجھے بوجھے محض خوف کی وجہ سے قبول کرلیتے ہیں - اس حالت میں بھی ان کے عمل کی ذمہ‌داری دوسرے لوگوں پر ہے - جب کبھی رائے عامہ کا دباؤ یا اُستاد کا اندیشہ دور ہوجاتا ہے تو اس کا اثر بہت خراب پڑتا ہے یعنی انسان کا اخلاقی توازن بالکل بگڑ جاتا ہے - چونکہ خود اس کے نفس میں کسی قسم کا اخلاقی ضبط نہیں ہوتا اور بیرونی اثرات جو اس کو ایک حد تک روکے ہوئے تھے ہٹ جاتے ہیں اس لئے وہ موقع پاتے ہی کھل کھیلتا ہے اور اخلاقی اصول اور قوانین کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہشات اور خارجی تحریکات کا غلام ہوکر رہ جاتا ہے - اس کے علم اور اخلاق کے درمیان کوئی ایسا مضبوط اور مستحکم رابطہ قائم نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذاتی ہدایت کی ذمہ‌داری اپنے سر لے سکے - یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب مدرسے کے تعلیمی نظام کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ وہاں بچے جو کچھ سیکھیں ' جو علم حاصل کریں اس کا اثر براہ راست ان کے طرز عمل پر پڑے - شوق اس کا محرک ہو اور تجربہ اور مشاہدہ اس کی بنیاد : اور اس طرح وہ عقیدے کی سی پختگی حاصل کرے اور خود بخود ہماری طبیعت میں اور ہمارے

کاموں میں ظاهر هو - روز مرہ کی زندگی میں هم هر وقت اس علم کو استعمال کرتے هیں جو اس درجہ هماری طبیعت اور سیرت کا جزو هوگیا هے کہ اسے نظر انداز کرنے کا خیال بھی همیں کبھی نہیں آسکتا - اس کی مثالیں هر وقت همارے سامنے هیں -

"جب کبھی کوئی شخص بجائے جلتے هوئے چولھے پر بیٹھنے کے کرسی پر بیٹھتا هے یا بارش میں چھتری لیکر نکلتا هے یا بیماری میں ڈاکٹر سے مشورہ کرتا هے یا ان هزاروں کاموں میں سے جو اس کا روز مرہ کا معمول هیں کوئی کام کرتا هے تو وہ اس بات کو ثابت کرتا هے کہ علم ایک خاص حالت کو پہنچ کر خود بخود عمل کی صورت میں ظاهر هوتا هے" - [1]

علم کی یہ خاص حالت اسی وقت هوسکتی هے جب انسان اس کو اپنے تجربے اور مشاهدے کے ذریعہ حاصل کرے اور وہ اس طرح اس کی طبیعت میں رچ پچ جائے کہ اس کو بھولنا یا اس کی طرف سے بے پروائی برتنا ممکن هی نہ هو بلکہ استعمال کے وقت اس کو شعوری طریقے پر سوچنے کی ضرورت بھی نہ پڑے - یہی اصول اخلاق پر ' جو هماری زندگی کی رهنمائی کرتا هے ' صادق آتا هے اگرچہ اس کے حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے میں زیادہ مشکلات هیں اور زیادہ عقلمندی کی ضرورت هے - جب هم خیر اور اخلاق کا مفہوم اور اپنے فرائض کی ادائگی کا سبق گھر کی عملی درسگاہ میں یا مدرسے کے منظم ماحول میں یا بیرونی دنیا کی کشمکش میں سیکھتے هیں اور خود همارے تجربات اور مشاهدات همارے معلم هوتے هیں تو یہ چیزیں همارے فلسفہ زندگی

---

[1] Democracy and Education ۱۱۲ صفحہ

کا جزو بن جاتی ہیں اور ہمارے محرکات عمل میں شامل ہوجاتی ہیں - یہاں علم و عمل ' عقل و اخلاق کی وہ تفریق مٹ جاتی ہے جس کی وجہ سے آج کل ہمارے مدرسوں کی تعلیم اس درجہ ناقص ہوگئی ہے -

علم و اخلاق کی اس بحث سے مدرسے کی تنظیم کے متعلق کئی قابل قدر نتائج نکلتے ہیں - اگر ہم ان دونوں کے درمیان یہ رشتہ تسلیم کریں تو اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ مدرسے کو ایک عمرانی جماعت کی شکل میں مرتب کرنا چاہئے جس کے ہر شعبے میں معاشری اصول اور محرکات کی کار فرمائی ہو یعنی بچے ایسے مشاغل میں مصروف ہوں جو ایک دوسرے کی مدد سے تکمیل کو پہنچائے جائیں اور جن کی بدولت وہ معاشری معاملات کو سمجھنا اور ان میں دلچسپی لینا سیکھیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں ' کھیلیں ' کودیں ' کھائیں ' پئیں اور مختلف قسم کی انجمنیں بناکر فرصت کے اوقات میں اپنے اپنے پسندیدہ مشاغل سے لطف اور فائدہ اٹھائیں - اور اس طرح ان عمرانی اور اخلاقی اصولوں کی اہمیت اور مفہوم کو سمجھیں جن کا ذکر وہ کتابوں میں پڑھتے ہیں یا استادوں سے سنتے ہیں - اس تبدیلی سے مدرسے کا وہ پرانا مفہوم قائم نہیں رہیگا جس کے مطابق یہ محض ایک " جائے درس " سمجھا جاتا ہے جہاں بچے لکھنے پڑھنے آتے ہیں جس کو ان کی جبلتوں اور فطری دلچسپیوں اور بیرونی دنیا سے کوئی سروکار نہیں اس کے بجائے ہم مدرسے کو جیسا کہ ہم وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں ' چھوٹے پیمانے پر جماعتی زندگی کا ایک نمونہ بنانا چاہتے ہیں جہاں طلبہ مشاہدات اور تجربات سے مالا مال اور راحت اور مسرت سے معمور زندگی بسر کریں جس میں ان کی مخصوص جبلتوں کو اظہار اور نشو و نما کا موقع ملے اور وہ اپنی ضروریات اور خواہشات

کے مطابق تحصیل علم میں ترقی کرتے رہیں - اس مدرسے میں عمل پر، زندگی پر، فعالیت پر زور دیا جائیگا اور علم اس طرح سکھایا جائیگا کہ بچے اس کی مدد سے ان مسائل کو حل کرسکیں جو ان کے پسندیدہ مشاغل کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں - اسی وجہ سے جدید تعلیمی تحریکوں کی کوشش یہ ہے کہ نصاب تعلیم میں بجائے غیر مربوط اور مجرد اسباق کے مختلف قسم کے مسلسل عملی مشاغل داخل کئے جائیں - ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے ہم ان کی اہمیت کو واضح کر چکے ہیں لیکن اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بھی وہ بہت ضروری ہیں - ان مشاغل کے دوران میں بچے جو تخلیقی کوشش کریں گے اس میں ان کو نہ صرف جسم اور دماغ کی ہم آہنگ تربیت کے مواقع ملیں گے بلکہ مدرسے کی ساری فضا میں اشتراک عمل اور عمرانی زندگی کے اصولوں کی کار فرمائی ہوگی - بہت سی جدید تعلیمی تحریکیں مثلاً نصاب میں دستکاری اور صنعت و حرفت کے عناصر کا شامل کرنا، سائنس میں عملی کام کی اہمیت پر زور دینا، طلبہ میں حکومت خود اختیاری کا اجرا ان سب میں یہ مقصد مشترک ہے کہ طلبہ کو معاشری ضبط اور تربیت حاصل ہو جو اخلاقی تربیت کی بنیاد ہے -

یہ بھی ممکن ہے کہ مدرسے کے ماحول میں امداد باہمی اور اشتراک عملی کے مواقع مہیا ہوں اور بچے مل جل کر کھیلیں، کام کریں، رہیں سہیں، اور آپس میں ہمدردی اور دوستی کا برتاؤ کریں لیکن ان کی یہ عادتیں اور صلاحیتیں ایک مخصوص اور محدود ماحول کے ساتھہ اس طرح وابستہ ہوجائیں کہ جب وہ مدرسہ سے باہر نکل کر زندگی کے مشاغل میں شریک ہوں تو ان صفات کا مناسب حال استعمال نہ کرسکیں اور ان اصولوں کو سب لوگوں کے ساتھہ نبھانے میں کامیاب

نہ ہوں یہ اندیشہ ایسی حالت میں زیادہ ہوتا ہے جب مدرسے کی زندگی اور بیرونی زندگی میں کوئی زندہ رابطہ نہ ہو اور طالب علم تمدنی زندگی کے مسائل اور مصروفات سے بے تعلق ہو کر مدرسے میں بالکل قلعہ بند ہوجائے جہاں نہ باہر کے اثرات پہنچ سکیں نہ باہر کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور اتحاد اغراض و مقاصد پیدا ہوسکے - جن مدرسوں میں تاریخی حالات کی وجہ سے خاص رسوم و روایات قائم ہو جاتی ہیں وہاں یہ بے تعلقی بہت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے - اس کی ایک نہایت واضح مثال انگلستان کے پبلک اسکولوں میں ملتی ہے - ان اسکولوں کی محدود چار دیواری میں ایک خاص قسم کی فضا اور روایات پیدا ہوگئی ہیں جن کی بدولت وہ نہایت کامیابی کے ساتھ ان عادات و خصوصیات کو نشو و نما دیتے ہیں جو ان کے نزدیک قابل قدر ہیں - اور اپنے طلبہ میں ایک مخصوص سیرت کی تشکیل کرتے ہیں - لیکن ان کا نقطۂ نظر اور تخیل دونوں تنگ ہیں - اس وجہ سے ان کی تربیت ناقص اور نامکمل رہتی ہے - ان میں باہمی ہمدردی یک جہتی اور تعاون کی جو صفات پرورش پاتی ہیں وہ اپنی جماعت اور اپنے طبقہ کے لوگوں تک محدود ہیں - ان کے دائرے میں خود اپنی قوم کے کل افراد تک شامل نہیں ہوتے - ان میں ایک " پبلک اسکول کی ذہنیت " پیدا ہو جاتی ہے جو قوم کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیتی ہے - ایک وہ جس نے ان اسکولوں میں تعلیم پائی ہے دوسرا وہ جو اس شرف سے محروم رہا ہے - وہ موخرالذکر طبقے کے لوگوں کو جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اپنے آگے حقیر جانتے ہیں اور معاشری معاملات میں انہیں اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے - ظاہر ہے کہ جمہوری معاشرے میں اس قسم کی سیرت قوم کے لئے مفید نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اُس تفریق کو اور مستحکم بناتی ہے

جس کو دور کرنا جمہوریت کا اولین فرض ہے - ہمارے ملک میں یہ تفریق کسی قدر مختلف صورت میں پائی جاتی ہے - ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی زبان اور آداب معاشرت سیکھ کر گویا ایک نئی تہذیب اور نیا تمدن اختیار کر لیا ہے - یہ لوگ خود کو باقی تمام ابنائے وطن سے، جن کو یہ تعلیم یا کسی طرح کی تعلیم بھی نصیب نہیں ہوئی، بالکل مختلف اور ممتاز سمجھتے ہیں ان کا کام اور تفریح، ان کا طرز خیال اور طرز معاشرت، ان کے اغراض و مقاصد غرض سب چیزیں عام لوگوں سے مختلف ہو جاتی ہیں - تعلیم یافتہ طبقے اور جمہور کی یہ باہمی اجنبیت ملک و قوم کے اخلاقی، معاشری اور سیاسی مفاد کے لئے بہت مضر اور خطرناک ہے - اگر چہ گزشتہ بیس سال میں زیادہ تر سیاسی وجوہ سے اس میں مقابلتاً کمی واقع ہوئی ہے لیکن اب بھی کالجوں اور اسکولوں کے تعلیم یافتہ لوگوں اور ملک کی بے شمار دیہاتی آبادی کے درمیان ایک سد سکندری ہے جس کو دور کرنا قومیت کی نشو و نما کے لئے نہایت ضروری ہے - علاوہ اس کے ہم کسی ایسے نظام اخلاق کو مکمل نہیں مان سکتے جس کا دائرہ ایک خاص جماعت یا طبقہ تک محدود ہو کیونکہ اخلاق کی بنیاد کسی امتیازی خصوصیت مثلاً رنگ یا نسل یا وجاہت ظاہری یا تعلیم یا مالی اور معاشری حیثیت پر نہیں رکھی جاتی بلکہ انسانیت کے اس عنصر پر قائم ہے جو تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہے حقیقی اخلاق اور سچی تہذیب کی پہچان صرف ایک شے ہے اور وہ یہ کہ جن لوگوں کی صورت میں اخلاق کے اصول محض ظاہری شائستگی اور آداب محفل کی سطح پر نہیں رہتے بلکہ دل تک اتر جاتے ہیں ان کا اخلاق اور ہمدردی

باران رحمت کی طرح ہر شخص کے لئے ہوتا ہے - اس میں امیر اور غریب ' جاہل اور عالم کا امتیاز نہیں ہوتا - اخلاق طبیعت کا ایک خاصہ ہے جو مشک کی خوشبو کی مانند ہرجگہ اور ہر موقع پر ظاہر ہوکر رہتا ہے - ہم اپنے مدرسوں میں اس اخلاق کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس کے دائرے میں تمام عالم انسانی آجائے - یہ آرزو اُسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب مدرسے کی زندگی اور بیرونی زندگی میں اچھی طرح ربط ضبط پیدا ہو جائے اور ایک طرف مدرسے میں عمرانی زندگی کے بہترین عناصر اور مشاغل مہیا ہوں اور دوسری طرف طالب علم اپنی تعلیم و تربیت کے نتائج کو بیرونی زندگی میں استعمال کرے اور دیکھے کہ انصاف ' تقسیم عمل ' امداد باہمی ' ادائے فرض ' راست بازي ' معاشری وفاداری کے اصول نہ صرف مدرسے کی زندگی میں ضروری ہیں بلکہ دنیا کے کارو بار کو کامیابی اور عمدگی کے ساتھہ چلانے کے لئے بھی ناگزیر ہیں اور تمام نظام تمدن میں ان کي کار فرمائي ہے اور ہونی چاہئے - لہذا اخلاقی تربیت کے لئے لازم ہے کہ ہم مدرسۂ جدید کے نصاب کو معاشری ضرورت اور مقاصد کے مطابق تربیت دیں اور اس کے طریقۂ تعلیم کو عمرانی زندگی کے طریقہ کار کے ساتھہ ہم آہنگ بنائیں تا کہ طلبہ تمدنی زندگي کے اخلاقي اصول عملی طور پر سیکھہ لیں -

نصاب تعلیم کی اہمیت

مدرسے کا نصاب اخلاقی تربیت میں کیونکر معین ہوسکتا ہے اور اپنے طلبہ میں معاشري صلاحیت کس طرح پیدا کر سکتا ہے ؟ نصاب تعلیم کی بحث میں ہم بتا چکے ہیں کہ نصاب بنانے والوں کو معاشری زندگی کے مختلف شعبوں سے ان بہترین اور اہم ترین عناصر کا انتخاب کرنا چاہئے جو اس کی مستقل اقدار و مقاصد کے حامل

ھوں تاکہ ان کے مطالعہ سے طالب علم کے ذہن میں نظام تمدن کو سمجھنے کی قابلیت اور بصیرت پیدا ھو اور وہ اپنی سیرت کو اس کے ساتھ ہم آھنگ بنا سکے - اگر نصاب کے تمام مضامین کا مطالعہ محض اس نظر سے کیا جائے کہ ان سے معلومات میں تھوڑا بہت اضافہ ھو اور امتحان میں کامیابی حاصل ھو جائے تو ان کی کوئی خاص اخلاقی یا عمرانی اھمیت نہ ھوگی - برخلاف اس کے اگر ان کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان سے طلبہ کو معاشری زندگی کے اصول و اساس سے واقفیت ھو اور بہتر زندگی بسر کرنے میں مدد ملے تو ان کی اخلاقی قدر میں کوئی شبہہ نہیں - اس کی تشریح کے لئے ھمیں درسی مضامین کی نوعیت کے متعلق اس تمام بحث کا اعادہ کرنا پڑیگا جو ھم ایک دوسرے سلسلے میں اس سے پہلے کرچکے ھیں - اس کا تو یہاں موقعہ نہیں - لیکن ھم اخلاقی تربیت کے نقطۂ نظر سے یہ بتانا چاھتے ھیں کہ اس مقصد کے لئے بعض اھم درسی مضامین کی تنظیم و ترتیب میں کیا تبدیلی لازمی آئیگی -

سب سے پہلے تاریخ کو لیجئے - اگر تاریخ محض پرانے واقعات اور بھولے بسرے افسانوں کا مجموعہ سمجھہ کر پڑھی اور پڑھائی جائے ' جیسا بالعموم ھمارے مدارس میں ھوتا ھے تو اس سے نہ عمرانی تربیت میں مدد ملے گی نہ اخلاقی تربیت میں - لیکن فرض کیجئے ھم تاریخ کی تعلیم میں ارتقائی نقطۂ نظر اختیار کریں اور ماضی کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ اس سے موجودہ تمدنی اور سیاسی حالات پر روشنی پڑے تو تاریخ نظام معاشرت اور اس کے تمام پیچیدہ اور ترقی یافتہ اداروں کی تفسیر کا ذریعہ بن جائے گی - معاشری زندگی کے تمام شعبوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ھے کہ ان کی ابتدا بہت سادہ اور محدود ھوتی ھے اور وہ

رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ اور وسیع ہوتے جاتے ہیں - تاریخ کا فرض یہ ہے
کہ وہ اس عمل ارتقا کی تشریح کرے اور طلبا کو یہ سمجھائے کہ انسانی
جدو جہد سے تمدن کے ہر شعبہ میں کس طرح ترقی ہوئی ہے - اگر طلبہ
اس کا مطالعہ سمجھ بوجھ کر اور صحیح نقطۂ نظر سے کریں گے تو وہ
انسانی ارتقاء کی نوعیت ، اس کی رفتار اور اس کے رجحانات کو پہچاننے
لگیں گے - اور وہ اپنے عمرانی فرائض کو عمدگی سے پورا کریں گے اور اپنے
حقوق سے اچھی طرح فائدہ اٹھائیں گے - نصاب تاریخ کے انتخاب میں
جن امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ ہم بیان کرچکے ہیں - ان کے
علاوہ ہمیں اس مضمون کی تعلیم میں انسانی معاشرت کی ارتقاء کے
بعض خاص پہلو نمایاں کرنے پڑیں گے - مثلاً ابتدائی زمانے کے وحشیوں
کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوگی کہ اول اول انسان اور
فطرت کس طرح ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے تھے اور کس طرح رفتہ
رفتہ انسان نے فطرت کی طاقتوں کو مطیع کرکے ان کو بجائے دشمن کے
دوست بنا لیا - قدیم آریوں کی زندگی کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ
انہوں نے کس طرح اپنی مخصوص ضروریات پوری کرنے کے لئے متمدن
زندگی کے وہ ادارے قائم کئے جو آج زیادہ مکمل شکل میں موجود ہیں -
اسی طرح مختلف قوموں کی تاریخ در اصل مختلف انسانی کمالات کی
ارتقاء اور کامیابی کی داستان ہے - تاریخ روما کا مطالعہ سیاست اور
ملک گیری کے کمال کا تاریخ یونان کا مطالعہ علوم و فنون لطیفہ کی
ترقی و نشو و نما کا ، سلطنت مغلیہ کی تاریخ کا مطالعہ آئین سلطنت کی
تنظیم اور فن تعمیر کی تکمیل کا مطالعہ ہے - بحیثیت مجموعی علم
تاریخ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ موجودہ تمدن کے رنگا رنگ تارو پود کے ملنے
سے کس طرح یہ جامہ تیار ہوا ، وہ کون سے محرکات تھے جو مختلف ایجادوں ،

دریافتوں اور جغرافی سیاحتوں کا باعث ہوئے اور ان چیزوں نے کس طرح زندگی کے نئے نئے طریقوں کی بنیاد ڈالی - طالب علم کے دل میں اس عظیم‌الشان ارتقاء کا احساس پیدا ہونا اور اس کا معاشری معاملات اور مسائل کو ہمدردی کے ساتھہ سمجھنا اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے -

اسی طرح جغرافیہ چند اصطلاحوں اور ناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی معاملات اور ان کی باہمی وابستگی کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ اس کے مطالعے میں معاشری اور انسانی پہلو مقدم رکھا جائے - تاریخ اور جغرافیہ دونوں میں انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے - فرق یہ ہے کہ تاریخ انسان کا تعلق وقت اور زمانے سے دکھاتی ہے یعنی اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ گذشتہ صدیوں میں اس کی زندگی اور تمدن میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جغرافیہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول تعلق سے بحث کرتا اور یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نشو و نما کس حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہے - بہر حال دونوں کو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سرو کار ہے - جغرافیہ کی اخلاقی اہمیت یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط کو ظاہر کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ وہ کیسے عالم طبیعی کے واسطے سے ایک دوسرے کے ساتھہ وابستہ ہیں اور کس طرح اقتصادی اور مادی زندگی کی بقا اور اصلاح و ترقی کے لئے لوگوں کا باہمی تعامل ضروری ہے اور تقسیم عمل کے اصول پر زراعت ، صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں کی تنظیم لازم آتی ہے - اسی کے ساتھہ جغرافیہ انسانی تخیل اور ہمدردی کا دائرہ وسیع کرتا ہے اور اس طرح طالب علم کی عمرانی تربیت میں مدد دیتا ہے -

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ادب کی تعلیم صحیح اصول پر

مرتب کی جائے تو وہ اخلاقی تربیت کا کس قدر موثر ذریعہ بن جائیگی -

ادب انسانی خیالات اور جذبات انسانی آرزوں اور اُمنگوں ' انسانی کامیابیوں اور نا کامیابیوں کا ترجمان ہے اور انسان کے قلب و روح کی واردات اور جد و جہد کا آئینہ دار - اس کے ذریعے سے ہم نہ صرف مختلف قسم کی مفید معلومات حاصل کرتے ہیں (یہ تو ادب کا سب سے ادنیٰ فائدہ ہے) بلکہ قدیم اور جدید خیالات اور جذبات ؛ اور دنیا کے بہترین ارباب فکر کے شاہکاروں سے روشناس ہوتے ہیں - اس کے مطالعے سے ہماری نظر زیادہ وسیع ' ہماری ہمدردی زیادہ عام ' ہماری قدر شناسی کی حس زیادہ تیز ہو جاتی ہے - اعلیٰ ترین ادب ہمیں نہ صرف معاشری معاملات اور مسائل کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے ' نہ صرف اپنی سحر آفرینی سے گزشتہ زمانوں اور شخصیتوں کو دوبارہ زندہ کر دکھاتا ہے بلکہ ان صفات کو جو انسانیت کا جوہر ہیں نشو و نما دے کر اخلاقی تربیت میں معاون ہوتا ہے - وہ ہمیں براہ راست اخلاقی تلقین اور نصیحت نہیں کرتا بلکہ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کرتا ہے اور واقعات اور افسانوں کو اس پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ ان کا مجموعی اثر ہمارے جذبات کی تہذیب کا باعث ہوتا ہے - جن تصانیف میں پند و نصیحت کا رنگ غالب آجاتا ہے اور مصنف اپنے فن لطیف کے اصول کو نظرانداز کرکے عمداً اخلاقی تعلیم کی کوشش کرتا ہے ان کا ادبی معیار بالعموم زیادہ بلند نہیں ہوتا - ناولوں ' ناٹکوں اور افسانوں میں بھی جب کبھی خیالات و عقائد کی تبلیغ کی خواہش آرٹ پر غالب آجاتی ہے تو ان کا اثر جاتا رہتا ہے - اس لئے ادب عالیہ کی پہچان اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طریقہ پر طالب علم کے بہترین خیالات اور جذبات کو ابھارے اور خود بخود اس کی سیرت میں سرایت کر جائے - جس شخص

میں ادب کا صحیح ذوق ہوتا ہے اسے ہمیشہ ایک اعلیٰ درجہ کا مضمون یانظم یا افسانہ پڑھکر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں ایک نئی وسعت اور گہرائی اور اس کے احساسات میں تیزی اور شدت پیدا ہوگئی ہے - اکثر لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہوا ہوگا کہ جب وہ کوئی ایسی چیز پڑھتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگے تو کم از کم عارضی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نفس سے بہت سے ادنیٰ جذبات اور تعصبات دور ہوگئے ہیں اور طبیعت میں گداز اور نرمی اور محبت پیدا ہوگئی ہے - گویا بقول ارسطو کے ان کا روحانی تنقیہ [۱] ہوگیا ہے - لہذا ایک صاحب نظر اور صاحب دل معلم کے ہاتھہ میں ادب کی تعلیم تربیت اخلاق کا ایک نہایت اہم اور موثر ذریعہ بن جاتی ہے - بشرطیکہ اس کی غرض محض زبان سکھانا اور الفاظ کی مشق کرانا نہ ہو بلکہ اس میں انسانی جذبات اور تجربات کے مطالعہ پر زور دیا جائے اور ادب کی وساطت سے طلبہ کو بلمی نوع انسان کے بہترین خیالات اور احساسات میں شرکت کا موقع ملے -

سائنس کی تعلیم جس کو عام طور پر محض مادی مفاد کے حصول اور صنعت و حرفت کی ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے در اصل اس زمانے میں اخلاقی اور عمرانی تربیت کا جزو لازم ہوگئی ہے کیونکہ اس کی مدد سے ہم موجودہ تمدن کو سمجھتے ہیں جس کی بنیاد بڑی حد تک سائنس اور اس کے استعمال پر ہے اور اسی کے ذریعے سے ہم فطرت کی طاقتوں کو تسخیر کرکے انہیں اپنے مقاصد کے لئے کام میں لاتے ہیں - سائنس کے مطالعہ سے ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان نے دنیا میں جس قدر مادی ترقی کی ہے اس میں سب قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے اور جب تک تمام ماہرین سائنس اپنی اپنی علمی

- Catharsis [۱]

تحقیقات کے نتائج سے اپنے شرکائے کار کو مطلع نہ کریں اور ان میں نہایت قریبی اشتراک عمل نہ ہو سائنس ترقی نہیں کرسکتی - علاوہ بریں سائنس نے انسان کو سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز سبق یہ سکھایا ہے کہ وہ خود اپنی تربیت یافتہ عقل کے ذریعہ اپنے معاملات کی ہدایت اور رہنمائی کر سکتا ہے اور اس کی قسمت کا انحصار نامعلوم اور خوفناک قوتوں کی مرضی پر نہیں ہے - وہ قدیم زمانے کے وحشیوں کی طرح جن کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ماحول کے تمام مظاہر ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں ' ہمت شکن توہمات اور خطرات کا غلام نہیں ہے - سائنس کی مدد سے انسان نے اپنے گذشتہ تجربات کو منظم کرکے انہیں آئندہ کی ترقی کا ذریعہ بنا لیا ہے اور اس خوف سے جو اس کے دل پر طاری تھا رہائی حاصل کرکے اپنے لئے آگے بڑھنے کی بے شمار راہیں کھول دی ہیں اگر سائنس اس طرح انسانی تجربات کی تنظیم کرکے ان سے مفید نتائج نہ نکالتی تو یہ تجربات یا تو بالکل اکارت جاتے یا انسان کے دماغ کے لئے ایک بوجھ بن کر رہ جاتے - جن لوگوں پر سائنس کے مخصوص منہاج و نقطہ نظر کا اثر نہیں پڑا وہ یا تو عادت اور روایات کے مطابق عمل کرتے ہیں یا تقدیر پر بھروسا کرکے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں - ان میں معاملے کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے اور اس کے موافق اور مخالف دلائل کو تولنے کی قابلیت نہیں ہوتی - اور وہ اپنے افعال کی ذہنی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے - ظاہر ہے کہ اس ذہنیت کے لوگ کبھی زیادہ ترقی نہیں کرسکتے اور خصوصاً اس زمانے میں جو حرکت اور تبدیلی کا زمانہ ہے وہ علمی اور معاشری ترقی میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے - ہندوستان میں اس قسم کے لوگ بہت ہیں جو قسمت پر شاکر رہنا پسند کرتے ہیں اور جدو جہد کے قائل نہیں - قومی سیرت کی تشکیل کا تقاضا یہ

ھے کہ اس ذھنی کیفیت میں انقلاب پیدا کیا جائے - اس کا بہترین طریقہ جیسا کہ ھم نے اوپر اشارہ کیا ھے یہی ھے کہ مدرسوں کے نصاب میں سائنس کو معقول حصہ ملے اور طلبہ صحیح طریقے پر اس کا مطالعہ کریں تاکہ وہ معاشری زندگی کے ان شعبوں میں کامیابی کے ساتھہ شریک ھو سکیں جن کی بنیاد سائنس کے علم پر ھے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) لکھتے ھیں :

" نصاب تعلیم میں بھی سائنس کا کام وھی ھے جو اس نے نسل انسانی کے لئے انجام دیا ھے یعنی تجربے کو اس کی مقامی اور عارضی پابندیوں سے آزاد کرنا اور عقلی ترقی کی ایسی راھیں کھول دینا جن میں شخصی عادات اور رجحانات کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ھو - اس طرح جب کوئی خیال اس مخصوص اور محدود دائرے سے جس میں وہ پیدا ھوا ھے نکال کر ایک مجرد تصور بنا دیا جائے اور اس کو زیادہ وسیع معنی دیدئے جائیں تو انفرادی تجربے کے نتائج سب لوگوں کے کام میں آسکتے ھیں اور انجام کار فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سائنس عمرانی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ھے " [1]

ھم نے اخلاق کا جو مفہوم پیش کیا ھے اس کے مطابق سائنس سے عمرانی برکات کے علاوہ اخلاقی فوائد بھی حاصل ھوتے ھیں کیونکہ اس عقیدے سے بڑھ کر کون سی اخلاقی صفت ھو سکتی ھے کہ انسانی ترقی اور اصلاح خود انسان ھی کی کوشش سے ممکن ھے اور یہ کوشش صرف باھمی اشتراک عمل کے ذریعے کامیاب ھوسکتی ھے ؟ اس عقیدے کے طفیل میں انسان عاجزانہ تقدیر پرستی سے نجات پاکر نظام عالم میں اپنی اھمیت اور اپنے فرائض کو پہچانتا ھے اور یہی خودشناسی خدا شناسی کی سیڑھی ھے - بلکہ واقعہ یہ ھے کہ

---

[1] Democracy and Education -

سائنس قدرت کی کار سازی کے وہ حیرت انگیز کرشمے دکھاتی ہے اور دنیا کے لاتعداد اور بظاہر متضاد مظاہر میں قانون الہی کی حکومت کا ایسا بین ثبوت دیتی ہے کہ اگر ہم عقیدت اور احترام کے ساتھ چشم بصیرت سے اس کا مطالعہ کریں تو وہ ہمیں بلاواسطہ معرفت الہی کی منزل پر پہنچا دیتی ہے - [۱] اگر گنجائش ہوتی تو ہم نصاب کے باقی مضامین سے بحث کرکے دکھا سکتے تھے کہ اخلاقی تربیت میں ان کا کیا حصہ ہے - بہر حال ان سب کی تنظیم میں شرط مشترک یہی ہے کہ ان کی تعلیم صحیح طریقہ پر دی جائے - حساب جیسا خشک اور بظاہر بے روح مضمون بھی ' جس کا بادی النظر میں اخلاقی تربیت سے کوئی رشتہ معلوم نہیں ہوتا ' در اصل نہایت اہم اخلاقی اور عمرانی قدروں کا حامل ہے - اس کے ذریعے سے ہم ان تمام معاشری معاملات اور مسائل کو سمجھتے ہیں جو اعداد و مقادیر کی صورت میں ظاہر کئے جاسکتے ہیں - اس کے بغیر اس مادی دنیا میں ہماری بہت سی کوششیں یا تو بالکل ضائع ہو جاتی ہیں یا ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے - زراعت ' تجارت ' صنعت و حرفت ' سائنس کی تحقیقات ' روز مرہ کے کارو بار میں ہمیں برابر حساب کی ضرورت پڑتی ہے اور وہی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور معاشری کارو بار کو ناپنے تولنے اور ان کا صحیح اندازہ کرنے میں کام آتا ہے - دوسری طرف حساب کی تعلیم میں ہمیں ہر ہر قدم پر صحت عمل ' نقد و تنقید اور ذہنی دیانتداری کی صفات درکار ہوتی ہیں - کیونکہ یہ ان علوم صحیحہ میں سے ہے جن میں غلطی اور صحت کے مابین کوئی درمیانی

---

[۱] سائنس کے فوائد اور برکات کی مفصل اور مکمل بحث کے لئے سپنسر کی " فلسفہ تعلیم " کا مطالعہ کرنا چاہئے -

راہ نہیں ہوتی - یہاں طالب علم الفاظ کی گنجائش کے ذریعے نہ اپنے آپ کو دھوکہ دے سکتا ہے نہ دوسروں کو مغالطے میں ڈال سکتا ہے - لہذا حساب کی صحیح تعلیم کے ذریعے جو ذہنی صفات اور عادتیں پیدا ہوتی ہیں وہ اخلاقی تربیت کا جزو بن جاتی ہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم انتقال قوت اکتسابی [1] کے غلط نظریہ کو صحیح مانیں - دست کاری اور فنون لطیفہ کی اہمیت، اور نصاب میں اس کی قدر و قیمت سے ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ وہ نہ صرف طلبہ کی جسمانی اور دماغی نشو و نما کے لئے مفید ہیں بلکہ اخلاقی تربیت کے لئے بھی ضروری ہیں - ماہرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بچوں کی شخصیت کی نشو و نما اور تشکیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک انہیں مسلسل عملی اور تخلیقی مشاغل میں شرکت کا موقعہ نہ ملے - شرط یہی ہے کہ ان کی تعلیم بالکل رسمی اور خشک نہ بنا دی جائے کہ بچوں کو سوائے چند کم و بیش مفید قاعدوں کو سیکھنے کے تخلیقی اظہار کا موقعہ نہ ملے - اس صورت میں نہ تو ان فنون کے سیکھنے سے بچوں میں معاشری احساس پیدا ہوگا نہ ایسے تعلیمی طریقے اختیار کئے جاسکیں گے جن میں اشتراک عمل باہمی ہمدردی اور ذہنی تعاون کی گنجائش ہو - ان میں بھی اسی رشک و خود غرضی اور باہمی مسابقت کی کار فرمائی ہوگی جو بد قسمتی سے دوسرے درسی مضامین میں داخل ہوگئی ہے - برخلاف اس کے اگر ان چیزوں کی تعلیم میں بچوں کے فطری میلانات اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھا جائے، فعالیت کے اصول پر زور دیا جائے اور وہ اپنا کام آزادی کی فضا میں کریں تو ان میں اعتماد ذات، تعاون عمل اور تخلیقی اظہار کی صفات

- Transfer of Training [1]

پیدا ہونگی جو معاشری زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہیں -

نصاب کی مندرجہ بالا بحث میں ضمناً طریقۂ تعلیم کی بحث بھی آگئی ہے اور ہم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ محض نصاب تعلیم کو باقاعدہ اور معقول طور پر مرتب کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہمیں وہ تمام علمی اور اخلاقی نتائج حاصل ہوجائیں جن کی تفصیل اوپر کی گئی ہے کیونکہ جو علم کتابوں میں محفوظ ہے وہ ہمارے لئے کوئی اہمیت اور قدر نہیں رکھتا جب تک ہم اس کو اپنے تجربات کی شکل میں تحویل نہ کرایں اور وہ ہماری زندگی اور عمل کا جزو نہ بن جائے - اس عمل تحویل کا ذریعہ طریقہ تعلیم ہے - اگر وہ بچوں کی فطرت کے موافق ہے ، ان کو عمل کا موقع دیتا ہے ، اس کے اندر جدت پسندی اور ذاتی ذمہ داری کے ساتھہ کام کرنے کی گنجائش ہے تو وہ جو کچھہ سیکھیں گے ان کا جزو طبیعت بن جائے گا اور ان کی سیرت پر اثر ڈالے گا ورنہ ان کی تمام معلومات دماغ پر بار ہوکر رہ جائے گی اور ان کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ نہ لیگی - مجھے اپنے ایک پرانے سائنس ماسٹر کا یہ قول اکثر یاد آتا ہے کہ " تم ان چیزوں کو حفظ کر رکھو ، کسی وقت خود بخود کام آئیں گی " - یہ بیچارے طریقۂ تعلیم کی اہمیت اور اثر سے بالکل ناواقف تھے - انہیں یہ خیال کبھی نہیں گزرا تھا کہ جب بغیر چبائے ہوئے جسمانی غذا بھی ہضم نہیں ہوتی تو دماغی غذا کیسے کوئی مفید اثر پیدا کرسکتی ہے اگر وہ بغیر ہضم کئے حافظے میں تھونس لی جائے ؟ ان کی یہ غلطی کوئی غیر معمولی جہالت کی دلیل نہیں بلکہ ایک خاص تعلیمی نقطۂ نظر کی نمائندگی

طریقہ تعلیم اور معاشری تربیت

کرتی هے جس کي حکومت صدیوں تعلیم کی قلمرو پر رهی هے اور جس نے نه جانے کتلے غریب طلبه کی تعلیمی زندگی برباد کي هے - اُستادوں کي تمام کوششیں مدتوں اس مقصد کے لئے وقف رهیں که طلبه کسي طرح وہ بے اندازہ معلومات حاصل کرلیں اور یاد کر رکھیں جو وہ اپنی سمجهه کے مطابق ان کے لئے مفید سمجھتے تھے - ان کو اس امر سے بحث نه تهي که ان علوم کی تحصیل کے لئے وہ خود اور ان کے شاگرد کیا طریقے اختیار کرتے هیں - کومینیس (Comenius) اور اس کے هم خیال معلموں کے همه داني پر مبني نظام تعلیم کا ذکر هم کرچکے هیں - ان لوگوں کا زور تمام تر موضوع پر تھا ' طریقۂ تعلیم پر نه تھا اور ظاهر هے که علوم کی تعداد اور وسعت اتنی هے که ایسی حالت میں معلم کو طریقۂ تعلیم کی طرف سے خواہ مخواہ بے توجهی کرنی پڑیگی اور تمام ذهنی قوتوں کو نظر انداز کر کے صرف حافظه سے کام لینا هوگا - مشرقی ملکوں میں بالعموم اور خود همارے ملک میں بهی قدیم نظام تعلیم کی بنیاد اسی خیال پر تهی - اس کا منشا یه تھا که جو طلبه اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاهیں وہ مختلف علوم مثلاً فلسفه ' ریاضی ' طب ' قانون ' اخلاق وغیرہ کی تکمیل کریں - اس نظام کی خرابی اور کمزوری تو ظاهر هے لیکن هم یه اعتراف کئے بغیر نهیں رہ سکتے که اس زمانے میں جو لوگ طلب علم کا سچا شوق رکھتے تھے وہ اپنی تعلیم پر اتنی توجه اور مدت صرف کرتے تھے که ان میں سے بعض مستعد اور قابل افراد مختلف علوم میں کمال پیدا کرلیتے تھے - لیکن جیسا هم وضاحت کے ساتھ بتا چکے هیں جب سائنس اور دوسرے تجربی علوم نے جدید دور ارتقاء میں قدم رکھا تو علوم کی تعداد اور وسعت میں بهت تیزی کے ساتھ اضافه هونا شروع هوا اور موجودہ زمانے میں کسی شخص کے

لئے یہ ممکن نہیں کہ تمام علوم کا تو کیا ذکر ھے ان کے دسویں یا سویں حصے پر بھی عبور حاصل کرسکے - علاوہ اس کے یہ زمانہ خصوصي قابلیت کا ھے - علوم بھی پہلے سے بہت زیادہ منظم ہوگئے ھیں اور انکے بہت سے علحدہ شعبے کر دئے گئے ھیں جن میں سے ہر ایک میں کمال پیدا کرنے کے لئے ایک ماہر خصوصی کی ضرورت ھے - موجودہ تمدن کے بہت سے مشاغل ایسے ھیں جن کے لئے مخصوص قابلیت درکار ھے - اس وجہ سے موجودہ حالات میں یہی مناسب ھے کہ ایک شخص ثانوی تعلیم پانے کے بعد جو عام تہذیب کے لئے ناگزیر ھے ' کسی ایک علم یا فن میں مہارت حاصل کرے یا چند ایسے علوم و فنون کا مطالعہ کرے جن میں بہت قریبی تعلق ھے ' بجائے اس کے کہ وہ بہت سے مختلف قسم کے علوم میں سطحی واقفیت پیدا کرے - لیکن نصاب تعلیم کي وسعت محدود کرنا صرف اسی حالت میں جائز ہوسکتا ھے جب طریقۂ تعلیم میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ طلبہ میں ذہنی آزادی ' اعتماد نفس اور ذاتی مطالعے کی قابلیت پیدا ہو اور وہ آئندہ زندگی میں اپنی ضرورت کے مطابق جس علم کو چاھیں حاصل کرسکیں - یہ صلاحیت معلومات کے اس ذخیرے سے بدرجہا بہتر ھے جن کو انسان ایک دفعہ غیر معمولی محنت اور کوشش کر کے جمع کرے لیکن آگے چل کر اچھي طرح استعمال نہ کرسکے - ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے یہ صلاحیت بہت قابل قدر ھے اور اسی وجہ سے موجودہ نظریۂ تعلیم میں طریقۂ تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ھے -

ہم نے کتاب کے حصہ اول میں جن سیاسی اور معاشری انقلابات کا ذکر کیا ھے ان کی وجہ سے انساني سیرت میں فعالی صفات کی اہمیت بہت بڑھگئی ھے - جمہوریت کے اس دور میں انفرادی ترقی اور اجتماعی

زندگی میں کامیابی کے ساتھہ حصہ لینے کے لئے ہمت ، حوصلہ اور قوت اجتہاد کی ضرورت ہے - اگر بچے ذہنی جمود میں مبتلا رہیں اور انہیں دوسروں پر بھروسا کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی عادت پڑ جائے تو وہ کشمکش حیات میں نا کامیاب رہیں گے - جہاں تک مدرسے کے علمی مشاغل کا تعلق ہے فعالی صفات اُنہیں تعلیمی طریقوں کے ذریعے نشو و نما پائیں گی جو طلبہ کی تعمیری اور تخلیقی قوتوں کو اظہار کا موقع دیں تاکہ وہ معلومات کو محض جذب نہ کرلیں بلکہ اسے مختلف طور پر استعمال بھی کریں - فطرت اطفال کا مقتضا بھی یہی ہے ، کیونکہ ان میں قدرتاً یہ خواہش اور بے چینی ہوتی ہے کہ وہ کام کریں ، چیزیں بنائیں اور بقول فروبل (Froebal) کے " جو کچھہ ان کے اندر ہے اسے باہر لائیں " - جس قدر نئے تعلیمی تجربے حال میں ہوئے ہیں ، جن میں سے بعض کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے ، سب میں یہ امر مشترک ہے کہ وہ فعالیت پر زور دیتے ہیں اور طالب علم کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ پر بھروسا کرے ، مشکلات پر قابو پائے ، جسم اور دماغ کی قوتوں سے کام لے کر وسائل اور ذرائع کی تنظیم کرے اور اپنے مقاصد کو تکمیل تک پہنچائے - میڈم مونٹسوری کے طریقۂ تعلیم میں ، طریق ڈالٹن اور گیری اسکیم (Gary Scheme) میں اور دوسرے تعلیمی طریقوں میں جو انفرادی نشو و نما کے اصول پر مبنی ہیں معلم کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچوں کے لئے ایک موزوں ماحول مہیا کرے جس میں ہر نوع کے مشاغل کا امکان ہو ، ہر قسم کے عمل کے محرکات موجود ہوں ، ہر طرح کے ضروری سامان اور آلات فراہم ہوں تاکہ وہ اپنے شوق سے عملی تعلیم حاصل کرسکیں - معلم کی حیثیت ایک دوست اور رہبر کی ہے جو راستہ دکھاتا ہے لیکن اس

راستہ پر چلنا طلبہ پر چھوڑ دیتا ہے - وہ خوف یا لالچ کے ذریعے بچوں
کو زبردستی اپنے ساتھہ نہیں کھینچتا - بلکہ کام کی نوعیت ایسی ہوتی
ہے اور وہ پیش اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ خود بخود اس کی طرف
کھینچتے ہیں اور اس میں منہمک ہوجاتے ہیں - جوں جوں
انہیں مشاغل میں کامیابی حاصل ہوتی ہے انہیں خوشی کا احساس
ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت عمل میں اضافہ ہو رہا ہے -
کسی مفید کام میں دلچسپی لینا ' اور اس کو پوری توجہ اور محنت
سے کرنا ' اپنی ذات کو کم سے کم کچھہ عرصے کے لئے اس میں کھودینا '
اور ہر منزل کو طے کرنے کے بعد یہ محسوس کرنا کہ ہماری علمی اور
عملی قوتیں بڑھ رہی ہیں ' یہ ایسی صورت حال ہے جس کی اخلاقی
قدر و قیمت کا پورا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا - کون کہہ سکتا ہے
کہ دنیا میں محض اسی سبب سے کس قدر ملال اور افسردگی ' مایوسی
اور ناکامی پائی جاتی ہے کہ اکثر لوگوں کو اس کام میں کوئی دلچسپی
نہیں ہوتی جس کو وہ مجبوراً روزی کمانے کے لئے کرتے ہیں ؟ ان کو
زندگی کا حقیقی لطف کبھی میسر نہیں ہوتا - وہ روزانہ کام کے اوقات
میں اپنا آتھہ دس گھنٹہ کا معمول بہت بد دلی کے ساتھہ پورا کرتے
ہیں اور اسکے بعد یا تو اس قدر تھک جاتے ہیں کہ کسی
اور شغل میں حصہ ہی نہیں لے سکتے ' یا نہایت ادنیٰ
اور سستی تماشا گاہوں میں جاکر چند گھنٹے کے لئے خود فراموشی خرید
لیتے ہیں - حقیقت یہ ہے کہ روز مرہ کے کام کا اور ان جذبات کا جو اس
کام سے وابستہ ہوں انسان کی تہذیب نفس اور اخلاق پر بہت گہرا اور
پائدار اثر پڑتا ہے - لوگوں کے روحانی اضطراب اور ان کی اخلاقی خرابیوں
کی اصل وجہ یہ نہیں کہ وہ بہت معمولی قسم کے کام کرتے ہیں اور

انہیں اس میں بہت قلیل آمدنی ہوتی ہے - اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے کام ان کے لئے نا موزوں ہوتے ہیں اور انہیں ان میں نہ دلچسپی ہوتی ہے نہ ہوسکتی ہے - اگر ایک خاکروب کو بھی اس امر کا سچا اور پورا احساس ہوجائے کہ وہ اپنے روز کے کام سے ایک نہایت اہم معاشری خدمت انجام دے رہا ہے اور اس کے بغیر نظام معاشرت میں بہت بڑی خرابیاں واقع ہونگی تو اس کے کام کی نوعیت بالکل بدل جائے گی اور اسے خوش دلی ' خلوص اور انہماک کے ساتھہ کرے گا - اگر اس کے ساتھہ ھی اور سب لوگوں میں بھی اس خدمت کی اھمیت کا احساس پیدا ہوجائے تو ان کا رویہ بھی اس کی جانب سے بدل جائیگا اور وہ اس کی اسی قدر عزت کرنے لگیں گے - لیکن جب کوئی شخص کارلائل کے لوہار کی طرح '' ہتھوڑے کی ہر چوٹ پر خدا کے دسوں قوانین توڑ ڈالے '' تو اس کو اپنے کام میں کوئی مسرت نصیب نہیں ہوسکتی خواہ اس کی آمدنی اور معاشری حیثیت کتنی ہی زیادہ ہو - مدرسے کا ایک نہایت اہم اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کے دل میں کام کا ' ہر مفید اور دیانت دارانہ خدمت کا ' احترام پیدا کرے اور ان کی شخصیت اور ان کے درسی اور معاشری مشاغل کے درمیان وہ رشتہ جوڑے جو ایک ہنر مند دستکار یا صناع اور اس کے فن میں ہوتا ہے یعنی کام کی محبت اور عزت اور اس سے قلبی اور روحانی تعلق - اگر مدرسے میں طلبہ کو یہ بات حاصل ہوجائے تو وہ باہر نکل کر عملی زندگی یعنی اپنے کارو بار یا پیشے یا ملازمت میں بھی اسے قائم رکھیں گے - اس مقصد کے حصول کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور ذہنی آزادی پیدا کی جائے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ مدرسے میں ایسے مشاغل اور تعلیمی طریقوں کو رائج کیا جائے کہ وہ مل جل کر کام کرنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا سیکھیں اور ان میں معاشری خدمت کا ولولہ

پیدا ہو - لیکن موجودہ صورت حال جس کا مختصر سا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اس کے بالکل برعکس ہے - مدرسوں میں بچوں سے کام لینے کے لئے مختلف قسم کی خارجی تحریصیں استعمال کی جاتی ہیں یعنی امتحان میں پاس ہونے اور نمبر پانے کا لالچ ' اُستاد کا خوف یا لحاظ ' اپنے ساتھیوں کی رقابت وغیرہ - اخلاقی نقطۂ نظر سے اس قسم کے محرکات عمل کو استعمال کرنا نہایت قابل اعتراض ہے - جب بچے سالہا سال تک ان اغراض کی بنا پر کام کریں گے تو ظاہر ہے کہ ان کی طبیعت پر اس کا مجموعی اخلاقی اثر بہت برا پڑیگا - نہ وہ کام کو کام سمجھہ کر اس کی قدر کریں گے نہ ان میں کسی قسم کا معاشری احساس یا جذبہ پیدا ہوگا بلکہ تمام عمر اپنے ادائے فرائض کے لئے اسی قسم کے سہاروں کے محتاج رہیں گے - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب خارجی اثرات کارفرما نہ ہوں گے تو یا تو وہ برے راستے پر پڑ جائیں گے یا بالکل نکمے ہوکر رہ جائیں گے اور ان پر جمود اور کاہلی غالب آجائے گی - اس لئے تربیت اخلاق کا مقتضا یہ ہے کہ طلبہ جلد سے جلد ان تحریصوں کے اثر سے آزاد ہوجائیں اور وہ جو کچھہ کام مدرسے میں کرتے ہوں اس کی حقیقی قدر کو پہچانیں اور یہ محسوس کریں کہ اس کا ان کی موجودہ اور آئندہ زندگی سے کس قدر قریبی تعلق ہے اور اس کو محنت اور خوش دلی سے انجام دینے سے انہیں نہ صرف اس وقت خوشی اور تقویت حاصل ہوگی بلکہ آگے چل کر بھی وہ بہت مفید ثابت ہوگا - لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر ہر قدم پر ذاتی مفاد کے ساتھہ معاشری مفاد بھی مد نظر رہے تا کہ ان میں خود غرضی اور نفس پرستی نہ پیدا ہونے پائے -

طریقہ تعلیم کے اس معاشری پہلو کی اہمیت دو وجوہ سے بہت زیادہ ہے - اول تو یہ وہ پہلو ہے جس سے ہمارے مدرسوں میں بہت زیادہ

غفلت برتی گئی ہے - یعنی نہ تو نصاب کی ترتیب میں نہ طریقہ تعلیم کے تعین میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ بچوں کو اشتراک عمل اور امداد باھمی کے موقع دئے جائیں - دوسرے ہمارے ملک کی سیاسی اور عمرانی حالت کا تقاضا ہے کہ نوخیز نسلوں میں باھمی وابستگی ' اور اتحاد مقاصد کے اس احساس کو پختہ کیا جائے اور مدرسوں میں اتفاق و یکجہتی کے ساتھہ کام کرنے کی عادت ڈالی جائے - کیا ہمارے مدرسے اپنے موجودہ طریقہ تعلیم کے ذریعے سے یہ تقاضا پورا کر رہے ہیں ؟ ہرگز نہیں - جیسا ہم نے ابھی بتایا ہے وہ طلبہ سے کام لینے کے لئے ان کے ادنیٰ جذبات کو اُبھارتے ہیں - بہت سے اُستاد جو اپنے آپ کو نہایت قابل اور ہوشیار سمجھتے ہیں نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں کہ درسی تعلیم میں طلبہ کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرائیں - ایک بیدار مغز ہیڈ ماسٹر کا مجھے ذاتی تجربہ ہے جس کا تعلیمی اصل اصول یہ ہے کہ ہر اُستاد روزانہ ہر طالب علم کو نمبر دیا کرے تاکہ نمبر حاصل کرنے کی خواہش میں سب طلبہ محنت اور توجہ سے کام کریں ! ان تمام عقلمندیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ طلبہ میں خود غرضی اور نفسا نفسی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور تقسیم عمل اور تعاون کے ذریعے بڑے بڑے کام انجام دینے کے بجائے وہ سب اپنی اپنی ڈیڑہ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح امتحان میں ایک دوسرے پر سبقت لیجائیں اور اُستادوں کی نظر میں سرخ روئی حاصل کریں - گویا انسانی کامیابی کا معیار متحدہ خدمت نہیں بلکہ انفرادی برتری اور باھمی مسابقت ہے ! اُستاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنی تعلیم اور طلبہ کی محنت کے نتائج کو بالکل خارجی اور مشینی معیاروں پر جانچتے ہیں - مختلف استعداد اور

طبیعت کے طلبہ میں امتیاز نہیں کرتے اور ان کی محنت کا اندازہ لگانے میں اور اس کی داد دینے میں وسعت خیال اور ہمدردی سے کام نہیں لیتے - ان کے نزدیک ذی روح افراد بھی گویا لکڑی کے پیمانے میں ناپے یا اوچھے کی ترازو میں تولے جاسکتے ہیں - جو طالب علم مروجہ امتحانوں میں اچھا رہتا ہے وہ ان کے نزدیک ہر طرح قابل تعریف ہے اور اس کی کامیابی ان کے طریقہ تعلیم کی کامیابی کی دلیل ہے - باقی طلبہ جو امتحانوں میں اچھے نمبر نہیں پاتے نالائق یا سست یا کام چور سمجھہ لئے جاتے ہیں - انہیں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ ممکن ہے اس ناکامی کی وجہ ان کے طرز تعلیم کی خرابی یا طلبہ کا اختلاف طبائع ہو - اس کا اثر دونوں قسم کے طلبہ پر بہت برا پڑتا ہے - جو طلبہ امتحانوں کے معیار سے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ایسی تیاری کرسکتے ہیں جس سے خوب نمبر حاصل ہوں وہ اپنی جگہہ پر بالکل مطمئن ہوجاتے ہیں - ان کو اپنی قابلیت کا غلط اور مبالغہ آمیز گھمنڈ پیدا ہوجاتا ہے اور ان کے لئے اور زیادہ محنت کرنے اور قابلیت حاصل کرنے کی کوئی تحریص نہیں رہتی - کسی شخص کو نوعمری ہی میں یہ خیال پیدا ہوجانا کہ وہ معراج کمال پر پہنچ گیا ہے اس کی ذہنی قوتوں کو بالکل معطل کر دیتا ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے تیز طالب علم اپنی محدود کامیابی سے پوری طرح مطمئن ہوجاتے ہیں اور ان کی آئندہ ترقی قطعاً مسدود ہو جاتی ہے - بر خلاف اس کے کمزور طلبہ میں یعنی ان طلبہ میں جو امتحان میں نمبر نہیں پاسکتے احساس شکست پیدا ہوجاتا ہے - ان کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے ، حوصلہ پست ہوجاتا ہے اور کچھہ مقابلے میں ناکامیاب رہنے سے ، کچھہ اُستاد کی دل شکن باتوں سے انہیں یہ یقین ہوجاتا ہے کہ ان میں کسی طرح کی قابلیت نہیں - یہ احساس کم مائگی

بھی انسان کے لئے بہت مضر ہے - کیونکہ یہ ترقی کی خواہش اور حوصلے کی بالکل بیخ کنی کردیتا ہے اور طبیعت پر مایوسی اور افسردگی چھا جاتی ہے - یہ خرابیاں تو تمام طلبہ کے لئے مشترک ہیں لیکن اِس نظام تعلیم میں سب سے زیادہ نقصان اُن بچوں کو پہنچتا ہے جو فطرتاً زیادہ زود حس ہوتے ہیں' جن کا رجحان طبع زیادہ تر غور و فکر کی طرف یا فنون لطیفہ کی طرف ہوتا ہے - وہ مثلاً کسی علمی کتاب یا مضمون کا مطالعہ کر کے اِس کے مطالب کو خوب سمجھہ سکتے ہیں اور تحریر و تقریر میں اس پر بہت اچھی طرح بحث کرسکتے ہیں یا کوئی عمدہ نظم پڑھہ کر اِس سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں یا مصوری یا دستکاری میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں - مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ امتحانوں میں بھی اچھے رہیں کیونکہ وہاں انہیں اپنے ذوق اور مطالعے کے بہترین نتائج فرصت اور دل جمعی کے ساتھہ پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا - بلکہ کم سے کم وقت میں ایک خاص طرح کی واقفیت کا اظہار کرنا ہوتا ہے جس کا گر ہر شخص کو نہیں آتا - ان کی برتر اور لطیف تر صفات کا نہ کوئی امتحان ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے - گزوں سے ناپنے والا معلم اپنے سطحی پیمانے سے سوائے طول کے اور کچھہ نہیں ناپ سکتا - طبیعت کی شائستگی اور گہرائی' ذوق حسن' معاشری احساس قیادت کی قابلیت' اور اس قسم کی تمام اعلیٰ صفات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ایسے طلبہ کی قدر کرتا ہے جن کو وہ نمائشی اور سطحی لیاقت ہوتی ہے جس کا اندازہ ان امتحانوں کے ذریعے آسانی سے ممکن ہے - اسے یہ معلوم نہیں کہ انسان کی روح راز سربستہ ہے اور کیا عجب ہے کہ جس وقت طالب علم کی قوتیں بظاہر خوابیدہ معلوم ہوتی ہوں اور وہ اپنے درسی

مشاغل اور معمول کی طرف سے بے توجہي برتتا ہو بقول برگسان (Bergson) کے " وہ اپنی هستي کی گہرائیوں میں ایک نئي شخصیت کی تشکیل میں مشغول ہو " ایسی شخصیت کا معلم کو خاص طور پر احترام کرنا چاهئے - کیونکہ علمي اور تخلیقی کاموں کے لئے عموماً اُنہیں صفات کی ضرورت ہے جو امتحانوں کی کسوٹی پر نہیں کسی جاسکتیں - تجارتی اور اقتصادی معاملات میں یقیناً مقابلے اور مسابقت کی بہت گنجائش ہے لیکن علمی مشاغل اور فنون لطیفہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اشتراک احساس اور اشتراک عمل کا قانون کارفرما ہے - اس لئے مدرسہ میں همیں تمام درسی مشاغل کی تنظیم اسی قانون کے مطابق کرنی چاهئے اور ان مشاغل کو بچوں کے سامنے ایسے انداز میں پیش کرنا چاهئے کہ اُنہیں ان سے وهي خوشی حاصل ہو جو ایک محقق یا صناع کو اپنے کام سے ہوتی ہے - وہ خوشی نہیں جو محض عارضی تفریح کے مرادف ہے بلکہ وہ جو شوق اور انہماک کے ساتھ کام کرنے سے پیدا ہوتی ہے - مدرسے میں دست کاري اور عملی مشاغل رائج کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان میں اجتماعی مقاصد کے لئے کوشش کرنے کا موقع ملتا ہے اور طلبہ میں معاشری اتحاد اور یک جہتی کا احساس پیدا ہوتا ہے - بقول پروفیسر ڈیوئی کے :—

" ہر ایسے طریقہ عمل کو مدرسے میں رائج کرنے سے ، جو بچے کے عملی رجحانات کو اُبھارے اور اس کی قوت تعمیر و تخلیق کی تربیت کرے ، ایسے مواقع پیدا ہوتے ہیں کہ اسکے اخلاقي احساس کا مرکز ذاتی اور خود غرضانہ مشاغل سے ہٹاکر معاشري خدمت کي طرف منتقل کر دیا جائے " [۱]

[۱] Educational Essays صفحہ ۲۱ -

لیکن اگر مدرسے کو محض رسمی درس کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہ ہو، اور سیکھنے اور کرنے، علم و عمل میں ربط قائم نہ کیا جائے تو سیرت کی تشکیل اور علم کی تحصیل میں کوئی تعلق پیدا نہ ہوگا اور اس کی وجہ سے دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہہ پر ناقص رہ جائیں گی اسی سبب سے اکثر ماہرین تعلیم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دست کاری کو نصاب میں محض ایک جداگانہ مضمون کے طور پر داخل کرنا کافی نہیں بلکہ اس کو تمام مضامین نصاب میں ذریعہ تعلیم بنانا چاہئیے - اگر معلم طریقہ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کریں اور مدرسے کے نصاب اور مشاغل اور تعلیمی طریقوں کو اس طرح منظم کریں کہ طلبہ میں مذکورہ بالا صفات پیدا ہوں تو تعلیم میں ایک انقلاب عظیم ہوجائے گا - مدرسے کی اخلاقی تربیت محض حلقہ درس اور اوقات تعلیم تک محدود نہ رہے گی بلکہ وہ ہر وقت اور ہر کام کے ذریعہ اس کام کو انجام دیگا - اس حالت میں طلبہ کے تمام مشاغل کی ایک اخلاقی اہمیت ہوگی اور ان سے ان کو اخلاقی سیرت کی تشکیل میں مدد ملے گی - تحصیل علم میں صحیح طریقہ عمل اختیار کرنے کی بدولت جو صفات طلبہ میں نشو و نما پاتی ہیں وہ محض علمی اور نقلی اعتبار سے نہیں بلکہ اخلاقی اور عمرانی لحاظ سے بھی نہایت قابل قدر ہیں - معاملات پر غیر جانبداری اور بے تعصبی سے غور کرنا، کام میں خلوص اور انہماک، وسعت نظر، استقلال اور حوصلہ، اجتماع توجہہ، اعتماد ذات، احساس و ذمہ داری، یہ تمام چیزیں اخلاقی سیرت کا جزو لازم ہیں - جس شخص میں یہ صفات پائی جائیں گی وہ ہر کام کو، خواہ اس کا تعلق کسی شعبہ زندگی سے ہو، ایمانداری اور قابلیت کے ساتھہ انجام دیگا -

باب چہارم

ضبط و تادیب کا نظریہ جدید

طلبہ کی سیرت کی تشکیل میں مدرسے کے قواعد اور قوانین اور ضبط و تادیب کو بھی بہت کچھہ دخل ہے - طریقہ تعلیم کی بحث میں ہم نے بتایا ہے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور امداد باہمی کی عادت ڈالنی ضروری ہے - اور اگر یہ صحیح اصولوں پر مرتب کیا جائے تو درس اور تدریس کے ضمن میں ان صفات کی نشو و نما خود بخود ہو جائیگی - لیکن ان صفات کی ضرورت علاوہ علمی کاموں کے زندگی کے دوسرے تعلقات اور فرائض میں بھی پڑتی ہے مثلاً معاشی مشاغل میں ' عمرانی فرائض کی ادائگی میں اور ہر قسم کی ذاتی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے میں - معلم کو یہ بھی سوچنا چاہئیے کہ اِن فرائض کے لئے طلبہ کو کس طرح تیار کرے - جب بہت سے ہم عمر اور ہم مقصد بچے ایک مدرسے میں جمع ہوتے ہیں ؛ ساتھہ لکھتے پڑھتے ہیں ؛ اٹھتے بیٹھتے ہیں ' کھاتے پیتے ہیں ' کھیلتے کودتے ہیں تو ان میں علاوہ علمی تعلقات کے بہت سے معاشری تعلقات بھی پیدا ہوتے ہیں - انہیں آپس میں دوستی ہوجاتی ہے ' جن مقاصد میں انہیں مشترک طور پر دلچسپی ہوتی ہے ان کے حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد سے کوشش کرتے ہیں ' کلب اور انجمنیں بناتے ہیں ' انفرادی آزادی کو بر قرار رکھنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے کے لئے قاعدے بناتے ہیں تاکہ ہر فرد اور ہر گروہ اپنا اپنا کام بغیر خارجی مداخلت کے کرسکے خواہ اس کا تعلق درسی مشاغل سے ہو یا فرصت کے اوقات کی تخلیق و تعمیر سے - اس

طرح رفتہ رفتہ مدرسے میں معاشری روایات قائم ہوجاتی ہیں اور عمل کے اخلاقی معیار بن جاتے ہیں - اس میں ایک خاص ''فضا'' پیدا ہوجاتی ہے جس سے تمام طلبہ خود بخود متاثر ہوتے ہیں ہر نیا طالب علم بہت جلد ان روایات کو اور رائے عامہ کے احکام کو قبول کرلیتا ہے - اس قسم کی معاشری زندگی اور اس کے اثرات مدرسوں میں ہمیشہ سے چلے آتے ہیں لیکن اس کی اہمیت پوری طرح ابھی تک نہیں سمجھی گئی - البتہ جدید نظریہ تعلیم نے اس کو مدرسے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر مانا ہے اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ معلموں کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے - مدت تک استادوں نے طلبہ کے باہمی میل جول کی طرف سے یا تو بالکل بے اعتنائی برتی یا اس کو قابل اعتراض جان کر روکا کیونکہ وہ تو درسی تعلیم کے علاوہ ہر چیز کو مدرسے کے مقصد کے خلاف سمجھتے تھے - لیکن باوجود اس کے بچے اکثر اپنی فطرت کے مقتضا سے مجبور ہوکر مدرسوں میں معاشری زندگی کی بنیاد ڈال لیتے ہیں اور کھیلوں میں بالخصوص اس کا اظہار ہوتا ہے - مگر ہمارے معلموں نے اب تک اس کی باقاعدہ تنظیم کرکے اس سے اخلاقی فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی - یورپ کے بعض ملکوں مثلاً انگلستان ، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی میں اور امریکہ کے بہت سے مدرسوں میں طلبہ کی اجتماعی زندگی کا باقاعدہ مطالعہ کیا گیا ہے اور اس کی نفسی اور معاشری پہلوؤں پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں جن کے مطالعے سے ہر سمجھ دار آدمی کے تجربے کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ آپس کے ان تعلقات کا طلبہ کی سیرت پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے اور اگر ان کو مناسب اصولوں پر منظم کیا جائے اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے تو معلم غیر محسوس طریقے پر طلبہ کی سیرت کو بہترین

سانچوں میں ڈھال سکتا ہے اور اپنی طرف سے خواہ مخواہ دخل در معقولات کئے بغیر معاشری ضبط و تادیب سے کام لے سکتا ہے جس کی مداخلت کو بچے اور نوجوان خوشی سے قبول کرتے ہیں -

ماہرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مدرسے کے ماحول میں معاشرہ خود افراد کی تربیت میں بہت دخل رکھتا ہے لیکن اس سے پورا فائدہ اس وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب معاشری زندگی کی تنظیم خود طلبہ کے ہاتھہ میں ہو اور اسکول کی حکومت اور ضبط و نظم کی بنیاد ان کے معاشری احساس پر رکھی جائے - بالفاظ دیگر ان میں حکومت خود اختیاری قائم کی جائے اور اس چھوٹی سی ریاست کا انتظام ، اور باہمی معاملات اور اختلافات کی گتھیوں کو سلجھانے کا کام انہیں کے سپرد کردیا جائے - جب تک انہیں معاشری معاملات میں آزادی عمل حاصل نہ ہوگی وہ باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے زندگی کے مسائل کو طے کرنا اور اپنی غلطیوں اور تجربوں سے سبق حاصل کرنا نہیں سیکھیں گے ، اور نہ ان میں اعتماد ذات پیدا ہوگا نہ باہمی مراعات و مفاہمت کی عادت ، جس پر تمدنی زندگی کا انحصار ہے - خصوصاً موجودہ زمانے کا جمہوری نظام ایسے افراد کا طالب ہے جن میں اعتماد ذات کے ساتھہ دوسروں پر بھروسہ کرنے کی صلاحیت بھی ہو ، جن میں اجتماعی اتحاد اور شہریت کے فرائض کا پورا احساس ہو ، جو موقع پر قیادت کا کام انجام دے سکیں اور ضرورت کے وقت خلوص اور وفاداری کے ساتھہ اپنے قائد کی اطاعت کرنے کو تیار ہوں - ہماری تعلیم گاہیں ، جمہوری شہریت کے لئے موزوں افراد اسی حالت میں پیدا کرسکتی ہیں جب ان کی اندرونی تنظیم خود مختار جماعتوں کی سی ہو اور اس کے طلبہ کو ذمہ دارانہ طریقہ پر انتظامی فرائض ادا کرنے

کا موقع ملے - جن مدارس میں حکومت خود اختیاري کا تجربہ کیا گیا ھے اور مطالعہ کے کمروں؛ کھیل کے میدانوں اور دارالاقامہ میں طلبہ کو آزادی کے ساتھہ ساتھہ ذمہ داریاں بھی دی گئی ھیں وھاں بالعموم بہت عمدہ نتائج حاصل ھوئے ھیں اور ان کے طلبہ نے اعتماد ذات؛ قوت عمل اور معاشری رواداري کا ثبوت دیا ھے - ان مدرسوں کے معلموں کو اس بات کی ضرورت نہیں رھتي کہ وہ ھر وقت جاسوس کی طرح اپنے شاگردوں کی غلطیوں اور شرارتوں کي توہ میں رھیں اور نکتہ چینی اور عیب جوئی کا ناگوار فرض ادا کرتے رھیں جس کی وجہ سے اکثر اُستادوں اور شاگردوں کے تعلقات خراب ھوجاتے ھیں - وھاں ضبط و تادیب کے فرائض طلبہ خود انجام دے لیتے ھیں - معلموں کو اتنی مہلت ملتي ھے کہ وہ اپنی شخصیت سے اس چھوٹے سے معاشرے کی عام فضا پر عمدہ اثر ڈالیں - اس کے افراد فرائض اور ذمہ داریوں کو آپس میں تقسیم کرلیتے ھیں اور اگر ان میں سے کوئي اپنے کام میں کوتاھي کرتا ھے تو وہ خود اس سے باز پرس کرتے ھیں اور اس کے لئے سزا تجویز کرتے ھیں - علاوہ بریں اس انتظام میں ان طلبہ کو قیادت اور سرداري کے فرائض انجام دینے کا موقع ملتا ہے جو فطرتاً اس کے اھل ھوتے ھیں اور باقی سب مل جل کر احکام کی تعمیل کرنا سیکھتے ھیں -

حکومت خود اختیاري کے تجربات صرف عام مدارس ھی تک محدود نہیں رھے بلکہ بعض ماھرین نفسیات اور معلموں نے انھیں نو عمر مجرموں کی اصلاح اور تعلیم میں بھی استعمال کر کے دیکھا اور بہت کامیاب پایا - ان کی تجویز یہ تھی کہ ان مجرموں کو جو بالعموم شہروں کی خراب اور گمراہ کرنے والے ماحول ھی میں بگڑتے ھیں وھاں سے نکال کر ایسي جگہ منتقل کیا جائے جہاں ان کو آزادی کي فضا

ملے اور خود اپني زندگی نئے سرے سے تنظیم کرنے کا موقع حاصل ہو - چنانچہ یہي ہوا اور یہ نوجوان اور بچے ان اصلاحی مدارس یا بستیوں میں رکھے گئے جہاں حکومت خود اختیاری کے اصولوں کی کار فرمائی تھی - یہ لوگ خود قانون بناتے تھے اور تمام ذمہ داریوں اور فرائض کو آپس میں تقسیم کر لیتے تھے - ان پر کوئی بیرونی تعزیر عائد نہیں کی جاتی تھی بلکہ جو افراد جماعت کے قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے جماعت ان کو خود ہی سزا دے لیتی تھی - ان پر ایک بہت بڑا اصلاحي اثر یہ ڈالا گیا کہ اُن کے لئے خود اپنی محنت سے روزی کمانا لازم کر دیا گیا اور اس طرح انہیں باقاعدگی کے ساتھہ کام کرنے کی عادت پڑی جو اخلاقی اور اصلاحي نقطہ نظر سے بہترین چیز ہے - جو اراکین جماعت ابتدا میں چند روز یا چند ہفتے تک اپنی پرانی عادتوں کی وجہ سے کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے ان کے لئے کوئی جسمانی سزا مقرر نہیں تھی لیکن انہیں اپنے ساتھیوں کی خیرات پر گزارہ کرنا پڑتا تھا جس سے زیادہ تکلیف دہ اور شرمناک محتاجی اور کیا ہوسکتی ہے ؟ چنانچہ اس کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا تھا کہ وہ خود ہی کام کرنا شروع کر دیتے تھے اور جماعت کے فرائض میں شریک ہوجاتے تھے - اس طرح اکثر نوجوانوں کے مجرمانہ رجحانات کی اصلاح بہت جلد ہوگئي اور ان میں وہ عادتیں پختہ ہونے لگیں جو کامیاب اور مفید شہري بننے کے لئے ضروري ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو محنت اور باقاعدہ کام کرنے کی ذمہ داری سے ان کی طبیعت کی اصلاح ہوتی اور دوسري طرف ان کی بہت سی عملی صلاحیتیں اور مفید حوصلے جن کو واقعات اور حالات نے دبا رکھا تھا اور اس وجہ سے ان کے نفس میں ایک مستقل اور مسلسل کشمکش رہتي تھی اب مناسب صورتوں میں ظاہر ہونے لگتے - آزادی اور ذمہ داری کی اس نئی فضا میں آنے والے افراد

کو یہ محسوس ہوا کہ اب وہ کسی بیرونی اور خارجی طاقت سے برسرپیکار نہیں جو ان کی مخالفت پر آمادہ ہے بلکہ اپنے ہی ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھہ زندگی بسر کر رہے ہیں جو کچھہ عرصہ پہلے انہیں کی طرح معاشرے اور اس کے قوانین سے باغی تھے لیکن اب اس جماعت کے ذمہ دار اراکین بن گئے ہیں جو خود قانون وضع کرتے ہیں اور خود ہی اسے نافذ کرتے ہیں - اس لئے اس قانون کی مخالفت میں نہ انہیں کوئی لطف آتا ہے نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے - لہذا رفتہ رفتہ جماعتی زندگی کے اصول اور قوانین کو قبول کرکے بقول شخصے " جنگل کے چور ہی جنگل کے محافظ بن جاتے ہیں " اور کچھہ عرصہ کے بعد اس قابل ہوجاتے ہیں کہ ان کی اصلاحی بستیوں سے نکل کر معاشرے کی طبعی زندگی میں بحیثیت ذمہ دار شہریوں کے حصہ لے سکیں - اگر یہ لوگ ایسی فضا میں نہ رکھے جاتے جو اخلاقی تربیت کا وسیلہ ثابت ہوتی ہے تو وہ بھی معمولی مجرموں کی طرح جیل خانوں میں رہ کر مختلف قسم کی سزائیں اور معاشرے کی مخالفت برداشت کرکے عادی جرائم پیشہ بن جاتے اور تمام عمر معاشری اور اخلاقی قوانین کے خلاف ورزی کرتے رہتے - ان تجربوں کی نہایت دل چسپ اور سبق آموز تفصیل بہت سی جدید تعلیمی تصانیف میں بیان کی گئی ہے جن میں سے ہومر لین (Homer Lane) کی کتاب " Little Commonwealth " اور امریکہ کی ایک اصلاحی بستی "George Junior Republic" کے حالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں - اس کے نفسیاتی پہلو سے سرل برٹ (Cyril Burt) نے جو ایک انگریز عالم نفسیات ہیں اپنی مستند اور قابل قدر کتاب " The Young Delinquent" (نو عمر مجرم) میں بحث کی ہے - علمی تحقیق اور عملی تجربات دونوں اس امر پر

متفق ہیں کہ حکومت خود اختیاری کے طریقے اور تجربات صرف انہیں طلبہ کے لئے مفید نہیں جو بعض خارجی یا خلقی اسباب کی وجہ سے دماغی کمزوریوں اور اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہیں بلکہ مدرسوں کے معمولی طلبہ کے لئے بھی، جن کی دماغی اور اخلاقی حالت طبعی ہے، اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کار آمد ہیں، کیونکہ ان طلبہ کو سابقہ خرابیوں اور کمزوریوں کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑتی بلکہ شروع ہی سے آزادی کی فضا میں ان کی تربیت کی صحیح بنیاد پڑجاتی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری میں اخلاقی اصول و قوانین کی پابندی کرنا سیکھہ لیتے ہیں -

ہم نے حکومت خود اختیاری کے جو اصلاحی اور طبعی فوائد بیان کئے ہیں ان میں بہت اختصار سے کام لیا ہے اور بہت سی ایسی عملی مشکلات سے بحث نہیں کی جو اس کے دوران میں پیدا ہوتی ہیں اور بعض اوقات اس تجربے کو کامیاب نہیں ہونے دیتیں - لیکن ہم نے اپنی بحث قصداً اصولوں تک محدود رکھی ہے اور جہاں تک اس اصول کا تعلق ہے جس پر حکومت خود اختیاری کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کی صحت اور مقبولیت میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں گو اسے عمل میں لانے کے لئے بہت کچھہ احتیاط اور دیکھہ بھال کی ضرورت ہے - ضبط و انضباط کا یہ نیا نظریہ جو آزادی اور ذمہ داری کے ستونوں پر قائم ہے اور دونوں کو برابر اہمیت دیتا ہے ادب و تادیب کے پرانے اصولوں سے بہت مختلف ہے - اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ہمیں پھر ایک بار اس غلط نفسی عقیدے کی تردید کرنا چاہئے جس کا ہم نے اس حصہ کے باب اول میں ذکر کیا ہے اور جس کی وجہ سے اخلاق کے مفہوم کے متعلق غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں - اکثر زمانوں

میں ، زیادہ تر مذہب کی تعلیم کی وجہ سے ، یہ خیال رائج رہا ہے کہ انسان بالطبع شر کی طرف مائل ہے اور بہت کچھ مشکلیں اور تکلیفیں اٹھانے ، اور اپنے نفس کو مارنے کے بعد ، وہ ایک حد تک خیر کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے - مذہب عیسوی کے نظریۂ اخلاق و نجات کی بنیاد اسی عقیدے پر رکھی گئی ہے اور جہاں کہیں رہبانیت اور ریاضت کی تعلیم دی گئی ہے وہاں کسی نہ کسی شکل میں اسی خیال کی کار فرمائی پائی جاتی ہے - اس نظریہ کے مطابق انسان کے نفس میں قوت ارادی اور خواہشات کے درمیان ہمیشہ جنگ رہتی ہے - خواہشات اس کو برائی اور بدی کی جانب لے جاتے ہیں اور قوت ارادی کا یہ کام ہے کہ وہ اس کو جبراً اس راہ پر چلنے سے روکے - گویا وہ ایک مستقل اور قائم بالذات قوت ہے جس کو فطری خواہشات اور میلانات سے کوئی اندرونی تعلق نہیں سوائے اس بیرونی تعلق کے کہ ان کی مخالفت اور روک تھام کرے - یہ قوت ارادی " ضمیر " کہلاتی ہے اور انسان کا دل ایک " رزم گاہ خیر و شر " سمجھا جاتا ہے - یہاں " شر " کے معنی ہیں انسان کے جبلی میلانات اور " خیر " نام ہے اس قوت ارادی یا ضمیر کا جو اسے نیکی کی طرف کھینچتا ہے - اس نقطۂ نظر کے مطابق سوائے خاص خاص لوگوں کے جو غیر معمولی اخلاقی قوت اور روحانیت رکھتے ہیں اور کوئی شخص ان بری خواہشات کو پوری طرح زیر نہیں کر سکتا - البتہ تادیب نفس کے ذریعہ ایک حد تک انہیں قابو میں رکھ سکتا ہے ، جس طرح معاشری زندگی میں پولیس مجرموں کا خاتمہ نہیں کر سکتی لیکن ان کو تھوڑا بہت دبائے رکھتی ہے -

فطرت انسانی کی اس تفسیر نے تعلیم اور تادیب کے نظام پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے - اس کی رو سے نہ صرف بالغین کی بلکہ بچوں

کی فطرت بھی قدرتاً شر کی طرف مائل ہے اور اس کی اصلاح کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اوائل عمر ہی سے رکاوٹوں، بندشوں اور سزاؤں سے کام لیا جائے اور بچوں کی فطری میلانات اور خواہشات جو خرابی کی جڑ ہیں، ابھرنے نہ دی جائیں - ان کی روح کی نجات اسی میں ہے کہ وہ بے چوں و چرا ان تمام قواعد اور احکام کی پابندی کریں جو والدین اور استاد ان پر عائد کرتے ہیں خواہ ان کا مطلب اور فائدہ ان کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے - ہر معاملے میں انہیں اپنی ذاتی خواہشات کو دبانا اور روکنا چاہئے کیونکہ خواہش کی راہ پر چلنا شیطان کو اس کے کام میں مدد دینا ہے - انگلستان کے مشہور فلسفی جان لاک (John Locke) کا نظریہ تعلیم و تادیب بہت کچھ اس خیال کی نمائندگی کرتا ہے - اس کا تعلیمی اصول یہ تھا کہ :—

"بچے کی روح کو ہلاکت سے بچانے کے لئے اس کی خودی کو پامال کرو"

لیکن صدیوں کے تجربے نے اس بات کو واضح کردیا ہے کہ اگر ضبط و تادیب کی بنیاد محض خارجی خوف اور بیرونی بندشوں پر رکھی جائے گی تو اس کے نتائج بہت خراب ہوں گے - یا تو طلبہ میں عمل کا حوصلہ اور ولولہ بالکل نہیں رہے گا اور وہ اپنی قوت ارادی اور جذبات کو اچھے کیا برے' کاموں کے لئے بھی استعمال نہ کرسکیں گے - یا وہ کھلم کھلا ان بندشوں کی مخالفت کریں گے جن کی وجہ سے مدرسے میں استادوں اور شاگردوں میں ہر وقت ایک کشمکش رہے گی جو تعلیم کی کامیابی میں دارج ہوگی، یا انہیں کھلے بندوں مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی ان کی مخالفت درپردہ اور بھی گہری ہو جائے گی یعنی داخلی اور

نفسی کشمکش کی کیفیت اختیار کرے کی جو دماغی اور اخلاقی صحت کے لئے سب سے زیادہ نقصان دہ صورت ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی دماغی اور اخلاقی صحت اور مدرسے کا ضبط و انتظام اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب طلبہ اپنے کام میں دلچسپی لیں، مدرسے کے قانون کو سمجھ کر اس کا احترام کریں، خود اس کے بنانے میں شریک ہوں اور اس کی پابندی کرنے اور کرانے کو اپنا ذاتی فرض تصور کریں۔ برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) ضبط کے اس مفہوم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

'' جب طلبہ ان کاموں میں مشغول ہوتے ہیں جو ان کو خود مرغوب ہیں تو بیرونی ضبط و تادیب کی ضرورت ہی نہیں پڑتی - چند سیدھے سادھے قاعدے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں کافی ہیں مثلاً یہ کہ کوئی بچہ دوسرے بچوں کے کام میں مداخلت نہ کرے، ایک وقت میں ایک سے زیادہ اپریٹس (apparatus) استعمال نہ کرے وغیرہ وغیرہ - وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ قاعدے مناسب اور قرین عقل ہیں اس لئے ان کی پابندی میں دقت نہیں ہوتی - اس طرح بچے میں ضبط نفس پیدا ہوتا ہے جو دو چیزوں پر مشتمل ہے، ایک تو کسی حد تک اچھی عادتوں پر دوسرے اس احساس پر جو عملی مثالوں کے ذریعے پیدا ہوتا ہے، کہ بعض اوقات انجام کار فائدہ اسی میں ہے کہ آیندہ نفع کے لئے موجودہ خواہش روک لی جائے - لوگوں کو ہمیشہ سے یہ بات معلوم ہے کہ کھیلوں میں اس قسم کا ضبط نفس آسانی

سے حاصل ہوتا ہے - لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ تحصیل علم بھی اتنی دلچسپ بنائی جاسکتی ہے کہ اس میں وہی محرکات عمل کار فرما ہوں جو کھیلوں میں ہیں..........اس کا اصل اصول بہت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی ضبط بیرونی جبر اور دباؤ کے مرادف نہیں بلکہ ان ذہنی عادتوں پر منحصر ہے جن کی وجہ سے بچہ خود بخود برے اور ناپسندیدہ کاموں کے بجائے اچھے اور پسندیدہ کاموں کی طرف راغب ہوتا ہے "[1]

اس خیال کے خلاف ایک لازمی رد عمل یہ ہوا کہ بعض معلمں اور مفکروں نے اس کے بالکل برعکس نقطہ نظر اختیار کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ بچہ اوائل عمر میں تمام تر خیر و خوبی کا مجسمہ ہوتا ہے اور اس میں جو کچھ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ماحول کے اثر اور اپنے ساتھیوں اور بزرگوں کی بری مثال کا نتیجہ ہیں - روسو نے اس خیال کی نمائندگی کی ہے وہ کہتا ہے کہ :—

" ہر چیز جب خالق فطرت کے ہاتھوں سے نکل کر آتی ہے، اچھی ہوتی ہے لیکن انسان کے ہاتھہ میں آکر خراب ہو جاتی ہے - "

انہیں خیالات کو شاعرانہ پیرائے میں ورڈز ورتھہ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھہ اپنی نظموں میں جا بجا بیان کیا ہے - بالخصوص

---

[1] On Education صفحہ ۲۹ -

اس کی مشہور نظم " اوائل عمر میں حیات ابدی کے نشانات " [1] کا موضوع یہی مسئلہ ہے :—

" ہم بچپن میں آسمان سے جو ہمارا گھر ہے ، اُترتے ہیں اور ہمارے پیچھے پیچھے روحانی عظمت و جلال کے بادل امڈے چلے آتے ہیں "

اس نقطۂ نظر کی رو سے انسان میں کوئی فطری قوتیں ایسی نہیں ہوتیں جو اس کو برائی کی طرف لے جاسکیں - اس کی طبیعت کا میلان سراسر خیر کی جانب ہوتا ہے - اگر معاشرے کے خراب اثرات اس پر نہ پڑیں اور تربیت صحیح اصولوں پر کی جائے تو وہ بہت عمدگی اور آسانی سے ایک مفید شہری اور با اخلاق انسان بن جائیگا - اس سے مدرسے کے ضبط و تادیب کے متعلق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کو اور افراد کو بچوں کی نشو و نما میں کم سے کم مداخلت کرنی چاہئیے اور اُنہیں جہاں تک ممکن ہو ان کی فطرت پر چھوڑ دینا چاہئیے تاکہ وہ اس کے قوانین کے مطابق تربیت پائیں اور ماحول کے خراب اثرات کی وجہ سے ان کی نفسی اور اخلاقی ارتقاء میں رکاوٹ نہ پیدا ہو - جن معلموں نے روسو (Rousseau) وغیرہ کی پیروی میں اس اصول پر عمل کیا انھوں نے حتی‌الامکان مدرسوں سے سزاؤں بندشوں اور بیرونی قواعد اور ضابطوں کو اُٹھادیا اور طلبہ کو آزادی دیدی کہ وہ ایک وسیع دائرے کے اندر جو چاہے کریں - یعنی اپنی فطرت کے متقضا کے موافق جن مشاغل کو چاہیں اختیار کریں -

---

[1] Ode on the Intimations of Immortality especially in early childhood.

یہ خیال بہت دل خوش کن معلوم ہوتا ہے اور اکثر نرم مزاج معلموں کے دل کو لگتا ہے ' اور دنیا کے بہت سے مصلحوں اور نوع انسانی کے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے اپنی اصلاحی تجاویز کی بنیاد اسی پر رکھی ہے - لیکن واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ خیال بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا وہ خیال کہ انسان بالطبع شر کی طرف مائل ہے - در اصل یہ دونوں نظرئے تصویر کے دو مختلف رخوں کو دکھاتے ہیں اور جیسا کہ قاعدہ ہے مبالغہ کے ساتھ اپنے اپنے نقطہ نظر کو ظاہر کرتے ہیں - حقیقت ان دونوں کے وسط میں ہے یعنی ہمیں ایک طرف تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بچے فطرتاً شر کی طرف مائل نہیں اور دوسری طرف یہ ماننا پڑیگا کہ ان میں بعض ایسی جبلتیں ہیں جو غلط راہ پر پڑکر اخلاقی خرابیوں کی شکل اختیار کرسکتی ہیں - بچے کو نہ تو بری جبلتوں کا غلام سمجھنا چاہئے جن کے ہاتھ وہ اتنا بے بس ہے کہ جب تک ان کو ریاضت اور نفس کشی کے ذریعے زیر نہ کرے نیک نہیں بن سکتا - نہ اس کو ماحول کی قوتوں کے ساتھ اس حد تک وابستہ تصور کرنا چاہئے کہ اس کی اصلاح اور تہذیب دونوں ان پر منحصر ہیں - حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی حد تک خود اپنی سیرت اور اپنے کردار کا خالق ہے ' اور اپنی جبلی قوتوں اور ماحول کے وسائل اور اثرات سے کام لیکر اپنی زندگی کو بنانا اور بگاڑنا اسی کے اختیار میں ہے - موجودہ علم نفسیات اس مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے کہ بچہ کو اوائل عمر میں اخلاقی اعتبار سے نہ اچھا کہہ سکتے ہیں نہ برا - اس کی ابتدائی حرکات ' جو محض اس کی جبلتوں کا سیدھا سادہ اظہار ہیں کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتیں یعنی کسی اخلاقی معیار پر نہیں پرکھی جاسکتیں - اس کی مخصوص اور قوی جبلتیں

بھی مثلاً تجسس، تعمیر، اظہار [illegible] شکل میں اخلاق سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ [illegible] سکتے ہیں کہ سوائے ان چند طبعی صورتوں کے جب [illegible] خراب اثرات جسمانی اور دماغی کمزوریوں اور برے میلانات کی شکل میں ظاہر ہوں، بچے اوائل عمر میں خیر و شر سے بری [illegible] یعنی ہم ان کے عمل پر کوئی اخلاقی حکم نہیں لگا سکتے [illegible] اپنے افعال کا ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں - لیکن یہ ضرور ہے کہ ان [illegible] اخلاقی جبلتوں اور رجحانوں میں خیر و شر دونوں کے امکانات پوشیدہ ہیں اور [illegible] ماحول کے اثرات، تعلیم، تربیت [illegible] خود بچے کی اپنی کوشش پر منحصر ہے کہ یہ آئندہ چل کر کیا رنگ اختیار کریں گے آیا اخلاق حسنہ کی شکل میں ظاہر ہوں گے یا اخلاقی عیوب کی صورت میں۔ رسل (Russel) اپنی کتاب [illegible] میں اس بات کو بہت صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ بچے فطرتاً نہ اچھے [illegible] ہیں نہ "برے" وہ صرف چند اضطراری افعال [illegible] لے کر [illegible] پیدا ہوتے ہیں [illegible] کی بنیاد پر ماحول [illegible] عادتیں نشو و نما پاتی ہیں جو اچھی بری [illegible] زیادہ تر ماں باپ یا کھلائیوں کی عقل پر منحصر ہے کیونکہ اوائل عمر میں بچوں کی طبیعت بے حد شکل پذیر ہوتی ہے - اکثر بچوں میں اچھے شہری بننے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور مجرم بننے کی بھی - عام نفسیات کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہفتہ میں

چھہ دن بچوں کو زد و کوب کرنے اور ساتویں دن وعظ اور تلقین کرنے کا دستور ان کو نیک بنانے کا صحیح طریقہ نہیں - لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاھئے کہ اخلاقی تربیت کی کوئی صورت ھی نہیں ھے - کسی تندرست بچے کو خوش رکھنا مشکل نہیں اور اگر بچوں کے جسم اور دماغ کی مناسب نگہداشت کی جائے تو وہ بالعموم خوش رھتے ھیں بچپن میں خوش و خرم رھنا بہترین قسم کا انسان بننے کے لئے بالکل لازمی ھے - اگر بچے یہ محسوس کریں گے کہ تعلیم کے ذریعہ وہ مفید باتیں سیکھہ رھے ھیں تو ان میں کاھلی کی وہ عادت پیدا نہ ھوگی جس کو ڈاکٹر آرنلڈ اخلاقی عیب سمجھتے ھیں - برخلاف اس کے اگر بچے کو جو علم سکھایا جاتا ھے وہ اسے بیکار معلوم ھو اور اُستاد ظالم اور بے رحم نظر آئے تو اس کی وھی حالت ھوگی جو چیخوف (Tchehov) کی کہانی میں بلی کے بچے کی ھوئی تھی [۱] - ھر صحت مند بچے کو از خود سیکھنے کی خواھش ھوتی ھے جس کو وہ مثلاً چلنے اور بولنے کی کوشش میں ظاھر کرتا ھے - اسی خواھش کو تعلیم

---

[۱]—چیخوف نے ایک کہانی میں ایک پروفیسر کا ذکر کیا ھے جو اپنی بلی کے بچے کو مار مار کر چوھوں کا شکار کرنا سکھایا کرتا تھا - نتیجہ یہ ھوا کہ بے چارہ بلی کا بچہ اس فطری فعل سے اتنا ڈرنے لگا کہ جب وہ کسی چوھے کو دیکھتا تو مارے ڈر کے پسینے پسینے ھوجاتا تھا - فاضل پروفیسر نے اس "مشاھدے" سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ بچہ بالکل غبی اور احمق ھے - (اس قصہ سے پروفیسر موصوف کی حماقت صاف ظاھر ھوجاتی ھے - لیکن دنیا میں انسانوں کے لا تعداد بچوں سے ان کے معلموں نے بالکل یہی سلوک کیا ھے اور صدیوں کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی!) -

میں قوت محرکہ بنانا چاہئے - (بچوں کی) تعلیم
میں اُستاد کی قمچی کے بجائے اس خراهش سے کام
لینا همارے زمانے کی نہایت اهم تعلیمی اصلاح هے -[۱] "

پس معلوم هوا کہ اخلاقی تربیت کا صحیح نظریہ قائم کرنے کے لئے همیں ان تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا چاهئے جن کے تعامل سے انسانی سیرت اپنا مخصوص رنگ اختیار کرتی هے - معلم کو اچھی طرح سمجھہ لینا چاهئے کہ بچوں کی ابتدائی جبلتوں میں بہت بڑی قوت هوتی هے جس کو نظر انداز کرنا سخت غلطی هے - اگر ان جبلتوں کو تربیت دےکر اس طرح منظم نہ کیا جائے گا کہ وہ علمی اور اخلاقی مقاصد میں معین هوں تو وہ هر هر قدم پر اس کی کوششوں میں مزاحم هوں گی اور اخلاقی تعلیم محض الفاظ تک محدود رهے گی عمل کی شکل میں ظاهر نہ هوگی - کیونکہ عمل کی محرک همیشہ کوئی ایک جبلت یا کئی جبلتیں هوتی هیں - لیکن جبلتوں کی تنظیم بغیر کسی خارجی ماحول کے نہیں هوسکتی - اس کے لئے ان میں اور ماحول کے اثرات میں باهمی رد عمل کی ضرورت هے - هر جبلت بالعموم یہ ظاهر کرتی هے کہ خاص حالات میں بچے کی طبیعت اور عمل کا میلان ایک خاص "سمت" میں هوگا لیکن یہ بات ماحول کے اثر پر منحصر هے کہ وہ میلان کس موقع پر کس "شکل" میں ظاهر هوگا - مثلاً اظہار خودی کی جبلت کا تقاضا یہ هے کہ بچہ اپنی قوتوں سے کام لے کر کسی طرح اپنی شخصیت کا سکہ اپنے ساتھیوں اور ماحول پر بٹھائے - یہ جبلت هر بچے میں هوتی هے ' بعض میں بہت قوی بعض میں کمزور - اس کے اظہار کی بے شمار صورتیں هیں - اگر ماحول کا اثر اور هم صحبت لوگوں کی مثال خراب

---

[۱]—On Education صفحہ ۲۹ -

ھے تو ممکن ھے بچہ اپنے سے کمزور بچوں کو مارے پیٹے اور اس طرح رعب جمانا چاھے - یا ضد کرکے اپنے سے بڑوں کو اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور کرے یا اور قابل اعتراض حرکات کرے جن سے دوسروں کی توجہ اس کی جانب مبذول ھو - یہ سب اظہار خودی کی ناپسندیدہ شکلیں ھیں اور ان کا تجربہ ہر معلم کو ھوتا رھتا ھے - لیکن اس جبلت کو عمدہ تربیت اور اثرات کے ذریعے بہترین عادات و صفات کی بنیاد بنایا جاسکتا ھے - جہاں اظہار خودی کی ایک صورت دوسرے انسانوں پر جبر اور ظلم سے غلبہ حاصل کرنا ھے' وھاں اس کا اظہار خدمت کے ذریعے' عالم فطرت کی قوتوں کے ساتھہ جنگ کرنے اور ان کو زیر کرنے کی شکل میں' علمی تحقیقات اور ادب اور آرٹ کی تخلیق میں بھی ھوسکتا ھے - مختلف لوگوں کی طبیعت کے لئے اظہار خودی کے مختلف طریقے موزوں ھوتے ھیں اور جس طرح ایک شخص کے جذبۂ خودی کی تسکین مثلاً جنگ و جدال کے مشاغل میں ھوتی ھے' بالکل اسی طرح کوئی دوسرا شخص ایک خوبصورت تصویر بنانے میں' یا پتھر کے ایک تھرس اور بےھنگم ٹکڑے کو ایک حسین مجسمے میں تبدیل کرنے سے' یا قومی خدمت' اور مصیبت زدوں' غریبوں مظلوموں کی دادرسی سے' اپنی جبلت کو تسکین دیتا ھے - اس اختلاف کا باعث بڑی حد تک طبیعت کا فطری رجحان ھوتا ھے اور کسی حد تک ماحول کا اثر اور تقلید - لیکن تربیت اور ماحول کی اصل اھمیت یہ ھے کہ سوائے ان غیر طبعی صورتوں کے جب کوئی شخص نفسی امراض میں مبتلا ھو یا توارث کے بہت قوی اثرات کی وجہ سے اس کی جبلتوں کا اظہار لازمی طور پر غلط طریقہ اختیار کرے' ھر بچے کی جبلتیں ایسے مشاغل اور شوقوں کے ساتھہ وابستہ کی جاسکتی ھیں کہ وہ اُن کی اپنی ذات کے لئے اور معاشری مشاغل

کے لئے مفید ثابت هوں - مگر معلم کو هر صورت میں یہ یاد رکھنا چاهئے کہ تشکیل سیرت کے ڈراما میں هیرو کا پارٹ خود بچے کی اپنی ذات کرتی هے اور اس کی جبلتیں ' اس کا وہ سرمایہ جو توارث جسمانی کے ذریعے حاصل هوتا هے ' اور ماحول کی قوتیں اور مظاهر سب وسائل اور ذرائع هیں جن کو وہ استعمال کرتا هے - وہ ان کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا - اس معنی میں وہ ضرور ان کا محتاج هے - لیکن وہ ان کے هاتھوں میں بے بس نہیں هوتا کہ جس طرح کمہار گیلی مٹی کو جس شکل میں چاهے ڈهال سکتا هے اسی طرح یہ تمام قوتیں اس کو جس سانچے میں چاهیں ڈهالیں - اس کی اخلاقی آزادی اور ذمہ داری کے یہ معنی هیں کہ ان قوانین کے اندر رہ کر جو عالم طبعی اور عالم معاشرت میں کار فرما هیں ' اور جن سے رهائی حاصل کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل خود کرسکتا هے -

هم یہاں انعام و سزا کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کرسکتے لیکن چونکہ مدرسوں میں اور معلموں کے تعلیمی کار و بار میں اس کو صدیوں سے بہت اهمیت حاصل رهی هے اس لئے مختصر طور پر یہ بتا دینا ضروری هے کہ ان کا صحیح منشا کیا هے اور ان کو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا هے - اس زمانے میں جب جدید تعلیمی خیالات کا اثر آهستہ آهستہ همارے دور افتادہ مدرسوں تک پہنچ رها هے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اب تک سزا خصوصاً جسمانی سزا کا جو زور رها هے اور کہیں کہیں اب بھی هے وہ سراسر ناجائز اور خلاف عقل هے - بے سمجھ اُستادوں نے مدتوں یہ سمجھا اور اب بھی ایسے جاهل ' عقل کے دشمن استاد موجود هیں جو یہ سمجھتے هیں کہ جب کوئی بات بچہ کی سمجھ میں نہ آئے

یا وہ اسے یاد نہ کرسکے تو اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ اس کو زد و کوب کرکے اس سے دماغ اور حافظے کو تیز کیا جائے - خواہ طالب علم کی تعلیمی کمزوری کی وجہ کوئی جسمانی نقص یا صحت کی خرابی ہو یا کوئی فطری دماغی کمزوری ' یا توجہ کا انتشار ' یا گھر کے حالات کی ناسازگاری ؛ یا اُستاد کے طریقۂ تعلیم کی خرابی ان تمام صورتوں کے لئے اس کے پاس ایک ہی مجرب نسخہ تھا ؛ یعنی کسی قسم کی سزا اور وہ نئی نئی سزائیں ایجاد کرنے میں اپنی تمام قوت اختراع صرف کردیتا تھا - اب بھی گو سرکاری اور انگریزی مدارس میں جسمانی سزائیں بہت کم ہوگئی ہیں لیکن مکتبوں اور پاٹشالاؤں میں اکثر مولوی اور پنڈت اپنے شاگردوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لئے انہیں طرح طرح سے جسمانی یا روحانی ایذا پہنچاتے ہیں - سزا کا سب سے ادنیٰ اور سب سے زیادہ قابل اعتراض مفہوم یہ ہے کہ اُستاد ' شاگردوں کی کسی غلطی یا حرکت پر غصے اور انتقام کے جذبات سے بے بس ہوکر اس کو جسمانی تکلیف پہنچاوے - بعض لوگوں نے سزا کی اس خاص صورت کی تائید کی ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ بات فطرت کے موافق ہے کہ انسان فوری غصے سے مغلوب ہوکر سزا دے - اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد سزا دینا ان کے نزدیک جائز نہیں - لیکن ہم اس خیال سے اتفاق نہیں کرسکتے - معلم اور اس کے شاگردوں کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے جس کا قیاس معاشری زندگی کے معمولی تعلقات پر نہیں کرنا چاہئے - اس میں اتنا تحمل اور بردباری ہونی چاہئے کہ وہ اپنے غصہ کو ضبط کر سکے ' اور نفسیات اطفال سے اتنی واقفیت ہو کہ وہ ان کی غلطیوں اور قصوروں کی نفسی توجیہ کرکے یہ معلوم کرے کہ ان کے حرکات کی واقعی ذمہ‌داری کن اسباب پر عائد

هوتي هے - اس طرح تحلیل نفسي کرنے کا یہ نتیجہ هوگا کہ وہ غلط طریقہ استعمال نہیں کریگا - اور بجائے جسمانی سزا پر زور دینے کے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کریگا جو طلبہ کی تعلیمی یا اخلاقی تربیت میں حارج هیں اور جن کی وجہ سے ان سے قابل اعتراض حرکات سرزد هوتی هیں -

سزا کا اصلی منشا یہ هے کہ بچے کو کسی طرح یہ محسوس کرایا جائے کہ اس کی کسي خاص حرکت یا فعل کي وجہ سے نہ صرف دوسروں کو تکلیف پہنچی هے ' جس کا ممکن هے ابھی اسے پورا احساس نہ هوسکے ؛ بلکہ وہ خود بھی اپنے بعض حقوق اور آسائشوں سے محروم هوگیا هے ' اور جب کبھی وہ ان حرکات کا اعادہ کریگا اس کا یہی نتیجہ هوگا - یہاں قدرتي تادیب کے طریقہ سے کام لینے کي گنجایش هے جس پر روسو اور سپنسر نے زور دیا هے - وہ دونو اس بات کی مخالفت کرتے هیں کہ اُستاد بچوں کو جسمانی سزا دیں لیکن قدرتی سزا کے حامي هیں جس سے وہ تکلیف یا خمیازہ مراد هے جو بچوں کو اپنی حرکات کي وجہ سے خود بخود ' بطور قانون قدرت کے رد عمل کے اُتھانا پڑے - اگر بچہ آگ کو یا کسي بہت گرم چیز کو هاتھہ لگائے گا تو اسکا هاتھہ جل جائے گا اور وہ آئندہ احتیاط کرے گا - اگر وہ کسی دوسرے بچے سے کھلونا چھین لیگا تو مار کھائیگا ' اگر بے احتیاطی سے کھلونا توڑ دیگا تو اسے دوسرا کھلونا نہیں دیا جائیگا - اگر وہ وقت پر هوا خوری کے لئے تیار نہ هوگا تو باهر جانے سے محروم رهیگا - اگر وہ شرارت سے اپنے کمرے کے شیشے توڑ ڈالے تو بقول روسو (Rousseau) کے '' رات دن ٹھنڈی هوا اس کے کمرے میں آنے دو اور اس کي کچھہ پروا نہ کرو کہ اس کو زکام هوجائگا کیونکہ زکام هوجانا اس سے بہتر هے کہ وہ بے وقوف هی رهے - اگر وہ تمہیں تکلیف پہنچائے

تو اس کی شکایت نہ کرو بلکہ اسے خود بھی وہی تکلیف محسوس کراؤ" -
اس طریقہ میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُستاد اور والدین کے فوری غضب اور مزاجی کیفیت کو اس میں دخل نہیں ہوتا اور بچہ دو تین مرتبہ کے تجربے کے بعد ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ بعض حرکتوں کے ناگوار نتائج ناگزیر ہیں اگر وہ ان کا مرتکب ہوگا تو اسے ضرور تکلیف اٹھانی پڑیگی اور کوئی شخص اس کو اس خمیازہ سے نہیں بچا سکے گا - لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی سزائیں ہر جگہ پر کام نہیں دیتیں - بچوں اور نوجوانوں کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے پیدا ہوتے ہیں جب انہیں اپنے برے یا قابل اعتراض افعال کی کوئی فوری اور قدرتی سزا نہیں ملتی - مثلاً اگر کوئی بچہ اپنے سے کمزور بچے کو بے وجہ مارے یا اس کی کوئی چیز چھین لے تو اُسے اِس زیادتی کا کوئی فوری خمیازہ نہیں اٹھانا پڑیگا جب تک کوئی دوسرا شخص اس میں دخل نہ دے اور ارادتاً اس کو کسی قسم کی سزا نہ دی جائے ' خواہ سزا دینے والے والدین ہوں یا اُستاد یا خود طلبہ کی جماعت منتظمہ - علاوہ بریں بعض قدرتی سزائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اثر فوراً ظاہر نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ اپنا عمل کرتا ہے اور بچے کو اپنی حرکت کا پورا خمیازہ بہت مدت کے بعد بھگتنا پڑتا ہے جب اس کی بری عادت راسخ ہوجاتی ہے اور اصلاح کی گنجایش باقی نہیں رہتی - اس کی ایک مشہور مثال ایک قاتل کا قصہ ہے جس نے پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے یہ درخواست کی تھی کہ اسے اپنی بوڑھی ماں سے ایک بات کہنے کی اجازت دی جائے - حاکم نے رحم کھاکر اجازت دیدی - اس نے یہ کیا کہ ماں کے کان سے منہ لگایا گویا سرگوشی کرنا چاہتا ہے اور اپنے دانتوں سے اس کا کان کاٹ لیا - جب لوگوں نے اسے اس پر لعنت ملامت کی تو اس نے جواب دیا کہ

اگر میری ماں بچپن ہي میں تنبیہ اور سرزنش کرتی جب میں اپنے ہم جماعتوں کی پنسلیں اور کاغذ چرایا کرتا تھا تو مجھے یہ دن دیکھنے کی نوبت نہ آتی - یہی حال اور بہت سی خراب عادتوں کا ھے مثلاً شراب خوری ' بد دیانتی ' جھوٹ بولنا - ممکن ھے کبھی ان کا نتیجہ جلد ھی ظاھر ھوجائے لیکن اکثر اوقات لوگ مدت تک یہ حرکتیں کرتے ھیں اور اس کي انتہائی سزا ان کو بہت عرصہ کے بعد ملتی ھے جب انھیں اس سے کوئي فائدہ نہیں ھوسکتا -

غرض ہم قدرتی سزاؤں سے فائدہ ضرور اُٹھا سکتے ھیں - خصوصاً بچپن کے ابتدائی چند سال میں ان کا استعمال مفید ھے - لیکن بچوں کی تادیب کو صرف انھیں پر منحصر نہیں رکھہ سکتے بلکہ اکثر اس معاملے میں انسانی مداخلت کی ضرورت ھوتي ھے - چھوٹے بچے مختلف قسم کی بندشوں ' اور بعض مستثنیٰ صورتوں میں جسمانی سزا کے ذریعے ایسے افعال سے روکے جاسکتے ھیں جو ان کے لئے مضر ھیں - لیکن جب ان کی عمر زیادہ ھوجاتی ھے اس وقت سزا کا مسئلہ زیادہ مشکل اور پیچیدہ ھوجاتا ھے - اب ان میں عزت نفس اور احساس خودی کے جذبات زیادہ نمایاں ھونے لگتے ھیں اور وہ اپنے معاملات میں دوسروں کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے - بہت سے قاعدے اور قانون بناکر یا سزاؤں کا ایک مفصل نقشہ تجویز کرکے انھیں شرارتوں اور بري حرکتوں سے باز رکھنا ممکن نہیں - بلکہ اگر اس قسم کی سزاؤں پر زیادہ زور دیا جائے تو اندیشہ یہ ھے کہ ان کی طبیعت میں بزرگوں اور استادوں سے بغاوت اور ناراضگي کے جذبات راسخ ھوجائیں گے - جن معلموں نے اپنے شاگردوں کی نفسي کیفیات اور اعمال کا مشاہدہ غور سے کیا ھے وہ اس صورت حال سے بخوبی واقف ھیں -

لہذا بچپن کے آخری دور میں اور بلوغ کے زمانے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ طلبہ خود اپنے اعمال اور کردار کے ذمہ‌دار بنائے جائیں اور ہدایت کا مرکز باہر سے اندر کی جانب منتقل ہوجائے - اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی قوت ارادی کی تربیت کرنی چاہئے - تاکہ ان میں ضبط نفس پیدا ہو اور وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کرکے ان سے عمدہ طریقہ پر کام لیں اور اپنی زندگی کی تنظیم اس طرح کریں کہ اس پر اخلاقی اصولوں اور اخلاقی معیار عمل کی حکمرانی ہو - یہاں قوت ارادی سے مراد ؛ جیسا ہم بتا چکے ہیں ، وہ جداگانہ قوت نہیں جو قدیم نفسی عقیدے کے بموجب انسان کی خواہشات اور فطری میلانات کی دشمن ہوتی ہے اور بطور ایک بیرونی محافظ کے روک تھام کرتی رہتی ہے - بلکہ قوت ارادی دراصل خواہشات اور فطری رجحانات کی ترتیب و تنظیم سے عبارت ہے جو ہمیں ان کی اخلاقی قدر و قیمت سے آگاہ کرتی ہے اور ان میں سے بعض کو مقدم اور بعض کو موخر قرار دیتی ہے اور جس کی وجہ سے ہم عمرانی اور اخلاقی مقاصد کو اپنی فوری اور نفسانی خواہشات پر ترجیح دیتے ہیں - جب ہم میں شعوری طور پر انتخاب اور ترجیح کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے تو ہم اپنی رہنمائی کا فرض خود ادا کرسکتے ہیں - فورسٹر نے جرمن فوج کو مخاطب کرکے جو الفاظ کہے تھے وہ تعلیم کے اس مسئلہ پر بھی عائد ہوتے ہیں :—

'' انسان کی قوت ارادی کی تربیت اور اس کی تہذیب و تنظیم میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب اس کا فرض ہوتا ہے کہ سستی اور بے دلی کے ساتھ کام کرنے کی عادت چھوڑ

دے اور اپنی ذاتی اور مزاجی کیفیتوں کو کسی بڑے
اجتماعی مقصد کا تابع بنادے" [1]

حقیقت یہ ہے کہ انسان میں قوت ارادی کی صحیح نشو و نما اور ضبط نفس کا پیدا ہونا اسی وقت ممکن ہے جب اس کی زندگی کسی بڑے مقصد کے ساتھہ وابستہ ہوجائے اور وہ اپنی ذات کو اس کی تحصیل و تکمیل میں محو کردے - ناکام زندگی کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کا کوئی مرکز ' کوئی معین اور واضح مقصد نہیں ہوتا جس میں وہ دل و جان سے مشغول رہے ' جو اس کی قوتوں کو تضیع و انتشار سے محفوظ رکھے - ہر معمولی سی تحریص ہر مزاجی کیفیت اس کو ایک راہ سے ہٹاکر دوسری راہ پر ڈال دیتی ہے - دنیا میں جو لوگ کسی شعبہ زندگی میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں ان سب میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو کسی ایک مقصد کے ماتحت مرتب اور مجتمع کرلیتے ہیں اور اس مقصد میں اس درجہ محو ہو جاتے ہیں کہ جو چیز ' جو بات ' جو کام اس راہ سے ہٹا ہوا ہو وہ اُنھیں تضیع اوقات معلوم ہوتا ہے - ان کوتحریصوں سے یا غیر متعلق مشاغل سے ' بچانے کے لئے کسی سزا یا بیرونی دباؤ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود محسوس کرتے ہیں کہ فلاں کام اس لئے برا ہے کہ ان کے مقصد اعلیٰ میں حارج ہوتا ہے - اس وقت ان میں ضبط نفس کی شان پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنی تمام حرکات ' افعال ' کردار میں وہ نظم اور ترتیب قائم کرلیتے ہیں جس کے بغیر نہ قوت عمل پیدا ہوسکتی ہے نہ کامیابی حاصل ہوسکتی

Pinkavitch : The new education in the Soviet Republic [1]
صفحہ ۳۵ -

ہے - شخصیت کی قدرتی نشو و نما کے دوران میں اس قسم کے کسی مقصد کا تعین تربیت انسانی کا سب سے اہم عنصر ہے اور اس میں معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ طلبا کے مقاصد کو پست سے بلند اور بلند سے بلند تر کرے اور ان کو اخلاقی اور عمرانی اقدار سے ہم آہنگ بنائے - کیونکہ محض قوت عمل ' اور ضبط نفس اور کارکردگی کی صفت تو ہر اس شخص میں پیدا ہوسکتی ہے جو کسی ایک مقصد کو اپنا مطمح نظر بناکر اس کے لئے کوشش کرے خواہ وہ مقصد اچھا ہو یا برا ' معاشری مفاد کے موافق ہو یا مخالف - چنانچہ وہ لوگ جن کو کسی خیال میں اتنا انہماک ہوجاتا ہے کہ وہ جنون کی حد تک پہنچ جائے ' اس خیال کی خاطر اپنی ذاتی تکلیفوں کی پرواہ نہیں کرتے اور بعض اوقات فرہاد کی طرح وہ کام کر دکھاتے ہیں جو انسانی قوت سے بالا تر معلوم ہوتا ہے - تاریخ اور افسانے دونوں میں اس قسم کی ہزارہا مثالیں موجود ہیں - لیکن یہ لوگ نہ اپنے آپ کو کوئی مستقل فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ دوسروں کو - ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر نوجوان کے پیش نظر زندگی کا کوئی ایسا مقصد ہو جو اس کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے موزوں اور معاشری مفاد اور بہبود کے لحاظ سے قابل قدر ہو تاکہ وہ اس میں منہمک ہوکر ایک طرف تو اپنی شخصیت کی تکمیل کرسکے ' اپنے آپ کو اپنے کام میں کھوکر پاسکے کہ یہی "معرفت نفس" کا واحد ذریعہ ہے ' اور دوسری طرف وہ شخصی اغراض کے تنگ دائرے سے نکل کر اپنی ذات کو وسیع تر عمرانی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرے - جب اِنسان کی نظر میں اس قدر وسعت اور رسائی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ اپنے محدود ذاتی مقاصد کا رشتہ دائمي اور ابدی مقاصد کے ساتھ جوڑ لیتا ہے جن کی تکمیل میں کائنات کی ساري قوتیں مصروف

هیں اور اِس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قدرت کے سارے کارخانے میں ایک عظیم‌الشان ارتقا پذیر مقصد کی کارفرمائی ہے جس میں اسے بھی اپنی استطاعت کے مطابق شرکت کرنی چاھئے تو "ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا" کی منزل آجاتی ہے جہاں مذہبیت کی سچی روح اپنا جلوہ دکھاتی ہے ، انسان اخلاق اور انسانیت کے درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے - اسے انفرادی اور معاشری اغراض و حقوق کی جلنگ ، خارجی سزاؤں کا خوف اور خارجی جزاؤں کا لالچ بالکل بے معنی اور حقیر معلوم ہوتا ہے اور وہ برائیوں اور "گناھوں" سے اس لئے نہیں بچتا کہ وہ "ممنوع" ھیں یا اُن کے کرنے میں سزا کا خوف ہے ، بلکہ اس لئے کہ ان میں پڑنا اس کے نزدیک تضیع اوقات ہے ، اس کی اعلیٰ خدا داد قوتوں کی توھین ہے - وہ اپنے دل میں کہتا ہے :--

تو باز ساعد شاھی بہ استخوان منگر
ھمائے ھمت خود را بلند دہ پرواز

اس بحث کا نتیجہ معلم کے لئے یہ نکلتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے شاگردوں کو اعلیٰ مقاصد سے روشناس کرے اور ان میں ایک ایسا معیار اقدار قائم کردے کہ وہ اپنے اعمال و افعال کی تدریجی تنظیم کرسکیں - ان کی طبیعت میں اعتدال اور سلامت روی کے قائم رکھنے کے لئے سزا اور انعام کی ضرورت نہ ھو - بلکہ اس کے بجائے ان کے دل میں اپنے پسندیدہ مقاصد کا اس قدر احترام پیدا ھوجائے کہ یہی مقاصد ان کے اخلاقی معلم اور نگراں بن جائیں اور ان کو غلط راستوں پر پڑنے سے روکیں - اگر کبھی مجبوراً استادوں کو یا والدین کو خود اپنے ھاتھ سے

سزا دینی بھی پڑے تو انہیں یہ چاہئے کہ بچے کے ذہن میں سزا اور قابل اعتراض کام کے درمیان بلا واسطہ اور فوری تعلق قائم کرلیں تاکہ جب کبھی اسے اس کام کرنے کی دوبارہ تحریص ہو تو اس کے ناگوار نتائج کا خیال دل میں فوراً تازہ ہوجائے اور وہ اس سے باز رہے - اچھے معلم کی پہچان یہ ہے کہ وہ سزا کو ذاتی ناراضگی کے اظہار کے طور پر استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کو معاشری قانون اور اجتماعی مرضی کا نتیجہ بناکر دکھاتا ہے اور اس طرح ایک، فرد کے بجائے پورا معاشرہ ضبط و تادیب کا نافذ کرنے والا بن جاتا ہے - لیکن اس کا مطمح نظر ہمیشہ یہی ہونا چاہئے کہ بچوں کے عمل کے محرک اعلیٰ ترین مقاصد ہوں اور ان کے حصول کا خیال ان کے اخلاق و کردار کی رہنمائی کرے -

جس طرح مدرسوں میں سزاؤں کا استعمال حد سے زیادہ اور غلط طریقے پر کیا جاتا ہے اور اسی طرح انعاموں کا جائز استعمال بھی اُستادوں کو معلوم نہیں - طلبہ کا جذبہ مسابقت کو اُبھارنے اور اُنھیں اپنے کام سے ایک قسم کی بالواسطہ دل چسپی دلانے کے لئے اُنھیں مختلف قسم کے انعامات ' زیادہ تر مادی انعامات ' دئے جاتے ہیں جن کو وہ بجائے خود باعث امتیاز سمجھتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان میں عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس مصنوعی امتیاز کے حاصل کرنے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دیتے ہیں کسب کمال کی خواہش بذاتہ ان کے دل کو نہیں لگتی - یہ صورت حال ان کی اخلاقی تربیت پر بہت برا اثر ڈالتی ہے کیونکہ ان کی توجہ ضمنی اور غیر ضروری چیزوں میں پڑکر منتشر ہو جاتی ہے اور ان میں اور ان کے کام میں وہ رشتہ پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہئے - جب مدرسے میں یہ عادت راسخ ہو جاتی ہے کہ بغیر کسی مادی لالچ کے ' کسی انعام کی توقع کے 'پوری محنت اور انہماک سے

کام نہ کیا جائے ، تو طالب علم عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد
بھی اسی چیز کو مد نظر رکھتا ھے اور چونکہ موجودہ تمدن میں تقریباً
ہر چیز کی قدر کا اندازہ دولت یا نمود اور شہرت کے معیار پر کیا جاتا
ھے ؛ اس لئے وہ ہر کام کرتے وقت یہی سوچتا ھے کہ اس میں مجھے
کتنا مالی نفع ہو گا اور کس قدر شہرت حاصل ہوگی - اور اُن کاموں کو
کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا جن میں خاموشی ، نفس کشی اور بے غرضی
کے ساتھہ خدمت کرنے کی ضرورت ھے - یہی وجہ ھے (یا کم سے کم یہ
بھی ایک بڑی وجہ ھے) کہ ھمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی ھے
جو ایثار اور خاموشی کے ساتھہ قومی خدمت کریں اور ایسے لوگ بہت
ھیں جو نام پیدا کرنے کیلئے شور و غل مچاکر یا کسی نمائشی تحریک
میں شریک ہوکر بہت جلد " لیڈر " بن جانے کی کوشش کرتے ھیں -
اس خرابی کی اصلاح کا ایک ذریعہ یہ بھی ھے کہ مدرسوں میں انعام کا
استعمال اور اسکی نوعیت بدل دی جائے اور معلم بھی اس معاملے میں
اپنا طرز عمل بالکل تبدیل کردیں - موجودہ حالات میں بیچارے معلم کا
کام ھی یہ ھے کہ یا تو طلبہ کے قصوروں اور خطاؤں کی تلاش میں رھے
اور انہیں سزا دے یا ان کی پست ھمت کو اُبھارنے اور انہیں تعلیمی
مشاغل میں زبر دستی دل چسپی دلانے کے لئے انعام کا یا نمبر حاصل
کرنے کا لالچ دے - جب بچے کو مدرسے میں آئے دن یہی تجربہ ہوتا ھے
تو وہ بھی اپنے افعال و کردار کی قدر کا اندازہ اس معیار پر نہیں کرتا
کہ وہ بنفسہ اچھے ھیں یا نہیں بلکہ سزا کے خوف اور انعام کے لالچ سے
کام کرتا ھے اور اسے ھمیشہ دوسروں پر سبقت لیجانے کی فکر رھتی
ھے - اس طرح معلم غیر محسوس طریقہ پر طلبہ کے معیار قدر کو بہت
پست کر دیتا ھے - پروفیسر پنکے وچ (Pinkevitch) اپنی کتاب میں

لکھتے ھیں کہ روس میں جو تعلیم جدید انقلاب کے بعد سے رائج ہے اس میں ہر قسم کے '' نشان امتیاز '' کو ممنوع قرار دیا گیا ھے :—

'' مختلف قسم کے نشان امتیاز مثلاً گریڈ ' سرٹیفیکٹ ' ڈگریاں وغیرہ دینے سے خراب قسم کی نمائش پسندی پیدا ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے طلبہ محض انعام کی خاطر محنت کرتے ھیں اور انہیں اپنے کام میں قدرتی شغف اور انہماک پیدا نہیں ہوتا - اس لئے ہم نے ان سب کو بالکل موقوف کر دیا ہے - '' [1]

لیکن اس کے ساتھ ھمیں یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ بعض انعامات ایسے بھی ھیں جو کسی طرح قابل اعتراض قرار نہیں دئے جا سکتے - اُستادوں کی طرف سے پسندیدگی کا اظہار ' مہربانی کا سلوک ' ہمت افزائی جس سے طلبہ کو یہ معلوم ہو کہ وہ لوگ جن کی وہ قدر کرتے ھیں ' ان سے خوش ھیں - یہ سب چیزیں ایسی ھیں جن سے اس اطمینان و مسرت میں جو ادائے فرض سے نصیب ہوتی ہے ' اضافہ ہوجاتا ہے - لیکن بہر حال سزا کا خوف ' انعام کی تحریص ' معلم یا جماعت کی خوشنودی یہ تمام چیزیں صرف ذرائع کے طور پر استعمال کرنی چاہئیں - ان میں سے کسی کو بجائے خود مقصد بنا دینا اخلاقی نشو و نما کا خاتمہ کردینا ہے - سزا کا منشا محض اسی قدر ہے کہ وہ طالب علم کے ذہن میں برے کاموں اور اس کے برے نتائج کے درمیان ایک تلازم قائم کردے اور جب تک وہ شعوری طور پر ان سے احتراز کرنا نہ سیکھے ' ایک عارضی مانع کا کام دیتی رہے - اسی طرح انعام کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ

[1] The New Education in the Soviet Republic صفحہ ۴۲ -

کو محسوس ہو کہ جب وہ کوئی کام قابلیت سے اور دل لگا کر کرتے ہیں
تو سب لوگ اس کی قدر کرتے ہیں - مگر معلم کا منتہائے نظر ہمیشہ
یہی ہونا چاہئے کہ رفتہ رفتہ طالب علم تہدید و تحریص دونوں سے
بالاتر اور بے نیاز ہوجائے اور اسے اپنے کام میں اتنی دلچسپی پیدا ہو جائے
کہ اس کی انجام دہی کے لئے اسے کوئی رشوت نہ دینی پڑے - جب
طالب علم بچپن کے حدود سے گزر کر بلوغ کی منزل میں قدم رکھتا
ہے اور اس کے احساس خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے تو جسمانی
سزائیں اور مادی انعامات دونوں خلاف مصلحت ہوجاتے ہیں اور ان
کا استعمال نفسیات کی تعلیم کے سرا سر منافی ہے - اس وقت معلم
کو طلبہ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالنا چاہئے اور ان کے ساتھ دوستی
اور باہمی اعتماد کے تعلقات پیدا کر کے انہیں بہتر اور بلند تر قدروں
سے روشناس کرنا چاہئے -

باب پنجم

معلم کي شخصيت

هم نے اب تک اخلاقی تربیت کے جن ذرائع سے بحث کی ھے ان سب میں معلم کی شخصیت کی اھمیت اور اس کے اثر کا اعتراف کرنا پڑا ھے - نصاب کی ترتیب اور اس کو معاشري ضروریات کے ساتھہ ھم آھنگ بنانے کے لئے یہ ضروری ھے کہ معلم کو فطرت اطفال اور نظام تمدن دونوں سے واقفیت ھو ' وہ ذھین ھو اور معاشری احساس رکھتا ھو - اس کے بعد نصاب کو طلبہ کے سامنے پیش کرنے کا اور اس کو ان کی زندگی کا جزو بنانے کا مسئلہ آتا ھے ' جو طریقۂ تعلیم سے متعلق ھے ' اور اس کا انحصار تمام تر معلم کی ذات پر ھے - گو موجودہ نظریہ تعلیم کے مطابق ھمارا مقصد اعلی یہی ھے کہ طلبہ میں خود کام کرنے اور اپنی مشکلات آپ حل کرنے کی قابلیت پیدا ھو ' لیکن یہ مقصد بغیر معلم کی رھنمائی اور امداد کے حاصل نہیں ھوسکتا کیونکہ وھی مدرسے کے ماحول کو اس طرح منظم کرتا ھے اور اس میں ایسے محرکات عمل فراھم کرتا ھے کہ بچوں میں اعتماد ذات ' محنت اور حوصلے کی صفات ابھر آتی ھیں - اسی طرح مدرسے میں تادیب و ضبط کے نظام کو قائم رکھنے کي ذمہ داري بھی انجام کار اس پر عائد ھوتی ھے - یہاں بھی ھمارا منتہائے نظر یہی ھے کہ ھم طلبہ میں حکومت خود اختیاري قائم کریں اور مدرسے کی معاشری زندگی اور اس کے فرائض کی تنظیم کی ذمہ داري انہیں پر ڈال دیں - لیکن یہ حالت خود بخود پیدا نہیں ھوجاتی - اس کے لئے معلم کو ابتدا میں بہت غور اور کاوش اور

تدبیر کی ضرورت ھے اور اس کے قائم ھوجانے کے بعد بھی اسے ھمیشہ بڑی احتیاط اور ھوشیاری سے کام لینا پڑتا ھے - کیونکہ نہ معلوم کس وقت اس مشین میں کوئی ایسی خرابی یا رکاوٹ پیدا ھوجائے جس کو طلبہ خود دور نہ کرسکیں اور اس کی دوستانہ 'مداد اور مشورے یا مداخلت کے محتاج ھوں ۔ لہذا موجودہ تعلیمی خیالات کی رو سے معلم کو نظام تعلیم میں بہت بڑی اھمیت حاصل ھے - اگرچہ اسے پہلے کی طرح طلبہ کے بجائے خود کام کرنا نہیں پڑتا اور وہ مطالعہ اور محنت کی ذمہ داری حتی الامکان انھیں پر ڈالتا ھے لیکن اس کی تعلیمی ' معاشری اور اخلاقی ذمہ داریاں پہلے سے زیادہ اھم اور نازک ھوگئی ھیں اور زیادہ متنوع صفات اور صلاحیتوں کی طالب ھیں - موجودہ بحث کو مکمل کرنے کے لئے یہاں یہ بتانا ضروری ھے کہ علاوہ نصاب اور طریقہ تعلیم وغیرہ کی تنظیم کرنے کے معلم بحیثیت ایک انسان کے اپنے طلبہ کی اخلاقی تربیت میں کس طرح حصہ لے سکتا ھے -

معلم کے پیشے کی ایک خصوصیت ایسی ھے جو اسے تقریباً اور تمام پیشوں سے ممتاز کرتی ھے - اسے اپنے طلبہ کے دل و دماغ اور روح سے براہ راست سابقہ پڑتا ھے اور ان پر اس کی شخصیت ' اس کے فلسفۂ زندگی اس کے طرز عمل کا اثر بلا واسطہ ھوتا ھے - اس کا تعلق بچوں کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے نہیں بلکہ ان کی زندگی کے تمام شعبوں سے ھے اور وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی مجموعی سیرت کو متاثر کرتا رھتا ھے - اگر کسی ڈاکٹر یا انجینیر یا معمار کو اپنے کام کے موضوع سے محبت نہ ھو اور وہ اس کی انجام دھی میں مروت اور ھمدردی کا اظہار نہ کرے تو اس نقص کی وجہ سے اس کے کام میں کچھہ ایسی خرابی واقع نہیں ھوگی - بے شک یہ

صفات بجائے خود ہر شخص کے لئے مفید ہیں خواہ اس کا کوئی پیشہ ہو اور اسے انسانی فرائض کی ادائگی میں ہمیشہ ان کی ضرورت پڑتی ہے - لیکن ان کے نہ ہونے میں جو کچھہ برائی ہے خود اس کی ذات کے لئے ہے اس کے کام یا فن کے لئے نہیں - بہ خلاف اس کے معلم کو ذی روح افراد سے سابقہ پڑتا ہے جو اپنے ماحول کے اثرات کو ہر وقت قبول کرتے رہتے ہیں - اور اس ماحول میں معلم کی ذات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے - کیونکہ ایک تو معاشرہ خود اسے طلبہ کے مقابلے میں بر تر حیثیت دیتا ہے اور اسے ان کی نظر میں بہت عزت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے - دوسرے زیادہ قابل ' زیادہ تجربہ کار اور پختہ‌کار ہونے کی وجہ سے معلم ان پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے اور اس قوت سے کام لے سکتا ہے جو نفسیات کی اصطلاح میں " تاثیر تفوق " [1] کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے -

ہم عہد شباب کی بعض خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے یہ بتا چکے ہیں کہ نوجوانوں کو تحکم اور دباؤ بہت ناگوار ہوتا ہے - اور اگر کوئی شخص ان سے کوئی کام کرانا چاہے تو فوراً اس کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں - لیکن اس عمر میں وہ شخصیت کے قدرتی اثر کو بہت جلد اور بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں - اگر انہیں اس بات کا یقین ہوجائے کہ کوئی شخص ان پر کسی لحاظ سے مثلاً قابلیت یا تہذیب یا مرتبے میں فوقیت رکھتا ہے اور اسے ان کے ساتھہ محبت اور ہمدردی بھی ہے تو وہ عقیدت اور وفاداری کے ساتھہ اس کی پیروی کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں - یہی زمانہ ہے جب وہ اپنی تاثیر تفوق سے پوری طرح فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور اگر اس میں تسخیر اور تالیف قلوب کا

---

[1] Prestige Suggestion -

اتنا مادہ ہے کہ طلبہ اسے اپنا لیڈر مانیں اور اس کی ہمدردي اور
نیک نیتی کے معترف ہوں تو مدرسے کے انتظامی معاملات اور ضبط و
تادیب کے مسائل بہت کچھہ حل ہوجاتے ہیں کیونکہ جب وہ اس کو
اپنی جماعت کا سر گروہ تسلیم کرلیتے ہیں تو اس کی ناراضی ان کے
لئے بہت بڑي سزا اور اس کی خوشنودی بہت بڑا انعام ہوجاتی ہے -
اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اُستاد کو اپنے مزاج ' طرز عمل اور عادات
کے معاملے میں ہر وقت محتاط رہنے کی ضرورت ہے - کیونکہ اس کی
تمام حرکات و سکنات ' اس کے اصول زندگي ' اس کا اخلاق سب اس کے
شاگردوں کی طبیعت پر اثر ڈالتے رہتے ہیں - جس طرح یہ اس کا
فرض منصبی ہے کہ وہ نفسیات اطفال اور جدید تعلیمی تحریکوں کا
مطالعہ کرے اور اپنے علم اور استعداد کو بڑھاتا رہے اس طرح اس کے لئے
یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو پاکیزہ اور مہذب بنائے ' اپنی
شخصیت کی تربیت کرے اور اپنی ذات کو ان تمام خوبیوں کا زندہ
نمونہ بناکر دکھائے جن کی وہ تلقین کرتا ہے - اس صورت میں طلبہ
پر اس کا اخلاقی اثر بہت قوی اور دیر پا ہوگا - البتہ اس میں یہ
احتیاط شرط ہے کہ اس کی اپنی شخصیت طلبہ پر اس درجہ غالب نہ
آجائے کہ وہ ان کے ارتقائے نفس میں حارج ہو - کیونکہ تجربہ یہ
بتاتا ہے کہ اکثر والدین اور اُستاد جن کی طبیعت میں ' تحکم اور تسلط
کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے بچوں کو زبردستی اپنے عقائد اور خیالات
کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور انہیں آزادانہ نشو و نما کا موقع
نہیں دیتے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے اکثر طبیعت اور ارادے
کے کمزور ' اور ہمت اور حوصلے سے عاری ہوتے ہیں وہ ہر بات میں اپنے
بزرگوں کے محتاج رہتے ہیں اور اپنی قوتوں سے کام لینا نہیں سیکھتے

ان کی مثال اُن چھوٹے چھوٹے کمزور پودوں کی سی ھے جو کسی بڑے درخت کے نیچے اگتے ھیں اور بڑھنے نہیں پاتے - اس شرط کے ساتھ ھم معلم کے ذاتی اثر کی اھمیت کو تسلیم کرتے ھیں اور اس کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کرینگے کہ یہ کن شکلوں میں ظاھر ھوتا ھے -

معلم کئی طرح سے طلبہ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالتا ھے - ان میں بچپن کے زمانے میں تقلید کا مادہ بہت زیادہ ھوتا ھے اور وہ اپنے دوستوں ' بزرگوں ' ھم جماعتوں غرض ان سب لوگوں کی جن سے ان کو سابقہ پڑتا ھے نقل اتارتے ھیں خصوصاً اپنے اُستادوں کی ھربات میں تقلید کرتے ھیں - ان کی بات چیت کا طریقہ ' ان کا لباس ' ان کی عادتیں غرض کوئی چیز اس تقلید کے اثر سے خالی نہیں رھتی - اُستادوں کو چاھئے کہ فطرت اطفال کی اس خصوصیت سے فائدہ اُٹھائیں اور اپنے ذاتی نمونے اور مثال کے ذریعے انہیں آداب مجلس ' تہذیب و شائستگی اور عمدہ معاشري عادات کی تعلیم دیں - کیونکہ سیر بھر عمل من بھر زبانی تعلیم کے برا بر ھے - خصوصاً ابتدائی چند سال میں زبانی تعلیم کی گنجائش بہت کم ھوتی ھے - اس وقت عملی مثال ھی کار گر ھوسکتی ھے کیونکہ اکثر بچے بہت سی باتیں بغیر پوری طرح سمجھے ھوئے محض عضلات کی تقلیدی حرکت کے ذریعے سیکھ لیتے ھیں بچوں کی تربیت کی پہلی منزل یہی بلا واسطہ تقلید کی منزل ھے - اگر معلم کا اور گھر کے لوگوں کا ذاتی نمونہ اچھا ھے تو اس کے اثر سے بچوں میں بہت سی ایسی عادتیں پیدا ھوسکتی ھیں جو اگر اخلاق کا جز و نہیں تو اخلاقی سیرت کي تعمیر میں بنیاد کا کام ضرور دیتی ھیں - لوگوں کے ساتھ خلق و مدارات سے پیش آنا ' لڑائی جھگڑے سے دور رھنا ' ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد کرنا ' اپنا کام محنت اور استقلال کے

ساتهہ انجام دینا ، وقت کي پابندي ، صفائی کا اهتمام یہ تمام صفات ایسي هیں جو تقلید اور مشق سے عادتوں میں تبدیل هوجاتي هیں - اگر مدرسے میں طلبہ اپنے اُستادوں اور ساتهیوں میں یہ عادتیں پائینگے تو وہ ان کی دیکها دیکهی خود بهی ایساهی کرنے لگینگے - بیشک جب طالب علم سن شعور کو پہنچتا هے تو اسے بہت سی عادات اور رسوم و روایات اور اصولوں کے عقلي وجوہ بتانے کی ضرورت هوتی هے لیکن اوائل عمر میں تربیت کا ایک معقول حصہ تقلید کے ذریعے انجام پاسکتا هے -

نفسیات کی اصطلاح میں تقلید سے مراد مشابهت پیدا کرنے کا وہ عمل هے جس کا تعلق زیادہ تر جسمانی حرکات اور عادات سے هوتا هے اور اس کے ذریعے بچہ بہت سے کام سیکهہ لیتا هے جن کا اثر بالواسطہ اس کي طبیعت اور مزاج پر پڑتا هے لیکن اس کے علاوہ دو نفسی کیفیتیں ایسی هیں جن کے ذریعے انسان براہ راست دوسروں کے خیالات اور جذبات سے متاثر هوتا هے - یہ نفسیات کی اصلاح میں همدردي اور تاثیر خیال کہلاتی هیں - کسی شخص سے همدردي کا احساس همارے دل میں وهی جزبات پیدا کر دیتا هے جو اس کے دل میں هوں - اس کی مثالیں هر وقت همارے مشاهدے میں آتي رهتی هیں کسی عزیز دوست کو ملول دیکهہ کر هم پر خود بهی رنج کی کیفیت طاري هوجاتی هے " افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را " بشرطیکہ اهل انجمن کو افسردہ دل سے کچهہ همدردي بهی هو - اگر هم کسی خوش مزاج دوست کے پاس یا ایسے دوستوں کے حلقے میں چلے جائیں تو همارا غم غلط هو جاتا هے اور طبیعت هلکی هوجاتی هے - اسی لئے کہا گیا هے کہ جذبات متعدي هوتے هیں اور گویا اُڑ کر ایک دوسرے کو لگ جاتے هیں -

اس سے مراد یہ ھے کہ دوسروں کے جذبات کا اثر خود بخود ہماری طبیعت پر ہوتا ھے اس کی ضرورت نہیں کہ ہم کوشش کر کے یا عقلی دلائل کے ذریعے اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کریں - معلم مدرسے میں اپنی حیثیت سے فائدہ اُتھا کر اور طلبہ کے ساتھہ محبت اور ہمدردی کے تعلقات پیدا کر کے ان کے جذبات کو متاثر کر سکتا ھے - اگر اس کے جذبات موقع کے مناسب ہونگے ' اگر وہ رنج و غم ' رضامندی اور ناراضی ' غصے اور رحم کا اظہار موزوں طریقے پر کریگا تو اس کے شاگرد اس سے ضرور متاثر ہونگے - لیکن شرط یہ ھے کہ جذبہ سچا اور خالص ہو ' تصنع اور مبالغے سے پاک ہو کیونکہ بچے بناوٹ اور ظاہر داری کو بہت جلد پہچان لیتے ہیں اور اس شخص کی طرف سے بدظن ہوجاتے ہیں جس کے جذبات میں خلوص اور قول اور فعل میں مناسبت نہ ہو -
جذبات کی تربیت کا سب سے اہم پہلو یہ ھے کہ اچھے لوگوں سے عقیدت اور احترام پیدا کیا جائے - عمدہ چیزوں کی طرف رغبت اور خراب چیزوں سے نفرت دلائی جائے - بچوں میں یہ ذوق پیدا کر دیا جائے کہ خوبصورت اشیا اور مناظر ان کے دل کو لبھائیں اور بد صورت چیزیں بری معلوم ہوں - جذبۂ عقیدت اور حسن ذوق بچوں کے دل میں آسانی کے ساتھہ نشو و نما پاسکتا ھے اگر معلم کے اپنے جذبات سچے اور شائستہ ہوں اور اس کا مذاق پاکیزہ ہو ' کیونکہ بچے ان جذبات کو اکثر غیر شعوری طور پر قبول کرلیتے ہیں اور انسانوں کی جانب ان کا فطری رد عمل بھی وہی ہو جاتا ھے جو اُستاد کا ھے - معلم کا فرض یہ ھے کہ ان کا ہمدردی کا جذبہ اس قدر وسیع کر دے کہ وہ ان کے تمام ماحول پر محیط ہوجائے کیونکہ ہم حقیقی معنی میں کسی چیز یا شخص کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھہ

سکتے جب تک اس کے ساتھ ہمیں اس درجہ ہمدردی نہ ہو کہ ہم گویا اس کے دل میں اُتر جائیں اور اس کے جذبات کو اپنا بنالیں ہم کسی خوبصورت نظم یا تصویر سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اندر وہی کیفیت جو شاعر یا مصور کے دل میں تھی پیدا نہ کر لیں - کسی کے دکھ درد کو پوری طرح محسوس نہیں کرسکتے جب تک ہمدردی کے وسیلے سے گویا وہی مصیبت خود ہم پر نہ گزر جائے -

چھوٹے بچوں کے مدرسے میں معلم کو اس کا بھی خیال رکھنا چاهئے کہ ان کی محبت اور ہمدردی انسانوں تک محدود نہ رہے بلکہ انہیں بے زبان جانوروں اور پودوں سے بھی لگاؤ پیدا ہوجائے - مدارس جدید میں مختلف پالتو جانوروں کے پالنے کی تاکید کی جاتی ہے اور ان کی نگہداشت کی ذمہ داری بچوں پر ہوتی ہے - اسی طرح وہ باغ بانی کرتے ہیں ، اپنی اپنی کیاریوں میں پھولوں کے درخت اور ترکاریاں وغیرہ بوتے ہیں اور ان کی نشو و نما کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے سلسلے میں جن جن کاموں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی پانی دینا ، کھاد ڈالنا ، کھدائی کرنا وہ خود ہی انجام دیتے ہیں اس کا مقصد محض یہی نہیں ہوتا کہ بچے پودوں اور جانوروں کی عادتوں کا مطالعہ کریں اور اس طرح مفید معلومات حاصل کریں بلکہ اس ذریعے سے وہ عالم نباتات اور عالم حیوانات سے مانوس ہوجاتے ہیں - بعض لوگ جن میں احساس جمال زیادہ لطیف اور نازک ہوتا ہے اور جن کو زندگی کی لہر نہ صرف حیوانات میں بلکہ تمام عالم فطرت میں نظر آتی ہے پھولوں اور پودوں اور قدرتی مناظر کو بھی اپنے آغوش محبت میں لے لیتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ مثلاً بہت سے فطرت پرست شاعروں کو خوبصورت مناظر کے نظارے سے

دلی اطمینان اور سکون نصیب ہوتا ہے اور اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں
ورڈزورتھ (Wordsworth) نے کہا ہے کہ :—

" ہرے بھرے جنگل کا ایک ذرا سا اثر ہمیں انسان اور
نیکی بدی کے متعلق ایسے حقائق سکھا سکتا ہے جو
دنیا کے تمام دانش مندوں سے ممکن نہیں " -

اسی طرح سعدی نے اہل نظر کو آگاہ کیا ہے کہ

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن فطرت کی یہ سبق آموزی ہر شخص کے لئے عام نہیں - وہ انہیں کے لئے مخصوص ہے جن کے دلمیں ہمدردی کا اتھاہ سمندر موج زن ہے - ہر معلم کو بچوں میں یہی ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے - اس کے ساتھہ ساتھہ معلم کو اپنی ذاتی مثال اور مدرسے کی تعلیمی اور معاشری مشاغل کی تنظیم کے ذریعے طلبہ میں باہمی ہمدردی پیدا کرنی چاہئے جو اشتراک عمل اور امداد باہمی کی بنیاد ہے - اگر اس کے ساتھہ مدرسے اور بیرونی دنیا میں ربط اور تعلقات بھی قائم ہوں تو یہی ہمدردی وسیع تر انسانی ہمدردی کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ معلم خود بھی کوشش کرے کہ طلبہ کی ہمدردی میں وسعت پیدا کرے اور وہ کسی خاص جماعت یا طبقے تک محدود نہ رہے بلکہ انہیں یہ محسوس ہونے لگے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی غم زدہ انسان ہے وہ ہمارا دوست اور عزیز ہے - جہاں کہیں لوگ کسی عمدہ انسانی مقصد کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں وہ ہمارے رفیق کار ہیں -

آج کل تمام تمدن ممالک میں تفریق و اختلاف کا بازار گرم ہے - خصوصاً مزدوروں اور سرمایا داروں میں بڑي سخت جنگ چھڑي ہوئی ہے اور مصالحت کي کوئی صورت پیدا نہیں ہوتي - اس کی ایک بڑي وجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ہر قسم کے لوگوں کی ہمدردي کا دائرہ اس قدر محدود ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی جماعت کے اغراض و مقاصد کو سمجھہ سکتے ہیں اور ان سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن دوسری جماعتوں کے مقاصد کو نہیں سمجھہ سکتے - بعض دولت مندوں کو مزدوروں کے طبقے سے ایک قسم کی نظری ہمدردي ہے لیکن وہ بھی ان کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھتے اور انہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ لوگ بھی ہماري طرح انسان ہیں اور اپنے انسانی حقوق کی حمائت کے لئے جنگ کر رہے ہیں - اس نفسی کیفیت اور کشمکش کا نقشہ بہت سے لوگوں نے اپني علمی تصانیف اور افسانوں میں کھینچا ہے لیکن غالباً سب سے سچی اور جیتی جاگتی تصویر امریکہ کے مشہور افسانہ نویس اپٹن سنکلر (Upton Sinclaire) نے اپنے معرکۃالارا ناول Oil (تیل) میں دکھائی ہے - جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے اس کا کچھہ اندازہ پریم چند کے ناولوں چوگان ہستی اور گوشۂ عافیت کے مطالعے سے ہو سکتا ہے - اس صورت حال کي اصلاح اسی طرح ممکن ہے کہ مدرسوں کے تمام طلبہ میں عالم گیر اتحاد کا احساس ، مشترک انسانی اغراض کا احترام اور ہمدردی کا وسیع ترین جذبہ پیدا ہوجائے - اور جب وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچیں تو وہاں جرأت اور دیانت داري کے ساتھہ ان تمام نزاعي مسائل کا مطالعہ کریں جن کی وجہ سے مختلف جماعتوں میں آپس میں یہ جھگڑے پڑے ہوئے ہیں - تعلیم کے اعلیٰ مرکزوں میں آزادي کے ساتھہ بحث و مباحثہ کرنے کی ممانعت کرنا ، تعلیم کو فرسودہ

اور دور از کار معاملات اور مسائل تک محدود رکھنا اور تمام زندہ مسائل کي طرف سے بے اعتنائي برتنا ' یہ باتیں نہ صرف روح تعلیم کے منافي ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ان بے انصافیوں اور زیادتیوں کے تدارک کي کوئي صورت پیدا نہیں ہوتی جو ہمارے معاشری اور سیاسی نظام میں رائج ہوگئي ہیں - بد قسمتی سے تقریباً دنیا کے تمام ملکوں میں اعلیٰ تعلیم پر یہي تنگ نظری اور قدامت پسندی حاوی ہے - جاپان اور اٹلی میں حکومت نے علی الاعلان ممانعت کردی ہے کہ "خطرناک خیالات" یونیورسٹی کي چار دیواري کے اندر داخل نہ ہونے پائیں - دوسرے ملکوں میں اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ پیچیدہ اور مصلحت آمیز طریقے اختیار کئے جاتے ہیں لیکن مطلب سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ تعلیم گاہوں کے ذریعے ایسے خیالات کی اشاعت نہ ہونے پائے جو بعض زبردست اقتصادي اور سیاسی جماعتوں کے اغراض اور مفاد کے منافی ہوں - بقول حالی :—

بات سچي کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کي
سچ میں حالی کوئی رسوائي سی رسوائی ہے

یہ بحث بظاہر معلم اور اخلاقی تربیت کے عنوان سے بے تعلق معلوم ہوتي ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اخلاقی تربیت کا جو مفہوم پیش کیا ہے اس کے لحاظ سے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ طلبہ میں وسیع ترین انسانی ہمدردی پیدا کي جائے اور اس مقصد کی راہ میں جو جہالت اور تنگ نظری اور خود غرضی حائل ہے اس کو دور کرکے دیانت داری اور جرات کے ساتھہ ان انسانی اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیا جائے جو

موجودہ تمدن کی بنیاد ھیں - اگر معلم خود تنگ نظر اور قدامت پسند ہوگا اور ہر اہم معاملے پر بحث کرنے میں تامل کریگا یا بیرونی اثرات اس کی آزادی میں حائل ہونگے تو تربیت کا اہم ترین مقصد فوت ہوجائے گا -

ہمدردی سے ملتی جلتی دوسری نفسی کیفیت جس کی طرف ہم نے اوپر اِشارہ کیا ہے تاثیر خیال ہے - جس کی وجہ سے ہم میں وہ خیالات اور تصورات راہ پاتے ہیں جو اثر آفریں شخص کے ذہن میں ہوتے ہیں - یہاں بھی اس کی ضرورت نہیں کہ جو شخص دوسرے کے خیالات کا اثر قبول کرے وہ عقل کی رو سے بھی ان کا قائل ہوجائے - اثر آفریں شخص کا خلوص اور اس کے عقائد کی پختگی خود بخود ہمارے اندر ان خیالات کو پیدا کردیتي ہے - اس کی مثالیں بڑی ہمیں ہر وقت اپنے چاروں طرف نظر آتی ہیں - اس کی ایک انتہائي صورت مسمریزم (Mesmerism) کے عمل میں پائی جاتی ہے جب معمول عارضي طور پر اپنی قوت اِرادي کو بالکل کھو بیٹھتا ہے اور عامل کے ہر خیال کو اپنا خیال سمجھہ لیتا ہے - بے شک یہ تاثیر خیال کی انتہائی شکل ہے لیکن اس کو خرق عادت نہیں سمجھنا چاھئے - یہ ایک ایسی نفسی کیفیت کی اِنتہائی ترقی یافتہ صورت ہے جو ہم میں سے ہر ایک پر بارھا طاری ہوتی ہے - ہم بالعموم ان لوگوں کی باتوں اور خیالات کو آسانی سے مان لیتے ہیں جو علم یا دولت یا قوت یا کسی اور حیثیت سے ہم پر فوقیت رکھتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی ہر بات اور ہر خیال کو اپنے خیال پر ترجیح دیں لیکن اس خاص علم یا فن یا شعبہ زندگی میں جہاں ہم ان کی فوقیت کے قائل ہیں ہم بعض اوقات اپنے ذاتي عقیدے اور رائے کے خلاف بھی ان کی رائے

پر عمل کرتے ہیں - البتہ جس شعبے میں ہم دوسرے لوگوں سے زیادہ علم یا تجربہ یا مہارت رکھتے ہیں وہاں ان کی رائے کو نظر انداز کرکے اپنی رائے پر قائم رہتے ہیں - مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا عالم لباس یا خوراک یا تھیٹر کے متعلق ایک جاہل کی رائے کو صحیح سمجھ لیتا ہے بشرطیکہ اُس کو یہ خیال ہو کہ یہ شخص اِس خاص معاملے میں زیادہ واقفیت رکھتا ہے - لیکن اگر یہی شخص اُس عالم کے سامنے کسی علمی معاملے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے جو اُس کی رائے سے مختلف ہو تو وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا بلکہ اِس کا مضحکہ اُڑائے گا - یہ نفسی کیفیت نہ صرف افراد پر طاری ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ جماعتوں اور شہروں اور ملکوں پر طاری ہوجاتی ہے - اور اِس کی وجہ سے عجیب و غریب خبریں اور افواہیں مشہور ہوجاتی ہیں جنہیں لوگ بے سوچے سمجھے مان لیتے ہیں مثلاً بعض شہروں میں کبھی کبھی تین چار سال کے بعد یہ خبر اُڑ جاتی ہے کہ شہر میں "لال خورے" آئے ہوئے ہیں اور وہ بچوں کو پکڑ لیتے ہیں اور اُن کی "مومیائی" نکال کر لے جاتے ہیں - ہم نے دیکھا ہے کہ اچھے خاصے سمجھدار اور باخبر لوگ اُس بات کو یقین کر لیتے ہیں اور پریشان ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ پولیس جو تاثیر خیال کیا تخیل ہی سے محفوظ سمجھی جاتی ہے باقاعدہ تحقیقات شروع کر دیتی ہے - حالانکہ اُن لوگوں نے نہ کبھی "لال خوروں" کو دیکھا ہے نہ "مومیائی" کو، بلکہ ان میں سے اکثر تو اِن الفاظ کے مفہوم سے بھی ناواقف ہیں - اِس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بالکل ناواقف اور خالی الذہن ہونے کی وجہ سے وہ اس قسم کی افواہ کو بغیر سوچے سمجھے بغیر تصدیق کئے قبول کرلیتے ہیں اور چونکہ یہ خبریں بہت جلد ایک سے دوسرے اور دوسرے

سے تیسرے شخص تک پہنچ جاتی ھیں اِس لئے ان میں ذرا سی دیر میں وہ قوت اور زور پیدا ھوجاتا ھے جو بہت سے لوگوں کی ھم خیالی کا نتیجہ ھے - اِس طرح جماعت کی تاثیر خیال افراد کو متاثر کردیتی ھے - اس کی ایک اور مشہور مثال وہ افواہ ھے جو جنگ عظیم کے زمانے میں انگلستان کے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ آسّی ہزار روسی سپاھي آئے ھیں تاکہ جرمنی کے خلاف انگریزوں کی مدد کریں [۱] اتنی بڑی تعداد کا دفعتاً ملک میں پہنچ جانا بالکل خلاف قیاس تھا - اس کے متعلق کوئی سرکاری اطلاع یا بیان شائع نہیں ھوا تھا - لیکن ملک میں خوف اور پریشانی کا دور دورہ تھا - لوگ کسی ''غیبی امداد'' کے خواھاں تھے اور خواھش سے خیال کو قوت پہنچتی ھے - یہ خبر خدا جانے کہاں سے اُٹھی اور آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی لوگوں کو اس کا اس درجہ یقین ھوگیا کہ بہت سے معتبر اور ثقہ لوگوں نے یہ بیان دیا کہ ھم نے اپنی آنکھ سے روسي فوج کے دستوں کو گذرتے ھوئے دیکھا ھے - اس مثال سے معلوم ھوتا ھے کہ بعض خاص حالتوں میں تاثیر خیال کا امکان بہت زیادہ ھوجاتا ھے اور اس کي قوت بڑھ جاتي ھے - ماھرین نفسیات نے اِن حالات کا تجزیہ کیا ھے جو تاثیر خیال کے لئے سازگار ھوتے ھیں - [۲] ان کی

---

[۱] اس واقعہ کا ذکر علاوہ اور لوگوں کے لندن یونیورسٹی کے پروفیسر تعلیمات ڈاکٹر نن (Nunn) نے اپنی کتاب .Education—its Data and First Principles میں کیا ھے -

[۲] ''تاثیر خیال'' (Suggestion) کي نفسیات کا باقاعدہ مطالعہ گذشتہ چند سال ھی میں کیا گیا ھے - خالص علمي اور اصطلاحی تصانیف سے قطع نظر کرکے اس کے نفسي پہلو کو فرانسیسی عالم لے بون (Le Bon) نے اپنی تصنیف "Psychology of the Crowd" میں اور تعلیمی پہلو کو پروفیسر کیٹنگ (Keatinge) نے Suggestion in Education میں بہت اچھی طرح پیش کیا ھے -

تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ تاثر خیال کا اظہار اس وقت بہت زیادہ ہوتا ہے جب ہم عامل یا اثر آفریں شخص کی علمیت یا قوت یا وجاہت کے قائل ہوں - اور کسی خاص معاملے میں ہماری یعنی معمول کی واقفیت اور علم یا تو بہت ناقص ہو یا اچھی طرح مربوط اور منظم نہ ہو اور ہم اس کو کسی نئے خیال کی تنقید کے لئے استعمال نہ کر سکیں - دوسرے یہ کہ اگر عامل اپنے عقیدے اور خیال میں پختگی کا اظہار کرے اور اس خاص معاملے میں اپنی رائے کو بہت وثوق کے ساتھ ظاہر کرے تو ہم اسے بغیر عقلی تنقید اور غور و فکر کے تسلیم کرلینگے - اس اظہار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے خیال کو الفاظ میں بیان کرے - وہ اپنے عام انداز اور افعال سے بھی ایک خیال کو ظاہر کرسکتا ہے اور معمول پر اثر ڈال سکتا ہے - لیکن جن معاملات کے متعلق ہمارا اپنا علم یقینی اور باقاعدہ طور پر مرتب ہوتا ہے ان کے بارے میں ہم دوسروں کی تاثیر خیال سے متاثر نہیں ہوتے -

تاثیر خیال کے لئے ہم نے جن صورتوں کو ساز گار قرار دیا ہے وہ سب معلم اور شاگرد کے رشتے میں موجود ہیں - معلم عام طور پر جسمانی اور دماغی اعتبار سے اپنے شاگردوں پر فوقیت رکھتا ہے اور ان سے زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے اور اس کی منصبی حیثیت کی وجہ سے انکے دل میں اس کی وقعت ہوتی ہے - برخلاف اسکے اکثر معاملات میں بچوں کی اپنی معلومات محدود ہوتی ہے اور اس طرح مربوط اور منظم نہیں ہوتی کہ ایک مدلل عقیدہ کی شکل اختیار کرلے اور وہ اس کی مدد سے ہر نئے خیال اور نئے عقیدے کی تنقید کرسکیں - اس حالت میں استاد اپنی تاثیر خیال کی صلاحیت کو بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کرسکتا ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہئے یا نہیں -

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اُستاد ایسا کریں گے تو طالبہ کی ذہنی اور اخلاقی آزادی میں خلل پڑے گا اور وہ مختلف مسائل کے متعلق اپنی ذاتی رائے قائم نہیں کریں گے بلکہ محض انفعالی طریقے پر اس کے خیالات کو قبول کرلیں گے - اس لئے ان لوگوں کے خیال میں استاد کو تاثیر خیال سے کام نہ لینا چاہئے - بیشک اگر کوئی معلم اس قوت کا ، یا اپنی کسی قوت کا بھی ، بےجا استعمال کرے اور اس سے طلبہ کی ذہنی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہو تو اس کا نتیجہ خراب ہوگا - لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر معلم چاہے بھی تو اس تاثیر کو پوری طرح نہیں روک سکتا - جہاں کہیں لوگ مل جل کر رہتے ہیں ان کے خیالات اور عقائد ، ان کی رائے ، ان کے فلسفۂ زندگی کا اثر غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے پر پڑتا ہے خصوصاً جب اس جماعت میں مختلف عمر اور قابلیت اور تجربے کے لوگ ہوں - اس لئے سوال محض یہ رہ جاتا ہے کہ معلم اس اثر کو بغیر احتیاط اور انتظام کے طلبہ پر پڑنے دے یا اس بات کو محسوس کرکے کہ اس کی شخصیت تاثیر خیال کے ذریعے طلبہ کی شخصیت کو متاثر کر رہی ہے - وہ اس سے فائدہ اٹھائے اور اس اثر کو ان کی تربیت کا ایک مفید عنصر بنائے - پہلی صورت میں اُستاد کا اثر ممکن ہے اچھا پڑے ممکن ہے برا - اسے اس عمل پر قابو کیا اس کی طرف توجہ تک نہیں ہوگی - لیکن دوسری صورت میں اسے ہمیشہ یہ احساس رہے گا کہ اس کے خیالات و جذبات اسی کی ذات تک محدود نہیں بلکہ ان کا عکس طلبہ کی طبیعت میں جھلکتا ہے - جب وہ کسی بات کے متعلق خلوص کے ساتھ پسندیدگی یا نفرت یا جوش یا بددلی کا اظہار کرتا ہے تو یہ سب غیر محسوس طریقے پر اس سے متاثر ہوتے ہیں ، اس لئے اس کا فرض ہے

کہ ہر وقت اپنے خیالات ، اپنی رائے ، اپنے احساسات کا محاسبہ کرتا رہے تاکہ ان پر بالقصد اچھا اثر ڈالے - لھذا استاد کو یہ حق دینا چاھئے کہ وہ احتیاط کے ساتھہ اس قوت کا استعمال کرے اور اپنے بہتر علم ، وسیع اور پختہ تر خیالات کو طلبہ کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ ان سے شعوری استفادہ بھی حاصل کریں اور غیر شعوری طور پر بھی متاثر ہوں -

اسی صورت میں آزادی خیال میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ ہوگا بلکہ جس طرح ہر انسان اپنے ماحول کے مختلف اثرات سے مستفید ہوتا ھے اسی طرح طالب علم اپنے استاد کا اثر قبول کریگا - لیکن شرط یہ ھے کہ استاد ان خیالات کو جبر اور تحکم کے ساتھہ ان پر عائد نہ کرے کیونکہ اس کا اثر اکثر اوقات الٹا ہوتا ھے - طلبہ میں استاد کی مخالفت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ اس کی ہر تجویز ، ہر مشورے کے برعکس عمل کرتے ہیں - کیونکہ تاثیر خیال کے عمل کی خصوصیت یہ ھے کہ اس میں کوئی خیال جبراً عائد نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ معمول کی طبیعت میں بہت آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر اثر کرتا ھے - اکثر استاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو ادعائی انداز سے اپنے شاگردوں کے سامنے نمونہ بناکر پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کی تقلید کریں گے حالانکہ ان کے ادعا اور تحکم کی وجہ سے تاثیر خیال کی ساحرانہ کیفیت بالکل جاتی رہتی ھے -

ادب، تاریخ اور فنون لطیفہ کی تعلیم اور فلسفہ زندگی کی ترتیب میں استاد اس قابلیت سے بہت کام لے سکتا ھے کیونکہ ان چیزوں میں عقلی دلائل کی گنجائش کم اور ذاتی اثر ڈالنے کا موقع زیادہ ہوتا ھے - جب ادب کا معلم کسی عمدہ نظم کو پڑھہ کر جھومنے لگتا ھے یا

جوش و خروش کے ساتھہ کسی مستند ادیب کی تعریف کرتا ھے تو اس کے شاگردوں کے ادبی ذوق پر اس کا بہت گہرا اثر پڑتا ھے - اسی طرح جب کوئی طالب علم یہ محسوس کرتا ھے کہ معلم کسی خاص تاریخی شخصیت کا بہت احترام کرتا ھے اور اس کا ذکر کرتے وقت اس کے انداز بیان ، اس کے چہرے بشرے ، غرض اس کی ہر ادا سے خلوص اور عقیدت کا اظہار ہوتا ھے تو وہ بھی خود بخود اس کا احترام کرنے لگتا ھے علاوہ اس درسی تعلیم کے معلم کا سب سے اہم اور مشکل فرض یہ ھے کہ اپنے شاگردوں کو زندگی کے صحیح اصولوں اور قدروں سے روشناس کرے - اس مقصد کے حصول میں زبانی تعلیم و تلقین کو بہت کم دخل ھے نفسی زندگی کی تشکیل اور فلسفہ حیات کی ترتیب میں سب سے زیادہ اثر عملی مثالوں کا ہوتا ھے خواہ وہ گذشتہ زمانوں کے مشاہیر کی ہوں جن سے طالب علم ادب اور تاریخ کے ذریعے روشناس ہوتا ھے یا اس کے اپنے بزرگوں اور استادوں اور دور حاضرہ کی بڑی بڑی شخصیتوں کی زندہ مثالیں ہوں جن سے اس کو بالواسطہ یا بلا واسطہ سابقہ پڑتا ھے - وہ معلم جس کو اخلاقی اصولوں اور قدروں پر پختہ ایمان ھے ، جو اس ایمان کا محض زبانی اقرار نہیں کرتا بلکہ اپنے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام میں ، ہر بات اور ہر خیال میں اس کا عملی اظہار کرتا ھے جس کی عادتیں ریاکاری اور تصنع سے پاک ہیں ، جو ہر کام کو محنت اور دیانت داری سے کرتا ھے : جو ہر وقت دوسروں کے ساتھہ ہمدردی اور ان کی امداد کرنے کو تیار ھے ، ایسا معلم غیر محسوس طریقے پر اپنی زندہ مثال کے ذریعے طلبہ کو ایک بہتر اور بلند تر معیار زندگی سے آشنا کرتا ھے اور ان کی خراب عادتوں اور ادنی میلانات کو دور کر کے ایک اعلی اخلاقی سیرت کا مالک بنادیتا ھے - اب ہم اس تمام تفصیل بحث کے نتائج پر مجموعی حیثیت سے نظر

ڈال کر یہ دیکھہ سکتے ھیں کہ اخلاقی تربیت کے لئے ھمارے پاس کیا ذرائع ھیں اور ان سب کو استعمال کرکے ھم کن مقاصد کو حاصل کرسکتے ھیں - ھم چاھتے ھیں کہ مدرسے کو اخلاقی تربیت کا گھوارہ بنائیں - اور اس کے لئے یہ ضروری ھے کہ ھم اس کے تمام عناصر کی نئے سرے سے تنظیم کریں - یہ عناصر کیا کیا ھیں ؟ اول : مدرسے کی روز مرہ کی زندگی بحیثیت ایک معاشری ادارے کے - دوم ، طلبہ کے کام کرنے اور مطالعہ کرنے اور استادوں کے تعلیم دینے کے طریقے - سوم ، نصاب تعلیم - چہارم ، مدرسے کا نظام ضبط و تادیب اور اس کی عام فضا - پنجم ، معلموں کی جماعت - ھم ان سب سے اس طرح کام لینا چاھتے ھیں کہ طلبہ میں عمرانی معاملات کی سمجھہ ان کو انجام دینے کی قابلیت اور عمرانی اور اخلاقی مقاصد سے دلی لگاؤ پیدا ھو - ھم نے جو نقطہ نظر مندرجہ بالا صفحات میں پیش کیا ھے اس کی رو سے مدرسے کو ایک حقیقی اخلاقی ماحول بنانے کے لئے ضروری ھے کہ اسے ایک معاشری جماعت میں تبدیل کردیا جائے جس میں انھیں اصولوں کی کارفرمائی ھو اور وھی طریقہ ھائے عمل مروج ھوں جو بہترین انسانی معاشروں میں پائے جاتے ھیں - اس قسم کے محرکات عمل مہیا کیے جائیں جو بہترین انسانی کاموں کا باعث ھوتے ھیں یعنی تجسس اور تعمیر کا شوق ، خدمت کا ولولہ ، تکمیل شخصیت اور اظہار خودی کی خواھش وغیرہ اس کے لئے یہ بھی لازم ھے کہ نصاب کے مضامین کی ترتیب اور ان کا انتخاب اس لحاظ سے کیا جائے کہ طلبہ کو اس ماحول سے پوری طرح واقفیت پیدا ھو جس میں انھیں اپنی زندگی بسر کرنا ھے اور اپنے فرائض ادا کرنے ھیں - اس نصاب کی تعلیم میں یعنی اس تمام علمی مواد کو کتابوں اور استادوں کے دماغ سے منتقل کرکے طلبہ کے ذاتی تجربے اور علم کا حقیقی جزو

بڑھانے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں کہ طلبہ کو عمل اور فعالیت کا موقع ملے ، ان کے تعمیر و تخلیق اور خدمت اور اظہار خودی کے رجحانات کی تسکین ہو ، انہیں مل جل کر کام کرنے کی عادت پڑے اور وہ اعتماد ذات احساس اور ذمہ داری کے ساتھ علم حاصل اور اس سے کام لینا سیکھیں - ان صفات اور عادات کو آئندہ معاشری زندگی میں کارآمد بنانے کے لئے مدرسے کی حکومت اور نظام ضبط و تادیب میں بھی اس کی اجتماعی روح کا اظہار ہونا چاہئے یعنی طلبہ کو موقع دینا چاہئے کہ وہ خود اپنے مشاغل کی تنظیم کریں ، اپنے معاشری معاملات کا فیصلہ کریں اور ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لئے خود قوانین بنائیں اور جماعتی تاثیر اور تادیب کے ذریعے ان کی پابندی کرائیں - مطلب یہ ہے کہ مدرسے کے درسی اور معاشری مشاغل کی بنیاد یکساں اصولوں پر رکھی جائے تاکہ ایک طرف طلبہ میں تحصیل علم کے شغل میں ذمہ داری ، اجتہاد اور اعتماد نفس کی صفات پیدا ہوں اور دوسری طرف غیر درسی مشاغل کی ترتیب اور معاشری معاملات کی تنظیم میں بھی اُن صفات سے کام لے سکیں جو حرکت ، انقلاب اور جمہوریت کے اس دور میں انفرادی اور اجتماعی کامیابی کے لئے ضروری ہیں - تعلیم میں اس انقلاب عظیم کو پیدا کرنا معلموں کی جماعت کا کام ہے جو ایک طرف ان تمام وسائل کو استعمال کرکے طلبہ کے لئے ایک اخلاقی ماحول اور اخلاقی محرکات عمل مہیا کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنی شخصیت کے اثر سے ان میں براہ راست اخلاقی عادتیں اور اخلاقی اصولوں اور قوانین کا احترام پیدا کرتے ہیں - نو عمر بچے اور نوجوان ان کی مثال کی تقلید کرتے ہیں اور ہمدردی اور تاثیر خیال کی نفسی کیفیات کے ذریعے ان کی حرکات و سکنات اور ان کے جذبات اور خیالات کو اپنا بنا لیتے ہیں اور اس

طرح آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر ان میں اس فلسفہ زندگی اور معیار عمل کی روشنی سرایت کر جاتی ہے جو معلموں کی شخصیت میں کار فرما ہے بشرطیکہ معلم نے اس پیشے کو مجبور ہو کر اور بد دلی سے محض روزی کمانے کے خیال سے اختیار نہ کیا ہو بلکہ وہ خود کو معاشرے کا اخلاقی نمائندہ اور بہترین عمرانی اقدار کا حامل سمجھے اور انہیں اپنے شاگردوں تک منتقل کرنے کو اپنا فرض منصبی خیال کرے۔

باب ششم

اِخلاقی سیرت کی تعمیر

ہم نے گذشتہ ابواب میں اخلاق اور اخلاقی تربیت کے مفہوم سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مدرسے میں کون کون سے وسائل ایسے ہیں جو اخلاقی تربیت کے لئے اِستعمال ہوسکتے ہیں - اس باب میں ہم اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ہم اپنی تربیت کے ذریعے افراد میں کیا صفات اور خصوصیات پیدا کرنا چاہتے ہیں - ضمناً ان صفات کا ذکر گذشتہ بحثوں میں آچکا ہے اور ہم نے کتاب کے پہلے حصے میں یہ بتایا ہے کہ جمہوری معاشرے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کس قسم کی سیرت کی ضرورت ہے - یہاں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان اہم ترین انسانی خصائص سے بحث کرنا چاہتے ہیں - جس کا کسی نہ کسی حد تک اخلاقی سیرت میں شامل ہونا ضروری ہے ان کی تشریح میں ہمیں اس مسئلے کی دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا یعنی ارتقائے نفس کے اعتبار سے کن صفات کی نشو و نما ضروری ہے اور معاشری اور تمدنی حالات ، بالخصوص اپنے ملک کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان صفات کی ترتیب کس تناسب سے کرنی چاہئے اور ان کی اضافی قدر و قیمت کیا ہونی چاہئے - ہمیں اپنے ذہن میں دوبارہ اس نفسی حقیقت کو تازہ کرلینا چاہئے کہ انسان کی سیرت ، اس کے اعمال و کردار سب ان جبلی رجحانوں پر منحصر ہیں جو اس کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں - انسان کا نفسی ارتقاء ایک مسلسل عمل

ھے جو ابتدائی ، غیر مربوط حرکات اور فطری جبلتوں کے سادہ اظہار سے شروع ھوکر رفتہ رفتہ ماحول کے مختلف اثرات کے ماتحت عادتوں اور طبیعت کی خصوصیتوں کی شکل اختیار کرلیتا ھے - ھمارے تمام اخلاقی اصول ، ھماری عقل اور ھمارا علم اسی بنیاد پر قائم ھے - اسی لئے معلم کے واسطے جو ذھن اور سیرت کی تربیت کرنا چاھتا ھے یہ نہایت ضروری ھے کہ وہ ان نفسی رجحانات کا بغور مطالعہ کرے جو عمر کی مختلف منزلوں میں ظاھر ھوتے ھیں اور بچوں اور نوجوانوں کے مشاغل اور اعمال کے محرک ھوتے ھیں - اگر وہ ان کے تمام درسی اور غیر درسی مشاغل کی تنظیم اسی طرح کرے گا کہ ان میں ان نفسی رجحانات کو اظہار کا موقع ملے اور ان میں ربط و ترتیب قائم ھو تو طلبہ جو کچھہ حاصل کریں گے ، خواہ اس کا تعلق علمی قابلیت سے ھو یا اخلاقی صفات اور عادات سے ، وہ ان کی شخصیت کا جز و ھوجائے گا کیونکہ ان کے مشاغل کی محرک خود ان کی ذات ھوگی - برخلاف اس کے اگر ھم مدرسے میں طلبہ کے فطری شوقوں اور رجحانوں کی طرف توجہ نہ کریں گے اور ان کو نظر انداز کرکے خارجی محرکات مثلاً استاد کا خوف یا انعام کے لالچ یا باھمی رشک و مسابقت کے جذبے سے کام لیں گے تو ان کی تعلیم محض سطحی ھوگی اور ان کے اعمال اور سیرت پر کوئی دیرپا اثر نہ ڈالیں گی - اس لئے علم النفس کا یہ تقاضہ ھے کہ معلم بہت غور سے بچوں کے آزادانہ افعال و مشاغل کا مطالعہ کرے کیونکہ ان کے جبلی رجحانات کا اظہار سب سے زیادہ خوبی اور وضاحت کے ساتھہ ان کے کھیل کود اور ان کے کاموں میں ھوتا ھے جنھیں وہ اپنی پسند سے کرتے ھیں - یہ مشاغل نفسیات کے نقطہ نظر سے بجائے خود اتنی اھمیت نہیں رکھتے جتنی انھیں

" علامات " کے طور پر حاصل ہے اس لئے کہ ان کے معنی اور منشا پر غور کرنے
سے طلبہ کی نفسی زندگی کے متعلق بہت مفید معلومات حاصل ہوتی ہے -
معلم کو چاہئے کہ ان معلومات کی روشنی میں بچوں کے تعلیمی ماحول
کو اس طرح منظم کرے کہ ان کے جبلی رجحانات پسندیدہ عادتوں میں
تبدیل ہوجائیں اور عمدہ سیرت کی بنیاد بن جائیں - اسی جملے کے ان
ابتدائی الفاظ کو " بچوں کے ماحول کو اس طرح منظم کرے " ہمیشہ
پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے - کیونکہ موجودہ نظریہ تعلیم کا اصل اصول یہ
ہے کہ ہم براہ راست اپنے عقائد اور جذبات اور معلومات بچوں میں منتقل
نہیں کرسکتے اور نہ ان میں بلا واسطہ وہ عادات اور صفات پیدا کرسکتے ہیں
جو معاشری زندگی کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری ہیں - ان عادات و
صفات کی تعلیم میں ماحول کی وساطت لازم ہے یعنی تعلیم پانے والوں
کے لئے ایسے حالات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جن کی مدد سے وہ عملی
طور پر ان معلومات اور صفات کو حاصل کرسکیں - اسی وجہ سے ہم نے
بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ اخلاقی تربیت میں لفظی اور زبانی
تعلیم کے بجائے ایسے حالات اور مواقع پیدا کئے جائیں بالفاظ دیگر
ایسا ماحول مقرر کیا جائے جس میں زندگی بسر کرنے سے اخلاقی سیرت
کی تعمیر ہوسکے - اس امر پر ہم کتاب کے ابتدائی حصے میں تفصیل
کے ساتھہ بحث کرچکے ہیں - اب ہم اس مسئلے کی طرف متوجہ
ہوتے ہیں کہ اخلاقی سیرت کی تعمیر و تکمیل میں ہمیں کن صفات
کو شعوری طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور اپنی بحث کی بنیاد
زمانہ حال کے دو جید مفکرین پروفیسر ڈیوئی اور برٹرنڈرسل پر
رکھتے ہیں

پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اخلاقی سیرت کے تین اہم اور لازمی اجزا قرار دئے ہیں [1] :—

اول قوت عمل یا کار کردگی کی صلاحیت - ہم اکثر گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی سیرت بہت مضبوط ہے یا بہت پختہ ہے - اس سے ہماری یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں یہ قابلیت ہے کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو اس کے انجام دینے میں استقلال ' محنت ' جرات اور حوصلے سے کام لیتا ہے - یہ فعالی صفات ہیں جو بحیثیت مجموعی ہماری سیرت کے اس رخ کو ظاہر کرتی ہیں جو ہمیں مشکلات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور مایوسیوں اور شکستوں کا مقابلہ کرکے آخرکار کامیابی کی منزل پر پہنچاتا ہے - ظاہر ہے کہ جس شخص کی طبیعت میں یہ عنصر نہ ہوگا وہ اپنے ارادوں کو عمل میں نہیں لاسکتا عام اس سے کہ وہ ارادے اچھے ہیں یا برے - ہر ارادے اور عمل کے درمیان بالعموم ایک طویل منزل حائل ہوتی ہے جس میں انسان کو کاوش اور جد و جہد سے کام لینا پڑتا ہے ' وسائل کی تنظیم کرکے اور مادی اور نفسی حالات کو قابو میں لاکر اپنے ماحول کو اپنا مدد گار بنانا پڑتا ہے - جو شخص صرف نیک ارادوں کی پونجی لیکر زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اس کا خدا ہی حافظ ہے - ہم اس کی نیک نیتی کی ایک حد تک تعریف کرسکتے ہیں لیکن ہمیں یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ جائگا - اس صورت حال کی ایک بہت عمدہ مثال تالستائے (Tolstoy) کے ایک مشہور افسانے میں ملتی ہے جس کو رسل (Russel)

---

[1] اس کی تفصیلی بحث انہوں نے Democracy and Education میں اور مختصر بحث School and Society میں کی ہے -

نے اپني کتاب میں نقل کیا ھے - وہ ایک روسي خاتون کا قصہ بیان کرتا ھے جس نے تھیٹر میں ایک نہایت المناک ڈراما دیکھا تھا - دسمبر کا زمانہ تھا اور آدھی رات کا وقت - کڑاکے کی سردی پڑ رھی تھی - یہ خاتوں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ھوئي - ڈراما کو دیکھکر وہ اسقدر متاثر ھوئی تھی اور اس پر اس درجہ رقت طاری تھي کہ وہ راستے بھر قصے کے ھیرو کی خیالی مصیبتوں کو یاد کرکے روتي رھی - لیکن نہ اس میں اتنا تخیل تھا نہ قوت عمل کہ اپنے اس گاڑي بان کا خیال کرتي جو سردی میں باھر بیٹھا ھوا گاڑي چلا رھا تھا اور گھر تک پھنچنے سے پہلے ٹھٹھر کر مرگیا - اس کہانی سے معلوم ھوتا ھے کہ نیک کاموں کے لئے محض نیک دلی اور رقت قلب نہیں بلکہ تخیل کی وسعت ، حالات سے واقفیت اور عمل کی صلاحیت بھي درکار ھے تا کہ جذبات کو عمل کا جامہ پہنایا جائے یہ صفات سب لوگوں میں یکساں نہیں ھوتیں - کسی میں زیادہ ھوتی ھیں کسی میں کم - لیکن ھر تندرست اور صحیح دماغ رکھنے والے بچے میں فطرتاً یہ خواھش ھوتی ھے کہ وہ کچھ کرکے دکھائے ، کسي طرح اپنے عمل کا سکہ اپنے ماحول پر جمائے - یہ وھی خواھش ھے جو چھوٹے بچوں کے کھیلوں میں ان کي تعمیر و تخریب میں ظاھر ھوتي ھے - اس تقاضائے عمل کی حقیقت کو سمجھنا ، اس کو ایسے مشاغل میں استعمال کرنا جو تعلیم و تربیت کے مقاصد میں معین ھوں ، اس کو حسب توقع ابھارنا اور راہ پر لگانا تاکہ بچہ میں مفید عادتیں پیدا ھوں ، یہ مدرسہ اور معلم کا فرض ھے -

لیکن یہ ظاھر ھے کہ محض قوت عمل حسن سیرت کی ضامن نہیں ھوسکتي کیونکہ قوت ایک وسیلہ ھے جو اچھے برے دونوں طرح کے مقاصد کے لئے استعمال ھوسکتا ھے - ھمیں بے شمار مثالیں ایسي ملتی

هیں جن میں افراد اور جماعتوں نے اپنی قوت کو ایسے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے جو معاشری مفاد کے خلاف تھے اور اس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں - اس لئے قوت عمل کو قابل قدر اخلاقی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشری نقطہ نظر سے مفید کاموں میں صرف ہو - اس کے لئے دو اور صفات کا ہونا لازمی ہے یعنی قوت فیصلہ اور ذکاوت احساس -

انسانی سیرت کا عقلی یا ذہنی پہلو اس وقت مکمل ہوگا جب انسان کی قوت فیصلہ کی تربیت کی جائے - یہ قوت محض علم تک محدود نہیں بلکہ عقل اور اس کے استعمال کی صلاحیت پر منحصر ہے - جب ہمارا علم مربوط اور منظم ہو" جب وہ ذہن میں روشنی پیدا کرے، تکمیل مقاصد میں مدد دے، جب اس کی بدولت ہم میں معاملات کی سمجھ، احساس تناسب، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی پیدا ہوجائے اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم فیصلے کی قوت رکھتے ہیں - اس کی تشریح ایک مثال سے ہوسکتی ہے - ایک طالب علم تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے حالات پڑھتا ہے اور اس کے ذریعے بہت سی معلومات حاصل کرتا ہے - اگر اس کا نتیجہ محض یہ ہو کہ اسے بہت سے نام اور تاریخی واقعات یاد ہو جائیں جن کو وہ مثلاً امتحان کے وقت بیان کرسکے تو اس کی معلومات بے جان رہیں گی اور اس سے اس کی قوت فیصلہ کی تربیت میں مدد نہ ملے گی - بر خلاف اس کے اگر تاریخ کے مطالعے سے اس میں انسانی معاشرے کی ارتقاء کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے اگر وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کرے کہ موجودہ تمدن نے کس طرح رفتہ رفتہ ابتدائی مدارج سے ترقی کی ہے اور اس میں انسانوں کی

متعددہ کوششوں کو کس درجہ دخل ہے ، اگر وہ اس علم کو اپنے عہد کی زندگی کے سمجھنے اور اس کے فرائض کو ادا کرنے میں استعمال کرسکے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس میں تاریخ کے مطالعے سے قوت فیصلہ پیدا ہوگئی ہے یعنی اب وہ تاریخی واقفیت کو مدنی مسائل اور انسانی معاملات کا فیصلہ کرنے میں استعمال کرسکتا ہے۔ یہی حال اور تمام علوم کا ہے - جب ان کے مطالعے سے انسان کے طرز عمل پر اثر پڑتا ہے اور اس میں معاملہ فہمی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس کی عقل اور قوت فیصلہ کی تربیت میں معین ہوتے ہیں - لہذا اس قوت کی نشو و نما میں صرف نصاب تعلیم کی اصلاح کو دخل ہے بلکہ اس کا انحصار بڑی حد تک طریقہ تعلیم و تحصیل پر بھی ہے -

تیسری صفت جو عمدہ سیرت کا جزو ہے جذبات سے تعلق رکھتی ہے - اگر کسی شخص میں قوت عمل اور قوت فیصلہ دونوں موجود ہوں مگر وہ ذکاوت احساس سے محروم ہو تو وہ معاشرے کا مفید رکن نہیں بن سکتا - لوگ اپنی عقل اور علم کو نہایت قابلیت کے ساتھ صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور چونکہ ان میں قوت عمل ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں - تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاہوں کی مثالیں ملتی ہیں اور خود ہم میں سے ہر ایک کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کو معاشری اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں ، جن کو اخلاق کے اصول بالکل مجرد اور دور از کار معلوم ہوتے ہیں ، جنمیں روح انسانی کی بلند تر آرزوؤں کی طاق حس نہیں - وہ گڑھیا کے مینڈک کی طرح اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے - موجودہ صنعت و حرفت کے تمدن میں ایسی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں - اس کی ایک نہایت زبردست

مثال سنکلیر (Sinclaire) نے اپنے ناول [1] میں جس کا اوپر ذکر آچکا ہے ورنن روسکو (Vernon Roscoe) کی شخصیت میں دکھائی ہے جس کا مقصد حیات یہی تھا کہ وہ زمین سے مٹی کا تیل نکال کر اپنی دولت میں اضافہ کرے اور اس راستے میں جو دکاوتیں حائل ہوں ان کو بلا تامل ہر امکانی ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کرے - اس مقصد کے حصول کی دھن میں اس کے نزدیک انصاف ' دیانتداری ' مروت ' انسانیت یہ سب محض بے معنی الفاظ تھے اور ظلم ' بیدردی' رشوت ' بددیانتي ہر چیز جائز تھی - اگر اس کا کوئی نصب العین تھا تو محض یہ کہ اس کا کام نہایت خوبی اور انتظام کے ساتھ چلتا رہے اور اس میں سے ہر قسم کے اسراف کو دور کردیا جائے - ظاہر ہے کہ اگر کسی جماعت میں تمام افراد ایسے ہی ہوں گے تو اس کا سارا کام بند ہو جائیگا - '' ہر شخص کا ہاتھ دوسروں کی مخالفت میں اُٹھا رہے گا" اور کسی شخص کو سوائے اپنی ذاتی اغراض کے کسی چیز سے دل چسپی نہ ہوگی - لہذا معلم کا ' اور مدرسے کی تعلیم کا ' مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ کے جذبات کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں ذکاوت احساس پیدا ہو ' وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوں - جب انہیں کسی اہم معاشری تحریک یا اخلاقی مسئلے سے سابقہ پڑے تو وہ اس کي طرف دل سے توجہ کریں اور اس پر محض اپنے شخصی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے غور کریں - ہر کام میں اس بات کو مدنظر رکھیں کہ اس کا رد عمل دوسروں پر کیا ہوگا ؛ اس میں ان کی حق تلفی تو نہ ہوگی ؛ ان کے جائز جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگے گی - جب انسان کے نفس میں ذکاوت احساس کی بدولت ہمدردي ' اور فراخ

---

[1] Oil .

دلی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر تمدنی اغراض و مقاصد سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا شخصی نصب‌العین اجتماعی نصب‌العین سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے - اس میں اخلاق کی وہ امتیازی شان پیدا ہوجاتی ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں بےجا فرق نہ کرے اور اپنی بھلائی اور بہتری اُن مشاغل میں تلاش کرے جن کا نتیجہ معاشری لحاظ سے قابل قدر ہو - انسانی ہمدردی کی وسعت اور گہرائی کے متعلق جو کچھہ کہا جا چکا ہے وہ اس موقع پر بھی صادق آتا ہے -

اب ہم برٹرنڈ رسل کے خیالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے انسانی سیرت کے اہم ترین فضائل کیا قرار دئے ہیں - وہ کہتا ہے کہ یہ صفات ایسی نہیں ہونی چاہئیں جو بعض لوگوں کے لئے موزوں ہوں اور بعض کے لئے نہ ہوں - ہمیں اُن عام صفات کی تلاش ہے جو ہر تربیت یافتہ انسان کے لئے مفید اور ضروری ہیں - وہ اس نقطۂ نظر کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہے [1] :—

" کچھہ صفات ایسی ہیں جو سب انسانوں کے لئے نہیں بعض کے لئے مفید ہیں اور کچھہ ایسی ہیں جو سب کے لئے ضروری اور مطلوب ہیں - بیشک ہمیں صناعوں کی ضرورت ہے سائنس دانوں کی ضرورت ہے ' بڑے بڑے مدبروں کی ضرورت ہے لیکن اسی کے ساتھہ ہل چلانے والے ' آٹا پیسنے والے اور نانبائی بھی درکار ہیں - وہ صفات جن کی بدولت انسان کسی خاص شعبۂ عمل

---

[1] On Education (E)

میں امتیاز حاصل کرتا ہے عموماً ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا سب کے لئے عام ہو جانا کچھہ اچھا نہیں - شیلے (Shelley) ایک شاعر کے دن بھر کے کام کو اس طرح بیان کرتا ہے :—

'وہ نور کے تڑکے سے جھٹپٹے وقت تک اس نظارے سے لطف اٹھاتا ہے ' کہ سورج کی کرنوں کے جوت سے ساری فضا جگمگا رہی ہے ' اور اس کی تہ میں سبز کائی کے اندر شہد کی مکھیاں کھیلتی پھرتی ہیں - اس کی بلا جانے یہ کون ہیں کیا ہیں ' !-

یہ عادت ایک شاعر کے لئے ضرور قابل تعریف ہے - لیکن کسی اور شخص مثلاً چٹھی رساں کے لئے نہیں - لہذا ہم ایسی تعلیم نہیں دے سکتے جو ہر شخص میں شاعرانہ طبیعت کی نشو و نما کرے - مگر بعض صفات عام طور پر مفید اور پسندیدہ ہیں اور ہم یہاں صرف انہیں سے بحث کریں گے - ہمارے خیال میں چار صفات ایسی ہیں جو مل کر بہترین سیرت کی بنیاد بن سکتی ہیں :—

(۱) قوت

(۲) جرأت

(۳) ذکاوت احساس

(۴) ذہانت

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ فہرست مکمل ہے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ یہ چاروں چیزیں موجود ہوں تو بہت کافی ہیں - اور مجھے یہ بھی پوری طرح یقین ہے کہ اگر بچوں کی دماغی جسمانی اور جذباتی تربیت میں غور اور احتیاط سے کام لیا جائے تو یہ صفات بہت عام ہوسکتی ہیں''-

اس کے بعد رسل (Russel) نے ان چاروں صفات سے یکے بعد دیگرے بحث کرکے بتایا ہے کہ ان کا مفہوم اس کے ذہن میں کیا ہے اور یہ کس طرح انسانی سیرت کی تکمیل کرتی ہیں - پہلی دو صفات یعنی قوت اور جرأت ایک حد تک ڈیوئی کے یہاں '' قوت عمل'' میں شامل ہیں - لیکن رسل ان دونوں میں امتیاز کرتا ہے - قوت کا تعلق ' اس کے خیال میں زیادہ تر جسم سے ہے - اگر بچے کی جسمانی صحت اچھی ہے اور اس کے بدن میں طاقت ہے تو اس کو تکلیفیں مقابلتاً کم محسوس ہونگی - اور وہ زندگی سے زیادہ لطف اندوز ہوگا - وہ اپنی ذات میں اتنا منہمک نہیں ہوگا کہ اپنے جسم کے سوا دنیا کی اور تمام چیزیں اس کو بے معنی اور بے لطف معلوم ہوں - اسے گرد و پیش کے واقعات اور اشخاص اور خارجی چیزوں سے دل چسپی ہوگی اور وہ محنت سے جی نہیں چرائیگا - وہ دوسروں کی خوش حالی کو دیکھکر حسد نہیں کریگا کیونکہ حسد کمزوری اور بیماری کی نشانی ہے - وہ عام طور پر خوش اور بشاش رہے گا اور اپنے اوپر افسردگی اور بیدلی کو طاری نہیں ہونے دے گا - رسل اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض صورتوں میں قوت کے نتائج برے بھی ہوتے ہیں اور بعض مستثنیٰ حالتوں میں لوگوں نے اس کے بغیر بھی بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں - لیکن بحیثیت

مجموعی ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ قوت سیرت کا ایک لازمی عنصر ہے اور جو تعلیم طلبہ میں قوت پیدا کرنے پر زور نہیں دیتی وہ اپنے مقصود میں کامیاب نہیں ہوسکتی خصوصاً موجودہ زمانے میں جب زندگی پر محنت اور جد و جہد کا قانون حاوی ہے -

دوسری صفت ہے جرأت، یعنی خوف پر غالب آنے کی قوت - ہمیں نہ صرف اپنی ظاہری حرکات اور افعال کو خوف سے پاک رکھنا چاہئے بلکہ اپنے خیالات اور جذبات میں بھی اس کو راہ نہ دینی چاہئے - بچوں کے لئے یہ تعلیم، جس پر مثلاً انگریزوں کی تربیت مبنی ہے، کافی نہیں کہ وہ خوف کو ظاہر نہ کریں - کیونکہ اگر خود داری یا دوسروں کی شرم اور لحاظ کی وجہ سے وہ اپنی طبیعت پر جبر کرکے ان ظاہری حرکات کو روکیں گے جن سے خوف کا اظہار ہوتا ہے اور جو عام طور پر معیوب سمجھی جاتی ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوف دماغ کے غیر شعوری حصے میں پہنچ کر ان کے اطمینان اور سکون قلب کو غارت کردے گا اور زندگی بھر نئے نئے بھیس بدل کر عجیب و غریب شکلوں میں ظاہر ہوتا رہے گا - اس مسئلے پر ماہرین تحلیل نفسی (Psychoanalysts) نے اپنی تحقیقات کے ذریعے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خوف بلکہ ہر قوی جذبے کو دبا دینے سے کیا کیا خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں - علاوہ اس کے جسمانی خوف پر غالب آنے کی کوشش میں اکثر رائے عامہ کا یا دوستوں کی ناراضگی اور لعن طعن کا نیا خوف پیدا ہوجاتا ہے جو سیرت کی اعلا تربیت میں حارج ہوتا ہے کیونکہ آئندہ عمر میں انسان اپنے ہر کام میں اسی خوف ملامت کو اپنا راہبر بناتا ہے - ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اخلاقی سیرت کی تدریجی ارتقاء میں یہ محرک عمل

بھی ایک وقت میں مفید ثابت ہوتا ہے لیکن سیرت کی تکمیل اسي وقت ہوتی ہے جب انسان ملامت کے خوف اور دوسروں کي رضاجوئي دونوں پر غالب آجائے - لہذا سوال یہ ہے کہ سچی جرأت طلبہ میں کس طرح پیدا کی جائے ؟

اس جرأت کو پیدا کرنے میں صحت اور قوت دونوں کو دخل ہے - وہ اس وقت مستحکم ہوتی ہے جب اِنسان کو پر خطر موقع پیش آئیں اور وہ دل کو مضبوط کرکے دانشمندی سے کام لیکر اِن موقعوں پر کامیابی حاصل کرے - اس قسم کی جرأت کی ایک نہایت عمدہ مثال ایک انگریز افسانہ نویس ''سیپر'' (Sapper) نے اپنے ہیروٗ '' بل ڈاگ ڈرمنڈ '' (Bull Dog Drummond) کے کردار میں دکھائی ہے - اس میں غیر معمولی جسمانی قوت ہے جو اس کے دل کو قوی رکھتی ہے ' اور جنگ عظیم کے ہولناک تجربات کی بدولت یہ قابلیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ نہایت اطمینان کے ساتھہ ' اپنے ہوش و حواس کو مجتمع کرکے کرسکتا ہے - بلکہ خطرہ اس کے حواس اور اس کے ذہن کو اور زیادہ تیز کردیتا ہے - یہ جرأت در اصل جسمانی جرأت ہے جس میں ذہنی تربیت کے شریک ہوجانے سے کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہوگیا ہے - لیکن ہمیں ایسے عام جذبہ جرأت کی نشو و نما کرنی ہے جس کی بدولت انسان زندگی کی تمام مشکلات کو مردانہ وار برداشت کرے ' خواہ وہ خارجی ہوں اور جسمانی دلیری کي طالب ہوں ' خواہ داخلي جن کے مقابلے کے لئے ضبط نفس درکار ہے - اس جذبہ کي تربیت کے لئے انسان میں دو گہري نفسی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے یعنی ایک تو خود داری یا عزت نفس کا احساس اور دوسرے ذاتی اغراض سے قطع نظر کرکے زندگی سے بلمفسہ دلچسپی رکھنے اور اس کا غیر شخصی نظر سے مطالعہ

کرنے کی صلاحیت - عزت نفس کا احساس اُنھیں لوگوں میں ہوسکتا ہے جن کی زندگی کا مرکز خود ان کی ذات کے اندر ہو، اِس معنی میں نہیں کہ وہ تنگ نظر یا خود غرض یا نفس پرست ہوں بلکہ اس معنی میں کہ اُن کے خیالات اور مقاصد اور رائیں ان کے اپنے تجربے اور فکر کا نتیجہ ہوں اور وہ یہ سمجھیں کہ بحیثیت اِنسان کے ان کو آزادی فکر و عمل کا حق حاصل ہے جس سے کوئی شخص اُنھیں محروم نہیں کرسکتا - برخلاف اس کے جن لوگوں کے خیالات اور جذبات اور افعال محض دوسروں کی تقلید پر مبنی ہوتے ہیں، جو ہر وقت دوسروں کی تحسین کے خواہاں رہتے ہیں ان میں حقیقی جرأت پیدا نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کہیں ایسا کام نہ کر بیٹھیں جس کی وجہ سے دوسرے لوگ انھیں برا کہیں یا حقیر سمجھیں - اس کمزوری کی وجہ سے اکثر لوگ فیشن کے؛ یا عوام کے توہمات اور مہمل رسم و رواج کے غلام ہوجاتے ہیں اور جوہر انسانیت کی بیحرمتی کرتے ہیں - یا ان میں جھوٹا انکسار اور ریاکاری پیدا ہوجاتی ہے اور عزت نفس جو تمام فعالی نیکیوں کی بنیاد ہے جاتی رہتی ہے - لہذا تعلیم کے ذریعہ طلبہ میں عزت نفس کے احساس کو اُبھارنے اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے - دوسری شرط جو اعلیٰ قسم کی جرأت پیدا ہونے کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اِنسان میں زندگی کو غیر شخصی نظر سے دیکھنے کی صلاحیت ہو - جس شخص کی تمام اُمیدیں اور اندیشے اپنی ہی ذات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، وہ اطمینان قلب کے ساتھ کسی خطرے کا خصوصاً موت کا سامنا نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے نزدیک اپنی موت گویا تمام دنیا کا خاتمہ ہے - وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کائنات میں بہت سی قوتیں، اور اجتماعی اور اخلاقی نظام ایسے ہیں جو فرد کی زندگی

سے اہم تر، بلند تر اور بے نیاز ہیں اِس لئے اپنی ذات کو غیر معمولی اہمیت دینا ایک مضحکہ خیز حرکت ہے - اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ حیات انسانی کی بقا اور ترقی اسی جیسے انسانوں کے عمل پر منحصر ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی کی زندگی کا چھوٹا سا، ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ جائے لیکن اس کا نام کسی زبردست ادبی یا اخلاقی یا معاشری کارنامے کی بدولت ہمیشہ روشن رہے اور اسے زندہ جاوید بنادے - بہر حال جب تک انسان اپنی محدود ذات کی طرف سے بے تعلقی کی یہ شان پیدا نہ کرے اس میں حقیقی اخلاقی جرأت کا پیدا ہونا ممکن نہیں - لیکن اس اَنداز طبیعت کو پیدا کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان نفس کشی اور ترک دنیا اختیار کرے اور بے سبب تکلیفیں اُٹھانے کو تزکیہ نفس کا ذریعہ قرار دے - دنیا کے تمام مذاہب اور ملکوں میں ایسے لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے اس رہبانی فلسفہ زندگی کو اختیار کیا ہے اور وہ نفی حیات کے ذریعہ اپنی نجات کی کوشش کرتے ہیں بجائے اسکے کہ اپنی فطری خواہشوں اور قوتوں کی ترسیع و تربیت کر کے ان کو اخلاقی مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کریں - ہم نے ارتقائے شخصیت کا جو نقطہ نظر اس کتاب میں پیش کیا ہے وہ "نفی حیات" کے سراسر خلاف ہے اور اس کی رو سے اخلاقی تربیت کا نقطۂ آغاز بھی فطری خواہشات اور جبلتیں ہیں جن کو ہم اپنے ماحول کے اثر اور تجربے کے ذریعے زیادہ وسیع اور منظم بناتے ہیں اور بلند تر مقاصد سے وابستہ کرتے ہیں - اس لئے غیر شخصی انداز طبیعت پیدا کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم بچوں میں مختلف قسم کے قابل قدر مقاصد سے دلچسپی پیدا کریں اور ان کو ان کی ذات کے محدود دائرے سے نکال کر ان علوم و فنون اور مشاغل سے روشناس

کریں جن میں منہمک ہوکر وہ حقیقی معرفت نفس حاصل کریں اور ان کی خودی اس درجہ وسیع ہوجائے کہ وہ خارجی دنیا کے بہترین عناصر کو اپنے اندر سمیٹ لے - رسل نے بتایا ہے کہ وہ بہترین اور قابل قدر عناصر کیا ہیں جو انسان کي خودی کو وسعت بخشتے ہیں :—

'' فطرت اِنساني میں بعض چیزیں ایسی ودیعت کی گئی ہیں جو بغیر کوشش کے ہمیں خودی کي تنگ چار دیواری سے باہر لے جاتی ہیں - ان میں سب سے زیادہ عام محبت کا جذبہ ہے خصوصاً والدین کی محبت جو بعض لوگوں میں ایسی وسیع شکل اختیار کرلیتی ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو اپنی آغوش شفقت میں لے لیتی ہے - اسی قسم کی دوسري چیز علم ہے - ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مشہور عالم فلکیات گلیلیو (Galileo) کو نوع اِنسانی سے کوئی خاص محبت تھی لیکن اس نے اپنی زندگی یقیناً ایک ایسے مقصد کی خاطر بسر کی جس کو موت بھی تمام نہ کرسکی - اِس طرح ایک تیسری چیز آرٹ ہے - بلکہ دراصل یہ کہنا چاہئے کہ جس حد تک اِنسان اپنے جسم کے علاوہ خارجی چیزوں سے دل‌چسپی رکھتا ہے اسی حد تک اس کی زندگی غیر شخصی ہوتی جاتی ہے - گو بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس شخص کو بہت سی چیزوں سے قلبی تعلق اور دل‌چسپی ہوتی ہے اسے زندگی کو خیرباد کہتے وقت اس قدر تکلیف نہیں ہوتي جتنی اس بیچارے شکی دائم‌المرض آدمی

کو جس کی دل‌چسپی اور توجہ ہمیشہ اپنی ہی بیماریوں اور تکلیفوں تک محدود رہی ہو - لہذا جرأت کی تکمیل اس آدمی کی شخصیت میں ہوتی ہے جو بہت سی دل چسپیاں رکھتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی "خودی" دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ خود کو حقیر جانتا ہے بلکہ اسوجہ سے کہ وہ بہت سی ایسی چیزوں کی قدر و احترام کرتا ہے جو اس کی ذات کے ماورا ہیں - یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کی جبلتوں کو آزادی حاصل ہو اور اس کی ذہانت پوری طرح کام کرتی ہو - ان دونوں کے اتحاد سے جو ہمہ گیر وسعت نظر پیدا ہوتی ہے اس سے نہ تو تارک الدنیا راہب آشنا ہوتا ہے نہ نفس پرست عیاش - اس طبیعت کے آدمی کے لئے اپنی موت ایک بہت معمولی سا واقعہ ہے - یہ جرأت حقیقی اور ثبوتی ہوتی ہے اور اس کی بنیاد جبلت پر قائم ہوتی ہے - یہ محض منفی جرأت نہیں جو فطری جذبات کو دبانے سے پیدا ہو - اس قسم کی ثبوتی جرأت کو میں سیرت انسانی کی تکمیل کے لئے ایک بہت اہم عنصر سمجھتا ہوں" - [1]

سیرت انسانی کی تیسری صفت رسل (Russel) کے نزدیک ذکاوت احساس ہے یعنی انسان کا جذبات کے معاملے میں سریع الحس ہونا

---

[1] On Education صفحہ ۵۴-۵۵ -

تاکہ ماحول کے مختلف محرکات اس میں مناسب جذبات پیدا کریں - جس شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گرد و پیش کی اچھی اور بری ، خوشگوار اور ناگوار چیزوں سے مناسب طریقے سے متاثر ہوسکے وہ معاشری اور اخلاقی زندگی میں کامیابی کے ساتھ شرکت نہیں کرسکتا - کیونکہ عمل کے محرک ہمیشہ جذبات ہی ہوتے ہیں یا کم از کم عمل کو مستقل اور مسلسل بنانے کے لئے وہ قوت محرکہ درکار ہے جو جذبات میں پوشیدہ ہوتی ہے - نفسیات نے انسانی عمل کے تین عناصر بتائے ہیں یعنی ادراک (Cognition) جذبہ (Emotion) اور فعل (Conation) - ان میں سے ادراک اور فعل دونوں میں تغیر اور تبدیلی ممکن ہے لیکن انسان کے مستقل جذبات ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور انہیں سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو اسے باوجود مشکلات کے ثابت قدم رکھتی ہے - بہر حال جذبات اور ان کی تربیت کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا - اگر کسی شخص میں معاشری حالات اور ضروریات کو دیکھ کر یا ان کا خیال کرکے مناسب جذبات کا جوش پیدا نہ ہوگا تو وہ خود کو عمرانی مقاصد کے ساتھ کیسے متحد کرسکتا ہے ؟ اس احساس کی تربیت میں کئی چیزیں شریک ہوتی ہیں - شروع میں بچے کی تحسین طلبی کی خواہش اپنا اثر کرتی ہے - وہ بڑوں کی خوشنودی اور تعریف کا خواہاں ہوتا ہے اور ان کی ملامت سے بچنا چاہتا ہے - اکثر لوگوں میں یہ محرک عمل تمام عمر باقی رہتا ہے - جہاں تک اس کی بدولت لوگوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہوں اور خود غرضی کی روک تھام ہو اس کے مفید ہونے میں شبہ نہیں لیکن جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں رائے عامہ کو عمل کا معیار اعلیٰ قرار نہیں دینا چاہئے - اس صفت کا دوسرا لازمی جزو ہمدردی ہے جو اپنی ابتدائی

حالت میں محض ایک جبلت ہے جو انسانوں اور دیگر حیوانات میں مشترک ہے - اس وقت اس کا تعلق دل سے زیادہ جسمانی کیفیت سے ہوتا ہے اور اس میں اور تقلید اور اثر پزیری میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے - ایک چھوٹا بچہ کسی دوسرے بچے کو روتا دیکھہ کر خود بھی رونے لگتا ہے - ذرا بڑی عمر میں شاید ہر شخص کو دیکھہ کر یہ کیفیت پیدا نہ ہو لیکن اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے جذبات سے متاثر ہونا عام اور قدرتی بات ہے - اس ہمدردی کی تکمیل اور توسیع کے لئے رسل (Russel) کے خیال میں دو چیزوں کی ضرورت ہے - ایک تو یہ کہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو کہ انسان علاوہ اپنے قریبی دوستوں اور عزیزوں کے اور انسانوں کے دکھہ درد سے بھی متاثر ہو سکے - اس کی تفصیل پہلے کی جاچکی ہے - دوسرے یہ کہ ہمدردی کا جذبہ اس وقت بھی بیدار ہو جب ہم کسی دکھہ یا مصیبت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں بلکہ کسی اور ذریعہ سے ہمیں اس کا علم ہو - اس وسعت اور احساس کے پیدا کرنے کے لئے تخیل کی تربیت ہونی چاہئے تا کہ ہمیں افسانوں اور تاریخوں، سرکاری رپورٹوں اور اعداد و شمار میں بھی وہی تصویر دکھائی دے جو واقعات کو اپنی آنکھہ سے دیکھہ کر نظر آتی ہے تا کہ ہمارا ہمدردی کا جذبہ صرف اسی وقت مشتعل نہ ہو، جب مثلاً کسی جنگ میں خود ہمارا کوئی عزیز یا دوست زخمی ہو - بلکہ جب کبھی ہمیں معلوم ہو کہ قوموں کی ایک خون ریز جنگ میں لاکھوں آدمی مارے گئے ہیں اور زخمی ہوئے ہیں تو ہمارا دل دکھے اور ہم یہ محسوس کریں کہ یہ سب لوگ کسی نہ کسی کے دوست اور عزیز ہوں گے - ہمدردی اپنی پوری وسعت اس وقت حاصل کرتی ہے جب ایک شخص کے دل میں سارے جہاں کا درد جمع ہوجائے -

رسل کے نزدیک یہ بات ناممکن نہیں ھے اور وہ اس بات پر افسوس کرتا ھے کہ :—

"اگرچہ سائنس نے ھماری قوتوں میں اس قدر اضافہ کردیا ھے کہ ھم دور دراز کے ممالک کے لوگوں کی زندگی پر اثر ڈال سکتے ھیں - لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ ھماری ھمدردی میں اتنی وسعت پیدا نہیں ھوئی" [1]

ایک سائنس داں جو اپنے معمل یا کارخانے میں بیٹھ کر کیمیا کے تجربے کرتا ھے اور کوئی خوفناک بم کا گولہ یا زھریلی گیس ایجاد کرتا ھے تو وہ گویا تمام دنیا کے امن و امان کو متزلزل کرتا ھے - ایک بڑا تاجر جو اپنا منافع بڑھانے کے لئے اپنی منڈیوں میں غلے کی فروخت اور بر آمد کو روک دیتا ھے وہ نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کو فاقہ کشی میں مبتلا کرسکتا ھے - اس کا تدارک کرنے کے لئے تعلیم کا فرض یہ ھے کہ طلبہ میں تخیل اور ھمدردی پیدا کرے تا کہ وہ دوسروں کی حالت کو صحیح طریقہ پر محسوس کریں اور اس ظلم اور بے انصافی کا خاتمہ ھو جو زیادہ تر عدم احساس کی وجہ سے رائج ھے - یہ بھی یاد رکھنا چاھئے کہ ذکی الحس ھونے سے محض یہی فائدہ نہیں کہ انسان دوسروں کے دکھہ میں شریک ھو اور عمرانی فرائض کو ادا کرے بلکہ تہذیب نفس اور ذوق جمال کی تربیت میں بھی اس کو بڑا دخل ھے - خوبصورت چیزوں سے وھی لوگ محظوظ ھو سکتے ھیں جن میں احساس کی نزاکت ھو' جو لطیف نکتوں کو سمجھہ سکیں ' اور رنگ و بو اور شکل کے باریک فرقوں میں امتیاز کر سکیں جن کے دل

---

[1] On Education صفحہ ٥٧ -

میں مصور کی رنگ آمیزی، شاعر کی جادو بیانی، مغنی کی نغمہ طرازی مضراب بن کر ذوق حسن کے تاروں کو چھیڑ دے - یہ ذوق اس شخص میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک ایک چابک دست مصور کی تصویر اور رنگ کے چند دھبوں میں جو کاغذ پر پڑجائیں کوئی فرق نہ ہو، جو طبلے کی تھاپ اور ہتھوڑے کی چوٹ کو ایک ہی چیز سمجھے ؟ - بے شک اس حسن شناسی کے لئے فنی امور سے واقفیت ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ احساس کی ذکاوت اور جذبات کی لطافت درکار ہے -

رسل نے ذہانت یا عقل کو انسانی سیرت کی چوتھی لازمی صفت قرار دیا ہے - عقل میں وہ دو چیزیں شامل کرتا ہے - ایک تو وہ علم جو ہم حاصل کر چکے ہیں جو گویا ہماری ملکیت بن گیا ہے - دوسرے وہ قابل قدر صلاحیت جس کے ذریعے سے ہم نیا علم حاصل کر سکتے ہیں - ان دونوں میں بہت قریبی تعلق ہے - کیونکہ جلد سیکھنے کی صلاحیت جو "ذہانت" کہلاتی ہے ایک حد تک ہمارے سابق علم پر منحصر ہے - جاہل آدمی کو کوئی نئی بات سکھانی بہت مشکل ہے - وہ آسانی سے اپنی ذہنی عادتوں اور اپنے خیالات کو تبدیل نہیں کرتا - اس میں عقیدہ تنقید اور تجسس کی جگہ لے لیتا ہے اور وہ ان نئی باتوں کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیتا ہے جو سائنس کی ترقی کی بدولت عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہیں - بر خلاف اس کے جس شخص کی تعلیم صحیح اصولوں پر مبنی ہوتی ہے، یعنی وہ جو علم حاصل کرتا ہے وہ اس کی ذہنی تربیت میں معین ہوتا ہے اور اس میں مزید علم حاصل کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ اس کی ذہنی نشو و نما ہمیشہ جاری رہتی ہے - مفید اور مکمل زندگی بسر کرنے کے لئے یہ قابلیت اس درجہ اہم اور لازم ہے کہ بعض تعلیمی مفکرین نے اس کو تعلیم کا منتہا اور اخلاق کی بنیاد

قرار دیا ھے - لہٰذا انسانی سیرت کی تشکیل میں عقل کا فرض اولین یہ ھے کہ ترقی، نشو و نما، اجتہاد، نئی باتوں کو سیکھنے کی صلاحیت برقرار رکھے، اور فرد کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے ارتقاء پذیر ماحول میں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے - برگساں (Bergson) وغیرہ نے ارتقائے تخلیقی کا جو نظریہ پیش کیا ھے اس کے لحاظ سے بھی حیات انسانی میں عقل کا مفہوم وھی ھے جس کی طرف ھم نے ابھی اشارہ کیا ھے -

عقل کی جبلی بنیاد تجسس ھے جو انسانی طبیعت کے لوازمات میں سے ھے - حیوانوں میں اور چھوٹے بچوں میں اس کا اظہار بہت افراط اور شدت سے ھوتا ھے اور وہ ان کے اکثر اعمال و افعال کی محرک ھوتی ھے - لیکن بدقسمتی سے موجودہ تعلیمی اور معاشری حالات ایسے ھیں کہ جوں جوں بچہ کی عمر بڑھتی جاتی ھے عموماً اس کا شوق تجسس کم ھوتا جاتا ھے یہانتک کہ ایک خاص عمر کو پہنچ کر، جو مختلف افراد میں مختلف ھوتی ھے، اس میں یہ صلاحیت ھی نہیں رھتی کہ وہ نئی چیزوں اور نئے خیالات سے دل چسپی پیدا کر سکے - اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح سخت اور بے لوچ ھو جاتا ھے - اس میں یہ عادت جو سن کہولت کی مخصوص صفت ھے، پیدا ھوجاتی ھے کہ وہ اپنے خیالات کی باگ ''پرانے زمانے'' کی طرف موڑ دیتا ھے، اسی کی تعریف کیا کرتا ھے اور نئی تحقیقات، نئے نظریوں بلکہ نئے لوگوں سے بھی گھبراتا ھے اور ان سے کچھ سیکھنے کی خواھش نہیں کرتا - جب جذبۂ تجسس بالکل مردہ ھوجائے تو سمجھ لینا چاھئے کہ ذھانت کا بحیثیت ایک قوت محرکہ کے خاتمہ ھو گیا ھے اور انسان میں نشو و نما کی صلاحیت باقی نہیں رھی - لیکن اس کے ساتھ ھی یہ یاد رکھنا چاھئے کہ جیسا

رسل نے بتلایا ھے : ممکن ھے تجسس کی شدت اور ہمہ گیری میں کمی
آجائے لیکن اس کی نوعیت بہتر ہوجائے - یعنی ایک پختہ عمر کے
انسان کو بچوں کی طرح جزئیات کے متعلق تجسس نہ ہو بلکہ کلیات سے
دلچسپی پیدا ہو جائے اور وہ صرف ایسے امور اور مسائل کی تحقیق
و تفتیش کرے جو علمی اھمیت رکھتے ھیں - تجسس کا یہ ارتقاء فطرت
انسانی کے مقتضا کے عین مطابق ھے اور ھمیں اس میں مدد دینا چاھئے
تا کہ تجسس کی قوت ایسے کاموں میں صرف ہو جن کی اھمیت مستقل
اور دائرہ وسیع ہے - لیکن اس ارتقاء کے لئے شرط یہ ھے کہ طلبہ میں
قوت مشاھدہ ' محنت اور مستقل مزاجی کی عادتیں پیدا کی جائیں
اور ان کا یہ عقیدہ ہو کہ علم کی تحصیل کی کوئی حد نہیں - ورنہ ان
عادتوں کے بغیر ' تجسس کا اظہار نہایت ناقص اور بے کار طریقوں پر ہوتا
یعنی اِدھر اُدھر کی فضول باتیں سننے کا شوق ' دوسروں کے بھید معلوم
کرنے کی خواھش' غیر متعلق چیزوں کا کھوج جن سے انہیں کوئی مستقل
فائدہ نہیں ہو سکتا - عقلی تربیت کا ایک اور اھم جزو رسل کے نزدیک
وسعت نظر ھے جس کی بدولت ہم نئے حقائق اور نئی تجاویز پر غور
کرنے کے لئے آمادہ رھتے ھیں اور اپنے پرانے اور پسندیدہ عقائد پر محض
اسی وجہ سے اصرار اور ضد نہیں کرتے کہ ہم انہیں عرصہ سے مانتے چلے
آئے ھیں - اس وسعت نظر اور ذھنی دیانت کے لئے بھی جرأت اتنی ہی
ضروری ہے جس قدر جسمانی بہادری کے لئے - کیونکہ اس کے بغیر ہم معاشرے
کے رسم و رواج اور خیالات کی طرف سے بے پروا ہوکر اپنی ذاتی رائے اور
عقیدے پر عمل نہیں کرسکتے - کمزوروں اور سہولت پسندوں کے لئے سیدھا
راستہ یہی ھے کہ وہ آنکھیں بند کرکے انہیں خیالات اور عقائد کی
پابندی کریں جو ان کے گرد و پیش عام طور پر رائج ھیں لیکن جن

لوگوں میں اخلاقی جرأت اور عزت نفس ھوتی ھے وہ اپنی عقل کی مدد سے دنیا کے مسائل اور معاملات کے متعلق دیانت داری اور آزادی کے ساتھہ رائے قائم کرتے ھیں جو عوام کی رائے سے مختلف ھوتی ھے - ان کو ہر طرح کی مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ھے لیکن وہ اپنی آزادی کی خاطر ان سب کو خوشی سے برداشت کرتے ھیں - بقول رسل (Russel) کے :—

" ذھنی آزادی کی زندگی اس قدر آرام دہ ' مرنجان مرنج اور پر امن نہیں ھوسکتی جتنی وہ زندگی جو مروجہ عقائد کی پابندی کے حصار میں محفوظ ھو - صرف عقیدے ھی کی پناہ میں انسان کو وہ آرام و اطمینان نصیب ھوتا ھے جو کسی شخص کو ایک روشن آتش دان کے پاس بیٹھہ کر حاصل ھوتا ھے جب کمرے کے باھر سردی کا زور ھو "

اِس بحث میں رسل (Russel) نے یہ مسئلہ بھی چھیڑا ھے کہ انفرادی زندگی کو کس حد تک اجتماعی زندگی کی پابندیوں سے آزاد ھونا چاھئیے - ھم اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کرچکے ھیں اِس لئے یہاں اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں - رسل (Russel) نے اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ھے کہ عام طور پر ھر شخص کو دوسروں کے ساتھہ مل جل کر اور ان کی رضاجوئی کا خیال رکھہ کر کام کرنا چاھئیے ورنہ لوگوں کے برتاؤ اور آداب معاشرت میں شائستگی پیدا نہ ھوگی اور جماعتوں کا قیام بہت مشکل ھوجائیگا - اِس طرح دوسروں کے جذبات سے متاثر ھونا اور اُن کو قبول کرنا مفید ھے بشرطیکہ جذبات کسی مقابلۃً کم عقل شخص کی طرف سے زیادہ عقل شخص کی طرف منتقل

هوں - لیکن جہاں ایک بڑا دائرہ عمل ایسا ہے جس میں اجتماعی اثرات کی حکمرانی ہے وہاں ہر شخص کے لئے ایک چھوٹا سا دائرہ ایسا بھی ہونا چاہئے جہاں اجتماعی اثرات کو بہت کم دخل ہو یا نہ ہو، اور یہ اس کی مخصوص قابلیت کا میدان ہے - یعنی جس خاص علم یا فن یا شعبہ عمل میں کسی شخص کو خاص مہارت ہو وہاں اس کو ذاتی غور و فکر اور آزادی رائے سے کام لینا چاہئے۔ اور اگر اِس دائرے کے اندر کوئی ایسا معاملہ یا مسئلہ ہو جس میں اس کی رائے، رائے عامہ کی مخالف ہو تو اس کو جرأت کے ساتھ کھلم کھلا ظاہر کردینا چاہئے - باقی مسائل میں، بالخصوص علمی اور فنّی مسائل میں ہمیں ماہرین خصوصی کی رہنمائی قبول کرنی چاہئے -

ان چاروں صفات کے مفہوم اور شرائط سے بحث کرنے کے بعد رسل اِس معاشرے کا ایک تخیلی نقشہ کھینچتا ہے جو اِس قسم کی تعلیم پا کر پیدا ہوگا اور جس کے افراد میں کسی نہ کسی حد تک یہ صفات پائی جائیں گی :—

"موجودہ معاشرے سے کس قدر مختلف ہوگی اِنسانوں کی وہ جماعت جس کے ہر مرد اور عورت میں قوت، جرأت، ذکاوت احساس اور ذہانت کی صفات اس حد تک موجود ہوں گی جس حد تک تعلیم اُن کو پیدا کرسکتی ہے! بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جو خوشی سے محروم ہوں - اِس زمانے میں رنج اور بے اطمینانی کے سب سے بڑے اسباب بیماری، مفلسی اور صنفی زندگی کی ناقابل اطمینان حالت ہیں - یہ سب چیزیں مقابلتاً بہت کم ہوجائیں گی - صحت اور

تندرستی بہت عام ہوسکتی ھے - بڑھاپے کی آمد کو
مدت تک ملتوي کیا جا سکتا ھے - صنعت و حرفت کے
انقلابات کے بعد بھی مفلسی کا قائم رهنا محض لوگوں
کی متحدہ حماقت کا ثبوت ھے - احساس کی بیداری
سے لوگوں میں عام افلاس کو دور کرنے کی خواهش پیدا
هوگی ' عقل ان کو راستہ دکھائے گی اور جرأت اُنهیں
اِس راستہ پر ثابت قدم رکھے گی - کم همت لوگ بالعموم
تکالیف برداشت کرلیتے هیں لیکن اِس کو رفع کرنے کے
لئے کوئی غیر معمولی کوشش کرنے پر آمادہ نہیں هوتے
...... بے خوف عورتوں کی ایک نسل تمام دنیا میں
انقلاب پیدا کر سکتی ھے کیونکہ ان کی اولاد بھی جری
اور بے خوف هوگی اور ان کی فطرت مسخ نہ هونے پائیگی
یہ لوگ راست باز، صاف گو ' فراخ دل ' محبت شعار
اور آزاد هوں گے - اُن کی جد و جہد ظلم اور مصائب
کے اس بوجھہ کو اُتار کر پھینک دے گی جس کو هم
محض اپنی سستی یا کم همتی یا بے رحمی یا حماقت
کی وجہ سے برداشت کرتے هیں - تعلیم کی خرابی هی
نے هم میں یہ بری عادتیں پیدا کی هیں اور اسی کي
اصلاح کرکے هم اچھی عادتیں پیدا کر سکتے هیں - تعلیم
نئي زندگی کی کنجی ھے [1] "

مکمل اِنسانی سیرت کے متعلق ان دونوں فاضل مفکروں کے
خیالات کا مقابلہ کرنے سے معلوم هوتا ھے کہ ان میں بڑی حد تک

[1] On Education صفحہ ۲۰۰ - ۲۰۲ -

اتفاق رائے ھے اور اگرچہ دونوں کے خیالات کی فلسفیانہ بنیاد الگ الگ ھے لیکن دونوں کو اخلاقی تربیت اور سیرت کے اس مفہوم سے اختلاف ھے جو صدیوں تک نہ صرف عملاً رائج رہا ھے بلکہ علمی نظریوں پر بھی مسلط رہا ھے - دونوں عقل و علم اور اخلاق کے قریبی تعلق کو تسلیم کرتے ھیں اور اس خیال کی تردید کرتے ھیں کہ عقل کو اخلاقی سیرت سے کوئی لازمی تعلق نہیں - فلسفہ تعلیم اور تنظیم مدارس کے لئے اس جدید نقطہ نظر کی بہت بڑی اھمیت ھے - کیونکہ جیسا ھم بتا چکے ھیں ، مدرسوں میں عام طور پر علمی مشاغل اور اخلاقی تربیت میں حد فاصل قائم ھو گئی ھے - ان کی درسی زندگی اس طرح مرتب نہیں کی گئی کہ اس میں طلبہ کے کردار پر بالارادہ اثر ڈالا جائے اور ان کی اخلاقی سیرت مستحکم کرنے کا اھتمام ھو - یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ عملی طور پر تو معلم اپنا تمام وقت اور توجہ درسی علوم کے سکھانے میں صرف کرتے ھیں اور زبان سے ھمیشہ یہ کہتے رھتے ھیں کہ '' اخلاق '' یا '' نیکی '' کے سوا اور تمام چیزیں ھیچ ھیں - جدید نظریہ تعلیم نے عقل اور اخلاق کے درمیان ایک لازمی رشتہ قائم کر دیا ھے - عقل اور ذھانت کے متعلق ان دونوں مفکرین کے نقطہ نظر میں جس کا ھم نے ذکر کیا ھے اتنا فرق ضرور ھے کہ ڈیوئی (Dewey) اس کے عملی استعمال پر زیادہ زور دیتا ھے اور اس طرح طلبہ میں قوت فیصلہ کی تربیت کرنا چاھتا ھے جو تحصیل مقاصد میں معاملہ فہمی میں ، مشکلات سے عہدہ بر آ ھونے میں مدد دے - رسل (Russel) کو زیادہ فکر یہ ھے کہ طلبہ کی ایسی ذھنی تربیت کی جائے جو ان میں جذبۂ تجسس کے ساتھ وسعت نظر پیدا کرے ، وہ نئے حقائق اور نئے نظریوں پر غور کرنے کے لئے تیار رھیں اور ان میں عقلی نشو و نما کی

صلاحیت باقی رہے - اس طرح دونوں کے نزدیک صلاحیت عمل سیرت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے - ڈیوئی اس کو قوت یا کارکردگی کے نام سے موسوم کرتا ہے ، رسل اس کو قوت حیات کہتا ہے - ڈیوئی کے نزدیک قوت اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور جب تک اس میں استقلال ، حوصلہ اور محنت کی صفات نہ ہوں گی ؛ جو قوت کے مفہوم کا جزو ہیں " وہ اپنے جذبات اور خیالات کو عمل میں نہ لا سکے گا - رسل بھی جسمانی قوت اور صحت کو لازم سمجھتا ہے لیکن وہ اس سے یہ کام لینا چاہتا ہے کہ طلبہ میں مسرت حیات کا احساس بیدار ہو اور وہ اپنی خردی کی قید سے نکل کر دنیا کی دوسری چیزوں اور مظاہر میں دلچسپی لینا سیکھیں اور ان جسمانی اور دماغی خرابیوں سے محفوظ رہیں جو کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً ضد ؛ بد مزاجی ، افسردگی ؛ بیماری وغیرہ - رسل جرأت کو ایک مستقل اور علحدہ صفت قرار دیتا ہے کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا میں بیشتر خرابیاں خوف کا نتیجہ ہیں اور جب تک لوگوں کا جسمانی اور ذہنی خوف رفع نہ ہوگا نہ انہیں اپنی ذاتی زندگی میں اطمینان نصیب ہوگا ، نہ وہ اپنے معاشری فرائض کی عمدگی کے ساتھ ادا کرسکیں گے - ڈیوئی نے بھی جرأت کو قوت عمل کا لازمہ قرار دیا ہے اور اپنی تصانیف میں جا بجا اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کی تربیت پر زور دیا ہے - اس طرح دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نوجوانوں میں جذبات کی صحیح تربیت نہایت ضروری ہے تاکہ ان میں ہمدردی اور دوسروں کی امداد کرنے کی خواہش پیدا ہو کہ اس کے بغیر اجتماعی زندگی کا قیام ناممکن ہے - دونوں موجودہ زمانے کے حالات اور تعلقات کا خیال کرتے ہوئے یہ

ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمدردی کے اس جذبے کو جس قدر ممکن ہو وسیع کیا جائے تاکہ اس کے دائرے میں علاوہ ان لوگوں کے جن سے ہمارا براہ راست تعلق ہے وہ لوگ بھی شامل ہوجائیں جن پر کسی نہ کسی طرح بالواسطہ ہمارے افعال و اعمال کا اثر پڑتا ہے - اور سائنس اور صنعت و حرفت کے اِس دور میں کون شخص ایسا ہے جس کی زندگی دنیا کے اور سب لوگوں کے ساتھہ بے شمار رشتوں میں مربوط نہ ہو ؟ -

اِنسانی سیرت کے اس نصب‌العین کو جس کے خد و خال ان ماہرین تعلیم نے دکھائے ہیں، ہم اپنے ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ کرتے ہوئے کہاں تک قبول کرسکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان صفات کا تعلق کسی خاص ملک یا قوم سے نہیں بلکہ یہ ہر اِنسان اور ہر جماعت کے لئے ضروری ہیں - اگر ہم اپنے سیاسی اور معاشری حالت کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری قوم کو خاص طور پر یہ صفات درکار ہیں - اور ہماری تہذیب اور فلسفۂ زندگی میں، جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل ہے، اِن کی اہمیت مسلم ہے - البتہ اِن کی ترتیب و تنظیم اور اضافی قدرو قیمت ہمارے یہاں کسی قدر مختلف ہوگی -

ہم سب سے پہلے جذبات کی تربیت کو لیتے ہیں جس سے ہمارا یہ منشا ہے کہ طالب‌علم میں ایسا اجتماعی احساس پیدا کیا جائے کہ وہ معاشرتی اور تمدنی حالات سے مناسب طریقہ پر متاثر ہو - یعنی اس میں وسیع ترین معنی میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوجائے - آج کل جو سیاسی حالات ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے اس جذبے کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے - یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہماری

بیشتر سیاسی مشکلات اور معاشری خرابیاں اِسی اِجتماعی احساس
کی کمزوری کی وجہ سے ہیں - نہ مدرسے کی تعلیم ہمدردی
کے اِس جذبے کی تربیت کرتی ہے ' نہ خانگی اور معاشری اثرات اِس
کی نشو و نما میں مدد دیتے ہیں - اِس ہمدردی کو وسیع کرنے اور
عملی جامہ پہنانے کے لئے تخیل کی ' یعنی علم اور جذبات میں ربط
پیدا کرنے کی ' ضرورت ہے لیکن یہ تخیل بھی مفقود ہے - مدرسے کے
نصاب میں اجتماعی مسائل اور مضامین کو وہ اہمیت حاصل نہیں
ہے جو ہونا چاہئے تھی - اِس لئے طلبہ کو اپنے تہذیب و تمدن اور
معاشری ضروریات سے وہ واقفیت جو ہمدردی کی بنیاد ہے نہیں ہوتی '
یا ہوتی بھی ہے تو اِس قدر سطحی اور سرسری کہ اُن کے دل و دماغ
پر اِس کا کوئی گہرا یا دیرپا اثر نہیں پڑتا اور اُن کی قوت متخیلہ
اِس کو قوی اِحساس اور جذبات میں تبدیل نہیں کرسکتی - لہٰذا
جہاں تک اخلاقی تربیت کا تعلق ہے ہماری تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ
طلبہ میں اِس رشتے کا احساس پیدا کرے جو فرد اور جماعت کو ایک
دوسرے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور مختلف خیالات اور مقاصد رکھنے
والے گروہوں کو ایک متحدہ معاشرے یا قوم میں تبدیل کرتا ہے - لیکن
یہ احساس محض انفعالی نہیں ہونا چاہئے ؛ بلکہ جذبات کے جوش
اور حرارت کی بدولت اس میں حرکت اور قوت عمل پیدا ہوجانی
چاہئے - ہماری مذہبی تعلیم اور ہمارے تہذیب و تمدن میں اس
احساس پر اِنتہائی زور دیا گیا ہے اور قدیم ہندوستانی معاشرے کی
بنیاد سراسر اسی یک جہتی اور باہمی وابستگی کے احساس پر قائم
تھی جس کا کچھ اندازہ اب بھی کہیں کہیں دیہاتی زندگی کی شیرازہ
بندی کو دیکھ کر ہوسکتا ہے *

اب رہا علم ، تو اِس کو ہمارے مذاہب نے جو رتبہ دیا ہے وہ اِس بات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم صدیوں تک مذہبی گروہوں کا مختص مشغلہ رہ چکی ہے یہانتک کہ اِس پر مذہبی رنگ غالب آگیا اور اِس کے مقاصد اس کی حدود ، اس کا نصاب یہ سب چیزیں مذہبی عقائد کی پابند ہوگئیں - موجودہ زمانے میں ہمارے ملک کی علمی اور تعلیمی ترقی کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے اور ہمارا علمی معیار بہت گرا ہوا ہے - اس امر کو تسلیم کرنے میں ہمیں باک نہیں ہونا چاہئے خواہ اس کے وجوہ ہم کچھہ قرار دیں - لہذا یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ علم یا ذہنی تربیت جس کو رسل ذہانت کہتا ہے ہمارے لئے بےحد ضروری ہے - سائنس اور صنعت و حرفت کی بےاندازہ ترقی نے زندگی کے نظام کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے کہ اس میں کامیابی کے ساتھہ حصہ لینے کے لئے ہر فرد کی ذہنی تربیت لازم ہوگئی ہے - یوں تو انسان معاشرتی ارتقاء کی ہر منزل میں ذہنی تربیت کا محتاج رہا ہے لیکن قدیم زمانے میں وہ اپنے ماحول سے براہ راست بہت کچھہ ذہنی اور عملی تربیت حاصل کر لیتا تھا اور یہ اس کو بہت سے کاموں میں مدد دیتی تھی - لیکن اب اس ضمنی تعلیم پر قناعت کرنا ممکن نہیں بلکہ تعلیمی اداروں کا ایک وسیع اور باقاعدہ نظام مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے ہر شہری کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے عام مدنی اور شخصی فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھہ ادا کرسکے - ہمیں ہر ہر قدم پر ایسے مسائل پیش آتے ہیں جن کا کوئی مسلمہ حل موجود نہیں - ہر روز ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جن میں مروجہ طریقے کام نہیں دیتے - بلکہ تربیت یافتہ عقل اور قوت فیصلہ

کی ضرورت پڑتی ھے - کچھ زمانے کے بعد یہ بات اور زیادہ عام ھو جائیگی - مثلاً ھر شخص کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ اپنے رائے دھندگی کے حق کو کس طرح استعمال کرے ، کس شخص یا کس پارٹی کے حق میں اپنا فیصلہ دے - اس کو یہ جاننے کی ضرورت ھوگی کہ ان پارٹیوں کے کیا کیا اصول ھیں اور ان میں کس بنا پر اختلافات ھیں ، اور اگر ان میں سے کسی کی تجاویز کو عمل میں لایا جائے تو اس سے ملک کی حالت پر کیا اثر پڑیگا - اس سے ھمارا یہ مطلب نہیں کہ ھر شخص کو ان باتوں کا منصل علم ھونا چاھئے یعني ھر شخص کے لئے سیاست داں بننا ضروري ھے - لیکن یہ امر بدیہی ھے کہ عام سیاسی مسائل سے تھوڑی بہت واقفیت ھر شخص کے لئے لازمی ھے تاکہ وہ ان کے متعلق معقول رائے دے سکے اور ایک جمہوری ریاست میں کوئی شہری اس فرض کی ادائیگی سے پہلوتہي نہیں کرسکتا - اسي طرح زندگي کے کسي شعبے میں بھی ذھنی تربیت کے بغیر کام نہیں چل سکتا - مثلاً ھر نوجوان کو پیشے کے انتخاب کے مسئلے سے سابقہ پڑتا ھے - اگر ھم یہ چاھتے ھیں کہ تعلیم یافتہ طبقے کو جو الجھنیں اس مسئلے میں پیش آتی ھیں انہیں دور کریں تو ھمیں طلبہ کی عقلی تربیت میں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ھوگا کہ وہ ملک کے اقتصادی امکانات اور وسائل معاش سے واقف ھوں تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ذاتی مفاد اور قومی فلاح کے لئے مناسب طریقے پر استعمال کرسکیں - اسی طرح ھمیں جو بےشمار اصلاحی مسائل در پیش ھیں ان سب کو خاطر خواہ حل کرنے کے لئے علوم کی اشاعت اور ذھنی بیداري پیدا کرنے کی ضرورت ھے - بیماری کا انسداد ، صفائی اور حفظان صحت کا انتظام ، افلاس کا رفع کرنا ، جماعتی اختلافات اور فرقہ بندیوں کی اصلاح ، یہ سب کام اسی وقت انجام پاسکتے ھیں جب

شہریوں کی معقول ذہنی تربیت کے وسائل مہیا کئے جائیں - اسی کی بدولت ان میں ایسی قوت اجتہاد پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ ترقی کی راہیں نکالیں اور جس طرح دوسری قوموں نے علم کے ذریعے فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرکے بےاندازہ قوت اور عظمت حاصل کی ہے اسی طرح وہ بھی سائنس کی تحقیقات اور ایجادات کی مدد سے اور اپنے ملک کے قدرتی وسائل کو کام میں لاکر، اپنی قومی اور اجتماعی حیثیت کو بڑھائیں اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں جگہ پائیں - خواہ ہم انسانی سیرت کی تربیت کے متعلق کوئی نظریہ بھی اختیار کریں ہمیں عقلی اور ذہنی تربیت کی اہمیت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں - اب ہم اپنے مدرسوں کی حالت پر نظر ڈالیں تو بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے معلموں کو عقلی اور علمی تربیت کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور وہ اپنی ساری کوشش اسی میں صرف کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اور ضروری چیزوں سے غافل ہوگئے ہیں - لیکن جیسا ہم کتاب کے دوسرے حصہ میں بتا چکے ہیں انہوں نے نہ عقلی تربیت کا مفہوم صحیح سمجھا ہے نہ اس کے لئے مناسب ذرائع اختیار کئے ہیں اور موجودہ صورت حال کی اصلاح ان طریقوں پر ہونی ضروری ہے جن کی تفصیل ہم کر چکے ہیں -

تیسری صفت یعنی قوت عمل میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہیں اور انسان کو اپنے ارادوں اور مقاصد کو پورا کرنے میں مدد دیتی ہیں - مغربی قوموں کے مقابلے میں ہندوستانیوں میں قوت عمل کی بہت کمی ہے، خواہ ہم قومی سیرت پر غور کریں خواہ افراد کی سیرت پر - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو فلسفۂ زندگی رائج رہا ہے وہ فکر اور سکون، عزت اور گوشہ نشینی کو زندگی کی جد و جہد اور کشمکش میں شریک

ہونے پر ترجیح دیتا تھا - ہندو فلسفے میں ترک دنیا کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے - مسلمانوں میں بھی مذہباً تو نہیں لیکن ملکی حالات اور معاشرتی انحطاط کے اثر سے قناعت اور تقدیر پرستی بہت بڑھ گئی ہے - ان چیزوں کی وجہ سے ہندوستانیوں میں بعض قابل قدر صفات بھی پیدا ہوئیں اور وہ ایک حد تک اس مہلک مقابلے اور رقابت سے محفوظ رہے جو گذشتہ سو برس سے نہایت شدت کے ساتھہ مغربی تہذیب و تمدن پر مسلط ہے - لیکن ان امور میں جن میں فعالی حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے ہندوستانی عموماً ناکام رہے اور مجموعی طور پر یہ افسوس ناک نتیجہ نکلا کہ چین اور بعض اور ایشیائی ممالک کی طرح ہمارا ملک بھی ترقی کے دور میں مغربی ملکوں سے پیچھے رہ گیا - تعلیم کا فرض ہے کہ وہ قومی سیرت کی اس کمزوری کی اصلاح کرے اور ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے طلبہ میں ہمت، استقلال، مستعدی اور محنت کی عادتیں نشو و نما پائیں تاکہ وہ دنیا کی نظروں میں اپنی شخصی عزت اور قومی وقار دونوں کو قائم رکھہ سکیں -

جرأت کو خواہ ہم ڈیوئی کی طرح قوت عمل کا جزو قرار دیں یا رسل کی طرح ایک مستقل اخلاقی قدر مانیں بہر صورت اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے - شخصی اور قومی سیرت کی تکمیل کے لئے زندگی کے ہر پہلو میں جرات کی ضرورت ہے - یعنی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی جرأت کی تربیت ہماری تعلیم کا ایک لازمی جزو ہونا چاہئے - جسمانی جرأت گو بجائے خود اعلیٰ ترین جرأت نہیں لیکن اس کا ایک لازمہ ضرور ہے کیونکہ جو شخص ہر قسم کی جسمانی تکلیف سے ڈرتا ہے وہ ہرگز ایسا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا؛ جس میں دوسروں کی ناراضگی کا اندیشہ ہو، ہرگز ایسے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا جو رائے عامہ کے

خلاف ہوں - ہندوستانی طلبہ میں مدرسے کے مشاغل معاشری زندگی کی تنظیم، اور کھیلوں اور ورزشوں کے ذریعے جسمانی تکالیف برداشت کرنے کی عادت پیدا کرنی چاہئے اور انہیں ایسے کٹھن اور مشکل کاموں میں لگانا چاہئے جن سے ان کے حوصلے اور ہمت میں اضافہ ہو - قدیم سپارٹا کے مدبرین انگریز فلسفی جان لاک اور مشرق کے اکثر مفکرین جسم کو مضبوط کرنے اور اس کو قابو میں لانے کے لئے جو ریاضتیں تجویز کرتے ہیں وہ یقیناً ایک حد تک ضروری ہیں - لیکن اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ جسمانی آسایش اور آرام کی خواہش کو مارنا یا دبانا چاہئے - یہ خیال موجودہ نفسیات اور اخلاقیات دونوں کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے - لیکن ہم راحت جسمانی کو مقصود بالذات نہیں بنانا چاہتے کہ انسان بالکل نفس پرست اور آرام طلب ہوجائے سوائے اپنے عیش کے دنیا کی کسی چیز سے دل چسپی نہ رکھے یا ان تمام باتوں سے احتراز کرے جن میں کسی قسم کی جسمانی تکلیف کا اندیشہ ہو - ہم جسم کو روح کا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان مقاصد کی تحصیل میں معین ہو جنہیں ہم عقلاً اور اخلاقاً مناسب سمجھتے ہیں - اسی وجہ سے آج کل ماہرین تعلیم ایسی جسمانی تربیت پر زور دے رہے ہیں جس کی بدولت بچوں اور نوجوانوں کو اپنے قوائے جسمانی پر پورا قابو حاصل ہوجائے، اور ان میں جھجک اور بزدلی قائم نہ رہے - ہمارے خیال میں اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ تعلیم کا مطمح نظر بالکل تبدیل کردیا جائے اور وہ بجائے "سفید پوش شرفا" پیدا کرنے کے جو کسی قسم کی محنت سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوں؛ ایسے مستعد مزدور یعنی آمادہ عمل افراد پیدا کرے جو کمر ہمت باندھ کر ہر قسم کے مفید اور دولت آفریں کام کرنے کے لئے تیار رہیں -

اخلاقی اور ذہنی جرأت سے ہماری مراد ہے اپنے اصولوں اور عقیدوں پر پختگی کے ساتھ قائم رہنا ، ان کو دوسروں کی خوشنودی کی خاطر تبدیل نہ کرنا ؛ جب ضرورت ہو اپنی رائے بے دھڑک ظاہر کردینا ؛ اور حق گوئی کی خاطر ہر قسم سختیاں برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا - جب تک ہم اس بات کے لئے آمادہ نہ ہوں گے کہ بقول شیکسپیئر :

''سچی بات کو جو ہمارے دل کے اندر ہے ڈنکے کی چوٹ کہہ دیں''

نہ معاشرے کے خیالات کی اصلاح ہوگی نہ وہ قدامت پرستی کے پنجے سے چھوٹے گا - ہماری قوم میں بدقسمتی سے اس ذہنی جرأت کی بہت کمی ہے اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں جنہیں زبان خلق کا خوف نہ ہو اور اپنے سچے خیالات اور عقائد کو ظاہر کرنے سے نہ جھجھکیں - یہی وجہ ہے کہ بہت سی معاشری اور اخلاقی خرابیاں جن کو لوگ اپنے دل میں برا سمجھتے ہیں بدستور قائم ہیں - حال میں زیادہ تر سیاسی اثرات کی وجہ سے لوگوں نے پہلے کی نسبت زیادہ دلیری کے ساتھ ان خرابیوں کے خلاف جنگ شروع کی ہے - لیکن محض اتنی بات کافی نہیں - جب تک ہمارے روزمرہ کے تعلقات اور کاروبار میں اس روش کا اظہار نہ ہوگا اور لوگ آزادی کے ساتھ تنقید کرنا اور خندہ پیشانی سے اس کو برداشت کرنا نہ سیکھیں گے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذہنی یا اخلاقی جرأت ہماری سیرت کا جزو ہوگئی ہے - ہماری تہذیب کی قدامت کی بدولت ہمارے یہاں رسوم و روایات کا بار اس قدر زیادہ ہوگیا ہے کہ اکثر لوگوں کی زندگی ، قول اور فعل دونوں کے اعتبار سے ، محض رسمی اور تقلیدی ہوکر رہ گئی ہے اور وہ کہیں بھی اس آزادی کا اظہار نہیں کرتے جو فطرت انسانی کا سب سے قیمتی عطیہ ہے - سیاست ، معاشرت ، اقتصاد ، مذہب ، غرض ہر شعبہ زندگی میں ارباب غرض جن کے ہاتھ میں عوام

کی باگ ہے یہی چاہتے ہیں کہ ان میں غور و فکر کی عادت نہ پیدا ہو اور وہ آنکھیں بند کئے ہوئے مقررہ راستوں پر چلتے رہیں - تعلیم کا انقلابی فرض یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو ان بزرگوں کے احکام کی تنقید کرنا سکھائے اور ان میں اتنی ہمت پیدا کرے کہ وہ خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنی عقل کے فتوے پر عمل کریں -

اخلاقی جرأت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کا تعلق دوسروں سے نہیں بلکہ خود ہماری ذات سے ہے اور جس کی ضرورت غالباً اس حالت میں بھی ہوتی اگر ہم بجائے معاشری زندگی بسر کرنے کے بالکل تنہائی کی زندگی بسر کرتے - اکثر لوگوں میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرسکیں - وہ جانتے ہیں کہ ان کی فلاں بات غلط ہے یا فلاں کام خلاف عقل و انصاف تھے لیکن وہ گویا اپنے ہی نفس سے اس درجہ مرعوب اور خوف زدہ ہوتے ہیں کہ انہیں یہ ہمت نہیں پڑتی کہ اپنی غلطی کو صاف صاف تسلیم کریں - ایسے لوگ نفس کے بندے بن کر رہ جاتے ہیں - وہ اس چیز کو وضعداری سمجھتے ہیں کہ جو بات ایک دفعہ کر بیٹھیں اس پر اڑیل ٹٹو کی طرح اڑے رہیں کیونکہ ان کے خیال میں رائے یا عمل کی تبدیلی سبکی اور ذلت کا باعث ہے - اس میں شک نہیں کہ دوسروں کے سامنے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم فلاں مسئلے میں غلطی پر تھے یا ہم سے فلاں معاملے میں خطا ہوئی - لیکن ہم ہرگز ایسے شخص کی سیرت کا احترام نہیں کرسکتے جو اپنی عزت کو بلکہ عزت کے ایک غلط تصور کو صداقت پر ترجیح دے - دنیا میں کوئی شخص اتنا بلند مرتبہ نہیں کہ اس کے لئے صداقت کے سامنے سر جھکانا ذلت کا باعث ہو - دنیاوی وجاہت اور مرتبے کے لحاظ سے نہیں بلکہ سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے جو بزرگ ہوئے ہیں ان کی زندگی میں

ان سب میں یہ صفت مشترک تھی کہ انہوں نے کبھی اپنی ذاتی عزت کو صداقت سے بڑھ کر نہیں جانا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں کیا - جمہوریت اور انفرادی آزادی کے زمانے میں کسی شخص کو خاص کر ان لوگوں کو جو اپنے ہم جنسوں کی سر کردگی اور رہنمائی کرتے ہیں اس قسم کی اخلاقی جرأت کے بغیر چارہ نہیں - کسی پالیسی یا پروگرام کو وقت اور حالات کے مقتضا کے مطابق چلانے کے لئے دماغی قابلیت اور اخلاقی جرأت دونوں درکار ہیں - اگر کوئی مدبر یا سیاسی لیڈر اس قدر ذہین اور دانشمند ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات کو دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسے کیا طریقہ عمل اختیار کرنا چاہئے لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ دوسروں کی رائے یا اپنی سابقہ رائے کی مخالفت کرسکے تو ملک کو اس کی دماغی قابلیت سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ؟ اسی طرح اخلاقی جرأت بڑی بجائے خود کامیابی کی ضامن نہیں ہوسکتی جب تک انسان میں اتنی قابلیت نہ ہو کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کرکے فیصلہ کرسکے کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے - لہذا تعلیم کا فرض یہ ہے کہ جہاں طلبہ میں زمانہ شناسی کا ملکہ پیدا کرے اور انہیں آزادی کے ساتھ اپنے عقائد کا اظہار اور ان پر عمل کرنا سکھائے وہاں صداقت کے سامنے سر جھکانے کا سبق بھی دے تاکہ وہ بے تامل اپنی غلطیوں کو تسلیم کرلیا کریں - اس سبق کو اس خوبی اور استحکام کے ساتھ عملی اور نظری طور پر ان کے ذہن نشین کرنا چاہئے کہ وہ ان کی زندگی اور فلسفہ زندگی کا جزو بن جائے -

اگر ہم ان صفات کے وسیع ترین معنی لیں تو ان میں وہ سب باتیں آجاتی ہیں جو ہم اپنے طلبہ کی سیرت میں پیدا کرنا چاہتے ہیں - لیکن الفاظ کو محض ذاتی رائے کی بنا پر اس قدر وسعت دینا

مناسب نہیں کیونکہ ہر شخص کا معہود ذہنی مختلف ہوتا ہے
اور اس وجہ سے ان کے مفہوم کے متعلق اتفاق رائے بہت مشکل ہوجائے گا
اس لئے اِس بحث کے خاتمے پر بہت اختصار کے ساتھہ ہم اتنا اور بتا
دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی طلبہ کی سیرت کی تربیت میں تین امور کو
خاص طور پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے - تربیت جذبات کے ضمن میں ہم
نے ہمدردی کی صفت پر بہت زور دیا ہے لیکن اپنے ملک کے مخصوص
حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں ہمدردی کے ساتھہ ساتھہ ایک اور جذبے
کی تربیت کرنی چاہئے جس کا تعلق عقل اور جذبات دونوں سے ہے یعنی
رواداری ، دوسروں کی رائے اور خیالات اور جذبات کا اتنا ہی احترام کرنا
جیسا ہم اپنے خیالات اور جذبات کا کرتے ہیں - رواداری کی ایک قسم تو
وہ ہے جو آج کل کے تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا ہو رہی ہے ، یعنی چونکہ
اکثر معاملات میں وہ خود کوئی پختہ اصول و عقائد نہیں رکھتے ہیں
اِس لئے ان کے نزدیک کسی اصول یا عقیدے کی کوئی خاص اہمیت
نہیں ، سبھی ایک سے ہیں - یہ حقیقی رواداری نہیں - اس کو بے پروائی
کہنا زیادہ مناسب ہوگا - بعض لوگوں نے اس ذہنی روش کو جو
تشکیک پر مبنی ہے بہت وقعت دی ہے اور وہ اس کو روشن خیالی اور
ذہنی آزادی سمجھتے ہیں - لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کی
بے پروائی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے نقص پر دلالت کرتی ہے اور اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے کوئی خاص معیار اخلاق یا نظام اقدار قائم نہیں
کیا اور اس کی زندگی کسی زبردست اصول یا مقصد کے ساتھہ وابستہ
نہیں ہے - ہم جس رواداری کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے
منافی نہیں بلکہ اس کے ساتھہ جمع ہوسکتی ہے - اس کے معنی یہ
ہیں کہ ہم زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے خیالات اور عقائد رکھتے

هیں اور ان پر عمل کرتے هیں لیکن اصولاً اور عملاً دوسروں کے اس حق کو تسلیم کرتے هیں که وہ هم سے بالکل مختلف خیالات اور عقائد رکھیں - هم اپنی رائے کا اظہار جوش اور خلوص کے ساتھ کرتے هیں که دوسرے لوگوں کو بھی اپنا هم رائے بنا لیں لیکن اس کے ساتھ هی هم بردباری اور خندہ پیشانی سے اپنے مخالفوں کی رائے سننے کے لئے تیار رهیں اور اس اختلاف رائے کی وجه سے همارے باهمی تعلقات میں کسی قسم کی ناگواری پیدا نہیں هوتی - مبادلۂ خیال بحث و مباحثه : اختلاف رائے ، علمی اور عقلی ترقی کی جان هیں بشرطیکه همدردی اور رواداری کی فضا موجود هو - همارے ملک کی حالت اس قدر ناگفته به هے که ذرا سے اختلاف خیال کی وجه سے آپس کے لڑائی جھگڑے کا دروازہ کھل جاتا هے جس میں قومی عزت اور قوت کا خون هوتا هے - اختلاف خیال کو دور کرنا تو نه ممکن هے نه قرین مصلحت ، اس لئے همیں رواداری کی صفت پیدا کرنی چاهئے تاکہ ذهنی اور معاشری زندگی میں امن و امان قائم رهے اور ترقی کی صورت نکلے -

جس طرح رواداری کے بغیر ذهنی آزادی اور جرأت سے ناگوار نتائج پیدا هونے کا امکان هے ، اسی طرح لوگوں میں قوت عمل محنت' جد و جہد اور حوصله مندی کی نشو و نما بھی اندیشے سے خالی نہیں اگر اس کے ساتھ هی امن پسندی ، قناعت ، اور مشاهدۂ نفس کی تربیت نه کی جائے جو هندوستانی تہذیب کی خصوصیات رهی هیں بے شک فوری ضروریات کی وجه سے همیں فعالیت پر زیادہ زور دینا چاهئے - لیکن ان کی خاطر هم ان مستقل اور ابدی قدروں کو قربان نہیں کرسکتے جن کی آغوش میں پرورش پاکر انسانیت اوج کمال کو پہونچتی هے - جو تعلیم اور تہذیب افراد میں رشک اور مسابقت کے جذبات کو فروغ دیتی هے ' اور

دنیاوی جاہ و قوت کے لئے مجنونانہ جد و جہد کو ضروری سمجھتی ہے وہ انسانیت کے مرتبے کو بہت پست کر دیتی ہے - انسانی سیرت میں توازن اور سکون کی ضرورت ہے تاکہ انسان اپنی خودی کا اظہار محض خارجی اشیا کی طلب اور جستجو میں نہ کرے بلکہ ان خزانوں کو بھی ٹٹولے جو اس کی ذات میں پنہاں ہیں اور ان سے مستفید اور لطف اندوز ہو - حکیم اسلام علی مرتضیٰ کے ایک شعر کا کسی شخص نے اردو ترجمہ کیا ہے جس میں انسان کی نفسی گہرائیوں اور روحانی خزانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :—

تیری دوا تجھی میں ہے تجھ کو خبر نہیں
تیرا مرض تجھی سے ہے تجھ کو نظر نہیں
جِرم صغیر سمجھے ہے تو اپنے آپ کو
پوشیدہ تجھ میں عالم اکبر مگر نہیں

اس '' جِرم صغیر '' یعنی انسان کی ذات میں عالم اکبر کو تلاش کرنا اور اس کو پالینا تعلیم اور تہذیب کا منتہائے کمال ہے - لیکن جو لوگ ہر وقت خارجی مقاصد اور مادی منافع کی طلب میں مصروف رہتے ہیں انہیں اپنی تہذیب نفس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی - ادب اور فنون لطیفہ سے محظوظ ہونا ، فطرت کے خوبصورت مناظر سے لطف اور سکون قلب حاصل کرنا ، کبھی کبھی دنیاوی مکروہات اور جد و جہد سے پیچھا چھڑا کر اپنے نفس کی گہرائیوں کا مشاہدہ کرنا اور اپنی زندگی کا جائزہ لینا ، یہ تمام باتیں بھی انسانی شخصیت کی تکمیل کے لئے اسی طرح ضروری ہیں جس طرح قوت یا دولت کے لئے جد و جہد کرنا - جہاں حیات انسانی کے ارتقاء کے لئے عقل کی ضرورت

ھے وہاں اس اعلیٰ تر قوت وجدان کی تربیت بھی لازم ھے جس پر مشرق کے ارباب فکر ھمیشہ سے اور مغرب میں برگسان اور اس کے ھم خیال آج کل زور دے رھے ھیں، جس کے واسطے سے انسان کائنات اور خالق کائنات کی معرفت حاصل کرتا ھے - ھندوستان میں تعلیم کا جو نظریہ یا فلسفہ مرتب کیا جائے اس میں یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہی ھندوستانی تہذیب کی امتیازی خصوصیت ھے -

مذھب اور مذھبیت کو نہ ڈیوئی نے واضح طور پر سیرت کے عناصر میں شمار کیا ھے نہ رسل نے - لیکن ھم ھندوستانی اپنی سیرت کی تشکیل میں اسے نظر انداز نہیں کرسکتے کیونکہ ھمارے ملک میں ھمیشہ سے تہذیب اور مذھب کا گہرا اور قریبی تعلق چلا آتا ھے - لہذا تعلیم کو، جو افراد کے لئے تہذیب کی ترجمانی کرتی ھے اور انہیں اس کا حامل بناتی ھے، مذھب کی اھمیت کی طرف سے غافل نہیں ھونا چاھئے - یہ ھماری بدنصیبی ھے کہ ھماری جدید تاریخ کے صفحات ان فتنوں اور خون ریزیوں کے بیان سے آلودہ ھیں جن کی ذمہ داری بظاھر مذھب یا اختلاف مذاھب پر عائد ھوتی ھے اور اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ جن کی نظر سطح سے گزر کر تہ تک نہیں پہونچتی ھے سرے سے مذھب ھی سے بددل ھوگئے ھیں اور انہیں اس المناک صورت حال کا علاج یہی معلوم ھوتا ھے کہ مذھب کو قطعاً ترک کردیا جائے - لیکن ان کا یہ خیال ایک بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس میں شکست پسندی کا رنگ جھلکتا ھے - حقیقت امر یہ ھے کہ مذھب کوئی خارجی لباس نہیں کہ اسے جب چاھیں پہن لیں جب چاھیں اُتار پھینکیں - جاپان کے متعلق مشہور ھے کہ وھاں سے ایک کمیشن یورپ بھیجا گیا تھا کہ مختلف مذاھب کا مطالعہ کرکے رپورٹ پیش کرے کہ جاپانی قوم کے لئے کون سا مذھب سب سے زیادہ موزوں

ہوگا - اگر یہ قصہ صحیح ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ عجیب و غریب حرکت کی تھی ان کو مذہب کے مفہوم اور منشا سے مطلق واقفیت نہیں - مذہب محض چند رسوم اور عبادات کا نام نہیں جنہیں انسان سیکھ لے اور ادا کر دیا کرے - وہ انسان کی روحانی فطرت کا مظہر ہے اس کی نہایت گہری اور شدید نفسی ضروریات کو پورا کرتا ہے، اس کی نظر کو عارضی اور وقتی چیزوں سے ہٹا کر دائمی اور ابدی حقائق سے روشناس کرتا ہے اور اس کے اور خالق کائنات کے درمیان وہ تعلق قائم کرتا ہے جو اس کی شخصیت کی تکمیل کے لئے لازمی ہے - اگر مذہب ایک بے معنی لفظ ہو، اگر روح اور خدا کا تصور انسانی دماغ کے توہمات کا نتیجہ ہو اور انسان بھی مثل اور کیمیاوی مرکبات کے محض کیمیاوی اور طبیعی مادوں اور قوتوں کا مجموعہ ہو تو انسانی زندگی کی حقیقی اور ابدی اہمیت باقی نہیں رہتی - یہ ممکن ہے کہ بعض اشخاص باوجود لامذہب ہونے کے اپنے معاشری احساس اور عقل کی بدولت اعلیٰ تمدنی اور اخلاقی اصولوں کی پیروی کریں لیکن عام لوگوں کے لئے اِس بات کا امکان بہت کم ہے - کیونکہ عقل اور اخلاق کے اصول خشک اور مجرد ہوتے ہیں ان میں وہ کشش اور تاثیر نہیں جو مذہبی عقائد میں ہوتی ہے - علاوہ بریں مذہب کا دائرہ اخلاق کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے اور اس میں ایسے تجربات اور مسائل بھی آجاتے ہیں جن کا موضوع افراد کے باہمی تعلقات نہیں ہیں بلکہ ہر فرد کی اپنی روحانی زندگی ہے - جو شخص مذہب کے اثر سے بالکل محروم رہا ہے اس کے شخصی ارتقاء کا یہ پہلو بالکل معطل رہے گا -

ظاہر ہے کہ مذہب ان چیزوں میں سے ہے جو سکھائی نہیں جاسکتیں - جہاں تک سرکاری مدرسوں کا تعلق ہے ان کے لئے یہ بات نہ

تو ممکن ھے نہ مناسب ھے ' کہ وہ اپنے طلبہ کے لئے ہر مذہب کے عقائد و عبادات کی تعلیم کا اِنتظام کریں - یہ فرض طلبا کے والدین اور مذہبی جماعتوں پر عائد ہوتا ھے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے مخصوص عقائد کي تعلیم دیں - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدرسہ مذہبي تربیت کے فرض سے بالکل سبکدوش سمجھا جائے - مذہبیت کا جذبہ ایک عام احساس ھے جو مختلف مذاہب میں مشترک ھے - اس میں بہت سي چیزیں شامل ہیں - مثلاً ایک سچے مذہبی آدمی کو روحانی قدروں کا احساس ہوتا ھے اور یہ یقین کہ انسان کی شخصیت دنیاوي زندگی کا چراغ گل ہوجانے ' سے فنا نہیں ہوتی بلکہ روحانی ارتقاء کی منزلیں طے کرتي رہتي ھے - اس کے دل میں زندگي کا گہرا احترام ہوتا ھے خواہ اس کا جلوہ انسانوں میں نظر آئے یا حیوانوں میں یا مناظر فطرت میں ' کیونکہ وہ جانتا ھے کہ زندگی وہ عطیہ الٰہی ھے جس کا بدل دنیا کی کوئی چیز نہیں ہوسکتی - اسی وجہ سے اس کے دل میں رواداری اور ہمدردی کا وہ حقیقی جذبہ ہوتا ھے جو اتحاد اغراض مقاصد پر نہیں بلکہ احساس نوعی پر مبنی ھے - مگر جہاں وہ اِنسانی شخصیت کی عزت کرتا ھے وہاں یہ بھی جانتا ھے کائنات کے مقابلے میں انسان کی ہستی بہت چھوتي ھے اور اس کی علمی ترقی اور تسخیر فطرت کے زبردست کارناموں کے باوجود اس کا علم اور قوت بہت محدود ھے - یہ خیال اس کے دل میں سچا عجز اور انکسار پیدا کرتا ھے جس کی شناخت یہ ھے کہ وہ اس کے قوائے عمل کو معطل نہیں کر دیتا بلکہ اس کو جد و جہد کي دعوت دیتا ھے - نیوٹن (Newton) جیسے زبردست سائنس داں کا یہ قول کہ اس کے علم کي مثال سائنس کے بحر ذخار کے سامنے ایسی ھے جیسے کوئي بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے

کھیل رہا ہو حقیقی مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے - لہذا جب
ہم کہتے ہیں کہ تعلیم کو مذہب کی طرف سے غافل نہیں ہونا
چاہئے اور مذہبی جذبے کی تربیت میں حصہ لینا چاہئے تو ہمارا
مقصد یہ ہوتا ہے کہ معلم کو طلبہ میں قدروں کا احساس، احترام
حیات، رواداری و ہمدردی، عزت نفس، اور حقیقی انکسار کے جذبات
پیدا کرنے چاہئیں - یہاں مذہبی تربیت کے انتظام اور طریقوں سے
بحث کرنے کا موقع نہیں اور نہ اس کی گنجائش ہے - لیکن ہم اب تک
جن تعلیمی اصولوں سے بحث کرچکے ہیں ان پر غور کرنے سے اس کے
متعلق بھی بعض اہم نتائج نکل سکتے ہیں مثلاً یہ کہ مذہبی تربیت
کے لئے سب سے زیادہ اہم اور اثر آفریں عنصر معلم کی شخصیت ہے جو
براہ راست طلبہ کی شخصیت اور نظام اقدار کی تشکیل کرتی ہے -
اور اس کے بعد مدرسوں میں معاشری اور اخلاقی زندگی کی تنظیم،
مختلف مذاہب کے خیالات کا بے تعصبانہ مطالعہ، طلبہ کے دل میں
عالم فطرت کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا کرنا، فنون لطیفہ کے
ذریعے ان کے وجدان کو نشو و نما دینا، ان کے لئے اپنے بنی نوع کی
خدمت کے مواقع فراہم کرنا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو
مناسب طریقے پر استعمال کیا جائے تو وہ مذہبی تربیت میں معین
ہو سکتی ہیں

موجودہ ہندوستانی تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ مذہب سے
بالکل بے تعلق ہوگئی ہے اور طلبہ میں مذہبی روح کو بیدار نہیں کرتی -
اسی وجہ سے عوام کو کبھی اِس سے سچی ہمدردی پیدا نہیں ہوئی - خواہ
وہ بظاہر مذہب کی طرف سے بے پرواہ ہوں اور اِس کے اِحکام پر عمل
نہ کریں لیکن اُن کے قلب کی گہرائیوں میں مذہب کا احترام موجود ہے

اور وہ کسی ایسے نظام تعلیم کی دل سے قدر نہیں کرسکتے جو اُن کو محض حصول معاش میں مدد دے اور اس سے زیادہ اِس کا کوئی مصرف نہ ہو - ممکن ہے بادي النظر میں یہ رائے صحیح نہ معلوم ہو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل والدین باوجود ہر قسم کی مالی دقتوں کے اپنی اولاد کو یہی مغربي تعلیم دلا رہے ہیں اور اس کے لئے اپنی ذات پر ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں - لیکن اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ وہ اِس تعلیم سے مطمئن ہیں - وہ اِس کو واسطہ یا ذریعہ سمجھتے ہیں کوئی قدر مستقل نہیں مانتے - اِس کے مقابلے میں اِن کے دل میں اِس پرانے نظام تعلیم کي زیادہ قدر ہے جو بہت تنگ اور محدود تھا لیکن کم سے کم اِس میں مذہبی تربیت پر زور دیا جاتا تھا - چنانچہ ابتدا میں تنگ خیال مذہبي پیشواؤں نے مغربی تعلیم کو بالکل ہي ناجائز قرار دیدیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ضروریات زمانہ سے مجبور ہوکر لوگوں نے اِس کي طرف توجہ کی یہاں تک کہ اب وہ اُس کے حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہیں - لیکن جب تک اس تعلیم کا رشتہ مذہب کے ساتھہ نہ جوڑا جائے گا اس کا مقصد بہت محدود ہوگا یعنی زیادہ سے زیادہ اِس سے علم اور واقفیت میں اضافہ ہوگا - تمدنی زندگی کے ظاہري پہلو کي تھوڑي بہت اصلاح ہوگي لیکن ہمارے جذبات اور عقائد کی دنیا اور ہماري شخصی اور قومي تہذیب کے ساتھہ اِس کا کوئي تعلق قائم نہیں ہو سکتا اور زندگی کے اہم اور اصلی مقاصد کے حصول میں یہ ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتي - لہذا ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہے کہ وہ اِس پورے مسئلے پر احتیاط کے ساتھہ غور کریں اور ایسے ذرائع اختیار کریں کہ مغربی تعلیم کے قابل قدر عناصر یعني سائنس اور صنعت و حرفت اور معاشري علوم کی تحصیل کے ساتھہ

ساتھہ طلبہ میں ان مذہبی قدروں کا احترام بھی پیدا ہو جو مذہبی
تہذیب کی روح رواں سمجھی جاتی ہیں - ہندوستانیوں کے فرقہ وارانہ
اختلافات نے نہ صرف ان کی قومی عزت اور سیاسی وقار کو خاک میں
ملا دیا ہے بلکہ خود مذہب کے رخ روشن کو گرد آلود کردیا ہے اور جیسا
کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں بہت سے سمجھدار اور تعلیم یافتہ لوگوں کا دل
اس کی طرف سے پھیر دیا ہے - لیکن ہمارا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ ان
اختلافات کی اصلی وجہ مذہب نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی اغراض
ہیں جن کو بعض بے حمیت اور خود پرست لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد
کی خاطر مذہبی رنگ دیدیا ہے اور وہ عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل
کر کے اپنا کام نکالتے ہیں - یہ بیچارے اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے
اور آسانی سے ان لوگوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں - وہ اپنے نزدیک
مذہب کی حمایت میں جانی اور مالی نقصان اُٹھاتے ہیں جس سے
کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کو مذہب سے قلبی محبت ہے
خواہ وہ اس کا اظہار اپنی عاقبت ناشناسی کی وجہ سے غلط طریقہ پر کریں -
اس صورت حال کی اصلاح کی ذمہ داری صرف معلموں ہی پر عائد نہیں
ہوتی بلکہ ملک کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ اس لعنت کو دور
کرنے کی کوشش کرے - یہ کام آسان نہیں ہے کیونکہ اس میں انہیں
ہر قسم کے ارباب غرض کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی ' عوام کے توہمات
اور تعصبات کو رفع کرنا ہوگا اور مخالفتوں کے اصلی اسباب کو دور
کرنے کے طریقے سوچنے پڑیں گے - ان سیاسی اور اقتصادی اختلافات
کی اہمیت کو گھٹا کر دکھانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا -
ہمیں صاف صاف اس بات کا اعتراف کرنا چاہئیے کہ مختلف
فرقوں کے مطالبات کو ہم آہنگ کرنا ایک بہت کٹھن کام ہے
جس کے لئے نہ صرف قانونی فیصلے اور آئینی تصفیئے کی ضرورت

ھے بلکہ لوگوں کی ذھنیت کو بدلنا ھے اور انہیں یہ احساس دلانا ھے کہ ان کے باھمی اختلافات تھوڑے اور عارضی ھیں اور اُن عظیم‌الشان مقاصد کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے جو سب فرقوں میں مشترک ھیں - اور ان عارضی اختلافات کی خاطر مستقل مفاد اور مقاصد کو قربان کردینا دانشمندی کے خلاف ھے - اگر مدرسے کی تعلیم نوجوان طلبہ میں ھمدردی ' رواداری اور احترام حیات کے جذبات پیدا کرے ' جو مذھبی سیرت کے اھم اجزا ھیں ؛ تو وہ اِن اختلافی مسائل کے حل کرنے میں بھی معقولیت ' شائستگی ' اور حسن مراعات کو ھاتھہ سے نہ دیں گے ' بحث و مباحثہ میں وہ تلخی اور ناگواری پیدا نہیں ہوگی جو ھماری موجودہ سیاسی زندگی کا جزو لازم ہوگئی ھے - اس طریقے پر مذھبی تعلیم دینے سے نہ صرف مذھب کے دامن سے یہ شرم ناک دھبہ دھل جائیگا ' بلکہ یہ تعلیم ھمارے ملکی اور سیاسی معاملات کے سلجھانے میں بھی بہت مدد دے گی اور لوگوں میں فصل پیدا کرنے کے بجائے وصل کا جانفزا پیغام سنائے گی -

اصول تعلیم

مفصل فہرست مطالب

(باعتبار حروف تہجی)

فہرست کتب

(مصنفوں اور کتابوں کی فہرست جن کے حوالے اس کتاب میں
دئے گئے ہیں - صفحوں کے نمبر مقابل میں درج ہیں)

Findlay : Foundations of Education 78

Ferriere : Activity School 209

Ferriere : La Pratique de l'ecole active ... 255

George : Junior Republic 433

Howerth : Art of Education 60

Hamaide : Decroly Class 209

Hower Lane : Little Common wealth 433

James : Talks to Teachers 385

Kerschensteiner : Schools and the Nation 332, 155

Kerschensteiner : Education as Citizenship ... 209

Keatinge : Teaching of History 256

Keatinge : Suggestion in Education 471

Kipling : Stalky and Co. 364

Le Bon : Psychology of the Crowd 471

Mackenzie : Fundamental Problems of life ... 76

Mackenzie : Problems of National Education ... 332

Nunn : Education—its Data and First Principles ... 471

Pinketvitch : New Education in Soviet Republic 145 456, 451, 146

Russel : On Education 495, 487, 443, 438, 175, 26 504, 502, 498

Rousseau : Emile 52

Smith : Educational Sociology 76

Smith : Nation's Schools 141

Sanderson of Oundle 227

Sapper : Bull Dog Drummond 491

Sinclair : Oil ... ... 486 , 467

Tagore : Religion of Man 210

Thorndike and Gates : Elementary Principles of Education 274

Vasconcellos : A New School in Belgium 312 , 255 , 153

Wheeler : Youth ... ... 101 , 82

Wells : The Story of a Great School Master 230, 227, ۲۰۷

Wordsworth : Ode on the Intimations of Immortality 439

افلاطون : ریاست (مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین) ... 166

اقبال : پیام مشرق ... ... 395 ، 30

اقبال : بانگ درا 19

سپنسر : فلسفہ تعلیم (مترجمہ خواجہ غلام السیدین) ... 49

شپرانگر : نفسیات عنفوان شباب (مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین) 107 - 113 , 110

فہرست مصطلحات

ذیل میں اُن اصطلاحوں کی فہرست دی جاتی ہے جو کتاب میں استعمال کی گئی ہیں - چونکہ بہت سی اصطلاحوں کے متعلق اتفاق رائے نہیں ہے اس لئے کوشش یہ کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آسان اور قابل فہم الفاظ منتخب کئے جائیں :—

Suggestion	تاثیر خیال	Concentration of Studies	اجتماع مطالعہ
Psychoanalysis	تحلیل نفسی		
Scepticism	تشکیک	Social Efficiency	اجتماعی افادہ
Socialization of Education	تعلیم کی معاشری تنظیم	Impressions	ارتسامات
		Tests	آزمائشیں
Continuation Education	تعلیم مزید	Communist	اشتمالی
		Utilitarian	افادی ، افادیت پسند
Creative	تخلیقی	Values	اقدار
Catharsis	تنقیہ	Passive	انفعالی
Instinct	جبلت	Individuality	انفرادیت
Correiation of Studies	ربط مضامین نصاب	Transfer of Training	انتقال قوت اکتسابی
Impulse	وجدان	Informal Education	بے ضابطہ تعلیم
Formal	صوری		
Heuristic Method	طریقہ دریافت	Prestige Suggestion	تاثیر تفوق

Motives	محرکات	Amateur	عطائی
Occupations	مشاغل	Will-to-power	عزم للقوۃ
Pragmatism	مصرف پسندی	Scientific Method	علمی طریقہ
Project Method	منصوبی طریقہ	Social	عمرانی ' معاشری
Faculty Psychology	نفسیات انشعابی	Idealism	عین پسندی
		Active, Activity	فعالی ' فعالیت
Structural Psychology	نفسیات ترکیبی	Efficiency	کار کردگی
		Dynamic	متحرک ' حرکی
Federal Government	وفاقی حکومت	Environment	ماحول
		Civics	مدنیات